نگار

قواعد رسالہ "نگار"

۱۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے۔

۲۔ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا

۳۔ خط کتابت کیوقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جسپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کر دیے جاتے ہیں

۴۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۵۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہییں۔

۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مولانا نذیر احمد

- نبات النعش ۹ر
- مراۃ العروس ۱۰ر
- توبۃ النصوح ۱۲ر
- موعظ حسنہ عہ
- رویائے صادقہ عہ
- ایامی عہ
- فسانۂ مبتلا عہ
- ابن الوقت عہ
- مصائب غدر ۱۲ر

مولانا شبلی

- سیرۃ النبی جلد اول عـہ
- " دوم ہے
- " سوم عـہ
- الفاروق ۶ر
- سیرۃ النعمان عہ
- الغزالی عہ
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم ۶ر
- سفرنامہ مصر و شام ۶ر
- علم الکلام ۶ر
- الکلام ۶ر
- رسائل شبلی عہ
- مقالات شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول ے
- " دوم ۶ر
- " سوم ۶ر
- " چہارم ے
- " پنجم ۶ر
- موازنہ انیس و دبیر ے
- مضامین عالمگیر ۸ر
- آغاز اسلام ۸ر
- کلیات فارسی ۶ر
- کلام شبلی اردو ۸ر

امیر مینائی

- صنم خانۂ عشق ۶ر
- مراۃ الغیب عہ
- محامد خاتم النبیین ۸ر
- ضیائے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی ۶ر

رتن ناتھ سرشار

- سیر کہسار ہے
- خدائی فوجدار ۶ر
- جام سرشار ۶ر
- الف لیلہ طرز ناول صہ
- کامنی عہ
- سوانح عمر و عیار ۶ر

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس ۱۲ر

جوالا پرشاد برق

- مرنالنی ۱۲ر
- مار آستین ۸ر
- بنگالی دلہن
- معشوقۂ فرنگ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۲۹ء

ملاحظات ــــــ ۲

حکومت برطانیہ کی وسعت کارانہ (سیاسی) عبد القیوم رسا۔ ۹

تصویر کی موت۔ (افسانہ) ــــ عبد السلیم۔ ۱۹

برہان پور۔ (تاریخی) ــــ سید احمد اللہ قادری۔ ۲۶

پرستار محبت۔ (افسانہ) ــــ محشر عابدی۔ ۳۳

تصوف اسلام پر ایک گوشۂ نظر۔ عبد المالک (آروی)۔ ۴۹

شیطان کی آنت ــــ رشید احمد صدیقی۔ ۶۰

باب المراسلۃ والمناظرۃ ــــــ ۷۷

باب الاستفسار ــــــ ۸۴

وے بخیر گزشت۔ (فسانہ) ــــــ ۸۹

مغنیۂ مصر (نظم)۔ روش صدیقی۔ ۹۳

غزل فرخ بنارسی و نظیر لودھیانوی ــــ ۹۴

غم روزگار۔ ــــ سید علی اختر۔ ۹۵

"آجا" ــــ طالب باغپتی۔ ۹۶

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد ۱۶ | جولائی سنہ ۱۹۲۹ع | شمارہ ۱

ملاحظات

نگار کی اس اشاعت سے سولھویں جلد کا آغاز ہوتا ہے اور گزشتہ ۱۵ سال ۶ ماہ کا زمانہ غالباً "حق صحبت دیرینہ" قایم کرنے کے لئے ناکافی نہ سمجھا جائے گا جسکے مطالبہ میں اگر نگار اور ناظرین نگار دونوں اصرار و ابرام سے کام لیں تو بیجا نہ ہوگا۔ سب سے پہلے مجھے اپنے ادائے فرض کے متعلق یہ کہنے میں مطلق پس و پیش نہیں ہو سکتا کہ :-

از نفس انچہ داشتیم صرف ترانہ کردہ ایم

اب یہ اور بات ہے کہ نتیجہ کے لحاظ سے اور اثر و اعتبار کی حیثیت سے میں اک لفظ "اعتراف" کا بھی مستحق نہ قرار پاؤں

شعلہ چکد عنم گرا، گل شگفد مزد کو
شمع شبستانیم باد سحر گاہیم

یہ تو صورت ہوگئی اس حق کے فیصلہ کی جو ناظرین نگار کی طرف سے مجھ پر یا نگار پر عاید ہوتا ہے، اب رہا میرا یا نگار کا مطالبہ ملک و اہل ملک سے سو اس کے متعلق کیا عرض کروں، حقیقت یہ ہے کہ "نہ میں نے سمجھا" اور نہ آپ نے بے مہری سے کام لیا، تاہم انور دہلوی کا یہ مصرعہ ضرور زبان پر آجاتا ہے کہ :- "پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے"

نگار اب اس حد سے گذر گیا ہے کہ اس کے مقاصد و اغراض کی تشریح کیجائے اور نہ اسکو اس سطح سے نیچے آنے کی کوئی توقع کسی کو پیدا کرنا چاہیے جو اُسنے اپنے لئے بالکل جداگانہ قایم کرلی ہے، کیونکہ جو لٹریچر اس کے ذریعہ سے پیش ہورہا ہے، خواہ وہ ادب لطیف سے متعلق ہو یا اصلاح مذہب و معاشرت سے دنیا کی کوئی یسیر الحصول جنس نہیں ہے اور نہ وہ تاجرانہ لب و لہجہ سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز ہے، جس کا بطون اس کے ظاہر سے مختلف ہوا کرتا ہے اور جس کو ہر وقت آسانی سے بدلنا ممکن ہے، میں جو کچھ کہتا ہوں حق سمجھ کر کہتا ہوں اور صداقت کے اعلان میں دنیا کی کسی قوت سے نہ ڈر کر جو مسرت میں محسوس کرتا ہوں اسکو مٹا دینا میرے اختیار کی بات نہیں،

برلب یا علی سر اے بادہ روانہ کردہ ایم مشرب حق گزیدہ ایم عیش شبانہ کردہ ایم

نگار نے جو عظیم الشان انقلاب، ہندوستان کے مذہبی عقول انسانی میں پیدا کر دیا ہے وہ اتنا زبردست "معاوضہ" میری حقیر مساعی کا ہے کہ بعض اوقات میں متحیر ہو جاتا ہوں کہ

تا چہ فراہم شدست اجرت جانکاہ ایم

اور اس کے بعد میں ایک خاص قسم کا استغنار محسوس کرتا ہوں، لیکن جسوقت میں یہ دیکھتا ہوں کہ

از ہرچہ گفتن داشتم ایں جملہ حرفے بیش نیست

تو میری بھینیاں بڑھ جاتی ہیں اور "وسعت بیان" کی تمنا کے ساتھ ساتھ یہ بھی دل چاہتا ہے کہ "گوش سخن شنو" اور "دیدۂ اعتبار" دونوں میں اضافہ ہو۔ اس لئے قبل اسکے کہ یہ جلد ختم ہو آپ کو ایک بار کبھی تنہائی میں بیٹھ کر غور کر لینا چاہیے کہ آپ نے اس "حقِ دیرینہ" کا کس حد تک اعتراف کیا ہے چونکہ قرض کے استمرار کے ساتھ وقت و زمان کی تعیین اٹھ جاتی ہے اس لئے آپ اب بھی اور ہر وقت اسکی تلافی کر سکتے ہیں۔

گذشتہ ماہ کی اشاعت میں میں نے، اجمالی طور پر یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ نگار اور اس کے کاروبار کو اب کسی خاص شخص کی ملکیت رکھنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اجتماعی حیثیت سے اس کو چلانا ہے، مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ اس تجویز کو بہت سے حضرات نے پسند کیا اور وہ عملاً اس میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ بہر حال میں ایک ماہ کی مہلت اور دیتا ہوں تاکہ اچھی طرح پبلک اس پر غور کرے اس کے بعد میں مفصل لائحہ عمل شایع کروں گا جس سے سرمایہ کی مقدار، کاروبار کی عملی صورت اور متوقع نفع کا اندازہ ہو سکے گا، میں خود اس ارادہ کی تکمیل کے لئے اخیر جولائی میں حیدرآباد اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا سفر کروں گا، اور دیکھوں گا کہ کس حد اور کس وقت تک میری یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ جو حضرات اس باب میں خط و کتابت کرنا چاہیں، وہ براہ راست مجھسے کر سکتے ہیں۔

امیر امان اللہ خان ساحل ہند کو خیر باد کہہ چکے اور اُس سرزمین مین پہونچ گئے جہان زندگی ہے، نشاط عمل ہے، ولولۂ اقدام و ترقی ہے۔ حکومت و سلطنت خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے جو کسی انسان کو عطا ہو سکتی ہے، لیکن ایک نعمت اس سے بھی زیادہ مہتم بالشان اور ہے، جس کا نام ضمیر کی آزادی، فکر کی حریت اور حس و خیال کی روشنی ہے۔ ایک مجبور و پابند بادشاہ سے پوچھئے کہ وہ ایک آزاد مزدور کی زندگی کو کیا سمجھتا ہے جو دن بھر کی محنت سے تھک کر دماغ کے پورے سکون کے ساتھ رات بھر صحت کی نیند سوتا ہے۔ کیا نپولین جس وقت جزیرۂ ہلنا مین محبوس و مقید تھا، وہ ایک معمولی سپاہی کی آزادی کے لئے نہین ترس رہا تھا، اور کیا جس وقت ملکہ میری جلاد کے تیغ کے نیچے گردن جھکائے ہوئی تھی، اس بات کی متمنی نہ رہی ہو گی کہ اُسے ایک ادنیٰ خادمہ ہی کی حیثیت سے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اگر امان اللہ خان بھی دوبارہ افغانستان کی حکومت حاصل کرنے کے بعد اتنے ہی مجبور ہوتے اور تمام اصلاحات کا دروازہ ان کو بند کرنا پڑتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اس حالت مین اپنے آپ کو صحیح معنی مین وہان کا حکمران سمجھتے اور انھین اس ثروت و حکومت کے حصول پر حقیقی مسرت ہوتی۔ چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جس کی بنا پر انھون نے کہا تھا کہ "مین افغانستان کو جاہل رکھ کر اسپر حکومت کرنے کے لئے طیار نہین"

زوال امان اللہ خان کے صحیح اسباب کی تاریخ تو کسی وقت زمانۂ مستقبل مین طیار ہو گی لیکن بحالت موجودہ اسقدر ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بعض غلطیان امان اللہ خان سے ضرور ہوئین جنھون نے دشمنون کو بغاوت کا موقعہ دیا۔ پہلی غلطی تو یہ ہوئی کہ انھون نے تدریجی اصلاح کو مد نظر نہین رکھا اور چونکہ وہ فطرتاً بہت عجول اور بے چین دل و دماغ رکھتے ہین اس لئے وہ چاہتے تھے کہ افغانستان کو معجزانہ طور پر دفعتہً حیوان سے انسان بنا دین، حالانکہ ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ دوسری غلطی بالکل حضرت عثمان غنی کی طرح ان سے بھی یہ ہوئی کہ خاص ایک جماعت کو برسر اقتدار کر دیا اور دوسری اہم جماعتون کو جن کا ملک و قوم مین بڑا اثر تھا، بد دل ہو جانے کا موقعہ دیا۔ اس مین شک نہین کہ سردار محمود طرزی ایک روشن دل و دماغ کے انسان ہونے کی حیثیت سے ہر عزت و احترام کے مستحق تھے، لیکن اُن کا اور اُن کے خاندان کا عروج بالکل برامکہ کا سا عروج تھا کہ تمام سلطنت پر حاوی ہو گئے اور آخرکار خلفاء عباسیہ کو ان کا استیصال کرنا پڑا۔ یہان یہ ہوا کہ خود ملک نے شاہ و وزیر دونون سے انتقام لیا۔ لیکن افسوسناک امر صرف یہ ہے کہ جو کچھ ہوا وہ صرف اغراض ذاتی کے لئے ہوا اور انقلاب پیدا کرنے والون مین ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کے سامنے ملک کے فلاح و بہبود کا سوال ہو۔

بہر حال وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہوا لیکن، امان اللہ خان کا نام اکابر عالم کی فہرست مین ضرور داخل ہو گیا اور افغانستان کی تاریخ کبھی اس شخص کے احسانات سے سبکدوش نہین ہو سکتی جس نے چند سال کی مدت مین ملک کو خاک سے پاک بنا دیا تھا۔ یون تو مستقبل کے واقعات پر حکم لگانا دشوار ہے، لیکن بظاہر حالات اب کوئی امید امان اللہ خان کی واپسی کی نہین ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس سلسلہ مین ان کے صاحبزادے حکمران ہو جائین، نادر خان کے نام قرعۂ حکومت پڑ جائے یا کوئی اور

تیسرا شخص منتخب ہو جائے، لیکن بعض مخصوص اسباب کی بناء پر امین اللہ خان کا پھر واپس آنا بہت متعذر ہے۔

افغانستان سے جو خبریں آجکل آرہی ہیں، وہ بھی ناقابل اعتبار ہیں تاہم یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ امان اللہ خان کے چلے آنے کے بعد سے "بچہ سقہ" کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے اور وہ خود بھی اس کو محسوس کرکے مضطرب ہو رہا ہے۔

اُس وقت ہندوستان جس سیاسی منزل سے گزر رہا ہے وہ حقیقتاً بہت نازک ہے اور جس جماعت نے اس کی نزاکت کو نہ سمجھکر موقعہ کو ہات سے جانے دیا اس کا مستقبل سخت تاریک ہے۔

حکومت نے اس امر کو پوری طرح محسوس کر لیا ہے کہ ہندوستان کا موجودہ نظام حکومت یقیناً بدلنا ہے اور آج نہین تو کل اُسے ضرور آزاد ہونا ہے، اس لئے ایسی حالت مین جو پالیسی حکومت کی ہونا چاہیے ظاہر ہے یعنی جس صورت مین کم سے کم قربانی اس کو کرنا پڑے گی، وہی وہ اختیار کریگی اور بہرائش وقت اس کے سامنے سوائے اپنے مفاد کے اور کوئی سوال نہ ہوگا۔

اس وقت انگلستان کے ایوان حکومت مین مزدور جماعت کے اقتدار نے ہندوستان کے مسئلہ کو بہت زیادہ اہم کردیا ہے اور سائمن کمیشن کا نہرو رپورٹ کے اصول پر سفارش کرنا اور حکومت کا اُسے منظور کر لینا مستبعد نہین اس لئے بحالت موجودہ مسلمانون کی پوزیشن بہت زیادہ نازک ہے، کیونکہ ان کی بعض جماعتون نے نہرو رپورٹ سے مخالفت کرکے ایک ایسا محاذ قایم کیا ہے جس کے کامیاب ہونے کی مطلقاً کوئی توقع نہین ہو سکتی۔

مسلمانون کی طرف سے بڑی قوی دلیل (جو حقیقتاً نہایت ضعیف و کمزور ہے) مخالفت کی یہ پیش کیجاتی ہے کہ ان کے اقلیت کی کوئی رعایت ملحوظ نہین کی گئی اور حکومت برطانیہ اس کو حرب و دماغ کا بڑا ذریعہ سمجھکر اس سے کام لے رہی ہے، حالانکہ جس وقت نہرو رپورٹ کے اصول پر نظام حکومت قایم ہوا تو یہی حکومت برطانیہ جو اس وقت اقلیت کے عذر مین مسلمانون کے ہمنوا نظر آتی ہے، اسپر کاربند نہ ہوگی اور اقلیت کے تمام عذرات کو خود ہی ٹھکرا دیگی۔

اسوقت تک کہ حکومت کسی فیصلہ کرنے پر مجبور نہین ہے وہ آخری لمحہ تک ہر عذر لنگ کو ایک برہان ساطع اور ہر رائی کو پہاڑ بنا کر دکھائے گی، لیکن جب اس کو کوئی فیصلہ نہرو رپورٹ کے موافقت مین کرنا پڑا تو پھر نہ اقلیت کی ہمدردی ہوگی اور نہ کمزور کی اعانت۔ یہ کم لوگون کو معلوم ہے کہ گھونسہ کھا کر اس کا اعتراف کر لینا "جان بل" کی خصوصیات مین داخل ہے،

امسال انتخابات کے التوا سے حکومت ہند نے بہت کچھ اس تخریب کی رخنہ بندی کر لی ہے جو بصورت دیگر بالکل لاعلاج ہو جاتی، لیکن کیا دنیا اسقدر بیوقوف ہے کہ وہ ان کمزوریون کو محسوس نہین کر سکتی۔ اگر امسال انتخاب ملتوی نہ ہوتا تو شاید اقلیت و اکثریت کا مسئلہ بڑی حد تک سلجھ جاتا اور سال ختم ہونے کے بعد جب کلکتہ کانگریس کے فیصلہ کے مطابق پروگرام مقاطعہ کا آغاز ہوتا تو ہندو مسلمانون کے درمیان خلیج افتراق اسقدر وسیع نہ ہوتی۔

مسلمانون کی ایک جماعت جو نہرو رپورٹ کی مخالف ہے اور بعض اُن کی ہمت افزا اخبار کہتے ہین کہ ہمکو نہرو رپورٹ سے مخالفت اکثریت و اقلیت کی بنا پر نہین ہے بلکہ صرف اس لئے ہے کہ ہم نوآبادی کی سی حیثیت کو ہندوستان کی توہین سمجھتے ہین اور ہم مکمل غیر مشروط آزادی کے طالب ہین۔ یقیناً یہ حجت نہایت بلند ہے اور ہر وہ شخص جو اس کو سنے گا، مسلمانون کی اس ہمت مردانہ کی داد دیگا۔ لیکن سوائے الفاظ کے اس مین کوئی حقیقت نہین ہے اور یہ محض پردہ ڈالنا ہے اپنی بزدلی پر۔ اصلیت تو یہ ہے کہ جی ڈر رہا ہے ہندوؤن کی اکثریت سے اور اس کی مخالفت کیجاتی ہے اس طرح تاکہ ان کی ساکھ نہ مٹنے پائے۔

اوّل تو اقلیت کا صرف اس بنا پر خائف ہونا کہ وہ اقلیت ہے حد درجہ سفیہانہ اور بزدلانہ جذبہ ہے۔ کیونکہ جس طرح سے اکثریت نام صرف زیادتی اعداد کا نہین ہے اسی طرح اقلیت کمی اعداد کو نہین کہتے۔ اس کا سب سے روشن ثبوت مسلمانون کو خود اپنی تاریخ سے ملسکتا ہے کہ انھون نے اقلیت ہی سے اکثریت حاصل کی اور اکثر و بیشتر یہی ہوا کہ ان کی نہایت محدود جماعت نے بڑے بڑے لشکرون کے مُنہ موڑ دیے۔ اکثریت نام صرف قوت روح و اخلاق کا ہے اعزم و پامردی کا ہے۔ جنگل مین شیر تنہا ہوتا ہے اور لومڑیان ہزارون لیکن نہ آج تک کسی شیر کے دل مین لومڑیون کی طرف سے خدشہ پیدا ہوا اور نہ اس بنا پر اس نے جنگل چھوڑا۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو تسلیم کر لین کہ نہرو اسکیم کے نفاذ کے بعد ہندؤن کی کثرت مسلمانون کیلئے خطرناک ثابت ہوگی، تو اس کا کیا علاج ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی اکثریت تو کسی طرح کم ہو نہین سکتی یہانتک کہ وہ قوت بھی جس کے اعتماد پر ہم اپنی اقلیت کے توازن کو قایم کرنا چاہتے ہین اس کا کوئی مداوا اپنے پاس نہین رکھتی۔ پھر صورت یہی رہجاتی ہے کہ اپنی کیفیت سے ان کی کمیت کو دور کیا جائے۔ یا پھر انتظار کیا جائے اُس وقت کا جب اکثریت کے حقیقی خطرات رونما ہون اور پھر پوری قوت کے ساتھ اس کی مخالفت کیجائے۔ لیکن قبل از وقت خواہ مخواہ وہم و قیاس کی بنا پر رعشہ براندام رہنا اور اس طرح اپنے طرف سے بے اعتمادی پیدا کرا دینا بالکل خلاف عقل و مصلحت ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ نوآبادی کا سا مرتبہ ہندوستان کو ملجانا کوئی قابل فخر بات نہین، لیکن نہرو رپورٹ مین ہمکو کسی ایک جگہ بھی یہ نظر نہین آتا کہ وہ صرف اسی پر قناعت کر لین گے۔ ترقی ہمیشہ تدریجی ہوا کرتی ہے اور زیادہ بلندی پر چڑھنے والے ایک ہی ایک زینہ طے کیا کرتے ہین۔ وہ سمجھتے ہین کہ مکمل آزادی کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب اس کا مطالبہ زبان سے نہین بلکہ عمل سے کیا جائے اور یہ ظاہر ہے کہ نوآبادیون کی سی آزادی ملنے کے بعد ہم مکمل آزادی سے قریب تر ہوجائینگے اور پھر ہمارا مطالبہ ایک غلام ملک کا سا مطالبہ نہ ہوگا۔ اس لئے مسلمانون کا یہ سمجھنا کہ نہرو رپورٹ کا انتہائی نقطہ نظر مکمل آزادی نہین ہے، نادرست ہے، بیشک نہرو رپورٹ مین خامیان بھی ہین اور وہ کونسی انسانی کوشش ایسی ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہو۔ لیکن وہ تمام خامیان عملی دنیا مین آکر جب قانون اساسی مرتب ہوگا دفع ہو جانے والی ہین۔ البتہ صرف ایک خامی ایسی ہے جس کو اس سے پہلے ہی اصولاً دور ہوجانا چاہیئے اور وہ یہ کہ صوبہ کی حکومتون کو بھی مرکزی حکومت

کی طرح آزاد ہونا چاہئے سوائے ان مسایل کے جن مین صرف مرکزی حکومت ہی کا فیصلہ کسی فتنۂ عام کو روک سکتا ہے۔ لیکن مسلمانون کو اس کا مطالبہ انتقام کے خیال سے نہ کرنا چاہئے بلکہ صرف اس لئے کہ اگر صوبہ کی حکومتین آزاد نہ ہونگی تو ملک کبھی ترقی نہین کر سکتا۔

بہر حال اس وقت لیبر پارٹی کے برسر اقتدار ہونے سے اک ضعیف سی امید قایم ہو گئی ہے کہ ممکن ہے اختتام سال تک ہندوستان کو نو آبادیونکی سی حکومت ملجائے، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو پھر غور طلب امر یہ ہوگا کہ کلکتہ کانگریس کا الٹی میٹم کیونکر کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ ہر چند وہ متفقہ قوت جو اس سے قبل ترک موالات کو کامیاب بنانے مین ظاہر کی گئی تھی اب مفقود ہے اور ایک زمانہ چاہئے کہ کانگریس پھر وہی اعتماد حاصل کر سکے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ سب سے زیادہ کارگر حربہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف ترک موالات اور سودیشی مال کا بائیکاٹ ہے اور اگر ہلوگ واقعی اس کی اہمیت سے واقف ہو جائین تو تمام مشکلات ایک ہی سال کے اندر حل ہوئی جاتی ہین۔

اس ماہ کی اشاعت مین پہلا مضمون جناب عبد القیوم صاحب رسا کا ہے۔ اس کی اہمیت کے متعلق مین اس کے ابتدا مین اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہون۔ اس مضمون کے آیندہ ابواب مین براہ راست انگلستان اور ہندوستان کے موجودہ تعلق اور اسکے مستقبل پر نہایت ہی مدبرانہ اور دلچسپ بحث کی گئی ہے "سیاسیات" مین ایسے ہی مضامین کی ضرورت ہے اور ہر باشندۂ ہند کا فرض ہے کہ وہ اس نوع کی پختہ کارانہ تنقیدون کو نظر غور سے پڑھے۔

"برہانپور" پر جناب مولوی سید احمد اللہ صاحب قادری کا مضمون بہت محققانہ ہے۔ صاحب موصوف نے حیدر آباد سے ایک رسالہ سہ ماہی "تاریخ" کے نام سے جاری کیا ہے جس کے دو نمبر شایع ہو چکے ہین۔ آپ کا تعلق دکن کے آثار قدیمہ سے ہے اور آپ اپنی عمر کا بڑا حصہ "صنادید عجم" کی تحقیق مین بسر کر چکے ہین۔

"تصوف اسلام پر" مولوی عبد المالک صاحب آروی کا مضمون قابل داد ہے۔ اس کے آیندہ حصہ مین "خواب" کے متعلق بہت کافی اور دلچسپ مواد صاحب موصوف نے پیش کیا ہے۔

"شیطان کی آنت" مسٹر رشید احمد صدیقی ایم اے (علیگ) کا عطیہ ہے جس کا وعدہ انھون نے کیا تھا۔ ایک نہایت ہی مختصر سا فسانہ "وے بخیر گذشت" مر الکھا ہوا ہے جس کو اگر آپ نے حقیقت نہ سمجھ کر پڑھا تو بے لطفی کی ذمہ داری میرے سر نہ ہوگی "پرستار محبت" مین جناب محشر عابدی نے اپنے اور افسانون سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ اور "تصویر کی موت" مین نقاشی کے حقیقی معیار کو ظاہر کیا گیا ہے۔

"حصۂ منظومات" مین جناب مولوی سید علی اختر صاحب کی نظم اسقدر بلند پایہ اور الفاظ و معنی دونون لحاظ سے اسدرجہ پاکیزہ ذوق و معیار کی ہے کہ معمولی رسمی الفاظ سے اس کی داد نہین دیجا سکتی۔

روش صدیقی کی نظم "مغنیۂ مصر" اور جناب طالب باغپتی کی نظم "آجا" دونون اپنی اپنی جگہ خوب ہین۔ در حقیقت یہ ہے

کہ جس نظم میں صحیح جذبات سے کام لیا جاتا ہے، وہ فن کی لغزشوں کے باوجود بھی اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتی۔

روش صدیقی کی نظموں میں جو ایک خاص مستانہ پن ہوتا ہے وہ اس میں بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے اور جناب طالب نے جا بجا "نقطوں" سے جگہ پُر کرکے اپنی نظم کو بہت کچھ واقعیت سے وابستہ کر دیا ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ اس کے لفظ لفظ سے ایک والہانہ انداز ظاہر ہو رہا ہے۔

نیاز

ایک ادبی و علمی دعوت

جنوری ۱۹۲۸ء کی اشاعت نگار کو مومن کے لئے مخصوص کرکے مین نے اپنے آپکو گویا پابند بنالیا ہے کہ ہر سال کسی نہ کسی ایسے شاعر کی یاد کو تازہ کیا جائے جس کے مٹانے مین زمانہ نے اپنی پوری قوت صرف کردی ہے۔

چنانچہ ارادہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۰ء کا نگار "ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کیلئے مخصوص کردیا جائے اور کم ازکم دو سو صفحات کو محیط ہو اس سلسلہ مین جو عنوانات قایم کئے گئے ہین، یہ ہین:۔

(۱) ظفر کی سیرت اور اس کے عہد کے تاریخی خصوصیات (۲) عہد ظفر کے سیاسیات (۳) ظفر کی شاعری اور اسکی خصوصیات (۴) عہد ظفر مین دہلی کی شاعری (۵) ظفر کی شاعری پر سیاسیات وقت کا اثر (۶) دربار ظفر اور عہد ظفر کے شعراء (۷) ظفر کے عہد مین دہلی کی علمی و ادبی فضا (۸) ظفر رنگون مین (۹) حالی و آزاد کی رائے ظفر کی شاعری کے متعلق اور اسپر محاکمہ (۱۰) انتخاب کلام ظفر۔

امید ہے کہ مُلک کے ارباب علم و ادب

عنوانات بالا مین سے کسی عنوان پر یا ایک ہی مضمون کے سلسلہ مین ان تمام یا چند عنوانات پر اپنی تحقیقات و معلومات بھیجکر ممنون فرمائینگے۔ انتخاب کلام ظفر کی خدمت ادارۂ نگار نے اپنے ذمہ لی ہے اسلئے اسپر کسی کو وقت صرف کرنیکی ضرورت نہین۔

اسی سلسلہ مین غالباً یہ عرض کردینا بے محل نہوگا کہ بہترین مضمون کے لئے نگار کی طرف سے ایک حقیر ہدیہ سو روپیہ کا پیش کیا جانا قرار پایا ہے۔ جو کامیاب مضمون نگار کی خدمت مین ٹھیک ۲۵ جنوری ۱۹۳۰ء کو روانہ کردیا جائیگا۔ زیادہ سے زیادہ ۳۰ ستمبر ۱۹۲۹ء تک مضامین کا دفتر نگار مین پہونچ جانا ضروری ہے۔

نیاز فتحپوری (ایڈیٹر نگار) لکھنؤ

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز

اور قبضۂ ہندوستان کی دلچسپ داستان

"سرجان سیلی کی ایک مشہور کتاب (Expansion of England) ہے جس مین انگلستان کی توسیع پر بحث کرکے بہت سے سیاسی، تاریخی اور اقتصادی رموز کو آشکارا کیا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ ہندوستان سے متعلق ہے جس مین خصوصیت کے ساتھ قبضۂ ہندوستان کی داستان بیان کی ہے اس دوسرے حصہ کا ترجمہ ہمارے فاضل دوست جناب عبدالقیوم صاحب رسا (گورکھپور) نے بغرض اشاعت "نگار" کو روانہ کیا ہے جو بالاقساط شایع ہوکر بعد کو کتابی صورت مین پیش کیا جائیگا۔

یہ سلسلۂ مضمون نہایت اہم و دلچسپ ہے اور ہر اس شخص کو جو ہندوستان کا باشندہ ہے اسکا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

ہم جناب رسا کے ممنون ہین کہ انھون نے یہ مفید سلسلۂ مضامین نگار کو مرحمت فرمایا۔　(اڈیٹر)

تاریخ اور سیاست

بعض اوقات لوگ ایسے مورخین کا مذاق اُڑاتے ہین جو محض قیاسات کی بنا پر کہتے ہین کہ اگر فلان واقعہ تاریخ مین یون واقع ہوا ہوتا تو نتیجہ کے لحاظ سے اسکا یہ اثر ہوتا۔ لیکن جو لوگ ایسا کرتے ہین وہ غلطی پر ہین کیونکہ انھین معلوم نہین کہ مورخین کو ایسے قیاسات سے اصولی بحث کے لیئے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔ میرے خیال مین انھین اور زیادہ آزادی سے اس قسم کی قیاس آرائیون مین حصہ لینا چاہیئے۔ اہم واقعات عامہ کے متعلق یہ خیال کرنا کہ چونکہ وہ اعلیٰ پیمانہ پر ہین اسلیئے اُنکے محرک اسباب روزمرہ کے معمولی واقعات کے محرکات سے غیر معمولی ہونگے صریح دھوکا ہے اور یہی غلط خیال فیصلہ کی تخریب کا باعث ہوتا ہے۔ جب تک تم کسی ملک کی جزوی حکمت عملیون پر غور کرنے سے قاصر رہوگے تم اسکی قومی حکمت عملی کے متعلق بھی صحیح راے قائم کرنے سے قاصر رہوگے۔ یہ ریمارک توسیع انگلستان جیسے پیچیدہ اور بسیط مسئلہ پر ٹھیک ٹھیک منطبق ہوتا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر انگلستان کے تعلقات دنیائے جدید سے نہ ہوے ہوتے تو ملکۂ الزبتھ کے عہد سے لیکر اسکی پوری تاریخ کس قدر مختلف ہوتی! ہسپانیہ کے جنگی بیڑہ کا وجود کیونکر ہوتا، ڈریک (Drake) اور ہوکنز (Hawkins)

اسکے مقابلہ کے لیئے کہاں سے پیدا ہوتے، انگلستان کی بحری طاقت اتنی زبردست کیسے ہوتی بلیک کو وان ٹرمپ اور ڈی رویٹر سے جنگ کرنیکی نوبت کیونکر آتی۔ مجلس عالیہ شوری اور چارلس ثانی کے محاربات ہولینڈ اور کرامول کی جنگ اسپین کیونکر ظہور مین آتی۔ ملک اتنا کثیر سرمایہ جمع کرنے کے قابل ہرگز نہ ہوتا کہ لوئی چہاردہم جیسے بہادر کو نیچا دکھاتا۔ وہ عظیم الشان تجارتی کارپوریشن جو زرعی مفاد کے توازن کا ذمہ دار ہے اور جس نے سلطنت کے سیاسیات کی صورت ہی بالکل بدل دی ہے کیونکر پیدا ہوتا۔ ملکہ این کے عہد مین انگلستان تمام اقوام پر فائق نہ ہوتا اور ہماری اٹھارھوین صدی بالکل بالکل مختلف ہوتی۔ الغرض ہر چیز کی صورت حالات آج سے یک قلم مختلف ہوتی۔ چونکہ قیاسات کا یہ سلسلہ نامتناہی ہے اس لئے تم انکا مضحکہ اڑا سکتے ہو اور کہہ سکتے ہو کہ ان تمام کوششون کا نتیجہ مفید مطلب نہین ہے۔ مگر پھر بھی یہ قیاسات تمام علمی تجاویز سے زیادہ مفید مطلب ہین۔ اور ان وجوہ سے کہ یہ عظیم توسیع اور جدید ملحقات جو گذشتہ تین صدیون مین قدیم انگلستان کے گرد جمع ہوگئے ہین اسقدر نامناسب نہین ہین کہ اُنسے خالی الذہن ہو کر ملکہ الزبتھ کے عہد کے انگلستان کا تصور نہ کیا جا سکے۔ ہماری سلطنت کا عروج ایک طرح طبعی کہا جا سکتا ہے اور برطانیہ عظمی بمقابلہ انگلستان قدیم کے ایک توانا اور معمر شخص کی مانند ہے جو ابتدا مین ایک چست و چالاک لڑکا رہا ہو۔ لیکن فرق صرف اسقدر ہے کہ ایسا معمر انسان پھر اپنے عہد طفولیت کو عود نہین کر سکتا ہے اور انگلستان اپنی نوآبادیات اور ہندوستان کو آزاد کر کے اپنی اصلی حالت کو صرف لوٹ ہی نہین سکتا بلکہ لوٹنا ضروری بھی سمجھتا ہے۔ درحقیقت ہم کناڈا کو ایسا نہین خیال کرتے جیسا کہ کنٹ کو، نہ (Nova-Scotia) کو اسکاٹ لینڈ کی طرح، نہ جدید جنوبی ویلز کو ویلز کی طرح اور نہ ہندوستان کو آئرلینڈ کی طرح۔ ہم بہت آسانی کے ساتھ اُنسے علیحدگی کا خیال کر سکتے ہین اور اگر ہم مناسب سمجھین تو اس علیحدگی کو نہایت آسانی سے انجام تک پہونچا سکتے ہین بلکہ بہت سے ذی منصب اشخاص تو ایسا کرنیکی فہمائش بھی کرتے ہین۔ بنابرین توسیع انگلستان کے مسئلہ پر کوئی فیصلہ صادر کرنے سے ہم مجبور ہین۔ کیا یہ بھی توسیع ہسپانیہ کی طرح نقش برآب ہی تو نہین ہے؟ کیا یہ توسیع شروع ہی سے یہ ایک خطرناک غلطی تھی کیا یہ ہماری اعلیٰ قابلیت کا بے محل استعمال تو نہ تھا۔ قومین غلطی کر سکتی ہین اور کرتی بھی ہین۔ بسا اوقات کورانہ جذبات یا غلط میلان طبع انکی رہنمائی کرتے ہین اور اگر انکی بے راہ روی زمانہ دراز تک جاری رہے اور انکو ناقابل قیاس حد تک گھسیٹ لیجائے تو اشیا کی فطرت کو اس سے کوئی وجہ تعرض نہین ہے۔ لہذا اب یہ امر بہت زیادہ قرین فہم ہے کہ انگلستان کو شروع ہی سے اس جوع الارض کے مرض کا مقابلہ کرنا چاہئے تھا۔ اور اسکو اپنی حد سے تجاوز نہ کرنا چاہئے تھا یا کم از کم یہ اسکی خوش قسمتی ہوتی کہ وہ بھی فرانس کی طرح اپنی سلطنت کو کھو بیٹھتا یا یہ کہ جب اُسنے اپنی پہلی نوآبادیات کو کھو دیا تھا تو دوسری کی بنا ہی نہ ڈالتا۔

لیکن اگر ایسا ہو یا ہو سکتا ہو تو بھی ہمارے لئے یہ کتنا عظیم الشان، لاینحل اور اہم مسئلہ ہے۔ اگر ہم اسی طرح

صحیح راستہ سے منحرف ہو گئے ہین یا ابھی ہمکو کسی دوسرے بالکل نئے راستہ مین قدم ڈالنا ہے تو یہ کتنا مہتم بالشان امر ہے!
ان مقامی سیاسی مسائل سے جن مین ہماری تمام توجہ جذب رہتی ہے یہ مسئلہ اہمیت مین کس قدر زیادہ ہے! ہم مین بہت سے لوگ ہین جو اپنے پریشان دلائل سے اسکی اہمیت کو بے وقعت کرنا چاہتے ہین اور یہ کہکر اس بحث کو ٹال دیتے ہین کہ ہمین اپنے کام سے کام ہے نہ کہ بعید اور دور دراز ممالک کی گتھی سلجھانے سے جو ہمارے اوراک سے باہر ہین اور بدقسمتی سے ہمارے گلے پڑ گئے ہین لیکن اگر درحقیقت یہ ہماری بدقسمتی تھی یا خود ہماری اپنی سلطنت اتنی بڑی ہے کہ اسی سے ہمکو فرصت نہین ملتی تو ایسی صورت مین یہ مسئلہ اور بھی جلدی اور توجہ کا متقاضی ہے کیونکہ اس وقت ہم قطعی طور سے یہ فیصلہ نہین کر سکتے کہ اپنے آپ کو ایسے گران بوجھ سے جو یقیناً ہمکو مصیبتون مین پھنسائیگا سبکدوش کرین۔ بعد ازان تا وقتیکہ ہم اپنے مدعا مین کامیاب نہ ہو جائین اپنی سلطنت کی تباہی کے بسیط اور نازک مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کافی موقع ملیگا۔ بہرحال یہان ہمارے لئے ہر جگہ سے زیادہ سیاسی امور موجود ہین۔ کیونکہ اگر ہماری سلطنت مزید ترقی کی اہل ہے تو ہمین دریافت کرنا ہوگا کہ وہ ترقی کا کونسا راستہ اختیار کریگی۔ یا اگر ہماری سلطنت ہمارے لئے ناقابل برداشت بوجھ ہے تو پھر اس سے نجات حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ الغرض دونون صورتون مین ہمین ایسی سلطنتون اور نوآبادیات سے عہدہ برآ ہونا ہے جو بڑی سرعت سے بڑھتی جاتی ہین اور انکی قسمت کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔

مین کہتا ہون یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے لیکن کیا اسکو تاریخی نہین کہہ سکتے۔ بیشک میرے پاس اس موضوع پر بحث کرنیکی وجہ صرف یہی ہے کہ اس سے تاریخ اور سیاست کا تعلق زیادہ صحیح طور سے واضح ہوتا ہے۔ میری تمام تقریر کا ماحصل یہی ہے کہ سیاست اور تاریخ مطالعہ کے دو مختلف مناظر ہین۔ مگر عام طور سے سیاست کا مفہوم لوگ قومون اور انکے مصالح کی باہمی جد وجہد سے مراد لیتے ہین اور سمجھتے ہین کہ تاریخ کا مطمح نظر ادبی نمائش ہے جسکی بدولت چند دلچسپ نظم اور نثر کی کتابین تصنیف ہو جاتی ہین حالانکہ یہ دونون مفہوم سراسر بدمذاقی سے منسوب کئے جائینگے۔ اس الجھن کا سبب میرے نزدیک ان دونون فنون کی غیر فطری مغائرت ہے۔ سیاست مین جب تک کہ تاریخ کو آزادی سے دخل نہ ہو بالکل لغو ہے اور تاریخ جب تک عملی سیاست کو نظر انداز کریگی، اسکی حیثیت ادب محض سے زیادہ نہوگی۔ اسی امر کو روشن کرنے کے لئے مین نے ایک ایسا موضوع اختیار کرنا چاہا جو ہر دو فن کو حاوی ہو اور سوائے "برطانیہ عظمی" کے میری نظر مین کوئی اور موضوع زیادہ موزون نہین معلوم ہوا۔

اس مسئلہ سے بڑھکر اور کونسا مسئلہ سیاسی ہو سکتا ہے کہ "ہمکو ہندوستان اور نوآبادیات کے بارہ مین کیا کرنا چاہیے؟" لیکن یہ سوال ایسا ہے جسمین تاریخ کی امداد کی ضرورت ہے۔ تم یہ نہ سمجھو کہ حقوق آزادی، یا ٹیکس کے خانگی معاملات، کی طرح تم ہمین دھوکا دے سکتے ہو۔ کیونکہ یہان معمولی عقل یا عامیانہ واقعات کا تجربہ کسی صحیح رائے قائم کرنے کے لئے کافی نہوگا۔ مثلاً ہندوستان کے معاملہ کے متعلق بغیر خاص معلومات اور مطالعہ کے کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہین ہے۔ کیونکہ

ہندوستان کے باشندے جسمانی، دماغی اور اخلاقی تمام حالات مین ہم سے جداگانہ واقع ہوئے ہین۔ دیکھو یہان پر سیاست تاریخ مین کس طرح جذب ہو جاتی ہے لیکن مین اس سے زیادہ، اسی مثال سے، تمھین یہ بتانے کے لیئے بےچین ہون کہ تاریخ سیاست مین کیونکر جذب ہو جاتی ہے اس سلطنت کے قیام کو ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہے۔ اگر ہم ان نوآبادیات سے جنھین ہم کھو چکے ہین تعرض نہ کرین اور صرف انھین مقبوضات کو مدنظر رکھین جو اب ہمارے پاس موجود ہین تو گویا ہمارے پیش نظر وہ ممالک ہین جو تقریباً سارے کے سارے جارج ثانی اور جارج ثالث کے عہد حکومت مین فتح ہوئے تھے۔ اسی عہد کو طلبہ عہد جدید سمجھکر چھوڑ دیتے ہین اور یہی وہ عہد ہے جسکو ادنیٰ مورخین نظر انداز کر جاتے ہین۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس اس خاص حصّہ کو غیر اہم اور قابل تدبر واقعات سے معرا سمجھتے ہین۔ یعنی اس دور مین تہذیب اور ملکی فلاح مین کوی نمایان ترقی نہین ہوی۔ ہمارے مورخین جب اس باب مین قدم رکھتے ہین تو انکا انداز نگارش ادیبانہ ہو جاتا ہے۔ واقعات تو بیان کرتے ہین لیکن بے معنی۔ جس سے خواہ مخواہ پڑھنے والون کے دماغ پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ وہ سمجھتے ہین کہ تاریخ انگلستان ایک کہانی ہے جسکا کوئی نتیجہ نہین۔ اب تم سوچو اس مرض کا کیا علاج ہے۔ مین نے مستقبل کے عظیم الشان واقعات کی طرف تمھارے خیال کو منعطف کیا ہے مگر چونکہ انکا تعلق زمانہ آئندہ سے ہے، ہمین انکی نسبت پوری معلومات نہین ہین البتہ یہ کہہ سکتے ہین کہ وہ واقعات رونما ہو کر رہینگے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے غیر معمولی ہونگے۔ یہ واقعات انگلستان نوآبادیات اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کی آیندہ ترقی سے پیدا ہونگے۔ مین نے آیندہ کی قید اسواسطے لگائی ہے کہ موجودہ صورت بادی النظر مین یقینی اور ہمیشہ رہنے والی نہین معلوم ہوتی۔ مگر ہم یہ نہین بتا سکتے وہ ارتقا کس قسم کا ہوگا۔ آیا کوئی عظیم انقلاب ہوگا، آیا کناڈا اور آسٹریلیا آزاد ہو جائینگے آیا ہندوستان ہمین چھوڑنا پڑیگا۔ اور کوئی ملکی حکومت جو ابھی وہم و گمان مین بھی نہین ہے وائسرائے اور انکی کونسل کی جگہ سنبھالیگی؟۔ یا بالکل اسکے برعکس کچھ اور ہوگا۔ آیا برطانیہ عظمیٰ اس سے بھی اعلیٰ نظام کے ماتحت آجائیگا آیا اہل انگلستان جو متعدد سمندرون کی وجہ سے منتشر ہین موجودہ ایجادات اور تجربات کی مدد سے اضلاع متحدہ امریکہ جیسا کوی باضابطہ نظام قائم کرینگے جس مین باوجود غیر محدود ملکی وسعت کے پوری آزادی اور اتحاد برقرار رہے۔ یا ہم اس سے بھی زیادہ مشکل عقدہ کے حل کرنے مین کامیاب ہونگے آیا ہندوستان کی حکومت کرنے کا کوئی اطمینان بخش طریقہ ہمین معلوم ہو جائیگا جسکی مدد سے یہ دو مختلف العادات اقوام باہم متحد رہین۔ مین نہین جانتا کہ یہ سوالات کس طرح حل ہونگے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ کسی نہ کسی طرح حل ہونگے۔ اور یہی وہ منزل مقصود ہے جسکی طرف انگلستان گام زن ہے۔ جیسا کہ بعض مورخین کا خیال ہے ہمین یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ تاریخ انگلستان مین مزید ترقی و وسعت کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور ہماری موجودہ حالت فلاح و خوشحالی کی اعلیٰ ترین منزل ہے۔ ہرگز نہین گو ہماری رفتار مسابقت اعلیٰ پیمانہ پر ہونیکی وجہ سے محسوس نہ ہوتی ہو لیکن جسوقت انقلابات اور تنازعات ہونگے تو اعلیٰ پیمانہ ہی پر ہونگے۔ اور جب وہ نازک موقع آجائیگا تو ہماری گذشتہ تاریخ صاف طور سے نمایان اور نتیجہ خیز نظر آئیگی

وہ تمام حیرت انگیز ترقی اور وسعت جو جارج ثانی کے عہد سے ہوتی آئی ہے اور جسکو پڑھکر ہم متحیر ہوتے ہین، اُسوقت بالکل مختلف طور سے ہمارے دماغ کو متاثر کریگی۔ آج جب ہم کناڈا اور آسٹریلیا کے وسیع ممالک کو دیکھتے ہین تو ششدر رہجاتے ہین لیکن اُنکے متعلق کوی قطعی راے نہین قائم کرسکتے۔ اسی طرح جب ہندوستان کی فتح کا حال پڑھتے ہین، کہ ایک انگریزی تجارتی کمپنی نے ۲۰ کروڑ ایشیا والون کو مسخر کرلیا تو حیرت زدہ رہجاتے ہین۔ اور کمپنی کو آفرین کہتے ہین۔ مگر ہم کوئی معقول راے نہین قائم کرتے۔ یہ تمام باتین اسقدر تعجب آمیز اور مناسبت سے بعید معلوم ہوتی ہین کہ دلچسپی سے گرجاتی ہین۔ لیکن وقت خود اس معمہ کو حل کریگا اور بتائیگا کہ اس کامیابی مین کیا اصلیت تھی اور کیا نہین! واقعہ ہمکو دکھا دیگا کہ اٹھارھوین صدی مین دنیاے جدید پر قبضہ کرنیکی کوشش کیا تھی، آیا اسکا انجام کسی استوار سلطنت کے قیام کی صورت مین ظاہر ہوا یا اسکی حقیقت محض غیر مستقل تجارتی سلطنت کی تھی جو اسپین کی طرح چند دنون مین فنا ہوجانے کے لیئے پیدا ہوئی تھی! آیا ہندوستان مین مشرق و مغرب کے مابین مستحکم اتحاد کے خوشگوار نتیجے ظاہر ہوے یا کلایو اور ہاسٹنگز نے ایسی عظیم الشان مہم اپنے سر لی جو ایک صدی کی ظاہری کامیابی کے بعد ناکامی مین ختم ہوجانیوالی تھی زمانہ ہر شخص کو یہ سبق یکسان طور پر بتادیگا۔ لیکن، اگر یہ کوی مفید شے ہے، تو تاریخ کو مستقبل کی باتین ضرور کسیقدر اشارون مین بتادینا چاہیئے۔ واقعہ کے بعد بلاشبہہ ہم سب ہوشیار ہوجائینگے لیکن تاریخ کا مطالعہ صرف اسی واسطے کیا جاتا ہے کہ وقوع سے قبل ہی ہم کسی واقعہ سے باخبر ہوجائین۔ کیون نہین ہم بھی نوآبادیات اور ہندوستان کی قسمت کے متعلق کوی راے قائم کرلیتے؟ اسلیئے کہ یہ کوئی ایسا معمولی کام نہین جسکو بلا سوچے سمجھے کردیا جاے۔ اسکے لیئے فن سیاست کے اصول سے واقفیت ضروری ہے۔ جب کوئی واقعہ پردہ غیب سے ظہور مین آئیگا تو بات روشن ہوجائیگی اور ہر شخص کو کم یا زیادہ معلوم ہی ہوجائیگا کہ جو کچھ واقع ہوا ہے اُسکو ہونا ہی تھا۔ اگر ایسا ہے تو فن سیاست کے پڑھنے والون کو صاف صاف نہین تو مجملاً وہ واقعات معلوم ہوجانا چاہئے جو ابھی پردۂ غیب مین ہین۔

کیا یہ ملحوظات ایسے نہین ہین جو انگلستان کی جدید تاریخ کو بالکل نئی روشنی مین پیش کرین۔ مین تمھین بتا چکا ہون کہ سولھوین صدی کے آخر مین انگلستان بالکل ایک نئے راستہ پر قدم رکھ رہا تھا۔ سترھوین صدی مین جو ترقیان اس منزل مین ہوئین اور اٹھارھوین صدی مین جو کثیر نتائج رونما ہوے انکی تفصیلی تاریخ بیان کرچکا ہون علاوہ ازین مین نے یہ بھی جتا دیا ہے کہ ہماری موجودہ حالت غیر مستقل ہے، اس مین کوئی اہم تبدیلی عنقریب ہونیوالی ہے خلاصہ یہ ہے کہ انگلستان کی تاریخ جدید ہمارے سامنے ایک مشکل سیاسی مسئلہ پیش کرتی ہے۔ دیکھو اس طرح تاریخ سیاست مین جذب ہوتی ہے۔ مین جارج ثانی اور جارج ثالث کے زمانہ حکومت کو تمھارے سامنے اسواسطے نہین بیان کرتا کہ تم قدیم روایات و رسوم کا حال پڑھکر اپنا دل بہلاؤ بلکہ اسواسطے کہ پیچیدہ سیاسی مسائل کے حل کرنے کے لیئے تم مواد اور ضروری سامان فراہم کرو۔ اگر تم یہ دریافت کرنا چاہتے ہو کہ ہماری سلطنت کا حشر کیا ہونیوالا ہے تو اسکے مدد و معین اسباب وجود

ر اور ان اصول کا مطالعہ کرو جن پر اسکی زندگی کا انحصار ہے - اور اگر اسکی نوعیت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہو تو اُسکی تاریخ پڑھو خصوصًا ابتدائی تاریخ۔

ایک عرصہ سے رنگینی پسند مصنفین کا خیال ہے کہ تاریخ کا طرز بیان ضرورت سے زیادہ رفیع اور شاندار ہے اور یہ کہ تاریخ مین ہر واقعہ جزئی تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان ہونا چاہئے، غیر مانوس واقعات سے احتراز کرنا چاہئے۔ الغرض اُنکے خیال مین تاریخ اور ناول کا انداز تحریر ایک ہونا چاہئے۔ لیکن مین بھی، اس خیال کے متعلق جو اتنے عرصہ سے قائم ہے، اپنی رائے ظاہر کر دینا چاہتا ہون جس اعتراض پر اس خیال کی بنا ہے مجھے اس سے انکار نہین ہے۔ مجھے اس خیال سے پوری موافقت ہے کہ تاریخ کو ”شاندار“ اور ”ادبی“ نہین ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی ساتھ مین یہ تسلیم کرتا ہون کہ ایک زمانہ تک تاریخ ”شاندار“ اور ”ادبی“ رہی ہے۔ لیکن ”شاندار“ ہونا اور چیز ہے اور اہم ہونا اور چیز۔ وہ طبقہ جو اس خیال کی ہمنوائی کرتا ہے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ چونکہ تاریخ کا طرز تحریر ’اعلیٰ‘ نہین ہونا چاہئے لہذا اسکو ’سنجیدہ‘ بھی نہین ہونا چاہئے۔ اسکو انکار ہے کہ تاریخ سے ٹھوس اور اہم اصول مترتب ہو سکتے ہین اسکا ذہن اس بات کے تصور سے عاجز ہے کہ تاریخ کی مدد سے بڑی بڑی معلومات بھی حاصل ہو سکتے ہین۔ یہ طبقہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تاریخ کا طرز نگارش دلفریب اور دلکش ہو، جسکو پڑھکر پرانی قومون کے قدیم عادات و طریق معاشرت کا نقشہ آنکھون مین پھر جاے اور اُنکے کارنامون کو پڑھکر وہ مبہوت اور حیرت زدہ رہ جائے۔ تھیکرے نے جو لکچر اسٹیلے پر دیا تھا اس مین تمہید ہی مین اُسنے اس طبقہ کے اصول کو بڑی صفائی سے بیان کیا ہے۔ اسکو ہر شخص نے پڑھا ہوگا اور میرے خیال مین بہت تلخ حقیقت متصور کیا ہوگا۔

وہ کہتا ہے تاریخ کے مطالعہ سے ہماری کیا غرض ہے؟ آیا سیاسی معاملات اور مشاہیر کے اطوار سے واقفیت حاصل کرنا یا محض زمانہ کی حقیقت اور حالات سے آگاہ ہونا۔ اگر ہمارا مدعا یہی ہے تو پھر دیانت اور سچائی کہان رہی، کسکو یقین ہے کہ تاریخ بالکل سچ کہتی ہے۔ اسکے بعد وہ کہتا ہے کہ تاریخ مین جس قدر طبقہ عام کے برگزیدہ اشخاص کے متعلق اعلیٰ خیالات ظاہر کئے گئے ہین وہ بالکل لغو ہین کیونکہ اگر اُنکے متعلق نظر تدقیق سے کام لیا جاے تو انمین کا کوئی بھی معیار صداقت پر کھرا نہین اتر سکتا۔ اور بطور استناد کے حوالہ مین سوفٹ کی ”خصائل الاکبر“ اور کاکس کی ”سوانح مارلبرو“ کو پیش کرتا ہے۔ تاریخ کے متعلق یہ خیال صرف اسی وجہ سے پیدا ہوا کہ لوگون نے قدیم طرز کی ان جیسی تصانیف کو مستند کتب تاریخ سمجھا۔ لیکن اب جبکہ تھیکرے کے قول کے مطابق سیاسی تاریخ بالکل لغو ٹھہری تو پھر اسکی جگہ اور کون سی تاریخ مانی جائے؟۔

تھیکرے کے اس مقولہ کا کیا مطلب ہے کہ تاریخ کی غایت ”زمانہ کی حقیقت اور حالات سے واقفیت حاصل کرنا ہے“ آگے چلکر وہ خود اسکی تشریح ان الفاظ مین کرتا ہے ”جب ہم ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر کے دلچسپ مجلدات پڑھتے ہین تو زمانہ گذشتہ کا فوٹو اپنی تمام جزئیات کیساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے اور وہ انگلستان جو ہمارے آباو اجداد کے وقت مین تھا

صاف صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ عبادتگزار دن سے گرجا بھرا پڑا ہے، قہوہ خانون مین شہر کے ہر گوشہ سے لوگ سمٹ سمٹ کر چلے آرہے ہین، عورتین کھلونون کی دوکانون کو ہر طرف سے گھیرے کھڑے ہین، شارع عام پر راہگیرون کی چیخ و پکار سے عجب چہل پہل معلوم ہوتی ہے" غرضکہ اسی قسم کی معاشرت کا نقشہ کھینچتے ہوے مورخ مذکور کہتا ہے" ان حکایات مین ان تصانیف سے جنکو حقیقت پر مبنی ہونے کا دعوی ہے، زیادہ واقعیت اور صحت ہے۔ زمانہ کے حالات کا جتنا پتہ ان کتب افسانہ سے چلتا ہے اتنا سنجیدہ "تاریخ" سے نہین۔ اور جو لطف ان افسانون کے پڑھنے مین آتا ہے کسی تاریخ کے مطالعہ سے آسکتا ہے؟"

اگر کوئی افسانہ نویس ایسا خیال ظاہر کرے تو عین مناسب ہے۔ جب بریڈ کے مشہور انجینر سے کسی نے سوال کیا کہ دریا کسلئے پیدا کئے گئے تو اُس نے برجستہ جواب دیا "تاکہ نہرون مین پانی پہونچائین" اور تھیکرے سے جب پوچھا گیا کہ "ملکہ این کی زندگی کا کیا مقصد تھا اور ڈیوک مارلبرے کے عہد حکومت مین اہل انگلستان نے فرانس سے کیون جنگ کی تو اُسنے بڑی صفائی سے کہا "تاکہ مین اپنا دلچسپ ناول، اسمنڈ لکھون" درحقیقت اسکا اپنا یہی خیال تھا لیکن اس مسخرے کو یہ کہنے کی جسارت کیونکر ہوئی؟ تم نے دیکھا وہ کس بیباکی سے ہمین شک وشبہ مین پھنسانا چاہتا ہے اسکو انکار نہین کہ تاریخ بشرطیکہ صحیح ہو از بس اہم ہوگی۔ اسکا قول ہے کہ تاریخ مین کبھی صداقت آنہین سکتی۔ اور اسکو تاریخ کے ایک لفظ پر یقین نہین ہے۔

اس صورت مین ہمارے لئے کیا چارہ کار ہے۔ کیا ہم تھیکرے کی نصیحت پر عمل کرین۔ آیا تاریخ کو ایک مفید اور سنجیدہ قابل مطالعہ فن سمجھنے کی بجاے محض ایک تفریح طبع کا سامان سمجھین، آیا محاربات یوروپ سے بے اعتنا ہوکر پریوشان نازک خرام کی سیر کا تماشہ دیکھین یا اپنے قدما کے طرز حکومت کا مطالعہ کرنیکے عوض انکے اسباب معیشت کی بہنات اور رنگینی کو دیکھکر خوش ہون۔ اگر تم غور کروگے تو تمھین ایک نیا راستہ نظر آئیگا جو سراسر دوسری سمت کو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر تاریخ ناقابل اعتماد اور غلط ہے جیسا کہ کسی زمانہ مین تھی تو تم اس مین ترمیم و تنیخ کرو اسکو صحیح اور اغلاط سے پاک کرنیکی کوشش کرو۔ کوئی وجہ نہین کہ یہ ناممکن ہو۔ تاریخ کا غالب حصہ تو ان ملوثات سے پاک ہے البتہ دورجدید کے چند ابواب باقی ہین۔ لوگون کو عام طور سے معلوم نہین کہ تاریخ مین کیا کیا اضافہ ہوا ہے۔ تاریخ پر جو بیجا اور مہمل اعتراضات آج اُسکے ناقابل اعتماد ہونے پر کئے جاتے ہین کسی زمانہ مین حق بجانب اور معقول تھے۔ لیکن آج اسکا غالب حصہ واقعیت پر مبنی اور صحیح ہے، اس سے سیاسی اصول بآسانی مستنبط ہوسکتے ہین۔ تاریخ جیسی اب شاندار ہے کبھی نہین تھی بلکہ شروع سے آخر تک حد درجہ سنجیدہ۔ اب یہان پر پھر تمھارے آگے دو کام ہین پہلا یہ کہ بجاے تھیکرے کے قول پر عمل کرنیکے تاریخ کو زیادہ اہم اور پُرازغوامض سمجھو دوسرا یہ کہ اسکو واقعیت اور صداقت سے معرا سمجھکر چھوڑ نہ دو بلکہ دقت نظر اور محنت سے اسکی تحقیق و تفتیش کرو۔ ——— اگر تاریخی صداقت قابل حصول فرض کر لی جائے تو پھر اس کی رفعت اور اہمیت مین کسی کو کلام نہین ہوسکتا۔ تاریخ کے صفحات، مہتم بالشان واقعات عالم، سلطنتون کے اسباب عروج و زوال، جنگ اور امن کی داستانون اقوام انسانی کی خوشحالی اور آفات کے واقعات سے مملو ہین۔ یہی وہ باتین ہین جنکی رعایت سے

مین تاریخ کو سیاست مین جذب کرنیکی کوشش کر رہا ہون۔ مین تم سے کہتا ہون کہ انگلینڈ کی گذشتہ تاریخ کا مطالعہ اسکے مستقبل کا مطالعہ ہے جب تم اپنے ملک کی تاریخ پڑھتے ہو تو تمھارے پیش نظر ملک کی فلاح و بہبود، اور بحیثیت ایک شہری ہونے کے تمھاری تنہا غرض وہی ہوتی ہے۔ اس نکتہ کو واضح کرنے کے لئے مین تمھارے سامنے توسیع انگلستان، کا مضمون بیان کرونگا۔ کیونکہ مسئلہ ان تمام سیاسی مسائل سے جن پر تمھین اپنی زندگی مین غور و فکر کرنے کا موقع ملا ہوگا، زیادہ نازک اور اہم ہے اور اسی پر ہمارے مستقبل کا دار مدار ہے۔ اسکی چھان بین اور تدقیق کیلئے تاریخ انگلستان جدید سے کمال واقفیت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ، جیسا مین نے بیان کیا ہے، انگلینڈ گذشتہ تین صدیون سے برابر برطانیہ عظمی کی توسیع مین مصروف رہا ہے۔ لہذا اگر تم برطانیہ کے مستقبل کا اجمالی نقشہ دیکھنا چاہتے ہو تو انگلینڈ کی گذشتہ تین صدیون کی تاریخ پر عبور حاصل کرو۔ جون ہی تم نے تحقیقات کی غرض سے مسائل ہند اور نو آبادیات پر عقل سلیم سے غور کرنا شروع کیا، ایک سوال کے بعد دوسرا سوال، ایک سلسلہ کے بعد دوسرا سلسلہ تمھارے سامنے آتا جائیگا یہان تک کہ ان دو سوالات کے ساتھ تاریخ انگلستان کے دور جدید کی تمام کڑیان تمکو منسلک نظر آنے لگین گی۔ تاریخ انگلستان پر عبور حاصل کرنے کا یہی واحد اور بہترین طریقہ ہے۔ کیونکہ تاریخ مین حکایات کو اشکال و مسائل کا جامہ پہنانا ہی اصل چیز ہے جب تک تم فن تاریخ کو محض تاریخی حکایات نویسی تصور کروگے تم ادبی معنی آفرینی کی حد سے آگے نہین بڑھ سکتے۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ حقائق پسند ہین انکی نظرون مین تاریخ بے وقعت اور بے اعتبار ہو جائیگی۔ واقعہ نگاری کے طلسم کو توڑ و اور حکایات کو علمی سوال کی صورت مین اپنے سامنے رکھو، پھر دیکھو کہ تمھارے دماغ کا رجحان کسقدر انوکھا ہے۔ تمھاری حیثیت اسوقت ایک لائق محقق کی ہوگی نہ کہ لٹریری موسخ کی۔ اس مقام پر پہونچکر انگلینڈ کی تاریخ جدید دو حصون مین منقسم ہو جاتی ہے، پہلا حصہ نو آبادیات کا مسئلہ اور دوسرا ہندوستان کا۔

علاوہ ازین وہ اسباب جنکی بنا پر متمدن ممالک مین مطالعہ تاریخ ناگزیر ہے، انگلستان مین ساری دنیا سے قوی ترہین ہماری قوم کی عالمگیری نے انگریزی سیاست مین حیرتناک پیچیدگی اور مشکل پیدا کر دی ہے۔ میرے خیال مین دنیا کی کسی اور سلطنت مثلاً فرانس، جرمنی، امریکہ کو بات ثنائے روس ایسے پر پیچ معاملات سے سابقہ نہین پڑا جیسے کہ انگلینڈ کو۔ انمین کی بعض سلطنتین گو متعدد اندرونی ریاستون سے مرکب ہونیکی وجہ سے وسیع ہین لیکن وہ سب بایکدگر پیوستہ ہین اور ان پر غنیم کا حملہ صرف مقامی ہو سکتا ہے۔ اس صورت مین انکی تمام فوج شہریون سے ہی مرتب ہوتی ہے۔ لیکن جس سلطنت کے زیر نگین دور دراز کے بھی ممالک ہون اسکی پیوستگی منتزلزل ہو جاتی ہے اور قومی مصالح کی پیش بینی اور تحفظ نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ چونکہ ہماری نو آبادیات منتشر ہین۔ دشمن ہم پر نہایت آسانی سے حملہ کر سکتا ہے۔ اگر ہم امریکہ سے برسر پیکار ہون تو سمجھو کہ محاذ جنگ کناڈا ہوگا اور اگر روس سے تو افغانستان۔ لیکن یہ بیرونی خطرات، ان اندرونی مشکلات سے جنکے ایک منتشر الاجزا سلطنت مین ہر وقت رونما ہونیکا ڈر لگا رہتا ہے کم قابل اندیشہ ہین۔ ان تمام ممالک کو

جو نصف کرۂ ارضی پر پھیلے ہوئے ہون، اگرچہ انکے باشندون کی قومیت اور خون ایک ہی ہو، متحد الخیال کرنا کوئی آسان کام ہے!۔ مگر بدقسمتی سے انگلستان کی مصیبت کی انتہا یہی نہیں ہے۔ نوآبادیات کے علاوہ ہندوستان بھی ہماری سلطنت کا ایک جزو ہے جہان کے باشندے نہ ہمارے ہم قوم نہ ہم مذہب۔ یہان تو سرے سے وہ بات ہی غائب ہے جس پر ترک وطن اور قیام نوآبادی کی بنا ہوتی۔ یہ مسئلہ نوآبادیات کے مسائل سے بھی زیادہ ثکل، بسیط اور مایوس کن ہے۔ کیا کسی تنہا قوم کے لیئے بیک وقت دو ایسے گران بار کا سنبھالنا اسکی طاقت اور ہمت سے باہر نہین ہے؟

تم خود سوچو ان دونون متضاد مسئلون کا اثر عوام کے دماغ پر کسقدر مختلف ہوتا ہے۔ نوآبادیات مین ہر چیز نئی اور تازہ ہے جو قومین وہان آباد ہین اُنکے لئے ترقی کا دروازہ کھلا ہوا ہے، نہ انکا ماضی ہے نہ کوئی ناپیدا کنار مستقبل، حکومت اور ملکی مجالس ہر چیز مین انگریزی رنگ ہے۔ آزادی، صنعت و حرفت، ایجادات اور انقلابات کے باوجود وہان امن و سکون ہے برطانیہ عظمی کا دائرہ اگر صرف نوآبادیات تک محدود ہوتا تو باوجود غیر متناہی وسعت سلطنت کے ہم اسکے امور سمجھ سکتے تھے کیونکہ اس صورت مین تمام ترکیبی ممالک قومیت و مذہب مین متجانس ہوتے۔ مگر اس برطانیہ عظمی کے علاوہ ایک دوسرا برطانیہ بھی ہے جو اس سے رقبہ مین تو چھوٹا ہے مگر آبادی کے لحاظ سے بڑا ہے۔ ہندوستان مستقبل سے معرا سرتاپا ماضی ہی ماضی ہے عقلمند سے عقلمند شخص بھی ہندوستان کے مستقبل پر غور کرنے سے ڈرتا ہے۔ لیکن جب اُسکے ماضی پر نظر ڈالتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اُسکے بیشمار سلسلے طلسم آمیز قدامت مین جاکر غائب ہو جاتے ہین۔ تمام قدیم مذاہب اور رسوم و عادات گڈمڈ ہو کر ایک خاصا معجون مرکب ہو گئے ہین۔ جن مدارج تمدن کو یوروپ اور دنیائے جدید طے کر چکے ہین، ہندوستان ابھی ان سے گذر رہا ہے۔ باطل اور اوہام پرستی، مکارانہ مذہبی پیشوائی آج تک جاری ہے، مسئلہ تقدیر پر ایمان اور مستبد مطلق العنانی جیسی قدیم زمانہ مین تھی آج بھی ہے۔ وسط ایشیا کے ریگستانون کے رہنے والے ترک و تاتاری شمالی سرحد کو اپنے حملون سے آئے دن دھمکیان دے رہے ہین۔ اسطرح سے ایک ہی قوم جو ایک طرف تو کرۂ ارضی کے مستقبل کی مالک بنتی ہے اور یوروپ اور دنیا، جدید کے مابین خط نصف النہار کی حیثیت رکھتی ہے، دوسری طرف بعید اور بے پایان ماضی کے سمندر مین قدم ڈالتی ہے اور شاہان مغلیہ کو تباہ و برباد کر کے فاتح ایشیا کے لقب سے ملقب ہوتی ہے!

ایک ہی قوم دو متضاد پالیسی پر بغیر حیرانی کیونکر عمل کر سکتی ہے۔ ایشیا مین مستبد اور آسٹریلیا مین جمہوری حکومت کیونکر ہو سکتی ہے۔ ایک ہی وقت مین مشرق مین تو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی طاقت اور ہزارون بتکدون کی جائداد کی محافظ ہو اور مغرب مین آزادی خیال اور روحانی مذہب کی زبردست حامی بھی ہو وسط ایشیا مین تو روس کے مقابلہ کے لیئے ایک بڑی فوجی امپیریلزم کی حیثیت سے کھڑی ہو اور دوسری طرف کوئنس لینڈ اور منی ٹوبا کو آزاد نوآبادون سے بھرتی ہو۔ آغاز آفرینش سے آج تک کسی قوم کو ایسی ذمہ داریون سے سابقہ نہین پڑا ہوگا۔ کبھی ایک قوم کے فیصلہ پر کرۂ ارضی کے تمام حصص کے اتنے متعدد اور وسیع مسائل کا انحصار نہ ہوا ہوگا اور وہ مسائل بھی ایسے جو خاص لیاقت اور تعلیم کے

متقاضی ہون۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس قوم کو اس ذمہ داری کا احساس کم ہے۔ یہ نوآبادیات اور ہندوستان کے مسائل کا مطالعہ نہین کرتی، انکو قابل توجہ نہین سمجھتی تاوقتیکہ یہ سیاسی حیثیت نہ اختیار کرلین۔ جب کسی وزارت کی قسمت کا معاملہ درپیش ہو جاتا ہے تو یہ مسائل حد درجہ قابل توجہ ہو جاتے ہین لیکن عوام انکو اسوقت تک لائق توجہ نہین سمجھتے جب تک کہ ہندوستان کی تمام آبادی کی قسمت جو کرہ زمین کے ایک وسیع خطہ پر پھیلی ہوئی ہے اور خود انگلستان کا مستقبل معرض بحث مین نہ آجائین۔ ہندوستان کے متعلق میکولے لکھتا ہے "ہر انگریز سے جسے تاریخ کے کسی حصہ سے بھی دلچسپی ہے یہ توقع کرنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ اس بات کو دریافت کرنے کے لئے بےچین ہو کہ معدودے چند انگریزون نے بہت تھوڑے عرصہ مین دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت کو کیونکر فتح کرلیا، تاہم اگر ہم سخت غلطی پر نہین ہین تو یہ مضمون اکثر ناظرین کی نظرون مین صرف مہمل ہی نہین بلکہ قطعاً پھیکا اور بے لطف ہے"

تسخیر ہندوستان اس توسیع کا ایک جزو ہے جس نے گذشتہ دو صدیون مین ہماری حالت کو اس شدت سے بدل دیا ہے اسکی تشریح آیندہ لکچرون مین کیجائیگی۔

باقی ——— باقی

عبد القیوم رسا

بنگالی ناولون کے ترجمے

بنگالی وطن ایک نئی دلھن کے پُرحسرت ارمان شوہر سے جدائی کی تکالیف نیک نیتی سے استقلال اور وفاداری کی تصویرین اسکی سلامت زبان دانی عبارت وغیرہ قابل دید و داد ہے۔ - - - - - - - - - - ۱۰/

پرتاب ایک تاریخی ناول غدر ۱۸۵۷ء کا سنسنی خیز واقعہ نہایت پیچدار طریقہ سے لکھا گیا ہے جسمین درد عشق کوٹ کوٹ کر بھرا ہے طرز بیان نیا ہے نرالا ہے عشق حقیقی و مجازی کے ایسے دلکش و روشن پہلو دکھائے ہین کہ دیکھکر دل پر ایک گہرا اثر پڑتا ہے۔ - - - - - - - ۱۰/

مرنالنی عورتون کی وفاداری پر بحث عبرت و نصیحت کا خزانہ ۸/

اردو مرثیہ کی کتابین

کلیات مراثی مرزا دبیر یعنی مرزا سلامت علیصاحب دبیر ہر دو جلد عمر

کلیات مراثی میر انیس مضمون آفرینی زبان فصاحت بلاغت غرض کوئی بات ایسی نہین جو اس باکمال کے کلام بلاغت نظام مین نہین پائی جاتی کامل ہر چہار جلد - - - - - - - - - للعہ

کلیات مراثی میر ضمیر یعنی کلام بلاغت نظام میر مظفر حسین صاحب متخلص بہ ضمیر استاد جناب مرزا سلامت علیصاحب دبیر - - عمر

مجموعہ مراثی مرزا دلگیر مرزا صاحب موصوف نہایت پرگو اور مشہور مرثیہ گوؤن مین سے گزرے ہین کامل ہر سہ جلد - - - (ے)

"مینیجر نگار"

تصویر کی موت

مین نے ایک عرصہ تک فن مصوری کے قیمتی آثار کی تلاش مین سارے زمانہ کی خاک چھانی اور میرے پاس قدیم وجدید مصوری کے عجیب وغریب نادر الوجود نمونون کا انبار جمع ہو گیا۔ آخر الامر میرا گذر ہندوستان مین ہوا۔ اُس سرزمین مین جو کسی وقت حیرت و اسرار کا مخزن اور فنونِ جمیلہ کا سرچشمہ تھی اور جو ابتک دنیا کی نظرون سے پوشیدہ گمنامی کی حالت مین پڑی ہوئی ہے پہلے پہل مجھے لوگون کی زبانی معلوم ہوا کہ یہان اس فن جمیل کے آثار کی تلاش بیسود ہے۔ اور مجھے چند ناقص بھدّی رنگین تصویرون کے نمونے بتلا کر کہا گیا کہ یہان صرف اِس قسم کی تصویرین دستیاب ہو سکتی ہین۔ لیکن ایک شوقین محقق آثار کی حیثیت سے مین نے اس ملک کا گوشہ گوشہ شمال سے جنوب اور شرق سے غرب تک چھان مارا اور مطمئن ہون کہ مین اپنے مقصد مین ایک حد تک ضرور کامیاب ہوا کیونکہ اب میرے پاس یہان کی رنگین تصاویر۔ سنگین۔ برنجی۔ اور ہاتھی دانت کی منقش اشیا کی ایک قابل قدر تعداد جمع ہو چکی تھی۔

اس آوارہ گردی کے سلسلہ مین ایک مرتبہ میرا گذر سہارنپور کے قریب ایک گاؤن مین ہوا جو سواِلک۔ کی پہاڑیون سے کچھ دور واقع تھا۔ یہان مجھے ایک فقیر کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ ان پہاڑیون کے درمیان ایک غار مین رہتا ہے جسکی قیام گاہ عجیب وغریب پُر اسرار طلسمی تصاویر سے بھری پڑی ہے اور جسکی وجہ سے لوگ اُسے دیوانہ سمجھتے ہین۔ دوپہر کو کھانے سے فارغ ہو کر مین نے ایک رہنما کو ساتھ لیا اور اُس فقیر کی قیام گاہ کو روانہ ہوا۔ پُرپیچ ناہموار راستون سے گذرتے ہوئے ہم لوگ ایک کھلے ہوئے مقام پر پہونچے جو چارون طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیون سے گھرا ہوا تھا۔ یہ تنہا مقام سڑک سے بہت دور واقع تھا اور یہین ایک پہاڑی مین وہ غار نظر آتا تھا جو فقیر کا مسکن تھا۔ اسکے دہانہ پر ایک زبردست دروازہ پتھرون کو تراش کر بنایا گیا تھا جس پر طرح طرح کے بیل بوٹے اور نقوش کندہ تھے ہمارے قریب پہنچنے پر وہ شخص جو دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک بلند قامت ضعیف شخص تھا جسکی داڑھی سینہ پر پھیلی ہوئی تھی اعضا نہایت متناسب۔ رنگ گورا اور آنکھین روشن تھین۔ جسم پر فقیرون کا ساگیروا لباس تھا۔ مین نے اُسے جا کر سلام کیا۔ جسکا جواب دیکر وہ پھر خاموشی سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ مین نے اُس سے مخاطب ہو کر اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو مین جو مین اپنے پنج سالہ قیام ہند مین سیکھ سکا تھا کہا "باباجی۔ ہم آپ کی عجیب وغریب تصویرون کی خبر سن کر آئے ہین کیا آپ ہمین دیکھنے کی اجازت دینگے؟"۔ اُسکی آنکھین فخریہ انداز سے چمکنے لگین۔ اور اُسنے کہا کہ ہان صاحب۔ آئیے اور شوق سے ملاحظہ فرمائیے۔ اور یہ کہکر وہ مجھے غار کے اندر لیچلا۔ یہ ایک وسیع کمرہ تھا جس مین کئی طرف دروازہ تھے اور جا بجا ستون نصب کئے گئے تھے۔ اندرونی چھت بہت بلند تھی۔ اور کمرہ مین

ہر طرف اُجالا تھا۔ ایک طرف چارپائی بچھی ہوئی تھی اور کونے مین پیتل کے چند برتن رکھے ہوئے تھے۔ چارپائی کے نیچے ایک ٹوکری تھی جس پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔ دیوارون پر چارون طرف چھوٹی بڑی تصویرین آویزان تھین۔

"کیا آپ مصور ہین؟"

"جی ہان۔ میری خواہش ہے کہ مین مصور ہون لیکن ہمارا فن آپکے فن سے بالکل جدا ہے۔"

مین دیوار کی آویزان تصویرون کو نہایت دلچسپی سے دیکھنے لگا اور بہت جلد اُنمین محو ہو گیا۔ کچھ رنگین تصویرین جو قدیم نقاشی کا بہترین نمونہ تھین اب تک اچھی حالت مین تھین۔ انکی دلاویز رنگت کی تازگی اور چمک دمک مین کوئی فرق نہ آیا تھا۔ بعض بعض تصویرون کی حسن صنعت اور کمال تشابہ سے برش کی ہلکی رنگ آمیزی کی شان ہویدا تھی لیکن اکثر مین تناسبِ اعضا کی بجائے اظہار جذبات کی خوبیان صاف جھلک رہی تھین۔ جا بجا مہاتما بدھ کے مختلف عہد ہائے حیات۔ ہندو علم الاصنام۔ اور عہد مغلیہ کی تصویرین آویزان تھین۔ جو زبانِ حال سے اس سرزمین خواب کی روح معاشرت۔ تاریخ اور مذہب کی داستان سنا رہی تھین۔ اور اُس زمانہ کے علوم و فنون کا مظہر تھین جبکہ باقی دنیا مین جہالت کی تاریکی مسلط تھی۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ آخر اس سرزمین کے گم گشتہ خزانے کس قعر گمنامی مین پڑے ہونگے؟ افسوس اسکا علم نہ تو اُسکے فرزندون کو تھا اور نہ فاتحین کو۔ صرف حسن اتفاق میرے سوال کو صداے بازگشت کی طرح دُہراتا تھا کہ "آخر کہان؟" بلاشبہ ان مین سے کچھ تو دنیا کی نظرون سے پوشیدہ اس فقیر کے نگارخانہ مین موجود تھے۔ لیکن باقی ماندہ؟ آہ انکا کچھ پتہ نہ تھا۔ یکایک میری نظر ایک بڑی سی تصویر پر پڑی جو دروازہ کے سامنے دیوار پر سب تصویرون کے اوپر کچھ بلندی پر ٹنگی ہوئی تھی اور جسپر ڈوبنے والے سورج کی شعاعین پوری طور پر پڑ رہی تھین۔ یہ ایک حسین عورت کی تصویر تھی جسکی آنکھین پتھرائی ہوئی تھین اور دلِ مردہ تھا۔ آنکھین نیم باز۔ پتلیان سفید۔ اور چہرہ زردی مائل جسپر مُردنی چھائی تھی۔ قدزیبا سے طمانیت برستی تھی۔ اور عنابی ہونٹ بالکل پھیکے نظر آتے تھے سر کے لانبے لانبے لہراتے ہوئے نرم بال جن مین شاید مصور نے بکمال صنعت و چابکدستی سے کام لے کر موئے قلم سے ایک ایک کر کے کھینچا تھا دونون شانون پر پڑے ہوئے تھے اور خدوخال سے عجیب حسن و رعنائی کی شان ہویدا تھی۔ لیکن افسوس یہ حُسن بے روح اور اُسکی رعنائیان بے کیف تھین۔ تصویر کا فریم چکنے ہاتھی دانت کا تھا جسپر طلائی میناکاری کی گئی تھی۔ مین حیرت سے حسن و جمال کے اس رنگین مرقع کی طرف دیکھنے لگا جسپر موت کی رنگ آمیزی کی گئی تھی اور جو غار کی تاریک دیوار پر نمایان طور پر نظر آ رہی تھی۔ اتنے مین کسی کا ہاتھ میرے شانہ پر پڑا۔ مین چونک پڑا مڑ کر دیکھا تو فقیر پاس ہی کھڑا نظر آیا۔ اُسنے مجھے متحیر دیکھ کر کہا "صاحب معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس تصویر سے بہت دلچسپی لے رہے ہین۔ شاید آپکو یہ سن کر اور تعجب ہوگا کہ اسکے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ کی یاد وابستہ ہے اگر آپ سننا چاہین تو مین بخوشی سنا سکتا ہون"

مین ہمہ تن شوق و التجا ہو کر اُسکی طرف دیکھنے لگا۔ اب سورج کی افسردہ کرنون سے غار مین ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا

اور سفید فریم کی وجہ سے تصویر اور بھی بھیانک نظر آرہی تھی - اسنے کہا میرے کمزور ہاتھ ضعیفی سے کانپتے ہین - ذرا آپ بڑھ کر اپنے مضبوط و توانا ہاتھون سے اس تصویر کو اُتار لین تاکہ مین غار سے باہر اُسے مدھم روشنی مین دیکھ کر اس واقعہ کو اچھی طرح بیان کر سکون" مین نے دیوار سے تصویر کو اُتارا اور پلٹ کر دیکھا تو اسکی پشت پر ہاتھی دانت کی لوح نظر آئی جسپر باریک حرفون مین کچھ عبارت کندہ تھی - فقیر دروازہ کے پاس ایک بیش قیمت ایرانی قالین بچھا کر بیٹھ گیا اور مجھے پاس ہی ایک اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا - اُسنے میرے ہاتھ سے تصویر لیلی اور اس طرح اپنا قصہ شروع کیا -

"میان - جب تمھاری طرح نوجوان تھا تو دربار دہلی مین نقاشی کی خدمت پر مامور تھا - مین تصویر کشی کے علاوہ فنونِ جمیلہ کے نوادرات جمع کرنے کا بھی از حد شایق تھا - چنانچہ اسی دھن مین مین نے اس ملک کی خوب سیاحت کی اور یہان کے گوشہ گوشہ سے تصاویر بہم پہنچائین - آخر الامر میرا گذر اس ملک مین ہوا جو وندھیاچل سے آگے واقع ہے - جہان مجھے عہد قدیم کی ایک خوشنما شاہی عمارت کی خبر ملی جو شکستگی کی حالت مین تھی اور جو کسی زمانہ مین اُس عالی نسب خاندان شاہی کے زیر نگین تھی جس کے چند نام لیوا دست برد زمانہ کے ہاتھون تباہ و برباد ہو کر نہایت عزت سے زندگی بسر کر رہے تھے - ایک روز شام کے وقت مین اُسے دیکھنے گیا - باوجود اس ویرانی و شکستہ حالی کے عمارت نہایت خوبصورت نظر آتی تھی - مین نے اُسکے کمرون اور برآمدون کی خوب سیر کی اور اسکے دروازون کی ہلالی ساخت - اُنکے دلکش نقش و نگار - اور بیل بوٹے - مصفی ستونون کی گلکاریان - دریچون کی نفیس جالیان - قبون کی خوشنمائی - اور اندرونِ گنبد کی رنگ آرائی دیکھ کر دنگ ہو گیا - گھومتے گھومتے مین ایک چھوٹے سے صحن مین پہنچا جسکے درمیان سنگ مرمر کا چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا جو حسنِ صنعت و کمالِ فن کا بہترین نمونہ تھا اور منہدم و شکستہ آثار کے درمیان بکمال حسن و رعنائی سے قایم تھا - مین اسکے اندر داخل ہوا اور دریچون اور محرابون کو دیکھنے لگا - ناگاہ میری نظر بلند طاق پر رکھی ہوئی ایک مربع شئے پر پڑی جو نکلی ہوئی کارنس کے نیچے صاف نظر نہ آتی تھی - میرے دل مین اُس شئے کو معلوم کرنے کے لئے سخت خلش پیدا ہوئی - چنانچہ مین چند بڑے بڑے پتھرون کو ایک دوسرے پر رکھ کر اوپر چڑھا اور اُسے نیچے اُتار لایا گرد و غبار کو صاف کیا اور اُسے پلٹ کر دیکھا کیونکہ غبار آلود حصہ کسی تصویر کے فریم کا پچھلا حصہ تھا - میرے جسم مین حیرت و استعجاب کی برقی لہر دوڑ گئی یہ ایک حسین عورت کی تصویر تھی جو میری طرف دیکھ رہی تھی - اُس پیکر جمیل کا بیان کن الفاظ مین کیا جائے - اُف - وہ اُسکا حسن و جمال اور اشتیاق آگین نگاہین ! جسم کی رنگت ایسی دلاویز کہ قدرتی ہونے کا گمان ہو - لانبے لانبے سیاہ بال جو تاریکی مین رات کا مقابلہ کرتے تھے ریشمی لچھون کی طرح دونون شانون پر بکھرے ہوے چہرہ کے حسن اور رخسارون کی لطیف سرخی کو اور نمایان کر رہے تھے - لب ہائے لعلین سے تکلم کی شان پیدا تھی - غرضکہ ہر چیز اصل سے اسقدر مشابہ تھی کہ مین اس کاغذی پیکر کو زندگی سے معمور دیکھ کر حیران رہ گیا - دیکھتے ہی دیکھتے تصویر کی آنکھون سے رنج و حرمان کے آثار ناپید ہو گئے اور اُنکی جگہ امید نے لیلی ! - اور آنکھین

فرطِ مسرت سے چمکنے لگین!! میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مین نہین کہہ سکتا کہ اُسوقت مجھپر کونسی کیفیت طاری تھی مسرت وشادمانی کی یا خوف دہراس کی۔ بلاشک کسی زندہ عورت کی روح ان کنول جیسی خوبصورت آنکھون سے دیکھ رہی تھی! مین بہت متاثر ہوا اور شام ہوتے ہوتے تصویر کو لیکر گھر پہنچا۔

مین تنہائی مین گھنٹون اُسکی طرف غور سے دیکھتا اور اُسکے متعلق طرح طرح کے نظریے قایم کرتا۔ رفتہ رفتہ وہ میری انیس خلوت بن گئی مین اُسکے چہرہ سے ٹپکنے والے محبت آگین جذبات کا نہایت شوق سے مطالعہ کرتا۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ تصویر سے بالکل انسانون کی طرح حرکات سرزد ہوتی تھین۔ کبھی اُسکی آنکھین یاس وغم سے دھندلی پڑجاتین۔ کبھی مسرت وامید سے چمکنے لگتین اور کبھی رنج وحرمان سے تاریک نظر آتین۔ رات کو مین اُسے اپنے پلنگ کے بازو میز پر ریشمی تکیہ سے ٹکا کر رکھ لیتا۔ اب مین خود اپنے اندر ایک نئی قوت محسوس کرنے لگا اور اُسوقت سے میری تصویرین پہلے کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت اور دلکش بننے لگین۔ لیکن مین بیچین تھا۔ اُسکی سحر کارانہ قوت کا راز مجھ پر نہ کھلا۔ یہانتک کہ عاجز ہوکر بارہا مین نے اُسے اپنے سے جدا کرنے کا ارادہ کر لیا لیکن ہر مرتبہ کسی نہ کسی وجہ سے اس ارادہ کو ملتوی کرنا پڑا۔ اس طرح چند ماہ اور گذر ے۔ میرے کمال کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ ایک دن میری طلبی ایک راجہ کے دربار مین ہوئی۔ جب مین وہان پہنچا تو سنگ مرمر کے وسیع برآمدہ مین اسکے سامنے پیش کیا گیا۔ مین اپنی تصویرون کے ساتھ اُس تصویر کو بھی لیے آیا تھا۔ جب مین ایک ایک کرکے اپنی تمام تصویرین دکھلا چکا تو سب سے آخر مین اُس تصویر کو نکال کر راجہ کے حضور مین پیش کیا۔ جیسے دیکھتے ہی پہلے تو وہ حیرت سے میرے منہ کو تکنے لگا پھر تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگا "آخر اسکا کیا مطلب ہے! یہ شہزادی مایا کی شبیہ ہے۔ یہ تجھے کہان سے ملی۔ اسکا بنانے والا کون ہے؟"

مین نے جواب دیا "مہاراج مین نہین جانتا کہ یہ کس نقاش کی بنائی ہوئی ہے۔ البتہ مین نے اسے وندھیاچل کے پرے ایک شکستہ محل مین پایا تھا۔"

وہ کچھ دیر تک اُسکی طرف دیکھتا ہوا خاموش کھڑا رہا۔ بعدازان اسکی آنکھین غصہ سے سرخ ہوگئین۔ اور اُسنے کہا "یہ میری رانی مایا کی شبیہ ہے۔ اور دوسرے کے پاس نہین رہ سکتی۔ اسکا اجنبی نگاہون کے سامنے رہنا نہایت نامناسب ہے۔ تم اس تصویر کو مجھے دے ڈالو۔"

مین نے آہستہ سے جواب دیا "نہین مہاراج مین اسے آپ کو نہین دے سکتا۔ وہ میری ہے۔ مین اُسے کسی حالت مین اپنے سے جدا نہین کر سکتا!"

مین نہین جانتا کہ مین نے ایسا کیون کہا۔ کیونکہ مین اس کے قبل بارہا اس طلسمی تصویر کو کسی جگہ ٹھکانے لگانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اُسنے پھر مجھ سے کچھ نہ کہا اور ایک خادم کو اشارہ کرکے درشت لہجہ مین بولا کہ "جاؤ۔ رانی مایا کو اسی وقت

یہان بلالاؤ" وہ شخص اندر چلا گیا لیکن راجہ اسی مقام پر تصویر پر نظرین گڑائے خاموش کھڑا رہا۔ اتنے مین کڑون اور پازیب کی شیرین جھنکار اور ریشمی کپڑون کی سرسراہٹ سنائی دی اور ایک بلند و بالا لیکن موزون قامت عورت بازو کے دروازہ سے داخل ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ نازک قدم بڑھاتے ہوئے راجہ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اُسکے جسم پر آسمانی رنگ کی زرین ساری تھی اور چہرہ پر ہلکے نیلے رنگ کا ریشمین نقاب پڑا ہوا تھا۔ راجہ نے اسکی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "نقاب اٹھاؤ" اسنے نہایت ادب سے ارشاد شاہی کی تعمیل کی۔ نقاب کا اُٹھنا تھا کہ معلوم ہوا گویا چودھوین رات کا خوبصورت چاند بدلیون کے جھرمٹ سے باہر نکل آیا ہے۔ میری نگاہین اس کے حسین چہرہ مین جذب ہو کر رہ گئین۔ تصویر کا پیکر اصلی میری آنکھون کے روبرو تھا!۔

"مایا۔ کیا تو اس شخص کو جانتی ہے؟" راجہ نے کڑک کر پوچھا۔

ایک ایک اُسکی آنکھین جو نیچے جھکی ہوئی تھین ایک لمحہ کے لئے مجھے دیکھنے کو اُٹھین، "نہین حضور۔ مین اسے نہین جانتی" اسنے نرم و شیرین آواز مین جواب دیا گویا بربط کے تارون سے لطیف نغمہ ابل رہا ہو۔ ساتھ ہی اس کے رخسارون پر فرطِ حیا سے سرخی دوڑ گئی کیونکہ دیگر ہندوستانی دوشیزہ لڑکیون کی طرح وہ بھی غیر لوگون سے نامانوس تھی۔

راجہ جو اسکی طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا یہ سنتے ہی اسپر جھپٹا۔ وہ جوشِ رقابت سے دیوانہ ہو رہا تھا اسکی آنکھون سے محبت و نفرت کے متضاد شعلے نکل رہے تھے اُسنے اُسکے شانون کو زور سے جھنجھوڑ کر کہا "عورت تو جھوٹی ہے کمبخت سچ بتلا کہ یہ کون ہے؟"

اسنے حیرت و خوف سے ملی ہوئی نگاہون سے راجہ کو دیکھا اور اسکی حسین آنکھین آنسوؤن سے لبریز ہو گئین اور بڑے بڑے قطرے اسکے زرد رخسارون پر ڈھلکنے لگے۔ اُسنے کانپتی ہوئی آواز مین پھر جواب دیا "پران ناتھ مین بالکل سچ کہتی ہون کہ اس سے ذرا بھی واقف نہین" معاً راجہ کی پیش قبض ہوا مین چمکی اور آن کی آن مین مایا کے سینے مین تیر گئی۔ ایوانِ شاہی مین ایک ہلکی سی چیخ بلند ہوئی اور رانی کی نعش فرشِ مرمرین پر تڑپنے لگی۔ اسکے بعد وہ دیوانہ وار میری طرف جھپٹا اور نہایت تیزی سے میرے شانہ مین اپنا پیش قبض پیوست کر دیا۔ مین لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ یکایک میری نظر اُس تصویر پر پڑی جو گھبراہٹ کے سبب ہاتھ سے چھوٹ پڑی تھی راجہ نے دوبارہ وار کرنے کی غرض سے اپنا پیش قبض اُٹھایا ہی تھا کہ مین چلا اُٹھا "مہاراج! ٹھیریئے۔ ٹھیریئے۔ ذرا اس طرف تو دیکھئے!" مین نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ راجہ نے اسکی طرف دیکھا اور ہکا بکا ہو کر کھڑا رہ گیا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ اسوقت ایک عجیب واقعہ ظہور مین آیا۔ تصویر جو بالکل اصل سے مشابہ تھی جو کبھی امید و محبت سے معمور نظر آتی اور کبھی رنج و نومیدی سے لبریز اور جو تغیرِ جذبات کے سبب زندہ معلوم ہوتی تھی اب یک قلم تبدیل ہو چکی تھی!۔ آہستہ آہستہ گلابی رخسارون سے خون کی سرخی زائل ہو گئی۔ عالمِ نزع کی روح فرسا کیفیتین اسکی سیاہ آنکھون مین اپنے گہرے

نشانات چھوڑ گئیں - اور پیکر جمیل پر تشنجی کیفیت طاری ہو کر رفتہ رفتہ اس حسین مرقع کی روح قفس کاغذی سے پرواز کر گئی! ہاں یہ کاغذی پیکر بیجان ہو گیا کیونکہ اب اسپر موت کی علامات طاری تھیں - دھیرے دھیرے اسکا جسم سخت - آنکھیں بے نور - اور لب ہائے لعلین سفید پڑ گئے - تاہم وہ اب بھی خوبصورت معلوم ہوتی تھی - اب وہ حسین مجسم کا مرقع بیجان تھی اور اس طرح نظر آرہی تھی جیسی اسوقت آپ کے سامنے موجود ہے"

فقیر کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا - بعد ازان اسنے پھر اس طرح اپنا قصہ کہنا شروع کیا۔ "راجہ نے جو مارے دہشت کے بدحواس ہو رہا تھا مجھ سے مخاطب ہو کر خوفزدہ انداز مین پوچھا "یہ کیا جادوگری ہے؟"

"مہاراج - مین بالکل نہین جانتا" مین نے جواب دیا "لیکن شاید یہ تصویر ہی خود اپنی داستان بیان کرے کیونکہ اسکی پشت پر کسی غیر زبان مین کچھ عبارت کندہ ہے - مہاراج چونکہ آپ پڑھے لکھے ہین بہت ممکن ہے کہ اسکا مطلب نکال سکین"

مین نے تصویر کو پلٹ کر اُسکے ہاتھ مین دیا - اسنے ایک سرسری نگاہ اسپر ڈالی اور تعجب سے کہا "یہ زبان اجنبی ضرور ہے لیکن وہ جس سے مین واقف ہون" - "تب تو مہاراج آپ اسے پڑھ کر مجھے ضرور سمجھائیے" مین نے اُس سے التجا کی - راجہ نے پہلے اُسے آہستہ آہستہ پڑھا - اُسکے چہرہ سے حیرت و خوف کے آثار مترشح تھے بعد ازان اُسنے مجھے اسکا اردو ترجمہ سنایا - تصویر کی پشت پر ہاتھی دانت کی لوح مین یہ عبارت کندہ تھی -

"چترپور کے شاہی خاندان کی شہزادی ایلا کی تصویر!"

"مین نے تیرے رخسارون کو اپنی زندگی کے تازہ خون سے رنگا ہے - اور تیری آنکھون کو اپنی عزیز ترین امیدون ناکامیون اور محبت کی شمیم انگیزیون کا آشیانہ بنایا ہے - اور تیرے ابروؤن اور لب ہائے شیرین مین انھین کیفیات کی رنگ آرائی کی ہے - اے میرے اقلیم دل پر حکومت کرنے والی شہزادی ایلا! مین نے اپنے خیالات کو تیری زلف رسا کی تاریکیون مین پھنسا دیا ہے - جب میری روح کالبد عنصری سے پرواز کریگی تو اس کاغذی پیکر مین جسے مین نے خونِ حیات کی سرخی، محبت - امید اور ناکامی کی عجیب و غریب رنگ آمیزی سے تیار کیا ہے اُسوقت تک مقید رہیگی جبتک کہ تیرے ہی خاندان کا ایک فرد تیرے زندگی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہ کرے"

میران نقاش"

اسکے بعد پھر گہری خاموشی مسلط ہو گئی کچھ دیر کے بعد راجہ نے آہ سرد بھر کر کہا "افسوس - شہزادی مایا ہی چترپور کے شاہی خاندان کی شمع و چراغ تھی" اسکے ہاتھ سے تصویر گر گئی اور وہ فرط غم سے بیتاب ہو کر اپنی رانی کے تن بیجان کے پاس گر پڑا جسے اُسنے ابھی ابھی قتل کیا تھا - اس طرح ایک گھنٹہ اور گذرا - راجہ کی آہ و بکا کی آوازین دیر تک ایوانِ شاہی مین گونجتی رہین - آخرکار مین اُٹھا اور اپنی تصویرون کو جمع کر کے وہان سے نکل کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا

اپنے مکان پر پہنچا۔ کیونکہ میرے ہاتھ سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ صاحب یہ ہے قصہ اس تصویر کا جو مین نے آپ سے بیان کیا"

مین حیرت و دلچسپی سے اس قصہ کو سنتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد مین نے اُس سے پوچھا۔

"بابا جی! کیا خیالات و جذبات تصویر مین مقید ہو سکتے ہین؟"

"ہان میان۔ حقیقی مصور اپنے خیالات و جذبات کی تصویر مین اس خوبی سے بھر دیتا ہے کہ وہ اسکے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور جب اُسکا زندہ رہنا ممکن ہے تو کیا اسکی موت بعید از قیاس ہو سکتی ہے۔ اگر زندگی و موت مصور کے لیئے ضروری ہین تو تصویر کے لیئے بھی لازمی"۔ مین اب بھی خاموش رہا۔ کیونکہ یہ عجیب منطق میرے فہم سے بالاتر تھی۔

"لیکن صاحب" اسنے مجھسے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "وہ فن نقاشی کا کمال اس سرزمین سے رخصت ہو گیا اور صنعت و کاریگری جو ہندوستان کی سب سے بیش بہا دولت تھی اب یہان سے ناپید ہو چکی ہے"

مجھے اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور شام کی تاریکی رات سے گلے مل رہی تھی۔ مین اُٹھا اور اس سے وداعی سلام کر کے مرخص ہوا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر سوالک پہاڑیون کے ناہموار راستون سے گذرتا ہوا اپنی اقامت گاہ کو جا پہنچا۔

(ترجمہ)

عبدالسلیم

کلیات و دواوین (اُردو)

دیوان میر حسن دہلوی۔ نہایت درد انگیز کلام ہے ۶ر

دیوان مردان صفی تصوف کا رنگ کوٹ کوٹ بھر دیا گیا ہے ۵ر

کلیات مومن معہ تصاویر و مثنویات .... عہ

کلیات ظفر ہر چہار جلد کامل دو جلد ۱۲/ ۶ار

دیوان ناسخ استعارات و تشبیہ مین انکا کلام اپنی آپ نظیر ہے ۱۲/ عہ

کلیات میر تقی میر تعریف فضول ہے کل شعرائے ماضی و حال کے پیشوا مانے جاتے ہین .... ۸/ عہ

کلیات سودا ہجو گوئی کے بادشاہ اور قصیدہ کے استاد ... ۸/ عہ

کلیات نظیر اکبر آبادی۔ ہر رنگ مین فرد تھے .... عہ

مسٹر رینالڈز کے انگریزی ناولون کے ترجمے

فسانہ الہ دین و لیلے۔ مشہور ناول اسٹار آف منگریلیا کا ترجمہ رنگین داستانون کے ضمن مین بہشت و دوزخ کی سیر کرائی ہے پڑھکر دل دھڑک جاتا ہے۔ مترجمہ منشی امیر حسین صاحب تحصیلدار کاکوروی .... ۱۲/ عہ

فریب حسن ناول فاسٹ کا اردو ترجمہ جس مین قصہ کے پیرایہ مین بدکردارون کے زبون نتائج دکھائے گئے ہین .... ۱۲/ آ

ناول اسرار نیکرو منیسر کا بامحاورہ اور سلیس ترجمہ جو باعصمت اور حسین ننھ لیڈیونکے دلی جذبات کا خاکہ زمانہ کی حیرت انگیز نیرنگیون اور انقلاب کی حیرت انگیز تصویر ۶ا

(مینیجر نگار)

برہان پور

برہان پور دریائے تاپتی کے کنارے ۲۱ درجہ ۱۸ دقیقہ عرض البلد شمالی اور ۷۶ درجہ ۱۷ دقیقہ طول البلد شرقی پر واقع ہے۔ اس کی بنیاد ۸۰۲ھ یا ۸۰۳ھ مین پڑی ہے اور خاندان فاروقیہ کا پہلا خود مختار بادشاہ نصیر خان (۸۰۱ھ تا ۸۴۱ھ) اس کا بانی ہے۔ مورخ فرشتہ کا بیان ہے کہ جب نصیر خان نے خاندیس کے مشہور قلعہ آسیر کو فتح کیا تو اس خوشی مین حضرت شیخ زین الدین رح دولت آباد سے مبارکباد کے لئے نصیر خان کے یہان تشریف لائے، اور دریائے تاپتی کے کنارے اوس مقام پر جہان اب زین آباد، آباد ہے قیام فرمایا۔ نصیر خان نے آپ کی بڑی عزت کی۔ آپ کا یہان دو ہفتہ قیام رہا۔ اس عرصہ مین نصیر خان آپ کی خدمت مین کئی مرتبہ حاضر ہوتا تھا۔ جب آپ نے واپسی کا خیال کیا تو نصیر خان نے آپ کو چند قصبات دینے چاہے۔ لیکن آپ نے اس کو منظور نہین کیا اور فرمایا کہ درویشون کی ذات کے لئے اس قسم کے وظیفے اور عطیے بے محل ہین ہم کو ان چیزون سے کیا نسبت! جب شیخ سے نصیر خان نے ایسی باتین سنین تو اور اصرار کیا اس پر آپ نے فرمایا کہ جس مقام پر اسلامی لشکر خیمہ زن ہے۔ وہان ایک شہر کی بنیاد ڈال اور اس کا نام میرے پیر شیخ برہان الدین غریب رح کے نام پر رکھ اور اوسے اپنا دار الحکومت بنا اور اس جگہ جہان مین ہون ایک قصبہ اور مسجد تعمیر کر اور اس کو زین آباد کے نام سے موسوم کر، اوس کے بعد شیخ نے دعا کی اور فاتحہ پڑھی اور دولت آباد کو حضرت شیخ برہان الدین غریب رح کی خدمت مین واپس چلے گئے۔

شیخ کے دولت آباد تشریف لے جانے کے بعد نصیر خان نے آپ کے حسب ایماء دریائے تاپتی کے اوس پار ایک حصار کی بنیاد ڈالی، اور قلعہ کو مستحکم کر کے برہان پور کے نام سے موسوم کیا۔ اور جو آپ کا قیام گاہ تھا وہان زین آباد کو آباد کیا۔

برہان پور کوئی ایسی قدیم بستی نہین ہے۔ اس کی بنیاد پڑے ہوئے تقریبًا پانچ سو سینتالیس (۵۴۷) برس ہوتے ہین لیکن اس نے اس تھوڑی مدت مین زمانے کے بہت تاریخی انقلاب دیکھے ہین ۸۰۲ یا ۸۰۳ھ سے ۱۰۰۹ھ تک یہ سلاطین فاروقیہ کا دار الحکومت تھا۔ اس کے بعد ۲۵ رمضان ۱۰۰۹ھ مین یہ شہنشاہ اکبر (۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء تا ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کے قبضہ مین آیا اور شاہجہان (۱۰۳۶ھ/۱۶۲۱ء تا ۱۰۶۷ھ/۱۶۶۵ء شہزادہ خرم) کے زمانہ تک یہ خاندیس اور دکن کا صدر مقام تھا سلطنت مغلیہ کی کمزوری کے بعد اس پر ۱۱۳۲ھ مین نواب قمر الدین خان بہادر آصف جاہ اول (سنہ ۱۱۶۱ھ) قابض ہوئے۔ آپ کے زمانہ مین اسکی باضابطہ ترمیم ہوئی۔ ابتدا مین شہر کو کوئی حصار نہین تھا ۱۱۴۱ھ مین آپ کے حکم سے ایک زبردست حصار تعمیر کیا گیا ۱۱۷۳ھ کے اوائل مین اس پر مرہٹے قابض تھے۔ ان کی یہان مدتون حکومت رہی ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء مین اس پر انگریزون کا قبضہ ہوا

اور قریباً سوا سو سال سے یہ اِن کے حدود مین شامل ہے۔

برہان پور تاریخی لحاظ سے دکن مین خاص اہمیت رکھتا ہے، اور اس کے آثار قدیمہ سے متعلق بہت سی عمارات اہم ہین ذیل مین ہم اس شہر کے بعض قدیم عمارات کا حال لکھتے ہین۔

قلعۂ ارک۔ برہان پور کا قلعہ مسمار ہو گیا ہے۔ اس کے آثار سے اب کہین کہین برجون کے نشانات پائے جاتے ہین۔ جن سے پتہ لگایا جاتا ہے کہ یہ ساری چیزین بارھوین صدی ہجری کے ابتدائی یا وسطی زمانہ کی منہدمہ ہین۔

قلعہ کے شمالی حصہ سے شاہی محلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس مین بادشاہ اور بیگمات رہا کرتی تھین، لیکن اب اس حصہ کی بعض عمارات کا پتہ بھی نہین چلتا۔ اس حصہ کے جو آثار باقی ہین۔ ان مین نقاشی اور رنگ آمیزی کا نہایت بہترین کام ہے۔

اس کے سوا، قلعہ کی عمارات مین ترکی حمام بھی قدامت اور تناسب کے لحاظ سے خاص چیز ہے۔ اس کی چھت خاص وضع اور ترکی اصول پر بنائی گئی ہے اس کا گنبد مثمن واقع ہوا ہے اور اس کا فرش سنگ مرمر کا ہے اس عمارت کی بلندی سطح زمین سے تقریباً ۸۰ فیٹ ہوگی۔ اس کے اُوپر سے بہت دُور دُور کا نظارہ ہوتا ہے خاص کر دریائے تاپتی کا منظر جو اس پر سے دکھائی دیتا ہے وہ بہت پُر لطف ہے۔

کارخانہ آب رسانی۔ قدیم زمانہ مین برہان پور مین نہرون کے ذریعہ شہر مین پانی آتا تھا جس کے بعد اس کی صفائی ہوتی تھی۔ تاپتی کا پانی چونکہ کھارا ہے۔ اس لئے یہان پر اس کو قدیم اُصول پر صاف کرنے کیلئے بعض اونچے اونچے حوض مناروں کی شکل مین بنائے گئے تھے۔ اِن آثار کے شکستہ نقوش شہر کے گرد نواح مین ابھی تک کثرت سے پائے جاتے ہین جن کی ساخت سے قدیم کاریگری اور اُس زمانہ کے اصول تعمیر کا اندازہ ہوتا ہے۔

بی بی رقیہ کی مسجد۔ یہ مسجد شہر سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کو بی بی رقیہ مریم زمانی نے نوین صدی ہجری مین تعمیر کرایا تھا مسجد بہت وسیع اور بلند ہے، لیکن قدیم ہونے کی وجہ سے گرنے کے قریب ہو گئی ہے۔ اگر اس جانب توجہ کی جائے تو ممکن ہے کہ یہ اپنی پہلی حالت مین برقرار رہ سکے۔

سنہ ۹۷۰ھ مین جب عادلشاہ بن مبارک خان فاروقی نے شہر مین جامع مسجد کا سنگ بنیاد رکھا تو اس وقت سے اس مین نماز ہونی موقوف ہو گئی تھی۔

جامع مسجد۔ اس مسجد کا بانی عادلشاہ فاروقی (سنہ ۹۷۴ھ تا ۱۰۰۵ھ / ۱۵۶۶ء تا ۱۵۹۶ء) تھا۔ اس نے اس کو سنہ ۹۹۷ھ مین تعمیر کیا۔ اسکی عمارت نہایت خوشنما اور وسیع ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ طول مین ۱۴۸ فیٹ اور عرض مین ۱۵ فیٹ ۲ انچہ کے مماثل ہے۔

یہ مسجد ساری سنگ سیاہ سے تعمیر کی گئی ہے۔ اس مین تناسب اور طرز تعمیر کا اس قدر لحاظ ہے کہ اس نوعیت کی

مساجد شمالی دکن مین بھی نہین پائی جاتین۔

اس عالیشان مسجد کی چھت تقریبًا چھیانوے (۹۶) ستونون پر ایستادہ ہے یہ ستون اس طریقہ سے نصب کئے گئے ہین کہ مسجد پانچ حصون مین تقسیم ہو گئی ہے، اس نوعیت کی مساجد سوائے گلبرگہ اور بیدر کے دکن کے کسی اور حصہ مین مشکل سے ہون گی۔

مسجد کا اندرونی حصہ زیادہ آرائشی اور کنگرے دار ہے۔ اس مسجد کے سارے ستون چوپہل ہین ان مین کے ہر ستون کا قطر تقریبًا ۱ فیٹ ۴ اِنچہ ہے۔ مسجد کی عمارت کے نقشے پر غور کرنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ عمارت مسلمانون کے چوتھے عہد سے تعلق رکھنے والی تعمیر ہے۔

مسجد کا صحن دو حصون پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ کا عرض ۷۵ فیٹ اور دوسرے حصہ کا عرض ۳۹ فیٹ ہے اس کے صحن سے ملے ہوئے کئی قدیم حجرے ہین۔ جن کی تعمیر کا زمانہ سلطان عادل شاہ فاروقی کا وسطی عہد ہے اس لئے کہ اس مسجد کی تعمیر سنہ ۹۹۷ھ مین ختم ہوئی اور سلطان عادل شاہ فاروقی کا عہد سنہ ۱۰۰۵ھ تک تھا اور اس نے سنہ ۹۸۴ھ سے سنہ ۱۰۰۵ھ تک حکومت کی تھی۔

اس مسجد کے اندرونی محراب پر ایک کتبہ اس کی تاریخ تعمیر کا خط نسخ مین کندہ ہے۔ جس کو عہد فاروقیہ کے مشہور کتابہ نویس مصطفیٰ خان نے سنہ ۹۷ھ مین لکھا تھا، (کتبہ)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم - وان المساجد للہ فلاتد عوامع اللہ احدا ۰ الحمد للہ الموفق للطاعات المعین بہ فضلہ علی العبادات والصلوۃ والسلام علی اشرف الخلق محمد الذی حرض العباد علی العبادۃ وعلی آلہ واصحابہ الذین قاموا بواجبها و زیادۃ وبعد فان اولی ما ینفق فیہ شرایف الاحوال القربات التو یعود نفعها فی المال ومن اجل ذلک الصدقات الجاریہ فان بوابها ملای الازمان ساریہ وقد وردت السنۃ بان یصرف الیها الاعنہ ولانہ امر ببنیان المساجد من شعائر الدین وقمع المتمردین لما ترتیب من نبائها مزید الثواب۔ وان بانیها ملهم للصواب۔ حیث ورد عنہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال من بنی اللہ مسجدا ولو مکفحص قطاۃ نبی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ فلذلک امر مولانا السلطان الاعظم والخاقان المکرم الفائق بفضلہ علی سلاطین العرب والعجم عادل شاہ بن مبارک شاہ الفاروقی خلد اللہ ملکہ هذا المسجد الذی هو بالوصف جدیر لانہ قل ان یوجد لہ نظیر خالصًا لوجہہ الکریم وطالبا لمرضاۃ الجسیم تقبل اللہ ذلک منہ بفضلہ ومزید کرمہ وطولہ وکان ابتداءہ سنۃ سبع وتسعین وتسعمائۃ واتمامہ سنہ خدم بہ کتابتہ اقل عبیدہ الداعی لدولتہ مصطفیٰ بن نور محمد خطاط عفی اللہ عنہ۔

اس کتبے کے سوائے ایک اور کتبہ مسجد کے عقبی مینار پر تحریر ہے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ۵۔ رمضان ۱۰۰۹ھ مین اکبر نے برہان پور کو فتح کیا۔ اس کتبہ کا کندہ کرنے والا مشہور شاعر میر محمد معصوم نامی ہے، جو اکبر کا درباری شاعر اور کتابہ نویس تھا۔ اس کتبہ مین ۲۶۔ شوال ۱۰۰۹ھ کو اکبر کے لاہور جانے کا بھی ذکر ہے۔ کتبہ۔

تا تاریخ الٰہی عبارت ست از زمان جلوس حضرت شہنشاہ ظل اللہ اکبر بادشاہ غازی کہ ز تائید جوان بخت خویش قلعہ آسیر کشاد ؎

کشت آباد اسیر از ان نامی　　سنہ بخشش بہ گفت اللہ آباد

تاریخ ۱۱۔ فروردین ماہ الٰہی ۴۵ موافق ۵۔ رمضان ۱۰۰۹ھ حضرت شہنشاہ ملک بارگاہ ظل اللہ برہان پور را مقر رایات ظفر آیات ساختند و بہادر خان آمدہ بہ پابوس مشرف شد و اوراباع اتباع جان بخشی کردند قلعہ آسیر فتح شد۔

شہ غازی جلال دین اکبر　　آن بہ تائید بخت قلعہ کشا

کرد فتح اسیر از آن نامی　　گفت بگرفت قلعہ اعلا

قائلہ و کاتبہ محمد معصوم المتخلص بہ نامی بن سید صفائی الترمذی اصلاً و البکری مسکناً و مدفناً و المنتسب امالی سید شیر قلندر ابن بابا حسین ابدال السبزواری مولداً و القندہاری موطناً و مرقداً بہ تاریخ روز ماہ دوازدہم اردی بہشت ۴۶ موافق ۲۶ شوال ۱۰۰۹ھ بندگان حضرت عازم لاہور شد۔

فتح خاندیس و دکن چون کرد شاہ　　عازم ہندوستان الفور شد

یک عدد نامی خرد را نگاہ گفت　　شاہ والا عازم لاہور شد

نور بخش کی مسجد۔ ان مساجد کے علاوہ نور بخش کی مسجد بھی نہایت عالیشان مسجد ہے۔ بہ قول مصنف مآثر الامراء کے اس کے بانی نواب عبد الرحیم خان تھے۔ آپ کا حضرت نواب میر قمر الدین علی خان بہادر آصف جاہ اول سے چچا کا رشتہ تھا۔ نواب غازی الدین بہادر فیروز جنگ ان کے علاتی بھائی تھے۔ ایک عرصہ تک انھون نے برہان پور کی نظامت کی۔ اور اسی جگہ انتقال فرمایا۔ مسجد کے عقب مین چہل ستون کے متصل آپ کا مقبرہ ہے۔

یہ مسجد بہ لحاظ فن کے شہر کی ساری عمارات مین خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اور وسعت کے لحاظ سے برہان پور کی اور مساجد مین وسیع ہے۔ اس کا زینہ بھی سطح زمین سے خاصا بلند ہے بقول اسلامی مورخین کے اس کے کلس بہت دور سے دکھائی دیتے ہین۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابھی چڑھائے گئے ہین۔

خانخانان کی سرائے۔ عبد الرحیم خانخانان جب برہان پور کے صوبہ دار مقرر کئے گئے تو انھون نے اپنی صوبہ داری کے زمانہ مین یہان ایک سرائے تعمیر کی جو بلحاظ وسعت خاصی وسیع اور خوشنما ہے۔ اس مین ایک زمانہ سے بازار لگتا ہے۔

اس عمارت کے طریقہ تعمیر کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعض حصون کی درستی بعد مین کی گئی ہے۔ اس خانقاہ کے دروازے پر ایک کتبہ ۱۰۲۷ھ کا کندہ ہے، جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس عمارت کو خان خانان نے خلیل اللہ خان کے اہتمام مین جو بہادر خان کا بیٹا ہے ۱۰۲۷ھ مین جہانگیر کے عہد مین بنوایا تھا۔ (کتبہ)۔

"در عہد سلطنت ظل اللہ فی الارضین نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی خد اللہ ملکہٗ و عدلہٗ"

خان خان نان سپہ سالار راخلہ شوکتہ حسب الامر اجہان مطاع بہ اہتمام خلیل اللہ پسر بہادر خان در

سنہ ہزار و بیست و ہفت این سرائے بہ اتمام رسید۔

شاہان فاروقیہ کے گنبد۔

شہر کے انوارہ دروازے سے کوئی آدھ میل کے فاصلہ پر یہ گنبد واقع ہین۔ جن مین سب سے بڑا گنبد عادل شاہ فاروقی کا ہے۔ جو برہان پور کی جامع مسجد کا بانی تھا۔ اس گنبد پر کوئی کتبہ نہین ہے۔ اسی سلسلہ مین اور دو گنبد سلاطین فاروقیہ کے ہین۔ اس کے سوا، ان تمام مقابر مین کئی کئی قبرین ہین۔ قیاس ہوتا ہے کہ یہ قبور ان کے رشتہ دارون سے تعلق رکھتی ہین۔

شاہ سوزا کا مقبرہ۔ سلاطین فاروقیہ کے گنبد جس مقام پر واقع ہین۔ وہ ایک چار دیواری ہے۔ اسی حد مین ایک اور مقبرہ شاہ سوزا کے مقبرے کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقبرہ ان تمام گنبدون مین غیر معمولی خوشنما اور خوبصورت ہے اس کی صناعی اور منبت کاری نہایت شاندار ہے۔ اس نوعیت کا نفیس مقبرہ سارے برہان پور مین نہین ہے۔

شاہجہان کا باغ۔ "زین آباد جو حضرت شیخ زین الدین اولیأ کے نام سے آباد ہے۔ یہان پر شاہ جہان اپنی شہزادگی کے زمانہ مین رہا کرتا تھا۔ اس نے اپنے اس قیام کے دوران مین یہان ایک خوشنما باغ تعمیر کیا تھا۔ جس مین نہایت بہترین درخت اور اونچی اونچی عمارات تھین۔ اس باغ مین بہ قول مورخین کے ممتاز محل نے انتقال کیا۔ اور یہین سے ان کی لاش آگرہ بھیجی گئی۔"

اس باغ کی عمارت اور احاطہ کی دیوار کے نشانات ابھی تک باقی ہین، جن سے پتہ چلتا ہے کہ باغ اور عمارت کے حدود نہایت وسیع تھے۔

شاہنواز خان کا مقبرہ۔ برہانپور کی عمارات مین یہ مقبرہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی صناعی اور کاریگری نہایت بہترین ہے۔ یہان پر جو عام روایات مشہور ہین اون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقبرہ میرزا ایرج شاہنواز خان کا ہے۔ جو عبد الرحیم خانخانان کا بیٹا اور برہان پور کا صوبہ دار تھا۔

اس مقبرہ پر ہر سال ایک میلا بڑی دھوم سے لگتا ہے، جس مین شہر کے تمام لوگ جمع رہتے ہین اس مقبرہ کی خصوصیات مین ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی عمارت مین چینی کا نہایت بہترین کام کیا گیا ہے۔ اس کے سوا اسکے

دیوار اور دروازوں پر نہایت بہترین رنگ کاری ہے۔ جو برہانپور کی عمارات میں بہت کم بلکہ شاذونادر پائی جاتی ہے۔
ان مختصر آثار کے سوا، شہر اور اطراف میں کوئی اور قدیم عمارات نہیں ہیں جو قابل تذکرہ سمجھی جائے البتہ ان کے علاوہ شہر میں سینکڑوں اولیا اللہ کے مزارات ہیں۔

تصحیح:- ۱۔ مورخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ اکبر نے ۱۰۰۸ھ میں قلعہ آسیر کو فتح کیا۔ لیکن یہ بیان غور طلب ہے۔ جامع مسجد پر میر محمد معصوم نامی کے ہاتھ کا جو کتبہ کندہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ۵۔ رمضان ۱۰۰۹ھ سے متعلق ہے۔ (تاریخ فرشتہ مقالہ ششم صفحہ ۲۹۱)۔

۲۔ اسی موقعہ پر فرشتہ سے راجہ علی خان کے بارے میں ایک نہایت اہم اور صریح غلطی ہوگئی ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ راجہ علیخان نے اپنے نام کے ساتھ شاہ کا لقب اختیار نہیں کیا تھا لیکن جامع مسجد کے اندرونی کتبے کو دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ راجہ علیخان نے اپنے کو عادل شاہ فاروقی کے نام سے موسوم کیا تھا (تاریخ فرشتہ مقالہ ششم صفحہ ۲۷۸)۔

تعلیقات:- ۱۔ حضرت شیخ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ محبوب الٰہی کے خلفائے عظام سے ہیں آپ چار سو فقراء کے ساتھ دہلی سے دولت آباد تشریف لائے۔ اور اسی مقام پر ۱۱۔ صفر ۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء میں چہار شنبہ کے دن وصال فرمایا۔ آپ کا مقبرہ خلد آباد میں واقع ہے (روضۃ الاولیا صفحہ ۴۱)۔

۲۔ حضرت شیخ زین الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ، آپ حضرت شیخ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کے باکمال خلفاء سے ہیں۔ سلطان محمد شاہ بہمنی (۷۵۹ھ۔ ۷۷۶ھ) کے زمانہ میں گذرے۔ ۲۵ ربیع الاول ۷۷۱ھ/۱۳۶۹ء میں آپ نے وفات فرمایا۔ خلد آباد میں اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ سے متصل آپکا مزار ہے۔ (روضۃ الاولیا از آزاد بلگرامی ص۴۲)۔

۳۔ **عادلشاہ بن مبارک خان فاروقی**۔ اس بادشاہ کا نام راجہ علیخان ہے ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء میں اپنے بھائی میران شاہ کے انتقال کے بعد برہان پور کے تخت پر بیٹھا۔ ۱۷۔ جمادی الثانی ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء میں ایک معرکہ میں وفات پایا۔ اسکی مدت حکومت اکیس سال (۲۱) ہے (تاریخ فرشتہ مقالہ ششم صفحہ ۲۷۸)۔

۴۔ **میر محمد معصوم نامی**۔ ان کے آباؤ اجداد ترمذ کے باشندے تھے۔ یہ بھکر میں پیدا ہوئے۔ ان کے انتقال کی نسبت مورخین میں اختلاف ہے۔ بقول مصنف نتائج الافکار (ص۴۲۷) اور مآثر الامراء (جلد ۳ صفحہ) کے انھوں نے ۱۰۱۵ھ میں انتقال کیا۔
ان کے کتبے آگرہ۔ دہار۔ فتحپور۔ اوجین۔ سعدل پور۔ مانڈو۔ برہانپور۔ بیانہ۔ مدبکر۔ ناگور۔ قندہار۔ وغیرہ میں نہایت کثرت سے ہیں۔ ان کا تذکرہ اکبر کی سیاسی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کو شاعری سے خاص شوق تھا

تخلص نامی ہے۔ یہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ تاریخ سندھ۔ طب نامی۔ مفردات معصومی۔ معدن الافکار۔ حسن و ناز۔ پری صورت۔ خمسہ متحیرہ۔ اکبر نامہ۔ (ان کے حالات ذیل کی کتابوں میں ملاحظہ فرمائیے۔ طبقات اکبری صفحہ ۴۰۱۔ منتخب التواریخ صفحہ ۱۷۔ اکبر نامہ صفحہ ۳۹۶۔ ماثر الامراء صفحہ ۹۳۶۔ مفتاح التواریخ صفحہ ۱۵۵، ایضاً صفحہ ۱۱۱، روز روشن صفحہ ۶۷۹۔ ہفت آسمان صفحہ ۱۴۱)۔ حال میں میر معصوم نامی پر ایک بسوط اور مفصل مضمون مولوی حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب ایڈیٹر تاریخ نے اپنے رسالہ تاریخ میں تحریر فرمایا ہے۔ جس میں تقریباً چالیس کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ رسالہ تاریخ جلد ۱ نمبر ۱)۔

۵۔ شاہنواز خان۔ عبد الرحیم خانخانان کے بیٹے تھے۔ ان کا نام میرزا ایرج ہے۔ جہانگیر نے ان کو بعض کارہائے نمایان کے انجام دینے پر شاہنواز خان کے خطاب سے ممتاز فرمایا تھا۔ یہ جہانگیر کے جلوس کے تیسوین (۲۳) سال برہانپور مین (مالوہ) آئے دیکھو ماثر الامراء صمصام الدولہ شاہنواز خان جلد اول صفحہ ۵۴۔ ۹۰۔ ۴۔ ۷۰۳۔ ۴۔ ۷۰۔ ۱۱۷۔ ۴۷۷)۔

۶۔ ممتاز محل۔ ارجمند بانو بیگم جو تاج محل کے نام سے مشہور ہے۔ شاہجہان کی چھٹی بیوی تھی۔ آصف خان جو نور جہان کا بھائی ہے وہ اس کا باپ تھا۔ سنہ ۱۰۰۰ھ ۱۵۹۲ء مین پیدا ہوئی۔ چالیس سال کی عمر مین ۱۷۔ ذیقعدہ سنہ ۱۰۴۰ھ مین زین آباد مین انتقال کیا۔ ۱۷ جمادی الاول سنہ ۱۰۴۱ھ مین ان کی لاش آگرہ منتقل کی گئی۔ تاج محل جو دنیا کا مشہور مقبرہ ہے آسودہ ہے۔ مصنف قاموس المشاہیر نے اس موقعہ پر سنین مین بعض فاش غلطیاں کی ہین دیکھو قاموس المشاہیر جلد اول صفحہ ۲۷)۔

کتابیات:۔ برہانپور اور اس کے آثار قدیمہ کا حال ہم نے ذیل کی کتابوں سے اخذ کیا ہے۔

(۱)	تاریخ فرشتہ	حکیم محمد قاسم فرشتہ	مطبوعہ	مطبع نولکشور
(۲)	منتخب اللباب	محمد ہاشم خافی خان	"	لیڈن
(۳)	تاریخ رشید الدین خانی	غلام امام الدین خان دہلوی	"	حیدر آباد
(۴)	ماثر الامراء	نواب صمصام الدولہ میرزا شاہ نواز خان	"	رائل ایشیاٹک سوسائٹی
(۵)	سوانح دکن	منعم خان ہمدانی	"	قلمی
(۶)	واقعات بیجاپور	مولوی بشیر احمد دہلوی	"	مفید عام آگرہ سنہ ۱۹۱۵ء
(۷)	تاریخ برہانپور	مولوی خلیل الرحمن برہان پوری	"	مطبع مجتبائی دہلی سنہ ۱۸۹۹ء
(۸)	کتبہ جات اسلامیہ	رسالہ الناظر جلد ششم نمبر ۳۲		
(۹)	امپیریل گزیر اف انڈیا			

سید احمد اللہ قادری۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن)

پرستارِ محبتؔ

(افسانہ)

(۱)

ستار ندی (دریائے گوداوری کی ایک شاخ) کے کنارے کچھ فاصلہ پر گھنے درختون مین ایک لکڑی اور پھوس کا جھوپڑا تھا۔ پریم اسی مین رہا کرتا تھا یہان سے جگت پور بہت دور نہ تھا۔ دن بھر وہ گاؤن مین محنت مزدوری کرتا اور شام کو آکر اس مین سو رہتا۔ اس جھوپڑے کے سوا اُس جنگل مین اور کوئی مکان نہ تھا جب سے وہ یہان آکر رہا تھا اس کی زندگی مین بہت انقلاب پیدا ہوگیا تھا۔ رات کی بھیانک اور خوفناک تاریکی مین جب صرف خونخوار درندون اور جانورون کی ہیبناک آوازین دل کو دہلاتین، یا ندی کی موجین، پتھرون سے سر ٹکرا کر نالۂ وفغان کرتی ہوتین تو وہ بڑے بڑے آنسو بہایا کرتا۔ آنسو بہاتا۔ کروٹین بدلتا رہتا اور اپنے غم مین اس قدر محو ہوجاتا کہ اُسے درندون اور صحرائی جانورون کی چیخ پکار اور ندی کے شور وغل کا ذرا بھی احساس نہوتا۔ اُسے کسی بات سے ڈر نہ لگتا۔

کبھی کبھی وہ خیالات کی کثرت سے بیحد پریشان ہوجاتا۔ وہ دروازہ کھولدیتا اور باہر نکل جاتا بے خود اور بے پرواہ ندی کے بالکل کنارے پہنچ جاتا۔ خواہ کتنی ہی رات کیون نہ گذر گئی ہو، وہ وہان بیٹھ جاتا۔ اُس سے اپنی داستان الم کہنے لگتا۔ اس سے شانتی کی جدائی کا ذکر کرتا۔ اس سے التجا کرتا "اے جل کے دیوتا۔ میری جوانی لے جا۔ میری جوانی۔ مگر شانتی کو، پیاری شانتی کو میری آنکھون سے اوجھل نہ ہونے دے" ندی سے کوئی جواب نہ ملتا وہ وہان سے بھی شکستہ دل ہو کر بھاگتا چاندنی ہر طرف پھیلی رہتی۔ وہ چاند کو دیکھکر اُسے اپنی سرگزشت سُناتا۔ چاند سُنتا رہتا اور کوئی جواب نہ دیتا۔ وہ سب کو اپنے سے بیزار پاتا۔ وہ خود سب سے بیزار ہو کر اپنے جھوپڑے مین واپس آجاتا اور اشک باری اور نالۂ وفغان مین سحر کردیتا۔

(۲)

کشن پرشاد، جگت پور کے ایک نہایت امیر، ممتاز اور پابندِ مذہب برہمن تھے، خدا نے گھر مین سب کچھ دے رکھا تھا، کسی بات کی کمی نہ تھی۔ خود کھاتے تھے اور دوسرون کو بھی کھلاتے تھے۔ تمام جگت پور مین مہاراج کے نام سے مشہور تھے تمام لوگ مہاراج کو بہت قدر و قعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کشن پرشاد مہاراج کے گھر مین صرف تین آدمی تھے۔ ایک وہ خود، ان کی بیوی اور ان کی حسین لڑکی شانتی۔

پریم چند کے والد ٹھاکر رامچند، مہاراج کے ایک قدیم دوست تھے اور جب تک ٹھاکر صاحب زندہ رہے

دونون مین خوب نبھتی تھی۔ ٹھاکر صاحب زراعت وغیرہ کرتے تھے۔ لیکن فضول خرچ بھی بڑے تھے، بہت کچھ روپیہ ادھر اُدھر ناچ رنگ اور دوستون مین اُڑا دیتے تھے بیوی پہلے ہی مرچکی تھی اور اب اکیلے آپ تھے اور ایک لڑکا۔

جب ٹھاکر صاحب بہت ضعیف ہوگئے اور زندگی کی تمام کٹھن منزلین طے کرچکے تو انھون نے ایک دن مہاراج سے کہا۔ "مہاراج مین تو اب دنیا سے جارہا ہون۔ میرا ایک لڑکا ہے جسے مین آکے سپرد کرتا ہون۔ مہاراج آپ اسکی پرورش کیجئے۔ اور جب بڑا ہو تو اُسے میرا گھر اور جائداد وغیرہ دیدیجئے گا" مہاراج نے قدیم دوستی کا خیال کرتے ہوئے ٹھاکر صاحب کی اس استدعا کو قبول کرلیا۔ اور ٹھاکر صاحب کی بہت تسکین و تسلی کی۔ چند روز کے بعد ٹھاکر صاحب نیا سے کوچ کرگئے۔ مہاراج کو اپنے دوست کی جدائی سے بہت قلق ہوا۔ پریم کی عمر اس وقت صرف سات برس کی تھی اُسے باپ کی مفارقت کا صدمہ ضرور ہوا۔ لیکن مہاراج کے نیک برتاؤ، مہارانی کی محبت اور شانتی کی ہم جلیسی نے وہ سب بھلادیا۔ اور وہ نہایت آرام اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا۔

شانتی عمر مین پریم سے چھوٹی تھی دونون ایک دوسرے کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو بہت پیار اور الفت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی محبت ایک دوسرے کے دلون مین زیادہ گہرا اثر کرنے لگی۔ شانتی کی ذراسی تکلیف پر پریم بیتاب ہوجاتا اور پریم کی افسردگی پر شانتی کو قرار نہ ملتا۔

پریم اور پیار کی ہلکی ہلکی موجین، جو شانتی اور پریم کے چھوٹے چھوٹے دلون مین آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھین اب عمر کی ترقی کے ساتھ بڑھنے لگین گھر کی چار دیواری مین، ماں اور باپ کی نظرون سے پنہان ہوکر محبت کے دو چھوٹے چھوٹے پودے نشوونما پارہے تھے۔ دونون کے دلون مین ایک دوسرے کا احترام، عزت اور ایک دوسرے کی پسندیدگی کا راز زیادہ پراسرار ہوتا گیا۔ اب پریم کی عمر پندرہ سال کی ہوگئی تھی اور وہ اپنے دل مین شانتی کی طرف ایک کشش سی محسوس کرتا تھا۔ لیکن یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کشش کی وجہ کیا ہے اور اس کشش کا جذبات انسانی پر کیا اثر ہوتا ہے اور یہ کشش انسانی کی زندگی فنا کردینے پر کہان تک قادر ہے۔ وہ یہ کچھ نہ جانتا تھا۔ وہ ابھی کم عمر تھا وہ یہ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا۔

شانتی ایک بھولی بھالی، کمسن اور حسین لڑکی تھی۔ جو پریم سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ وہ بھی اپنے دل مین یہ بات ضرور پاتی تھی کہ پریم کے بغیر کسی کھیل کود مین اس کا دل نہین لگتا۔ پریم کے بغیر اُسے کھانے مین مزہ نہین آتا اور جب پریم کو کوئی بے چینی ہوتی ہے تو اُسے بھی ایک اضطراب سا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ اس کی چھوٹی عقل مین نہ آتی تھی۔ جذبات انسانی کو اس کے صحیح معنون مین سمجھ لینا ابھی اس جیسی لڑکی کا کام نہ تھا۔ ان دونون کی محبت معصوم تھی، گناہون سے مبرا تھی۔ عیوب سے پاک تھی۔

جب شانتی اور بڑی ہوگئی اور پریم بھی سمجھدار ہوگیا تو مہارانی نے دونون کی یکجائی کو مناسب نہ سمجھا۔

دونون کے برتاؤ۔ اور ارتباط کو دیکھکر ان کو گمان ہوا کہ شاید یہ ہم جلیسی آئندہ چلکر مفید نہ ثابت ہو اور اس لئے انھون نے مہاراج سے کہا کہ پریم کو الگ کردو۔ وہ سمجھدار ہو گیا ہے اور اپنا کاروبار خود کر سکتا ہے اتنے بڑے لڑکے کا گھر مین رہنا ٹھیک نہین۔ مہاراج نے سنا اور زیادہ توجہ نہ کی۔ جب مہاراجن کہتین۔ تو وہ یہ کہکر ٹالدیتے کہ ابھی کیا جلدی ہے۔ پڑا ابھی رہنے دو۔ اپنا کیا نقصان ہوتا ہے۔ اور اسی مین دو برس گذر گئے۔

لیکن مہاراجن کو چین نہ آیا۔ وہ دل ہی دل مین مضطرب رہنے لگین۔ اس اثنا مین پریم اور شانتی ایک دوسرے کی محبت کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ ان مین بے تکلفی پہلے ہی موجود تھی اور اب اس مین اضافہ ہونے لگا۔

مہاراجن نے دونون کے غیر معمولی برتاؤ اور محبت سے تاڑ لیا کہ دال مین کالا ضرور ہے اور انھون نے کوشش کی کہ جلد ہی اس آنیوالی مصیبت کی جڑ کاٹ دین۔ آخر کار انھون نے مہاراج کو اچھی طرح سمجھایا بجھایا مہاراج نے بھی اب مناسب سمجھا اور نہایت نرم لہجہ مین پریم سے کہکر اس کو الگ کردیا۔ اور اپنے ایک دوست کے پاس بہت معمولی تنخواہ پر نوکر رکھا دیا۔ ابھی اس کی عمر صرف اٹھارہ برس ہی کی تھی کہ اس کے نازک کاندھون پر ملازمت کا گران بار رکھدیا گیا۔

ٹھاکر صاحب کے مرنے پر ان کی تمام زمین اور جائداد وغیرہ قرض مین چلی گئی۔ اس لئے بیچارے پریم کو محنت مزدوری پر زندگی گذارنی پڑی۔ اس علیحدگی سے اُسے جو صدمہ ہوا اُسی کا دل جانتا تھا۔ شانتی بھی کچھ کم غمگین نہ تھی۔ مگر ماں کے ڈر سے کسی پر اپنی بیچینی کا اظہار نہ ہونے دیتی تھی۔ اور دل ہی دل مین اس آتش فرقت سے جل رہی تھی۔ مچل رہی تھی اور ضبط کر رہی تھی۔ آنسوؤن کو پی پی کر بھڑکی ہوئی چنگاریون کو بجھاتی تھی۔ کوئی ہم جلیس نہ تھا۔ کوئی مونس و غمخوار نہ تھا۔ کہتی تو کس سے کہتی اور کیا کہتی۔ غرض اس بیچاری کی ایسی ہی حالت تھی کہ جیسے کوئی کانٹون پر گھسیٹا جارہا ہو اور اُسے منہ سے اُف کرنے کی اجازت نہ ہو۔

(۳)

پریم کو شانتی سے جدا ہو کر اب کامل دو سال ہو چکے تھے اس اثنا مین وہ اکثر شانتی کے گھر جایا کرتا تھا۔ ایک تو اس غرض سے کہ یہ اس کا فرض تھا کہ اپنے محسن کو فراموش نہ کرے دوسرے یہ کہ شاید شانتی کی کوئی جھلک نظر آجائے۔ جب وہ مہاراج کے یہان جاتا تو مہاراج اور مہاراجن دونون اس سے نہایت محبت آمیز برتاؤ کرتے تھے۔ وہ جب گھر مین جاتا تو ایک خود فراموشی کے عالم مین رہا کرتا تھا۔ وہ لوگون کی باتین سنتا تھا۔ مگر کچھ سمجھ مین نہ آتا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھتا تھا مگر کوئی چیز اُسے صاف اور منور نظر نہ آتی تھی اور وہ نہایت خاموش اور مبہوت بیٹھا رہتا۔ مگر اس کی متجسس نگاہین شانتی کے لئے گھر کا کونا کونا چھان ڈالتی تھین۔ شانتی کی ایک جھلک کے لئے وہ بہت بیچین رہا کرتا تھا۔ شانتی کو پریم کی موجودگی مین باہر آنیکی

اجازت نہ تھی۔ نہ وہ اس سے مل سکتی تھی۔ مگر پریم کے آنے کی خبر سنکر وہ بہت مسرور ہو جاتی، اور گو یہ مسرت عارضی ہوتی تاہم اُسے اس مین کافی لذت محسوس ہوتی تھی۔ صرف پریم کی آمد ہی اس کی بیچینی کو کسی حدتک کم کر دیتی تھی۔ اور جب تک وہ گھر مین رہتا اُسے ایک قسم کا سکون اور اطمینان قلب نصیب ہو جاتا تھا۔

پردہ کے اندر بند رہنے سے بعض اوقات وہ نہایت گھبرا جاتی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ کسی طرح پریم کو دیکھ لے۔ اس شوق مین وہ اکثر، جب دیکھتی کہ ماتاجی کسی اور طرف ہین اور پتاجی بھی باہر ہین، کھڑکیون اور دروازون سے جھانک لیتی۔ بعض اوقات پریم اور شانتی کی نگاہین ایک ہی وقت ایک دوسرے پر پڑتین۔ اور آنکھون ہی آنکھون مین ایک دوسرے سے اپنے دل کا حال کہدیتین۔ اور جب پھر یہ وہ حائل ہو جاتا تو شانتی کی آنکھون سے آنسو بہنے لگتے۔ اور پریم بھی جذبات کے سیلاب کو نہ روک سکتا۔ اُس کی پاس آگین آنکھین بھی نم ہو جاتین۔ لیکن وہ فوراً پونچھ ڈالتا۔ اب زیادہ ٹھہرنے کی تاب اپنے مین نہ پاتا۔ اور اس ڈر سے کہ شاید آنسوٴن کا طوفان طاقت ضبط سے باہر ہو جائے وہ کسی بہانے فوراً گھر سے باہر چلا جاتا۔

(۴)

کچھ عرصہ گذر گیا اور اب شانتی کی شادی بیاہ کا تذکرہ گاؤن کے لوگون مین ہونے لگا لیکن ابھی یہ طے نہ پایا تھا کہ کس کے ساتھ شادی ہوگی؟ پریم نے بھی شادی کا حال سنا اور اپنا دل تھام کر رہگیا وہ بالکل بے بس تھا وہ اس معاملہ مین کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ شادی کے متعلق اپنی زبان سے کوئی لفظ نکالتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ مہاراج اُس جیسے غریب کو اپنی بیٹی کیون دینے لگے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ گو مہاراج نے پریم سے اب تک نہایت اچھا اور قابل ستائش سلوک کیا تھا۔ لیکن وہ یہ بات پسند نہ کرنے تھے کہ ایسے مفلس کو اپنی بیٹی دیکر اس کا جنم اکارت کرین۔ وہ برہمن تھے اور دوسری ذات کے ساتھ شادی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔

پریم اب بالکل مایوس ہو گیا۔ اس نے یقین کر لیا کہ اب شانتی کبھی اس سے نہ مل سکے گی۔ اور وہ آیندہ ہمیشہ کے لئے اس کی دید سے محروم کر دیا جائیگا۔ مگر وہ اپنے دل کو کیسے تسلی دیتا۔ وہ اپنی بیتابی کو کس طرح دفع کرتا۔ شانتی کی محبت پتھر کی لکیر تھی۔ اور اُسے لوح دل سے مٹا دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کی محبت کو بھول جانا اس کی طاقت سے بعید تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے سوچا کرتا کہ اب کیا ہوگا۔ وہ کس طرح شانتی کو بغیر دیکھے زندہ رہ سکیگا۔ اور زندہ بھی رہا تو اس کی زندگی مین لطف ہی کیا ہوگا۔ اس کی زندگی بالکل ایک مصنوعی انسان کی سی ہوگی جس مین بظاہر حرکت ضرور ہوگی لیکن جسکا باطن بالکل بے جان اور بے حس ہوگا۔

شانتی اس معاملہ مین دم نہ مار سکتی تھی۔ وہ شکاری کے پرندہ کی مانند تھی۔ کہ جہان بند کر دی جائے وہان رہے اور جسے دیدی جائے اس کے ساتھ چلی جائے۔ اور لب پر آہ و فغان نہ لائے۔ خواہ اس کا مستقبل

تکلیف آمیز ہو یا مسرتناک، خواہ وہ کانٹون پر گھسیٹی جائے یا پھولون مین تُلے۔

چند دنون کے بعد جگت پور ہی کے ایک برہمن خاندان مین شانتی کی بات چیت لگ گئی۔ اور اب اعلیٰ پیمانہ پر شادی کی تیاریان شروع ہو گئین۔ جون جون شادی کے دن قریب آتے جاتے تھے۔ شانتی اور پریم کی بیتابیون اور بیقراریون مین اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پریم کو شادی کی تمام تیاریان اپنی موت کا سامان نظر آرہی تھین۔ وہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس آنیوالی مصیبت سے ٹکرا کر کہانتک جانبر ہو سکے گا۔ اور وہ اس اُٹھنے والی آندھی کے جھونکون سے آپنے آپکو کیونکر محفوظ رکھ سکے گا۔ اس کے دماغ مین کوئی تدبیر نہ آتی تھی۔

اس اثناء مین مہاراج کسی ضرورت سے کہین باہر چلے گئے اور اب صرف مہاراجن اور شانتی اکیلی رہگئی تھین یا دو ملازم۔ ایک بڑھیا جو گھر مین کھانا وغیرہ پکاتی تھی دوسرا ایک لڑکا جو باہر کا کام کاج کیا کرتا تھا۔ شادی کو تھوڑے ہی دن باقی رہگئے تھے کہ مہاراجن بیمار پڑ گئین۔ انھین بخار آنے لگا اب پریم کے لئے اچھا موقع تھا اس نے یہ حالت دیکھی تو دن بھر مہاراجن کے یہان رہنے لگا اور دوا علاج مین بہت مستعدی ظاہر کرنے لگا۔ وہ وید اور حکیمون کو بلا کر لاتا۔ مہاراجن کو دکھاتا۔ اور خود ہی جاکر بازار سے دوا لاتا۔ اور آپ ہی مہاراجن کو پلاتا۔ اس پریشانی اور تکلیف کے وقت مہاراجن نے پریم اور شانتی کے پردہ کا زیادہ خیال نہ کیا۔ اور کئی مرتبہ خود مہاراجن کے سامنے پریم اور شانتی کا آمنا سامنا ہو گیا۔ لیکن شانتی مان کے ڈر سے فوراً پردہ مین چلی جاتی تھی۔

شانتی کی اُٹھتی جوانی اور بھولی صورت دیکھ دیکھ کر پریم اب اور زیادہ بیتاب ہونے لگا۔ اور شادی کے خیال سے تو اسکے سینے پر سانپ ہی لوٹ جاتا تھا۔ اور وہ کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا تھا۔ بعض وقت جب مہاراجن شدت بخار سے غافل پڑی رہتین۔ یا سو جاتین اور پریم آجاتا تو شانتی سے خاموش نہ رہا جاتا۔ وہ فوراً دروازہ کھولدیتی، پردہ سرکا دیتی اور دونون ایک دوسرے کو دیکھنے مین گھنٹون محو رہا کرتے۔ مگر بات نہ کر سکتے تھے۔ انھین یہ خوف لگا رہتا کہ کہین مہاراجن غفلت سے چونک نہ پڑین۔ یا کوئی اور آکر دیکھ نہ لے۔ اکثر بار خود جذبات سے مغلوب ہو کر پریم شانتی کو دیکھتے دیکھتے اس کے قریب بھی پہنچ جاتا اور جوش محبت سے چاہتا کہ شانتی ایک ہی بار اپنے سینے سے لگالے۔ مگر فوراً ہی کسی خیال سے وہ رُک جاتا۔ اس کے تمام جسم مین لرزہ پیدا ہو جاتا اور وہ جون کا تون کھڑا رہجاتا۔ شانتی پریم کی اس دیوانگی کو دیکھکر آپے مین نہ رہجاتی۔ وہ اس کی بیخودی کو دیکھکر خود بدحواس ہو جاتی۔ اور اپنا ہاتھ پریم کی طرف بڑھا دیتی کہ وہ اُسے بوسہ دیکر اپنے بیتاب دل کی تسکین کرے۔

(۵)

پریم اور شانتی کے لئے یہ آخری اور نہایت خوشگوار لمحے تھے جنھین وہ نہایت قدر سے دیکھتے تھے۔ اور مسرور ہوتے تھے۔ شانتی نے اپنی شادی کی پرشور اور طربناک گھڑیون کا خیال اپنے دل و دماغ سے نکال دیا تھا۔ کیونکہ حقیقت مین وہ آنیوالی گھڑیان خود اس کے لئے مسرتناک نہ تھین۔ اور وہ انھین لمحون کو اپنی شادی کی فرحت افزا اور نشاط آگین گھڑیان سمجھنے

لگی تھی۔ جبکہ وہ پریم کو دیکھ سکتی تھی اور پریم اُسے۔

ایک روز مغرب کے بعد مہاراجن کا مزاج زیادہ ناساز ہو گیا جس سے شانتی کسی قدر گھبرا گئی اور وہ پردہ کا خیال کئے بغیر پریم کی موجودگی مین مان کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ پریم کی زندگی کا یہ سب سے زیادہ زرین موقع تھا۔ وہ اپنی محبوبۂ دلنواز کے رُخ زیبا کی سُرور پاش تجلیون مین خود کو گم کئے دیرہا تھا، وہ اُسکے چہرے کی رنگینیون مین اپنی تشنہ نگاہون کو پیوست کئے دیرہا تھا۔ وہ اس کی ہلکی سی گھبراہٹ کی جھلک مین اپنے آپ کو محو کئے دے رہا تھا۔ وہ ہمہ تن شانتی کے جلوہ مین محو ہو گیا۔ وہ چپ بیٹھا تھا اور اُسے خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونیوالا ہے۔ وہ بس شانتی کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے مہاراجن کی فکر نہ تھی کہ وہ کس حال مین ہین۔ شانتی اپنی مان کی غیر معمولی خاموشی سے ہراسان ہو رہی تھی۔ اور کبھی کبھی شرمگین انداز سے پریم کو مخاطب کر کے کہتی "ذرا دیکھو تو ماتاجی کیسی چپ ہوتی جا رہی ہین!" پریم اس مترنم اور محبت آگین آواز سے چونک پڑتا اور نرم لہجہ مین تسلی دیتے ہوئے کہتا: "نہ گھبراؤ شانتی، ماتاجی ابھی ہو جائینگی"۔

رات، دیہات کی رات نہایت پُرسکون ہوتی ہے، مگر آج کی رات نہایت ہیبتناک معلوم ہو رہی تھی۔ آٹھ بج چکے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس وقت مان بستر پر غافل اور بیہوش پڑی تھی۔ شانتی ایک طرف بیٹھی مان کے چہرے کو حسرتناک انداز سے دیکھ رہی تھی۔ اور دوسری طرف پریم گم صم بیٹھا شانتی کی بدحواسیون کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

دروازہ گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ کھُلا اور مہاراج کشن پرشاد اندر داخل ہوئے۔ جو منظر انھین نظر آیا اس سے وہ بہت غضبناک ہو گئے۔ پریم کو رات مین شانتی کے پاس بیٹھا دیکھکر ان کی آنکھون مین خون اُتر آیا۔ اور ممکن تھا کہ وہ اپنا سارا غصہ پریم پر اُتار دیتے۔ لیکن فوراً ہی شانتی چلا اُٹھی، "پتاجی دیکھو ماتاجی کیسی چپ پڑی ہین شاید بیہوش ہو گئی ہین"، شانتی کی اس دردآمیز صدا نے ان کا غصہ فرو کر دیا اور وہ فوراً ہی مہاراجن کی طرف متوجہ ہو گئے۔

پریم مہاراج کی اس اچانک آمد سے کچھ کم خوفزدہ نہوا۔ وہ مہاراج کے تیور ہی دیکھکر سمجھ گیا تھا کہ اب کوئی مصیبت ضرور آنیوالی ہے۔ اور وہ اس ڈر سے کانپنے لگا تھا۔ مہاراج کی پیٹھ پلٹتے ہی وہ چپکے گھر سے باہر نکل گیا۔ شانتی کی تو جان ہی پر آبنی تھی۔ اگر اس وقت مہاراجن کی یہ بُری حالت نہوتی تو معلوم نہین اس بیچاری پر کیا قہر ٹوٹتا۔

(۶)

مہاراج نہایت سرگرمی اور جانفشانی سے تیمارداری مین منہمک ہو گئے اور مہاراجن کی حالت روبصحت ہو چلی اب شادی کو صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا اس اثنا مین پریم روزانہ مہاراج کے پاس آتا ضرور تھا۔ لیکن گھر مین مہاراج کی اجازت کے بغیر نہ جاتا تھا۔

دو دن گذر گئے اور اب مہاراجن مین چلنے پھرنے کی سکت بھی آ گئی تھی۔ مہاراج کے آنے کے بعد شانتی کو نہ تو پریم سے ملنے کا موقع ملا نہ وہ اُسے دیکھ ہی سکی۔ انھین دنون مین کرشن کی پوجا کا دن بھی آنیوالا تھا۔ اور اس روز مہاراجن

اور شانتی وغیرہ، بڑے مندر مین جاکر، جو گاؤن سے تھوڑی ہی دور باہر تھا، پوجا پاٹ کرتی تھین۔ اس روز مندر مین بہت ہجوم ہوا کرتا تھا اور میلہ بھی لگتا تھا۔ اس پوجا کے دوسرے ہی دن شانتی کا بیاہ ہونیوالا تھا۔ اور برات آنے والی تھی۔

شانتی کو اب شادی تک پریم سے ملنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ لیکن پوجا کا دن یاد آگیا اور اس سے وہ کسی قدر مسرور ہوگئی۔ اس کو اطمینان ہوگیا کہ بس آخری ملاقات کا یہی موقع ہے۔ اور اب وہ اس فکر مین رہنے لگی کہ پریم کو اس پوجا کے روز مندر مین بلائے اور اس سے آخری مرتبہ اپنی محبت کا اظہار کردے۔ ایک روز جب مہاراج باہر گئے تھے اور مہاراجن ایک کوٹھری مین سو رہی تھین۔ پریم مہاراج کے گھر آیا۔ شانتی کو جب معلوم ہوا تو اس نے بڈھی سے کہلا بھیجا کہ جاکر ان سے کہو تمھین ماتا جی بلا رہی ہین۔ اور وہ خود کوٹھے پر چڑھ گئی اور ایک کھڑکی سے پریم کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ بڈھی بیچاری ایک سیدھی سادھی عورت اُسے کیا خبر کہ کیا معاملہ ہے اس نے جاکر پریم سے کہدیا۔ وہ ڈرتا ڈرتا اندر آیا۔ شانتی نے فوراً پان بھجوایا اور کہدیا کہ دیکھکر کھائین کہین چونا زیادہ نہو۔ اور خود کھڑکی مین سے جھانکنے لگی۔ پریم مہاراجن کی کوٹھری کی طرف گیا مگر انھین سوتا دیکھکر واپس جانے لگا۔ اس اثنا مین اُسکی نگاہ شانتی پر پڑگئی وہ جھجک کر ٹھہرا۔ بڈھی نے پان لاکر دیا۔ اس نے جلدی سے لے لیا۔ اور مہاراج کے ڈر سے فوراً گھر سے نکلکر چلدیا۔ شانتی کے دل کی مراد بر آئی۔ اور وہ مسکرانے لگی پریم وہان سے نکلکر سیدھا اپنے گھر چلا آیا۔ اس سے قبل بھی اُسے پان کھانے کا موقع ملا تھا۔ مگر خود مہاراجن لگاکر دیا کرتی تھین۔ آج شانتی کے ہاتھ کا لگایا ہوا پان دیکھکر وہ خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ اس نے اُس پان کو آنکھون سے لگایا۔ چوما۔ سر پر رکھا۔ پھر بوسہ دیا۔ پھر آنکھون سے لگاکر آہستہ آہستہ اپنی مرتعش اور لاغر انگلیون سے کھولا۔ اسکے اندر ایک کاغذ کا پرزہ تھا جس مین حسب ذیل تحریر تھی۔

میرے پریم۔ میری شادی کو صرف دو دن اور ہین پرسون کرشن جی کی پوجا ہے مین اور ماتا جی ضرور پوجا کی غرض سے بڑے مندر جائینگی۔ تم وہان کہین مندر کے قریب ہم سب کی نظرون سے پوشیدہ ہوکر ٹھہرنا اور میرا انتظار کرنا۔ مین تم سے آخری بار ضرور ملنے آؤنگی۔ پریم وہان ضرور آنا اگر تم نہ آئے تو مجھے بیحد صدمہ ہوگا۔ تمھاری شانتی

(۷)

آج کرشن کی پوجا کا دن تھا۔ تمام مندر چراغون اور پھولون سے روشن اور آراستہ تھا ہر طرف پجاریون کا اژدہام نظر آتا تھا۔ دُور دُور سے لوگ پوجا کی غرض سے آئے تھے۔ مندر کے چارون طرف روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ دکانین بہت آراستہ تھین۔ شور و غل ہو رہا تھا اور لوگ ادھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ غرض جنگل مین منگل ہو رہا تھا اور اتنے بڑے مجمع مین کسی کو تلاش کرنا بڑا دشوار کام تھا۔

شانتی بھی اپنی مان اور نوکرون کے ہمراہ میلے مین وارد ہوئی۔ اُسے درحقیقت نہ میلے کی مسرتون سے دلچسپی تھی نہ پوجا کرنے کا شوق تھا۔ نہ وہ کچھ خریدنا چاہتی تھی اور نہ کسی کھیل تماشے سے اس کی دلبستگی تھی۔ اسکی

نگاہین صرف پریم کی متلاشی تھین - اور وہ سراپا پریم سے ملنے کے شوق مین ڈوبی ہوئی تھی - جب وہ لوگون کے اس ہجوم مین داخل ہوئی تو گھبرا گئی کہ ایسی بھیڑ مین پریم سے وہ کیونکر مل سکے گی - لیکن اس کے جذبۂ محبت اور شوقِ ملاقات کے آگے یہ ساری مشکلین ہیچ تھین - وہ مان کی نظر بچا کر گھونگٹ کھول کھولکر لوگون کی طرف دیکھنے لگی اور پریم کو تلاش کرنے لگی -

مان کے ساتھ رہکر پریم کو تلاش کرنا یا اس سے ملنا غیر ممکن تھا - اس لئے وہ مان سے الگ ہو جانا چاہتی تھی - ابھی وہ سب مندر کے قریب ہی پہنچے تھے کہ لوگون مین مندر کے اندر جانے کی کشمکش شروع ہو گئی - اور ایک مرتبہ ایسی زور کا ریلا آیا کہ شانتی مان سے الگ ہو گئی - اب وہ جلد جلد وہان سے قدم اُٹھانے لگی - اس نے اپنا گھونگٹ اُلٹ دیا - اور جدھر لوگون کی کثرت نہ تھی اُس طرف ہر شخص کو غور سے دیکھتی ہوئی بڑھنے لگی - چلتے چلتے وہ مندر کی اپشت پر پہنچ گئی - پریم بھی ایک طرف ایک ٹیلے پر کھڑا ہوا ہر آنے جانیوالی عورت کو غور سے دیکھ رہا تھا - وہ اپنا سر اور چہرہ کپڑون سے اس طرح چھپائے ہوئے تھا کہ کوئی اُسے پہچان نہ سکتا تھا - شانتی پر اس کی دور بین نظر جا پہنچی - وہ ٹیلے پر سے اُتر آیا اور شانتی کی طرف بڑھا - وہ شانتی کے پاس پہنچ گیا - شانتی اُسے دیکھکر مسرور ہو گئی - اور اُس نے اپنا گھونگٹ آگے کر لیا - پریم کو اس وقت کسی کا خوف نہ تھا - وہ انجام پر غور کئے بغیر شانتی کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا - "آہ شانتی تم آگئین" - شانتی نے کسی قدر مبہوت اور گھبرائی ہوئی آواز مین کہا "چپ رہو پریم - کوئی سُن نہ لے - چلو کہین دُور چلکر باتین کرین" اس کے بعد پریم نے کچھ نہ کہا اور وہ آہستہ آہستہ ایک سمت مین چلنے لگا شانتی بھی اُسکے پیچھے پیچھے روانہ ہوئی -

اس ہنگامۂ محشر نما اور مندر سے کچھ دُور پر ایک چھوٹی پہاڑی تھی - جدھر لوگون کی آمد و رفت بہت کم تھی - یہان تاریکی بھی تھی اور دوکانین بھی دو ایک سے زیادہ نہ تھین - پریم شانتی کو ساتھ لئے ہوئے اس پر چڑھ گیا - اور وہ دونون سب کی نظرون سے چھپ گئے - اب شانتی مین زیادہ چپ رہنے کی تاب نہ تھی - اس نے فوراً اپنا چہرہ پوری طرح عریان کر دیا - اور پریم کو آرزومند اور حسرت آگین نگاہون سے دیکھنے لگی - پریم بھی کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا - پھر اسنے شانتی کے دونون ہاتھ پکڑ کر زمین پر بٹھا دیا - اور بولا - "میرے دل کی شانتی اس پتھریلی زمین پر بیٹھنے مین کوئی تکلف نہ کرو یہ زمین آج ہمارے لئے بہت مقدس اور مبارک ہے" - شانتی نے جواب دیا - "پریم - میرے پریم اگر تم مجھے کانٹون پر بیٹھنے کو بھی کہدو تو مجھے انکار نہوگا یہ تو زمین ہی ہے" پریم نے جوش مین آکر اُسے اپنی محبت نواز آغوش مین لے کر اپنے سینے سے لگا لیا - اور چند منٹ تک دونون خاموش رہے - پھر پریم نے دردانگیز لہجہ مین کہا - "شانتی کل تم بیاہ دی جاؤ گی اور مین ہمیشہ کیلیے تم سے چھوٹ جاؤنگا" شانتی یہ الفاظ سنکر بیتاب ہو گئی مگر وہ پریم کو تسلی دیتے ہوئے بولی "پریم مین تم سے جُدا ہونے والی نہین ہون - یہ تو قسمت مین لکھا ہوا تھا کہ مین کسی اور سے بیاہ دی جاؤن - مگر پریم تمھاری محبت شادی کے بعد بھی مین تم سے ملتی ہونگی - پریم میرے شادی ہماری محبت مین کوئی فرق نہین پیدا کر سکتی" پریم نے کہا "ہان میری پیاری

شانتی۔ میری شانتی تم سچ کہہ رہی ہو۔ میری بھولی لڑکی، تمھارے من مین پریم کی محبت ضرور ہے لیکن تم اپنے من کی بات نہ کرسکو گی۔ تمھین اپنے سوامی کی اطاعت کرنی پڑیگی۔ جو کچھ وہ کہیگا وہی کرو گی" شانتی نے جواب دیا۔

"پریم میرے ایک استری کا سب سے پہلا فرض یہی ہے کہ وہ اپنے سوامی کی دل وجان سے فرمانبرداری کرے۔ لیکن پریم میرے۔ مین کسی اور کی استری ہو جاؤن گی تو کیا ہوا۔ میرے جسم پر میرے شوہر کا قبضہ ضرور ہوگا۔ مگر میری رُوح کے تم اکیلے مالک ہو۔ اس پر کسی کا قبضہ نہین ہو سکتا" پریم شانتی کے اس جواب سے بیحد متاثر ہو گیا اور وہ دیوانگی کے عالم مین چلا اُٹھا۔ "شانتی۔ شانتی۔ میری اچھی شانتی" اور یہ کہکر اس نے پھر ایک بار اُسے لپٹا لیا۔ اور دونون کی آنکھون سے آنسو بہنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد پریم نے شانتی سے جدا ہوتے ہوئے کہا۔ "شانتی تم میرے دل کی ملکہ ہو۔ دنیا مین، مین صرف تمھین چاہتا ہون۔ اور کسی سے مجھے محبت نہین ہے۔ مگر۔ مگر شانتی یہ جدائی یہ فرقت کی گھڑیان کیسے کٹین گی۔؟" شانتی نے حسرت بھرے لہجہ مین جوابدیا۔ "پریم۔ پرماتما کاٹنے والا ہے۔ تم زیادہ بچین نہو۔ مین تم سے ضرور آکر ملا کرونگی" پریم بیتابی کے انداز سے بولا۔ "شانتی پرماتما نے تمھاری محبت کیون دی تھی۔ مجھے۔ ہائے اگر جدا ہی کرنا تھا تو تمھاری محبت کا پرستار نہ بنایا ہوتا" شانتی نے نہایت نرم اور تسکین وہ لہجہ مین کہا۔ "پیارے پریم تم سچ کہتے ہو۔ مگر ایشور کی مصلحتون مین کسی کو کیا دخل اس نے ہماری قسمتون ہی مین جدائی لکھدی تھی۔ پھر ہم کیا کر سکتے ہین" پریم بولا۔ "تمھارے بغیر مجھے چین نہ آئیگا۔ شانتی مین دیوانہ ہو جاؤنگا۔" شانتی نے کہا۔ "ایسا نہ کہو پریم۔ تمھاری ان باتون سے میرے دل پر چوٹ لگتی ہے تم صبر کرو جس نے ہمین یہ غم دیا وہی دُور بھی کر دیگا۔ پریم۔ پریم تم رو رہے ہو؟" پریم نے روتے ہوئے جوابدیا۔ "شانتی۔ شانتی رو رہا ہون اپنی قسمت کو۔ اپنے پھوٹے بھاگون پر آنسو بہا رہا ہون" شانتی بولی۔ "مگر اس وقت کو غنیمت سمجھو۔ اس کی قدر کرو۔ اور اسے آہ وزاری مین ضائع نہ کرو" پریم نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "ہان سچ کہہ رہی ہو شانتی۔ میری پیاری ہان مجھسے اچھی اچھی باتین کرو مین اب نہ رُوؤنگا۔ اور شانتی یہ تو بتاؤ تم یہان میرے ہان اکیلے کیسے آسکین؟" شانتی نے جواب دیا۔ "مین لوگون کی بھیڑ مین اتفاقاً ماتاجی سے الگ ہو گئی اور تم کو ڈھونڈتی ہوئی یہان تک آپہنچی۔ پریم تمھاری کشش نے ساری مشکلین آسان کر دین" پریم بولا۔ "پھر تمھاری ماتاجی تمھین ڈھونڈتی ہون گی؟" شانتی نے جواب دیا "ہان ضرور۔ مگر مین اب یہان سے گھر چلی جاؤنگی۔ کیونکہ انھین اب مین اتنے بڑے مجمع مین کہان تلاش کرتی پھرونگی" پریم نے کہا۔ "اس سے کہین وہ کچھ اور نہ خیال کرین؟" شانتی نے اطمینان دیتے ہوئے کہا۔ "نہین پریم تم اس کا کچھ خوف نکرو۔ مجھپر کوئی آفت نہین آسکتی۔ پیارے پریم میری سمجھ مین خود ہی نہین آتا۔ کہ تمھارے بغیر میری زندگی کن مصیبتون کی آماجگاہ بنجائیگی" پریم نے مضطرب انداز سے جواب دیا۔ "شانتی بتاؤ پھر مین تمھارے لئے کیا کرون؟۔ مین تمھارے آرام کے لئے کیا کرسکتا ہون؟" شانتی نے اپنا سر اُٹھا کر پریم کو دیکھا اور دیکھتی رہی۔ پریم بُت کی طرح ساکت آنکھون مین آنکھین ڈالے بیٹھا رہا۔ کسی کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ پھر پریم نے مایوسانہ لہجہ مین کہا۔ "شانتی مین اب کبھی

تمھین نہ دیکھ سکونگا" شانتی نے جواب دیا "نہین اس قدر مایوس نہو۔ تم مجھے جب چاہو دیکھ لوگے۔ تم کیون بلاوجہ نااُمید ہوئے جارہے ہو؟" پریم نے کہا "مگر۔ مگر مین ڈرتا ہون کہ شادی کے بعد شاید تم مجھے بھول جاؤ" شانتی نے رنجیدگی سے جواب دیا "مجھے ایسی باتون سے صدمہ ہوتا ہے۔ نہ کہو پریم۔ تم مجھے ایسی بے وفا ہستی نہ سمجھو۔ میری زندگی صرف تمھاری یاد سے وابستہ ہے۔ پریم۔ پریم شانتی تمھین تمام عمر نہین بھول سکتی" پریم فرطِ انبساط اور جوشِ محبت سے چلا اُٹھا "تم کبھی نہ بھولوگی۔ میری شانتی تم مجھے کبھی نہ فراموش کروگی؟" شانتی نے سر اٹھا کر پریم کی طرف درد بھری نظرون سے دیکھا اور محبت آگین لہجہ مین کہا۔ "کبھی نہین" یہ جواب سنکر پریم نے اُسکا نازک اور سیمین ہاتھ اُٹھالیا اور اپنے تشنہ ہون کی طرف لیجانے لگا کہ اُسے بوسہ دے لیکن ابھی ہونٹون نے اس کے ہاتھ کو مس بھی نہ کیا تھا کہ پریم اکدم ساکت ہوگیا۔ اور آنکھین پھاڑ کر ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے ہاتھون مین کالا ناگ پکڑے ہوئے ہے اُس نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔

پریم کی اس حرکت سے شانتی متحیر ہوگئی۔ اس نئی وحشت سے وہ زیادہ مضطرب ہوگئی اُس نے تعجب سے پوچھا "پریم۔ پریم یہ کیون؟" پریم نے متانت سے جواب دیا "اب یہ میرا حق نہین ہے۔ شانتی اب یہ کسی اور کی ملکیت ہے" شانتی نے بیخود ہو کر کہا "نہین پریم۔ مین اجازت دیتی ہون۔ ابھی تمھین حق حاصل ہے ابھی مین تمھاری ملکیت ہون کل سے نہ رہونگی" پریم بولا "نہین شانتی اب میری جرأت نہین کہ تمھارے جسم کو ہاتھ لگا سکون۔ بس اور مین کچھ نہین چاہتا تم سے۔ شانتی مجھے اپنے دل سے نہ مٹانا" شانتی بیچین ہوکر بولی "پریم آخر ابھی سے تم کیون مجھسے نفرت کرنے لگے۔ میرے ہاتھون کو کیا ہوگیا؟" پریم نے جواب دیا "کچھ نہین شانتی، کچھ نہین۔ مگر اب تم پر میرا کوئی حق نہین ہے۔ مجھے کرشن جی نے آکر منع کردیا۔ بس شانتی یہ ہماری آخری ملاقات ہے اور اب تم جاؤ۔ ایشور تم کو چین اور سُکھ دکھائے"۔

کرشن کا نام سنکر شانتی کے معصوم اور منور آنکھون سے آنسوؤن کی جھڑیان لگ گئین اور وہ چپکے چپکے خوب روئی۔ پریم بے حس و حرکت بیٹھا دیکھتا رہا۔ اپنے آپ کو اس کے آنسوؤن مین غرق کرتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ شانتی نے ساری کے ایک کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "پریم تو مین اب جارہی ہون اور آخری مرتبہ تم سے کہتی ہون کہ میرے لئے تم اپنا دل نہ کڑھانا۔ مین تمھاری ہون اور ہمیشہ تمھاری ہو کر زندہ رہونگی۔ تم جب چاہو مجھے دیکھ سکتے ہو" پریم بولا "شانتی۔ میری شانتی جدائی کی تاب کسے ہے۔ مگر کرشن جی کا حکم ہے اور اب تم اپنے گھر جاؤ۔ مجھپر جیسی گذرے گی پرماتما مالک ہے۔ چلو اُٹھو۔ کیا مین تمھین مندر تک پہنچا دون؟" شانتی نے جواب دیا۔ "نہین پریم اب مین مندر اور میلے جاکر کیا کرونگی۔ تم مجھے گھر ہی تک پہنچا دو تو اچھا ہے" پریم نے ڈرتے ہوئے کہا۔ "مین پہنچانے کے لیے تیار ہون۔ مگر شانتی مجھے خوف معلوم ہوتا ہے کہ کہین کوئی ہمین دیکھ نہ لے" شانتی بولی "ہان یہ ڈر ضرور ہے لیکن تم مجھے گھر سے کچھ دُور چھوڑ دینا وہان سے مین اکیلی چلی جاؤنگی۔ تم اپنا منہ کپڑے مین چھپا کر آگے آگے چلو" پریم نے جواب دیا "اچھا چلو" یہ کہکر پریم اور شانتی

ٹیلے پر سے اتر آئے۔ اور گھر کی طرف جلد جلد قدم اٹھانے لگے۔

(۸)

شادی کا روز تھا۔ اور مہاراج کشن پرشاد کا گھر مسرتون اور خوشیون کا گہوارہ بنا ہوا تھا ہر طرف زرق برق پوشاکین نظر آرہی تھین۔ اور ہر شخص متبسم اور مسرور دکھائی دیتا تھا۔ شانتی دولہن بنی ہوئی بیٹھی تھی۔ مگر اس کا سارا دل گذشتہ ملاقات اور پریم مین لگا ہوا تھا۔ اور گویا وہ آنیوالی گھڑیون سے بالکل انجان تھی۔

پریم جب شانتی کو اُسکے گھر پہنچاکر اپنے جھوپڑے مین آیا تو اُسے کچھ کچھ حرارت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ آتے ہی سو گیا۔ حرارت بتدریج بڑھتی رہی۔ اور جب صبح اس نے آنکھ کھولی تو بخار اچھا خاصا چڑھا تھا۔

مہاراج پریم کا انتظار کر رہے تھے لیکن جب بہت عرصہ تک بھی وہ نہ آیا تو انھون نے ایک آدمی کو اُسے بلانے کے لئے بھیجا۔ اُس آدمی نے جاکر دیکھا تو پریم ایک چارپائی پر چادر مین لپٹا پڑا تھا۔ اُس نے چادر کھولکر اُسکے بازوٗن کو پکڑا اور ہلایا۔ پریم کا سارا بدن آگ کی طرح جل رہا تھا اور وہ بالکل غافل پڑا تھا۔ اس آدمی نے زیادہ جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اُسے اُسی حالت مین چھوڑ کر وہ مہاراج کے پاس واپس گیا اور ان سے کیفیت کہدی۔ مہاراج شادی کے جھگڑون مین پڑے تھے انھون نے زیادہ توجہ بھی نہ کی۔

جب برات رخصت ہونیوالی تھی تو مہاراج نے پھر ایک بار پریم کے پاس آدمی بھیجا۔ لیکن پریم کی حالت بدستور تھی۔ بخار مین کوئی تنزل نہ تھا۔ اور اُسے بالکل ہوش نہ تھا۔ دن بھر وہ اسی بخار مین بیدم پڑا رہا۔ رات بھی ہو گئی مگر وہ نہ چونکا۔ اس وقت کوئی اس کے حلق مین پانی ٹپکانے والا بھی نہ تھا۔ ساری رات شدتِ بخار سے وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔

(۹)

شانتی کی شادی ہو گئی اور وہ اب اپنی سسرال چلی گئی۔ شنکر لال رام نگر مین ملازم تھا جب اُس کی رخصت ختم ہو گئی۔ تو وہ شانتی کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔

پریم کے لئے یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس نے پریم کی زندگی مین ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے لوگون سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ اور نوکری سے واپس آنیکے بعد تمام وقت اپنے جھوپڑے مین پڑے پڑے گذارنے لگا۔ وہ کسی کھیل اور تماشہ سے دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ اور اب ہفتون گذر جاتے تھے مگر وہ مہاراج کے یہان بھی نہ جاتا تھا۔ اس اثنا رمین شانتی کا حسب ذیل خط آیا۔

"میرے پریم۔ مین تمھین دیکھنے کو بہت تڑپتی ہون۔ میرے شوہر نے تمھین بُلانیکی اجازت دیدی ہے۔ تم آکر مجھے دیکھ سکتے ہو۔"

پریم نے خط پڑھا تو اس کی بےچینی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُسکا سر چکرانے لگا اس نے اپنے دل کو اپنے دونون پنجون سے مسل ڈالا۔ اور آہ بھر کر رہگیا۔ اس خط سے محبت کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اُٹھین اور وہ آنسو بہانے لگا۔

اس خط کے بعد اکثر اسی قسم کے خطوط آتے رہے۔ اور اُن کو پڑھکر پریم کی حالت دیوانون کی سی ہوجایا کرتی تھی۔ مگر معلوم نہین کیا خیال کر کے وہ جواب نہ دیتا تھا۔ لیکن جب شانتی کے خطوط کی بھرمار ہونے لگی تو اس نے بہت جبر کر کے جواب لکھا۔

"..........ش"

"تمھارے سب خطوط مل چکے ہین۔ مین انکا کیا جواب دون۔ تمھین شاید ناگوار ہوگا۔ مگر بہتر یہی ہے کہ تم مجھے بھلا دو۔ اور جو وقت میری یاد مین گذارتی ہو وہ اپنے شوہر کی راحت و آرام کے خیال اور فکر مین صرف کردو۔ مین جانتا ہون کہ اس تحریر سے تمھین صدمہ ضرور ہوگا۔ مگر مین بالکل مجبور ہون۔ مین اپنی موجودگی سے تمھارے موجودہ سکون کو پراگندہ کرنا نہین چاہتا۔ اور اس لئے مناسب یہی ہے کہ ایک ایسے انسان کو، جسکا اب تم پر کوئی حق نہین ہے اور جس سے نہ اب تمھین کوئی اُمید رکھنی چاہئے، بھول جاؤ۔ شاید اب تمھین اور کوئی خط بھیجنے کی ضرورت محسوس نہو گی۔"

"پریم"

(۱۰)

چار برس گذر گئے۔ یکایک جگت پور مین طاعون پھیلا اور مہاراج اور مہاراجن دونون اس دنیا سے چل بسے اب ساری جائداد کی مالک شانتی اکیلی تھی۔ جب مہاراج اور مہاراجن بیمار تھے تو شانتی جگت پور آئی تھی اس کے علاوہ بھی وہ کئی بار مان باپ سے ملنے آچکی تھی اور یہان آنیکے بعد اُس نے پریم کو بلایا بھی تھا۔ مگر وہ پھر کبھی نہ آیا۔

جائداد بہت مختصر سی تھی۔ لیکن پھر بھی شانتی کے لئے بہت کافی تھی۔ اسے پالینے کے بعد شانتی نے پریم کو ایک بار پھر لکھا۔

"پریم میرے۔ تم جانتے ہو کہ میرے مان باپ اب زندہ نہین اور جو کچھ تھوڑا بہت سرمایہ وہ چھوڑ گئے ہین اس کی اب تک اکیلی مین ہی ہون۔ مین تمھین اپنی زمین وغیرہ کا مختار بنانا چاہتی ہون اور کچھ جائداد تمھارے نام لکھنا چاہتی ہون۔ بہتر ہوگا کہ تم مجھسے آکر مل لو۔ اور میرے اس ناچیز ہدیہ کو قبول کرو۔"

"تمھاری شانتی"

پریم نے جواب دیا "..........ش۔ مجھے نہ جائداد کی خواہش ہے نہ مال و دولت کی۔ پرماتما سب تمھین مبارک کرے۔ مین اب اس قابل بھی نہین ہون کہ جائداد کا کام سنبھال سکون۔ میری صحت اچھی نہین رہتی نہ ہوش و حواس بجا رہتے ہین۔ اُمید ہے کہ معذور سمجھکر تم مجھے معاف کردو گی۔"

"پریم"

دن و رات، ہفتے اور مہینے اسی طرح گذرتے رہے۔ دنیا گردش کرتی رہی، موسم آتے جاتے رہے لیکن پریم کی حالت مین کوئی تغیر رونما نہوا۔ وہ وہی پریم تھا۔ اُسکی آہین وہی تھین اس کی خاموشی وہی تھی اور اس کی وحشت مین بھی کوئی تبدیلی

نہوئی تھی۔ صرف اسکی صحت ضرور انحطاط کی طرف مائل تھی اور وہ روز بروز نحیف و کمزور ہوتا جارہا تھا۔

شانتی سے جدا ہوکر اب پانچواں برس بھی ختم ہونے والا تھا۔ ایک دن شام کو جب پریم اپنے جھونپڑے کے باہر بیٹھا ہوا ندی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک آدمی اُسکے پاس آیا اور اُس سے پریم کا پتہ پوچھنے لگا۔ پریم کے جواب پر اس نے ایک خط نکالکر اُسے دیا۔ پریم لے کر پڑھنے لگا۔

"پریم - یہ میرا آخری پیغام ہے، مین بسترِ مرگ پر پڑی ہوئی ہون - میرے سوامی یہان نہین ہین وہ یہان سے بہت دور ہین اور اسوقت ان کا آنا ناممکن ہے - اس وقت اگر مین مرجاؤن تو کوئی ایسا نہین جو میرے ننھے بچے موہن لال کی دیکھ بھال کرسکے - اور مین اپنے سسرال کے لوگون کو اس کے لئے مناسب نہین سمجھتی - مین اُسے تمھارے سپرد کردینا سب سے بہتر سمجھتی ہون - پیارے پریم میری اس آخری آرزو اور التجا کو نہ ٹھکرانا ورنہ مرنیکے بعد بھی چین نصیب نہوگا اب مین تمھارے لئے سراپا انتظار بنی رہونگی - میری روح جسم سے گھبرا گئی ہے اور وہ صرف تمھاری ملاقات کے لئے پھڑپھڑا رہی ہے -

غم نصیب شانتی"

یہ تحریر پڑھکر پریم آپے مین نہ رہا - اس کی بیقراریان آنسو کی شکل مین سیلاب کی طرح بہنے لگین - وہ یہ پڑھکر بہت رویا، پھر اپنے جھونپڑے مین آیا - ایک مختصر گٹھری لی اور اس آدمی کے ہمراہ روانہ ہوگیا -

(۱۱)

پریم کی موجودگی مین شانتی نے دنیا کو خیرباد کہا - پریم کے رنجور دل پر اس حادثۂ جانگاہ سے جو گہرا زخم لگا اُس کا اندازہ ناممکن تھا - وہ گرم ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا - مگر موہن کی موجودگی سے اس کے درد مین کسی قدر کمی ہوگئی - وہ موہن لال کو اپنے گھر لے آیا - اور اچھی طرح اس کی پرورش کرنے لگا -

اکثر اوقات موہن کو دیکھکر اس کے جذباتِ محبت مین ایک غیر معمولی تلاطم برپا ہوجاتا وہ موہن کو قہر و غضب کی نگاہون سے دیکھنے لگتا - وہ اپنی دونون مٹھیان بند کرکے برہم ہوکر موہن کی طرف خونی نگاہون سے دیکھتا - وہ اُسے گھونسا مارنے کے لئے آگے بڑھتا - اُسے گھورنے لگتا اور چاہتا کہ ایک ہی حملہ مین اس کی رُوح کو قیدِ حیات سے رہا کردے - مگر وہ اُسکے پاس پہونچتے ہی یک لخت ساکت ہوجاتا - وہ اُسے دیوانون کی طرح دیکھنے لگتا - اور کانپنے لگتا - پھر اپنی مٹھیان کھول دیتا - ہاتھ دونون نیچے چھوڑ دیتا - پھر بیساختہ کھل کھلا کر ہنس پڑتا - جوش مین آکر موہن کو اپنی گود مین اُٹھا لیتا - اُسے پیار کرنے لگتا - پیار کرتے کرتے اُسے شانتی کی یاد دامنگیر ہوجاتی - اور اس کی محبت نواز آنکھون مین آنسو بھر آتے -

موہن کی عمر صرف چار برس کی تھی - وہ پریم کی ان مجنونانہ حرکات کو نہ سمجھ سکتا تھا وہ پریم کو برہم دیکھکر ڈر جاتا تھا - مگر جب اُسے روتا دیکھتا تو اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کے منہ اور چہرہ پر پھیرنے لگتا - اس کے بڑے اور لمبے لمبے بالون کو اپنی انگلیون سے سُلجھانے لگتا - اس سے لپٹتا اور کھیلتا - موہن کے ان معصوم اور محبت آگین انداز و اطوار سے پریم چپ ہوجاتا

اور اسکا غم کسی قدر گھٹ جاتا۔

پریم کو موہن کی راحت کا خیال بہت تھا۔ وہ اس کی خاطر اپنے آلام و مصائب، اپنی زندگی اپنی راحت، اور زندگی کی لذتون اور مسترتون کو بالکل بھول گیا تھا۔ وہ جو کرتا صرف موہن کے آرام کے لئے ہوتا تھا۔ رات مین اکثر جنگلی جانور، سیار، اور بھیڑیے وغیرہ مکان کے گرد بولا کرتے تھے۔ اور جب کبھی رات مین موہن کی آنکھ کُھل جاتی تو وہ سنکر ڈر جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے پریم سے کہا۔ "چچا بھیڑیے کی آواز سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے" یہ سنکر اب پریم کو بھیڑیے کو مارنے کی فکر ہو گئی جو اب روزانہ آکر گھر کے اطراف پھرا کرتا اور چلاتا رہتا۔ اس نے دوسرے ہی دن گھر کی ایک دیوار سے ملا ہوا ایک بڑا پنجرہ تیار کیا۔ رات مین جب موہن سو گیا تو وہ اُسے گود مین اُٹھا کر دریا کے کنارے لے گیا۔ اور اُسے درختون مین ایک محفوظ مقام پر لٹا دیا اور واپس آکر گھر کا دروازہ کھولکر بھیڑیے کا انتظار کرنے لگا۔ آخر بھیڑیا آیا اور پریم نے اُسے پنجرے کے اندر بند کر لیا۔

موہن سوتے سوتے چونک پڑا وہ اُٹھ بیٹھا اور نیند کی حالت مین بلا خوف و خطر گھر کی طرف بھاگا اس نے گھر کا دروازہ کھولدیا۔ بھیڑیے کے پنجرے کا دروازہ اس دروازہ کی وجہ سے بند تھا۔ پریم ابھی یہان سے اٹھا بھی نہ تھا کہ دروازہ کھلا۔ بھیڑیے کے دروازہ کا کھٹکا بھی ساتھ ہی کُھل گیا۔ دروازہ ایک طرف گر پڑا اور پریم بھیڑیے کے قریب جا پہنچا موہن کو اس بات کی خبر نہ تھی۔ وہ جلدی سے اوڑھ کر لیٹ رہا۔

پریم جب بھیڑیے کے پنجرہ سے باہر نکلا تو اس کی بُری حالت تھی۔ اسکا تمام جسم خون مین لت پت تھا۔ اس کے تمام کپڑے پھٹ کر چندی چندی ہو گئے تھے اور اس کے چہرے اور جسم پر بھیڑیے کے پنجون کے خونی نشانات بن گئے تھے۔ اُسنے بھیڑیے کو مار ڈالا تھا۔

(۱۲)

تین مہینے گذر گئے۔ ایک دن پریم ندی کے کنارے بیٹھا ہوا موہن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اور ریت کے گھر بناتا پھر رہا تھا۔ جن مین موہن دیکھ دیکھکر خوش ہو رہا تھا۔ ایک آدمی سامنے سے آتا ہوا نظر آیا اور آکر پریم کے نزدیک ٹھہر گیا۔ موہن نے اُسے دیکھا اور دوڑ کر اس کی گود سے لپٹ گیا۔ پریم حیرت سے تکنے لگا۔

یہ شنکر لال، موہن کا باپ تھا۔ جو اپنے سیٹھ کے ساتھ تجارت کی غرض سے رنگون چلا گیا تھا اور اب تین مہینے کے بعد واپس آیا تھا۔ اُسے بیوی کے مرنیکی خبر معلوم ہو چکی تھی۔ اس نے پریم سے کہا "پریم تم مجھے شاید نہ پہچانتے ہو گے مین شنکر ہون" پریم نے گھبرا کر پوچھا۔ "اور ابتک کہان تھے؟" شنکر نے جوابدیا "رنگون مین اپنے سیٹھ کے ساتھ تھا اب اپنے بیٹے کو لینے آیا ہون" پریم یہ سنکر غم اور غصہ سے بیتابانہ چلا اُٹھا۔ "موہن کو۔؟ پرماتما میری زندگی کا آخری سہارا۔ میری محبت کی آخری تصویر!" یہ دردناک الفاظ سنکر شنکر بہت متاثر ہو گیا۔ اس نے دبی زبان سے کہا

"ہان پریم مین موہن کو اپنے گھر لیجانا چاہتا ہون اور جی چاہے تو تم بھی چلو۔" پریم بولا "نہین ایسا نہین ہو سکتا۔ مین موہن کو نہ دونگا۔ لاؤ میرا موہن مجھے دیدو۔" اُس نے آرزومند انداز سے موہن کی طرف اپنے دونون ہاتھ بڑھا دیئے۔ شنکر نے کہا۔ "پریم کیسی باتین کر رہے ہو۔ موہن میرا بیٹا ہے اور اس پر تمھارا کوئی حق نہین ہے۔" پریم نے دیوانون کی طرح کہا۔ "نہین کوئی حق نہین۔ لیجاؤ۔ مگر شنکر میری زندگی موہن کے دم سے ہے۔ تم پہلے مجھے مار ڈالو۔ پھر موہن کو لیجاؤ۔" شنکر نے سمجھاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ کیا بک رہے ہو پریم۔ موہن تمھارا ہی لڑکا ہے۔ تم جب چاہنا اُسے آکر دیکھ لینا۔" پریم نے دوڑ کر موہن کو شنکر کی گود سے لے لیا۔ اُسے سینے سے لگایا۔ اُسے پیار کیا اور بہت دیر تک اُسے لئے ہوئے اس کے منہ پر منہ رکھے ہوئے روتا رہا۔ پھر شنکر بولا۔ "پریم اب مجھے جانیکی اجازت دو۔" پریم یہ سنکر وہان سے بڑھا اور آہستہ آہستہ اپنے جھونپڑے کی طرف قدم اُٹھانے لگا شنکر بھی پیچھے پیچھے چپ چاپ چلتا رہا۔ وہ سب جھونپڑے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ پریم نے پوچھا۔ "شنکر تم موہن کو ابھی لیجاؤ گے؟" موہن نے جواب دیا۔ "یہان ٹھہر کر کیا کرونگا؟" اور یہ کہتے ہوئے اس نے پریم کی گود سے موہن کو لے لیا۔ پریم نے آہستہ آہستہ موہن کو اپنی آغوش سے جدا کیا۔ اور اُس کی طرف ہاتھ پھیلائے کھڑا گرسنہ نگاہون سے دیکھنے لگا۔ شنکر نے کہا "مین اب جاتا ہون پریم" اور وہ موہن کو لے کر گاؤن کی طرف جانے لگا۔ پریم اُسی عالمِ محویت مین ہاتھ آگے پھیلائے کچھ دُور تک اُسکے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ پھر اس کے پاؤن مین طاقت نہ رہگئی۔ وہ گر پڑا اور کہنے لگا "موہن میری محبت کی آخری تصویر!"

(۱۳)

موہن کے چھِن جانے سے پریم کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔ اس جدائی نے اُسکے سینے کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔ موہن کے ساتھ اس کی ساری جان چلی گئی۔ اب کہان کی نوکری اور کیسی ملاقات۔ سب کچھ چھوٹ گیا۔ وہ تارک الدنیا ہو گیا۔ اُسے مجبوراً دنیا کی جھگڑون سے الگ ہو جانا پڑا۔ اب اس کی صحت بھی برقرار نہ رہ سکی اور وہ دوسرے ہی دن سے بیمار ہو گیا۔ اب اس کی زبان سے "شانتی"! "شانتی"! کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا۔ ہوش اور بیہوشی یا بیداری اور خواب کی حالت مین بھی "شانتی" کی جگر خراش اور حسرت آگین صدائین جھونپڑے کے اندر گونجتی رہتی تھین۔

کبھی کبھی ایک آدمی اُس کے حلق مین پانی ٹپکا دیتا تھا اور بس۔

رات بہت تاریک اور خوفناک تھی۔ آندھی کے طوفان اُٹھ رہے تھے اور جانورون کی چیخ پکار سے دل لرز جاتا تھا۔ رات کی ہیبتناک تاریکی موت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ "شانتی" کی آخری صدا جھونپڑے مین گونجی۔ در و دیوار پر مردنی چھا گئی اور فضا مین ایک غیر معمولی سناٹا پیدا ہو گیا۔ پھر اس کے بعد کبھی "شانتی" کا

نام نہ سنائی دیا۔

(اس افسانہ مین نام اور مقامات فرضی ہین)۔

محشر عابدی

دنیائے طب مین ہل چل

آجکل طب یونانی کی بڑی شد و مد سے مخالفت ہو رہی ہے جو لوگ اسکے کرشمہ سے ناواقف ہین ذیل کے مضمون کا مطالعہ کرین جو رسالہ الحکیم سے پبلک کے فائدہ اور اطلاع کیلئے اقتباس کیا گیا ہے۔ "رنگون کے ایک صاحب ثروت سوداگر اسباب معلومہ کی وجہ سے ...... موذی کا شکار ہو کر بالکل ...... ہو گئے تھے۔ مدت تک مشہور و معروف اطبا کا علاج کرایا مگر حسب منشا فائدہ نہ ہوا۔ قاعدہ ہے کہ مایوس العلاج مریض ذلیل سے ذلیل طریقہ علاج کی طرف مائل ہو جاتا ہے انہون نے بھی عطائیون اور اناڑیون سب سے ہی رجوع کیا اور آخر مین ناکامیاب رہنے پر قصد کر لیا کہ ہندوستان کے تمام مشہور مقابر پر جا کر دعائین مانگین اور دوران سفر مین جو فقیر یا طبیب ملے لگے ہاتھ اس سے رجوع کرین وہ اپنے اسی دورہ پر تھے کہ اتفاقاً حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ مین مجھ سے شناسائی ہوئی اور یہ معلوم ہونے پر کہ مین طبیب ہون اپنا حال مجھے سنا دیا اور ایک ٹھنڈا سانس بھر کر چپ ہو رہے مجھ پر انکے طرز بیان کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ فوراً علاج کرنیکا وعدہ کر لیا چنانچہ مین نے انکا علاج نہایت محنت اور جانفشانی سے شروع کیا لیکن کچھ فائدہ مرتب نہوا۔ قریب تھا کہ وہ بددل ہو کر واپس چلے جائین کہ حسن اتفاق سے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ گوجر گانوہ مین کوئی نذیر احمد صاحب ہین جنکے پاس اس کا **نادر نسخہ** موجود ہے لیکن وہ طبیب نہین ہین صاحب غرض بلکہ گھر کے رئیس اور کھاتے پیتے ہین نسخہ کسیکو نہین بتلاتے البتہ اگر کوئی زبردست سفارش لیکر پہنچ جائے تو دوا تیار کر کے دیدیتے ہین۔ اسقدر تعریف سنکر مین ایک تعارفی خط لیکر سیدھا گوجر گانوہ پہنچا وہ بہت خلاق سے پیش آئے اور دوا مجھے دیدی مین نے سیٹھ صاحب پر اسکا استعمال شروع کر دیا **سیٹھ صاحب کی قوت حیرت انگیز** طور پر ترقی کر گئی اور اسقدر **طاقت** پیدا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ مین نے متعدد مریضون پر مختلف حالات مین آزمانے پر بھی ہمیشہ تیر بہدف پایا۔ یقیناً میرے علم مین ایسا پراثر نسخہ کسی دوسرے شخص کے پاس نہین ہے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یہ نسخہ **بوعلی سینا** کی خاص دماغی کوششون کا نتیجہ ہے جو کسی بادشاہ کیلئے تجویز کیا گیا تھا۔ یہ ایک **معدنی لوح** پر کندہ ہے وہ اس نسخہ سے کوئی فائدہ نہین اٹھاتے اس لئے میری یہ استدعا بیجا نہ ہوگی کہ ایسے صاحب کمال کے اس نسخہ کو **الحکیم** مین شائع کرا کے تمام اطبائے ہند کو شکریہ کا موقعہ دین

(خادم الاطبا مسعود الرحمٰن)

ایڈیٹر صاحب الحکیم کا نوٹ یہ مکتوب کئی دن ہوئے ہمارے پاس پہنچا تھا لیکن اشاعت سے قبل ہم نے ان واقعات کی مزید تحقیق کیلئے اپنے کرمفرما خان بہادر ملک سردار علی صاحب کو تکلیف دی جو حسن اتفاق سے آجکل گوجر گانوہ مین قیام پذیر ہین۔ چنانچہ صاحب موصوف کا جواب جو موصول ہوا درج ذیل ہے:۔

مکرمی جناب حکیم صاحب۔ السلام علیکم۔ مین کل نذیر احمد قریشی سے ملا تھا وہ حکیم نہین ہین مگر مولوی برکت علی صاحب وکیل لاہور کے فرزند ہین انکے پاس **واقعی قوت باہ کا ایک عجیب نسخہ ہے**۔ تابعدار (خان بہادر ملک) سردار علی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مارچ ۲۸ء

(نوٹ) اس دوا کو اسقدر قلیل عرصہ مین اتنی مقبولیت ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہے کہ اس کیلئے دواخانہ قائم کرنا پڑا۔ حکیمون اور ڈاکٹرون کی یہ متفقہ رائے ہے کہ یہ دوا **ضعف باہ** کے لئے **اکسیر اعظم** ہے قیمت اکسیر سینا پانچ روپے۔ طلاء سینا پانچ روپے محصول ڈاک وغیرہ ۸ بذمہ خریدار۔

دواخانہ اکسیر سینا۔ گوجر گانوہ (پنجاب)

تصوفِ اسلام پر ایک مورخانہ نظر

"صوفیائے اسلام" اور ڈاکٹر نکلسن کا تاریخی خطبۂ تصوف

ڈاکٹر نکلسن نے دیوان شمس تبریز کا فاضلانہ مقدمہ ۱۸۹۸ء مین لکھا تھا، اسوقت وہ ٹرینٹی کالج مین رفیق (فیلو) کی حیثیت سے علمی زندگی گذار رہے تھے، "مسٹکس آف اسلام" انھون نے اسوقت لکھی جب کیمبرج مین فارسی زبان کے خطیب تھے، اس لئے تصوف کی تاریخی معلومات کے اعتبار سے یہ چھوٹی سی کتاب دیوان شمس تبریز کے معرکۃ الآرا مقدمہ سے بھی بڑھی ہوئی ہے، تصوف کی تاریخ بیان کرتے ہوئے انھون نے مقدمۂ (دیوان) مین ایک مقام پر جس عجز کا اظہار کیا ہے، "مسٹکس آف اسلام" مین انھون نے اسکی قابل فخر تلافی کردی ہے، انھون نے "صوفیائے اسلام" کو چھ ابواب پر تقسیم کیا ہے، اور بالترتیب طریقت، تجلی وحال، معرفت، عشق آلہی، اولیاء اللہ وکرامات، اور "مقام وصل" پر محققانہ بحثین کی ہین اور شروع مین تاریخ تصوف کے متعلق ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے، اور اس مین ثابت کیا ہے، کہ اسلامی تصوف پر مسیحیت، فلسفہ اشراقی، مذہب بدھ اور (Neoplatonism) کا اثر پڑا ہے، سب سے پہلے مین ذیل مین ڈاکٹر صاحب کے مباحث کی تلخیص پیش کرونگا۔

مسیحیت اور تصوف اسلامیہ

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہین کہ مسلک تصوف کا زاہدانہ اور امن پسندانہ رجحان مسیحی اصول کے بالکل موافق ہے، انجیل کے بہت سے اقتباسات اور حضرت مسیح کے مقالات صوفیائے کرام کے سوانح زندگی مین پائے جاتے ہین۔ اور یہ بھی مسلم ہے، کہ پشمینہ (صوف) کا لباس جس سے اصطلاح "صوفی" مشتق ہے، مسیحیت کی پیداوار ہے عہد خموشی، ذکر وشغل، اور دوسرے صوفیانہ اوراد وظایف کا عہد بھی اسی کو قرار دیسکتے ہین۔

ایک شامی صوفی احمد ابن الحواری نے ایک مسیحی راہب سے سوال کیا، تمھارے کتب سماوی مین کونسا سب سے بڑا حکم ہے، راہب نے جواب دیا کہ ہملوگ اس سے بڑا کوئی حکم نہین پاتے کہ انتہائے وسعت اور قوت کے ساتھ اپنے خالق کی محبت رکھی جائے۔

ڈاکٹر نکلسن نے اس قسم کی اور بھی مختصر روایات نقل کی ہین، اور ان سے استدلال کیا ہے، کہ عشق اللہ کے متعلق صوفیہ کے تاثرات اسی مبدء سے لئے گئے ہین۔

صوفیانہ افکار اور فلسفۂ اشراقی

مسلمانون کے فلسفہ مین ارسطو کی ایک مقتدر شخصیت ہے، لیکن عربون نے اشراقی شارحین کی وساطت سے ارسطو کے فلسفہ کی تعلیم پائی، اس صورت سے "الہیات ارسطو" جسکا ایک عربی نسخہ نوین صدی مین ظاہر ہوا، گویا فلسفہ اشراقی کا ایک رسالہ تھا،

روایات علمیہ کے علاوہ اور بھی بہت ذرائع تھے، جنکی وساطت سے تجلی، معرفت اور "حال" کے عقاید حاصل کئے گئے۔ اور یہ تو ایک حقیقت تاریخی ہے، کہ مغربی ایشیا اور مصر مین جو تصوف کا گہوارہ تھے، اہل یونان کے صوفیانہ افکار وعقاید موجود تھے، جن سے وہان کے باشندون نے استفادہ کیا، ان مین ذوالنون مصریؒ جو اسکے سلسلہ ارتقاء کے ایک زبردست رکن ہین، ایک فلسفی اور ماہر کیمیا یا دوسرے الفاظ مین علوم یونانیہ کے طالب العلم گذرے ہین، اور جب یہ مطالعہ کیا جاتا ہے، کہ ذوالنون مصری کے افکار وعقاید دیانیسیوس (Dionysius) کی تحریرون مین پائے جاتے ہین تو معاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے، کہ فلسفۂ اشراقی نے اسلام مین صوفیانہ فکر واحساس کی وہی اثر آفرینی کی جس سے مسیحیت اثر پذیر ہو چکی تھی۔

بدھ مذہب اور تصوف

گیارھوین صدی مین مسلمانون کے فتح ہند سے قبل گوتم بدھ کی تعلیم نے مشرقی ایران اور توران مین ایک گہرا اثر پیدا کر لیا تھا، بلخ مین پیروان بدھ کی مہتم بالشان خانقاہین پائی جاتی ہین، مشاہیر صوفیہ کا نشیمن ہونیکی حیثیت سے بلخ ایک مشہور شہر ہے، پروفیسر گولڈزیہر نے اس طرف پر معنی توجہ دلائی ہے، کہ تارک الدنیا صوفی ابراہیم ابن ادہمؒ بلخ کے شاہزادہ تھے، انھون نے سلطنت ترک کردی، اور ایک بادیہ پیما درویش بنگئے، یہی واقعہ گوتم بدھ کی زندگی کا بھی ایک اہم جزو ہے۔

صوفیہ نے دانۂ تسبیح کا استعمال بدھ مذہب کے انہین تارک الدنیا زہاد سے حاصل کیا[1]۔ اور بلا تاویل کئے ہوئے یہ صحیح طور پر کہا جاسکتا ہے، کہ طریق تصوف جہان تک یہ اخلاق تربیت نفسی، مراقبہ زاہدانہ اور ذہنی تجربہ سے متعلق ہے، بڑی حد تک بدھ مذہب سے ماخوذ ہے۔

صوفیہ کا عقیدہ "فنا" یعنی انفرادیت کو مٹا کر کلیت مین ملجانا، میرے خیال مین یقیناً ہندوستان کی پیداوار ہے، اسکے سب سے پہلے واضع کرنے والے حضرات بایزید بسطامیؒ تھے، جنھون نے اسے اپنے پیر ابو علی سندھی سے سیکھا ہوگا، بدھ مذہب کا "نروان" تصوف کے عقیدہ فنا سے ملتا ہوا ہے، فرق یہ ہے، کہ نروان مین صرف ایک منفی پہلو پایا جاتا ہے، لیکن یہان فنا کے بعد بقا ہے، بدھ مذہب کا نروان اس خیال پر مبنی ہے کہ انسان کو اپنے خالق کے لیے مٹ جانا چاہیئے لیکن صوفیہ کے عقیدہ مین حصول فنا کے بعد بقائے دوام حاصل ہوتا ہے، لہذا فنا کے متعلق حضرت بایزید بسطامیؒ کے مقالات سے پتہ چلتا ہے، کہ صوفیہ کا طریقہ، ویدانت (علم الٰہی) کے عقیدہ وحدۃ فی الکثرت سے اثر پذیر ہوا ہے، بہت سے افکار جن سے مسلمانون کی فکر واحساس پر اثر پڑا ہے ہندوستانی کہلانے کے بجائے، بدھ مذہب کی طرف منسوب کردیئے گئے ہین، پھر بھی "فنا"، کا عقیدہ جو ایک اخلاقی پہلو رکھتا ہے، اور جسکا مقصد ہے، شہوات وخواہشات کا مٹانا،

[1] یہی وجہ ہے کہ اہلحدیث (غیر مقلد) تسبیح کا استعمال نہین کرتے، اللہ بخشے والد مرحوم کو مینے بچپن مین اُن سے سوال کیا کہ آپ انگلیون پر کیون پڑھتے ہین ؟ انھون نے مختصراً کہدیا، نبی صلعم نے اسی طرح پڑھا ہے نکلسن کی تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ بدعت کہان سے آئی ؟

نروان کی تعریف سے ملتا ہے، جو پروفیسر رائز ڈیوڈس کے عالمانہ مقالہ مین پائی جاتی ہے، لہذا کہا جا سکتا ہے، کہ تصوف کا عقیدہ فنا ایک حد تک بدھ مذہب اور فارسی ہندی مسلک وحدۃ فی الکثرت سے اثر پذیر ہوا ہے۔

اسکے بعد نکلسن ایک انصاف پسند محقق کی طرح لکھتا ہے، کہ ہماری تفصیلات کا یہ مطلب نہین ہے، کہ تصوف ایک مجموعہ ہے، خارجی عناصر کا، جسے اسنے دور ارتقا مین جذب کرنا شروع کیا، بلکہ اگر اسلام معجزانہ حیثیت سے دوسرے مسالک فلسفہ کے افکار اور مجامع صوفیہ کے عقاید سے الگ بھی رہتا، تاہم اسکے اندر تصوف کی کوئی نہ کوئی صورت رونما ہوتی کیونکہ مادہ موجود تھا۔

میکڈونلڈ اور تاریخ تصوف

میکڈونلڈ نے اس محققانہ انداز سے تصوف کی داخلی صورت پیش کی ہے، کہ اسکے تبحر علوم عربیہ پر بے اختیارانہ زبان سے داد نکلتی ہے، نکلسن موجودہ مستشرقین مین ایک خاص پایہ کا عالم ہے، جسکی تصنیفات کا سلسلہ یورپ کی علمی مجالس آجتک شایع کر رہی ہین، لیکن اسکے افکار کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک حد تک اسنے میکڈونلڈ کی خوشہ چینی کی ہے، اور بعض مقامات مین تو اسنے اسکے خیالات کا اقتباس دیکر اسکے تحقیقی ذوق کی داد بھی دی ہے، تاریخ تصوف کے متعلق میکڈونلڈ کے خیالات اسقدر وسیع نہین، بایںہمہ اسکی تصنیف مین اس موضوع پر بھی مختصر بحث پائی جاتی ہے۔

میکڈونلڈ کہتا ہے، کہ ابن خلدون کے مقدمہ تاریخ مین "صوفیہ" کے عنوان سے ایک مورخانہ بحث پائی جاتی ہے جس مین اسنے ثابت کیا ہے کہ "صوفی" لفظ صوف سے مشتق ہے، نکلسن لکھتا ہے، یورپ مین لفظ صوفی کی وجہ تسمیہ پر مباحث شروع ہوئے تو مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا، بعض علمانے اسے لفظ (Sophos) کا مترادف قرار دیا، جسکے معنی "تھیاسفسٹ" ہین، لیکن جرمن کے محقق نالڈک نے بتایا کہ یہ "صوف" سے مشتق ہے، نکلسن نے یہ نہین لکھا آیا نالڈک کی یہ ذاتی تحقیق تھی، یا اسنے علامہ ابن خلدون ہی کا نظریہ اپنی طرف منسوب کر دیا، میکڈونلڈ نے "صوفی" کی وجہ تسمیہ کے متعلق علامہ ابن خلدون کا خیال ظاہر کرتے ہوئے نالڈک کا بھی حوالہ دیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے۔ نالڈک علامہ ابن خلدون ہی کی یہ تحقیق مغربی دنیا مین پیش کی تھی اور اسکی یہ خدمت یورپ مین بہت مستحسن خیال کی گئی، نکلسن نے لفظ صوفی کے متعلق جو مباحث کئے ہین وہ غالبًا میکڈونلڈ ہی کی کتاب "اسلام مین مذہبی طریقہ اور زندگی" سے لئے ہین، اور اسنے ماخذ تصوف بیان کرتے ہوئے فلسفہ اشراقی کا جو تذکرہ کیا ہے، غالبًا میکڈونلڈ ہی کے خیال سے مستفاد ہے، میکڈونلڈ نے اسے مجمل لکھا، نکلسن نے اسکی تفصیل کی ہے، البتہ نکلسن نے فلسفہ اشراقی کی تخیلات اور فلاطینوس کے افکار سے تصوف اور مولانا روم کی شاعری کا جو موازنہ کیا ہے، وہ آجتک خود یورپ کی کسی دوسری کتاب مین نہین پایا جاتا، اور مشرق کو کیا غرض پڑی تھی کہ وہ فلاطینوس کی تخیلات کا مطالعہ کرے، نکلسن نے اپنے

ایک دوست کی غیر مطبوعہ تصنیف سے فلاطینوس کے افکار کا مطالعہ کیا، جسکا تذکرہ دیوان شمس تبریز کے دیباچہ مین پایا جاتا ہے،

میکڈونلڈ لکھتا ہے، ابتدا ہی سے اکابر صحابہ اور نبی صلعم کے خلفائے راشدین مین طریق تصوف کا ذوق عمل پایا جاتا ہے، اسی لئے صوفیہ کا سلسلہ بیعت عشرہ مبشرہ تک منتہی ہوتا ہے، تصوف کی یہ ابتدائی شکل مفصلۂ ذیل احساسات پر مبنی تھی، (۱) عبادات مین مصروفیت (۲) صرف خدا ہی کے لیے زندگی بسر کرنا، (۳) آرایش دینوی سے منہ موڑ لینا، (۴) جمہور انسان کے اغراض مثلاً شادکامی، ثروت، اور حوصلہ سے قطع نظر (۵) ہجوم انسان سے علٰحدہ ہوکر عزلت مین عبادت کرنا، یہ علامہ ابن خلدون کے نظریات ہین، جنھین میکڈونلڈ نے لکھا ہے، علامہ موصوف کے نزدیک مفصلہ بالا ذوق صوفیانہ تمام صحابہ اور قرن اولی کے مسلمانون مین پایا جاتا تھا، لیکن دوسری صدی مین دنیا کی طرف لوگ ایسے مائل ہوئے کہ اسی مین ملگئے ایک جماعت اس ابتدائی ذوق پر قایم رہی اور اسی جماعت کا امتیازی لقب "صوفی" مقرر ہوا،

اب یہ جماعت دوسرے لوگونکا حلقۂ ارادت اور مطمح پرستاری بن گئی، اولیاء اللہ کا تخیل قایم ہوا اور لوگون نے خیال کرنا شروع کیا، کہ یہ جماعت تجلی و معرفت کی حامل ہے، اور کرامات اس سے ظہور پذیر ہوتے ہین، لہذا انسانی قلوب مین انکی طرف سے جذبات احترام اور مرادطلبی پیدا ہوئے، اور اس جذبہ نے یہ صورت اختیار کرلی، کہ اسلام کو (کاشانۂ توحید سے اتار کر) شرک و دوئی کی سطح پر صف آرا کردیا، مین اسوقت اسکی دلچسپ تفصیل نہین کرسکتا، ارباب ذوق اسے ایک حد تک ڈاکٹر گولڈزہر کی کتاب الاعلام لاہل الاسلام (Mohammedanism Studies) مین مطالعہ کرسکتے ہین[۵]۔

ابتداً (صوفیہ کی) یہ جماعت منظم شکل مین نہ تھی، بلکہ اسکا ایک رکن ایک مرشد کی طرح اپنے مسترشدین کو دینیات کی تعلیم دیتا، عشق الٰہی کا راز بتاتا، اور انھین مراحل طریقت مین رشد و ہدایت کرتا، ارباب استرشاد کیلئے یہ لازم نہ تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے مرشد کے ساتھ منسلک رہین، کیونکہ اسوقت تک سلسلہ بیعت کا وجود نہ تھا اور نہ موجودہ خانوادۂ صوفیہ کی طرح کوئی خاص خاندانی رشتہ اتحاد پیدا کیا جاتا تھا اسوقت مرشد کے لیے بھی یہ ضرور نہ تھا کہ ایک راہب کی طرح خانقاہ مین گوشہ گیر رہے، بلکہ وہ کسی اعلی درسگاہ مین الٰہیات کا پروفیسر ہوتا، یا قانون کا خطیب، اسیطرح

---

[۵] اولیاء اللہ کے مقابر پر آج جو بدعات دیکھنے مین آتی ہین، وہ ایک نہایت ہی المناک افسانہ ہے طبقہ صوفیہ کے اکثر افراد اسلام کے روح رواں گذرے ہین، اور اس طبقہ سے اہل اسلام کی ارادت اور محبت لازمی ہے، لیکن اسکے یہ معنی نہین کہ قبور پر چراغان ہو، کمخواب اور زربفت کی چادرین چڑھائی جائین، میکڈونلڈ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے ۱۲-

صدیان گذر گئین، ایک مرشد لوگون کو تلقین کرتا اور جب اسکی زندگی کے ایام ختم ہو جاتے، تو مسترشدین کی جماعت منتشر ہو جاتی، اسکے بعد خانوادہ صوفیہ مین سلسلہ بیعت کا رواج شروع ہوا، ان مین سلسلہ قادریہ سب سے قدیم ہے، جسکے بانی خود عبد القادر جیلانی تھے یا آپکے قریبی متبعین، اس سلسلہ نے ایسی وسعت اختیار کی، کہ تمام عالم پر چھا گیا، سلسلہ قادریہ کے مزید سلسلے بغداد شمالی افریقہ، اور شمالی (Nigeria) مین پائے جاتے ہین، سب سے آخر سلسلہ سنوسیہ ہے جو بحر کاہل سے جزائر فلپائن تک پھیلا ہوا ہے،۔

تعریف تصوف

نکلسن نے "صوفیائے اسلام" مین تصوف کی مفصلہ ذیل تعریفین کی ہین،

تربیت نفسی کا نام تصوف ہے، تصوف یہ ہے کہ انسان نہ تو کسی پر قابض ہو نہ کسی کا مقبوض،

تصوف، قواعد وضوابط کا ایک نظام نہین، اگر یہ کوئی قاعدہ ہوتا، تو مجاہدانہ سعی سے یہ کسی کا اپنا ہو جاتا اگر یہ حکمت ہوتا، تو تعلیم کے ذریعہ حاصل ہو جاتا بلکہ اُسکے برعکس یہ ایک سیرت (Disposition) ہے، جیسا کہ حدیث مین وارد ہے **تخلقوا باخلاق اللہ** اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی اخلاقی فطرت کو نہ تو قواعد کی وساطت سے حاصل کر سکتے ہین نہ علم کے ذریعہ،۔

تصوف تعبیر ہے آزادی اور فیاضی کی، اور یہ مسلک ہے، ذاتی پابندیون سے علیحدہ ہو جانے کا تصوف کا وظیفہ ہے، عالم فانی کی بے کمالی کا مشاہدہ کرنا، بلکہ اس مستجمع کمال کے تصور مین، جو بے کمالی سے پاک ہے، ہر نا مکمل کی طرف سے اپنی آنکھین بند کر لینا، تصوف نام ہے، قویٰ پر تصرف رکھنے اور انفاس کا لحاظ رکھنے کا،۔

تصوف یہ ہے کہ جو کچھ تمھارے سر مین ہے اسے دور کر دو، جو تمھارے ہاتھ مین ہے، اسے دیدو اور جو حادثہ بھی تم پر آئے تم مایوس نہ ہو،۔

یہان تک تو تصوف کے خارجی معلومات کے متعلق تھا، میکڈونلڈ نے تصوف کی داخلی صورت پیش کرتے ہوئے جن عنوان کے ماتحت بحثین کی ہین، وہ اسکے "تمہیدی بیان" کے سلسلہ مین آیندہ ورق مین درج ہین اسلیے مین تصوف کی داخلی تشریح مین میکڈونلڈ ہی کے منتخب عنوان کے مطابق مفصلہ ذیل سطور مین کسی قدر تفصیلی بحث کرنا چاہتا ہون،

میکڈونلڈ کا تمہیدی بیان

مجھے اجازت دیجئے کہ مین مسیحی اور اسلامی دو نو نقطہ ہائے نظر سے بطور سند اپنے خطبات کے لیے ولیم جیمس کی عالمانہ تصنیف "اصناف تجربہ مذہبی" سے اقتباس نقل کر دون،

پروفیسر موصوف اپنے تیسرے خطبہ کی ابتدا مین جہان حقیقت "غیر مشہود" کے وسیع سوال پر پہونچا ہے، رقم طراز ہے،

"جہانتک عام اصطلاحات مین ممکن ہو سکتا ہے، اگر کسی سے حیات مذہب کی مرتفع آرائی کے متعلق سوال کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے، کہ حیات مذہب تعبیر ہے، اس عقیدہ کی، کہ (کائنات مین) ایک حقیقت غیر مشہود جاری اور ساری ہے، اور یہ کہ ہماری سب سے بڑی فلاح اسی مین ہے کہ ہم اس

(نظام غیر مشہود) سے وفق و اتحاد پیدا کرین، یہی عقیدہ اور توافق، نفس کے اندر مذہبی رفتار کا سنگ بنیاد ہے "

اسلام مین یہ مذہبی رفتار کیونکر ترقی پذیر ہوئی مین اسی کو پیش کرنا چاہتا ہون، اس بحث کو تین حصون مین تقسیم کر سکتے ہین، اول، غیر مشہود کی حقیقت کیا ہے، اور یہ کہ کس طرح ہم لوگ حواس جسمانیہ کی وساطت سے اس حقیقت تک نہین پہونچ سکتے؟ دوم یہ کہ یہ لحاظ ایمان اور کیفیات باطن، اس "غیر مشہود" سے انسان کا کیا تعلق ہے؟ اس مین عبادت گذارانہ رفتار سے لیکر صوفیا کے چشمہائے بینش کے سامنے حضور خداوندی (شہود) اور اسکے متعلقہ کی پر پیچ الہیاتی موشگافیان شامل ہین، اور آخری تقسیم یہ کہ اس بلا واسطہ معرفت الٰہی کے حصول کے لیے ایک طریقت کو تربیت (ریاضت و شغل) کے کون کون مراحل طے کرنا ہین، اور اس دور مین اسکی زندگی کا کیا نقشہ ہوتا ہے؟ فلسفہ کے مختلف مذاہب کے متعلق میری تعلیمی حالت بہت مختصر ہے، لیکن مین دیکھتا ہون، کہ ان تینون موضوع بحث مین میری تحقیقات کے لیے، مادرار طبعی، نفسیاتی اور اخلاقی (Ethical) پہلو موجود ہین، مین عربی زبان اور علوم اسلامیہ کا ایک محض طالب العلم ہون، میری خواہش ہے کہ مین اُنلوگون کے سامنے جو علمائے مابعد الطبیعہ، ماہرین نفسیات، اور دانایان فلسفہ اخلاق ہین، بعض ایسے مسائل پیش کردن، جو انلوگون کے علوم کے متعلق اس وسیع اور غیر معروف مخزن (اسلام) مین بھرے پڑے ہین، میری التماس ہے کہ ناظرین مجھے ایک ایسا سیاح تصور کرین، جو اپنی دور دراز بادیہ پیمائیون کے بعد وطن مین اجض ایسے تو ادر روزگار ساتھ لاتا ہے، جنھین حکمائے جغرافیہ و ماہرین نباتات و حیوانات مابعد بہ نظر امتحان دیکھتے ہین، اور انہین مرتب صورت مین پیش کرتے ہین۔

مین سمجھتا ہون بے لوگون نے غور کیا ہوگا، کہ ان افکار و عقاید مین نوع انسان کے لاکھون بہترین دماغ کی موت و حیات کا مدار ہے، وہ اسکی اہمیت سے کماحقہ واقف ہو سکتے ہین، یہ اس قوم کے افکار ہین جو تیرہ صدیون سے بزم ہستی مین رونق افروز ہوئی، اور تقریباً کرۂ ارضی کے چوتھائی حصہ پر آباد ہے، ہم لوگون کو طفلانہ ہنگامہ خیال کی بجائے غور کرنا چاہئے، کہ اس قوم نے جو ہر چند زبان مین ہم سے مختلف لیکن خیالات مین ہمنوا ہے، زمانہ اور ازل کے متعلق کیسے کیسے دقیقہ سنج اضافے کئے ہین۔

مسلمانون کے نظریہ خواب کا مبدء

میکڈونلڈ علامہ ابن خلدون کے مقدمہ تاریخ مترجمہ ڈی سلین جلد سوم کے حوالہ سے لکھتا ہے، کہ علامہ موصوف کے نزدیک مسلمانون مین خواب کی اہمیت اور اسکی تقدیس، کسی خارجی اثر کے ماتحت نہین، بلکہ یہ اسلام ہی کی پیداوار ہے، میکڈونلڈ نے ابن خلدون کے دعویٰ کی تائید کی ہے، لیکن وہ لکھتا ہے کہ مسلمانون کا فن تعبیر خواب ایک حد تک کہا جا سکتا ہے، کہ یونانی علمائے تعبیر (oneirocritic) کے افکار سے متاثر ہوا ہے، اس واقعہ سے اس نظریہ کی اور بھی تائید ہوتی ہے،

کہ ابن ندیم کی کتاب الفہرست مین علمائے اشراقیین کی بعض کتابونکے (عربی) تراجم کا تذکرہ پایا جاتا ہے، خواب کے متعلق اسلامی تصنیفات کے تفصیلی واقعات رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جریدہ جلد ۱۶ مین ایک فاضلانہ مضمون کے اندر پائے جاتے ہین، جو اِن بلینڈ کی تحقیق کا نیتجہ ہے۔

خواب کے متعلق قرآن وحدیث کا مسلک

عام انسانی نقطۂ نظر سے خواب کے متعلق بحث کرنا، ایک نہایت تفصیل طلب مسئلہ ہے، (Studies in dreams) کے نام سے انگریزی مین ایک کتاب ہے، جو جبین لائبریری مین میری نظر سے گذری ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹینکا مین بھی فلسفیانہ مباحث پائے جاتے ہین

قرآن مجید مین چند خوابون کا تذکرہ ہے، اور انکی تعبیرین بھی پائی جاتی ہین، سورۃ یوسف اسکے لیے خاص امتیاز رکھتی ہے، اس مین حضرت یوسفؑ، عزیز مصر، اور دو قیدیون کے خواب اور انکی تعبیرین نہایت ہی دلچسپ ہین، قرآن مجید کے ان بیان کردہ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور مین مصر و بابل کے اندر خواب کو کتنی اہمیت دیجاتی تھی، اور اسکے معبرین کیسی ممتاز حیثیت رکھتے تھے، سورۂ یوسف سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ اسوقت حکومت مین علم تعبیر کے ماہرین نوکر بھی تھے، یا کم ازکم دربار سے انکا تعلق تھا، چونکہ عام لوگ قرآن مجید کا ترجمہ بھی دیکھکر اسکے متعلق معلومات حاصل کرسکتے ہین، اسلیئے ان آیات کو مین یہان نقل نہین کرتا، اسی طرح سورۂ صفت مین حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا خواب نہایت تاثیر انگیز ہے، اور سورۃ انا فتحنا مین ایک خواب کا تذکرہ ہے، جو فتح مکہ (یا امن کے ساتھ داخلہ بیت الحرام وادائے حج) کے متعلق، جب صلح حدیبیہ واقع ہوئی تھی، خود آنحضرت صلعم نے دیکھا تھا، اس سورہ مین واقعہ کے فوری ظہور پذیر نہ ہونیکے باعث اصحابہ کے استفسارات اور انکی تشفی کے متعلق مجمل بیانات پائے جاتے ہین۔

میکڈونلڈ نے علامہ ابن خلدون، اور الغزالی کے جو اقتباسات دئے ہین وہ احادیث سے مالامال ہین مینے تو ہین کے اندر، اور بعض مقامات پر حاشیہ مین حدیث کے صحیح الفاظ کی تشریح بھی کردی ہے، احدیث مین اور بھی بہت سی روایتین ہین جن مین بی بی عائشہؓ کی روایت سے، جو ایک خواب کا تذکرہ پایا جاتا ہے، وہ بہت دلچسپ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا کہ مینے دو بار خواب مین دیکھا کہ ایک شخص تھین ایک ریشمی کپڑے مین اوٹھائے ہوئے ہے، اور کہہ رہا ہے، یا رسول اللہ یہ آپکی بیوی ہے، مینے کپڑا کھول کر جو دیکھا تو تم نظر آئین مینے کہا اِن یکن ھذا من عند اللہ یمضہٖ (اگر اللہ کی یہی مرضی ہے تو پوری ہوکر رہیگی)۔

الغرض اسلامی عقیدہ کے اعتبار سے خواب ایک اہم مسئلہ ہے، اور اسلام کے مایہ ناز علمانے، تاریخ، ماہرین فلسفہ و متکلمین کے ذاتی بیان کردہ خواب کی (مفصلہ ذیل) روایات سے پتہ چلے گا، کہ نفس انسانی کے اس عجیب وغریب کرشمہ کے اندر کیسی کیسی تاریخی حقیقتین پنہان ہین۔

ابن خلدون کے نظریات خواب

عالم خواب کی ماہیت طبعی یہ ہے کہ نفس مدرکہ اپنے جوہر روحانیہ کی وساطت سے

ایک لحظہ مین حادثات کی صورتون کے متعلق آگاہی حاصل کرتا ہے، نفس مین روحانیت کا جس قدر زیادہ حصہ ہوگا، اشکال حادثات کی جلوہ گری بھی اس مین حقیقی ہوگی، جیسا کہ تمام جواہر روحانیہ کی خصوصیت ہے، اور یہ مادی ملوثات اور قوت جسمانی کے سرچشمہ سے جدا ہو کر بالکل روحانی بن جاتا ہے، اور جیسا کہ ہم بیان کرینگے نفس مدرکہ پر خواب کے اندر ایک لحظہ مین وقتاً فوقتاً یہ کیفیت طاری ہوتی رہتی ہے، اسلئے یہ نفس مدرکہ حادثات مستقبل کے متعلق علم حاصل کرتا ہے، اور اس علم کے ساتھ اپنے ینابیع وقوف و ادراک کی طرف لوٹ آتا ہے، جب یہ حصول قوت مصورہ مین مجازیات اور مثال کے استعمال سے غیر محکم اور مبہم ہوتا ہے، تو ان مجازیات کے باعث تاویل کی ضرورت ہوتی ہے، بعض اوقات حصول محکم اور استوار ہوتا ہے، اور اس مین مجازی رنگ نہین پایا جاتا، اسوقت اسکی تاویل کی حاجت نہین ہوتی، نفس مین اس پرتو فہم و ادراک نقش طرازی کا سبب یہ ہے کہ نفس طبعاً جوہر روحانیہ سے تعلق رکھتا ہے، اسے اس امر کی کاوش رہتی ہے، کہ جسم و جسمانیات کے چشمہائے وقوف ہی مین رہکر وہ اس عالم بالا کی لذت آگینیون سے مستفیض ہوا کرے، یہانتک کہ نفس علم و معرفت کا مہبط ہو جائے، اور حقیقت کا آئینۂ کمال، اور پھر اسی صورت سے خود بھی سراپا جوہر روحانیہ ہو جاتا ہے، اسے علم و معرفت کے لیئے آلات جسمیہ کی ضرورت لاحق نہین ہوتی، اسلئے نفس کے یہ درجات، ملائکہ کے ماتحت ہین، جنھین اپنی ذات طبعی کو جسمانی اور دوسرے چشمہ ہائے علم و وقوف کی وساطت سے پر کرنیکی ضرورت نہین صرف نفس انسانی سے (جب تک اسکا تعلق جسمانیات سے وابستہ رہے) اس طریق علم و وقوف کا علاقہ رہا کرتا ہے، اسکی ایک مخصوص نوعیت ہوتی ہے، جو اولیاء اللہ سے مخصوص ہے، دوسری قسم عامیانہ پہلو رکھتی ہے، جسکا تعلق عوام الناس سے رہا کرتا ہے، اور یہ آخری قسم رویت (خواب) کی اصل بنیادی ہے، حصول علم معرفت کی وہ نوعیت جو انبیائے کرام کی ذات سے مخصوص ہوتی ہے، وہ یہ کہ مرسلین کو یہ قدرت ہوا کرتی ہے کہ وہ فطرت انسانیہ سے نوامیس ملکوتیہ کی خالص کیفیات مین مبتدل ہو جاتے ہین، اور یہ اختفائے روحانیہ کا نقطہ انتہا ہے، انبیائے کرام مین اس قدرت کا اظہار نزول وحی کے وقت ہوا کرتا ہے، الہام کی وہ حالت جب جسمانیات کے ذرایع علم و بصیرت کے میدان مین داخل ہوتی ہے، تو اسے تقریباً انہین مدارج سے گذرنا پڑتا ہے، جو (ذرایع جسمیہ کی وساطت سے) حصول وقوف کیلیے ناگزیر ہین، اس صورت مین حالت نوم سے یہ بہت مماثل ہوتا ہے، اسی مماثلت کے باعث خواب کے متعلق پیغمبر صلعم نے فرمایا کہ یہ نبوت کے چھیالیس حصون مین سے ایک حصہ ہے (یہ صحیح حدیث رؤیا المومن جزء من ستة و اربعین جزءاً من النبوة کا ترجمہ ہے، جو صحیح بخاری مین بروایت عبادہ بن صامت موجود ہے)۔

ابن خلدون کہتا ہے، کہ ہر چند فطرت انسانیہ سے گذر کر ناموس ملکوتیہ مین منتقل ہونیکی قدرت نوع انسان مین مشترک ہے، لیکن اسکے ساتھ بہت سے مواقع اور حجابات ہین، ان مین سب سے زیادہ قوی سبب حواس ظاہری ہین، لیکن اللہ جل شانہ نے فطرت انسانی مین یہ صفت بھی ودیعت کی ہے کہ نیند مین اس سے حجابات حواس اٹھ جاتے ہین اور اسوقت نفس عالم الحق سے اس شئے کا علم حاصل کرتا ہے، جسکے لیئے اسکی سعی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت نے اس ساعت کو

"مبشرات" (مژدہ رسان) تعبیر کی، آپنے فرمایا مبشرات کے سوا نبوت باقی نہین رہی، لوگون نے کہا یا رسول اللہ مبشرات کیا ہین آپنے فرمایا "سچے خواب" جو ایک صالح آدمی دیکھتا ہے، یا جو کچھ اسے دکھایا جاتا ہے، (یہ ایک حدیث کا ترجمہ ہے، جو مشکوۃ مین بھی موجود ہے، اور بخاری کی کتاب التعبیر مین بھی بروایت ابوہریرہؓ پائی جاتی ہے، لم یبق من النبوۃ الا المبشرات قالوا وما المبشرات قال الرؤیا الصالحۃ)۔

علامہ موصوف لکھتے ہین اب مین یہ بتانا چاہتا ہون، کہ اس حجاب کے برطرف ہونے کا کیا سبب ہے، نفس عقلیہ کے مدرکات اور وظایف عمل کی بنیاد روح جسمانیہ حیوانی پر قایم ہے، یہ ایک لطیف ابخرہ ہے، جسکا مقام عمق قلب کے دائین جانب واقع ہے، اسکی وضاحت جالینوس اور دوسرے علما کے مصنفات متعلقہ تشریحات مین پائی جاتی ہے) یہ ابخرہ خون کے ساتھ رگ اور شرائین مین منتشر ہو جاتا ہے، اسکی وساطت سے حس وحرکت، اور تمامی جسمانی اور ادو ظایف کا نظام عمل قایم ہے، اسکے لطیف اجزا دماغ مین صعود کرتے ہین، اور دماغ سے برودت (یا رطوبت) زایل ہو جاتی ہے، اور اعمال قوی جو معطل رہتے ہین، تیار ہو جاتے ہین، اسلئے نفس عقلیہ محض روح بخاریہ کی وساطت سے فہم ودرک حاصل کرتا ہے، نفس عقلیہ کے مدرکات کی دو قسمین ہین، ایک تو وہ درک جو حواس خمسہ ظاہری کی وساطت سے حاصل ہوتا ہے، اور دوسرا وہ جو حواس خمسہ باطنی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، اور تمام محسوسات ظاہرہ و باطنہ نفس عقلیہ کو جواہر روحانیہ کا ادراک نہین کرنے دیتے جو حیات سے بالاتر ہین، چونکہ حواس ظاہرہ کا تعلق جسمانیات سے ہوتا ہے، اسلئے انھین تکان اور محنت کے باعث بے خبری (غفلت یا نیند) ضروری ہے، اسوقت نفس، ہجوم مشاغل کے باعث بیہوش ہو جاتا ہے، اسلئے خدا نے اس مین جستجوئے استراحت کا ذوق پیدا کر دیا ہے، تاکہ اسکی قوت مصورہ مین تازگی ہوتی رہے، یہ اسوقت ہوتا ہے جب روح حیوانیہ سے حواس ظاہری کے تمام حجابات ہٹ جاتے ہین، اور وہ حواس باطنی کی طرف عود کرتی ہے، جب جسم پر بے خبری کا تسلط ہو جاتا ہے، رات کی سردی اس امر کی موید ہے، حرارت غریزیہ جسم کے تمام پر سکون مقامات مین روح حیوانیہ کے ساتھ ظاہر سے باطن کی طرف دوڑتی پھرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر لوگون کو رات ہی کے وقت نیند آتی ہے"۔

اسلئے روح جب حواس ظاہری سے حواس باطنی کی طرف رجوع کرتی ہے، اور نفس سے حجابات اور موانع کی گرانی کم ہو جاتی ہے، اور جب یہ ان صور و اشکال کی طرف لوٹتی ہے، جو قوت حافظہ مین جمع رہتے ہین اسوقت (قانون) حل وعقد کے ماتحت خیالی صورتین سامنے آجاتی ہین، جو مرقوجہ اور عامیانہ ہوتی ہین چونکہ یہ صورتین انھین منبع معلومات سے لیجاتی ہین، جو عام اور معہود ہین، اور اسکے بعد "حواس عامہ" جسے حواس ظاہری کی متحدہ صورت کہہ سکتے ہین اسے حواس خمسہ ظاہری کے مختلف طریقون کے مطابق سمجھتی ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ نفس ایک لحظہ کے لیئے اپنے جوہر روحانیہ کی طرف چلا جاتا ہے، (ہرچند اسوقت قوائے باطنی متصادم رہتی ہین) اور اپنے ادراک روحانیہ کے ذریعہ

بعض علم و وقوف حاصل کرتا ہے، ایسے چیزون (خیالات) کی بعض صورتین دستیاب ہوتی ہین، جو اسکے بعد اسکی ذات سے وابستہ ہوجاتی ہین، اسکے بعد قوت مصورہ ان صور (مدرکہ) کو لیتی ہے، اور انہین یا تو انکی اصلی شکل مین پیش کرتی ہے، یا مجازی رنگ مین، جیب مجازی۔ اثر ہوگا تو تاویل کی ضرورت ہوگی، بعض اوقات نفس کی جدت طرازیون (قانون حل و عقد کے ماتحت حافظہ جو صورتین پیش کرتا ہے) ”اضغاث احلام[51]“ (خوابہائے پریشان[52]) کی صورتین رونما ہوتی ہین، اور یہی وجہ ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا تین طرح کا خواب ہوتا ہے، لاہوتیہ، ملکوتیہ، اور شیطانیہ[53] اس تفصیل کا وہی مطلب ہے جسکا اوپر تذکرہ کیا ہے، جو خواب بین ہوگا وہ لاہوتی ہے، جسپر رنگ مجاز غالب ہو وہ ملکوتی ہے، اور ”خوابہائے پریشان“، (اضغاث احلام) شیطانیہ ہین۔

یہ انسانی نفس کی متاع خاص ہے، اور عام انسان مین مشترک ہے، کوئی انسان اس سے خالی نہین ہر انسان نے اپنی زندگی مین متعدد بار ایسا خواب ضرور دیکھا ہوگا، جو عالم بیداری مین بعینہٖ حادث ہوا ہو، اور اسسے نتیجہ نکالا ہوگا کہ نفس نیند کے اندر عالم غیب کے سرچشمہ سے علم و عرفان حاصل کرسکتا ہے، اور جس طرح یہ نیند مین ممکن ہے، اسی طرح دوسرے منازل ”حال“ مین بھی ممکن الوقوع ہے، کیونکہ ذات مدرک (علم حاصل کرنے والی) ایک ہے اور اسکی خصوصیات ہر ”حال“ کے لئے مشترک پہلو رکھتی ہین، خواب کا زیادہ حصہ انسانی قصد اور ارادہ سے بالاتر ہوتا ہے، یہ صرف اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ نفس کسی چیز کا متلاشی رہتا ہے، اسوقت انسان کو نیند آتی ہے، اور وہ خواب دیکھتا ہے، یہ وجہ نہین ہوا کرتی کہ نفس چاہتا ہے کہ خواب دیکھین، اور اسکے ارادہ سے خواب کا ظہور ہوتا ہے۔ ان ارباب فضل کی تصانیف مین جو مجاہدہ زاہدانہ اور ریاضت صوفیانہ کے متعلق ہین بعض اسماء پائے جاتے ہین، اگر سوتے وقت یہ اسماء پڑھ لئے جائین تو جس شئے کو خواب مین دیکھنا ہو، اُسے انسان دیکھ سکتا ہے، انہین ”حلومیہ“ کہتے ہین[54]۔ ایک مصنف ان مین سے ایک اسم کا تذکرہ کرتا ہے، اور اسے حلومیۂ ”طبیعت کاملہ“ سے تعبیر کرتا ہے، اسکا عمل یہ ہے کہ سوتے وقت، مذہبی اشغال سے فارغ ہونیکے بعد توجہ کامل کے ساتھ انسان یہ اسم پڑھ لے[55] طالب کو چاہئے کہ اپنی حاجت پیش نظر رکھے، کیونکہ نیند کے اندر جسکی طلب ہے، وہ ظاہر ہو جائیگا، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی نے

---

[51] قالوا اضغاث احلام وما نحن بتأويل الاحلام بعالمين (سورۂ یوسف)، ابن خلدون نے ”اضغاث احلام“ ہی لکھا ہوگا کیونکہ میکڈونلڈ نے اسکے بعد سورۂ یوسف کا حوالہ دیا ہے، اسنے (Bundle of Dreams) اسکا ترجمہ کیا ہے، جارج سیل نے اسے (Confused Dreams) لکھا ہے [52] الرؤیا من اللہ والحلم من الشیطانِ کی حدیث بخاری کی کتاب التعبیر مین بروایت ابی قتادہؓ پائی جاتی ہے، اس مین خواب ملکوتیہ کا تذکرہ نہین لیکن لاہوتیہ اور شیطانیہ کے اقسام موجود ہین [53] یہان میکڈونلڈ لکھتا ہے، یہ غالباً عبرانی لفظ ”حیلوم“، سے مشتق ہے، جسکے معنی ”خواب“، ہین، [54] اس مقام پر میکڈونلڈ نے قوسین کے اندر لکھا ہے کہ یہان چند ایسے حروف کا غیر مفہوم مجموعہ ہے، جنکا تلفظ مین نہین کرسکتا، غالباً یہ عبرانی یا شامی لغت کے الفاظ ہین۔

چند راتون کی تیاری کے بعد یہ عمل کیا، تب ایک صورت ظاہر ہوئی، اور اسنے کہا، مین تمھاری ''طبیعت کاملہ'' ہون اس آدمی نے سوال کیا، اور جو کچھ وہ چاہتا تھا اس ''صورت'' نے اسے بتایا، علامہ ابن خلدون کہتا ہے، مینے خود بھی یہ اسماء پڑھے ہین، اور نیند مین عجیب وغریب شکلین نمودار ہوئین، جن سے مجھے اپنے ان واقعات کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل ہوئے، جن کو مین جاننا چاہتا تھا، لیکن اسکا یہ مطلب نہین کہ جستجوے خواب سے یہ ظہور پذیر ہوتا ہے، بلکہ صرف یہ ہے کہ ان اسماء سے نفس مین حدوث رویت کے لئے استعداد پیدا ہو جاتی ہے، اسلئے نفس جسقدر مستعد ہوگا، اسی قدر اس شے سے جس کے لئے اسکی مستعدی ہوگی قریب تر ہو جاویگا۔

(باقی آیندہ)

عبد الماجد (آروی)

علم الکیمیا کا ایک حیرت انگیز معجزہ

کایا پلٹ ہیر آیل

کہنے کو صرف یہ تیل ہی لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے اکسیر کو بھی مات کرتا ہی یہ تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود نباتاتی و کیمیاوی اجزا سے جدید اصول پر طیار کیا گیا ہی جسکی تصدیق بڑے بڑے سائنس دانون نے کی ہی اسکے فواید کی تفصیل مختصر اشتہار مین ناممکن ہی مختصراً یون سمجھ لیجئے کہ گھر مین اسکی ایک شیشی رکھنا گویا بہت سے امراض کو دفع کر دینا ہے۔

(۱) اگر چند یا کے بال صاف ہو گئے ہین یا بالخورہ اور گنج ہو گیا ہی یا بال گرنا شروع ہو گئے ہین یا کمزور و باریک ہو گئے ہین یا سفید ہونے لگے ہین تو اس تیل کا استعمال بالون کی جڑون کو فاسد رطوبتون سے صاف کر کے بال کا گرنا موقوف کر دیگا، بال بڑھنے لگینگے اور جہان جہان سے بال گر گئے ہین وہان نئے بال سیاہ پیدا کریگا۔

(۲) جن کو نزلہ درد سر یا شقیقہ دوران سر ضعف دماغ، ضعف بصارت بے خوابی اور نسیان وغیرہ کی شکایت رہتی ہے ان کیلئے یہ تیل بڑی نعمت ہے، نزلہ کو فوراً روکدیتا ہے اور دماغ و بصارت کو قوی کر کے عجیب قسم کا سکون پیدا کر دیتا ہے اور عینک کے استعمال کو بھی غیر ضروری کر دیتا ہے۔

(۳) شدت تپ کی حالت مین اسکی مالش فوراً ہذیانی حالت کو دور کر کے پسینہ لے آتی ہے اور بخار کو کم کر دیتی ہے۔

(۴) دیہی ممالک امراض سے جیسے نتھنا لالا ہنسلی وغیرہ کا استعمال کنیدلالہ و تمام اثرات کو نجاہ دسترخوان یا ذہنون اور سوزشون مین یکقلم دور کر دیتا ہی۔

(۵) سر اور جسم کے پھوڑیان، پھنسیان، گرمی دانے، خارش اور ہر طرح کے جلدی امراض اسکی مالش سے کافور ہو جاتے ہین۔

(۶) اس کے استعمال سے بال نرم چمکدار، بڑے اور مضبوط ہوتے ہین اور تقویت دماغ کی وجہ سے چہرہ پر ایک خاص قسم کی تازگی اور نرمی پیدا ہو جاتی ہی۔

(۷) یہ تیل اپنی بھینی خوشبو کی وجہ سے بھی عجیب چیز ہے اور ہمارا دعوی ہی کہ اس کا استعمال کرنیوالا کبھی کسی اور تیل کو پسند نہین کر سکتا۔

(۸) اس تیل کا استعمال اگر حفظ ماتقدم کے لحاظ سے کیا جائے تو پھر کوئی وہ شکایت پیدا نہین ہو سکتی جن جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

اگر کسی کو ہمارے دعوی کے مطابق نہ ہو تو قیمت واپس کر دیجیگا وعدہ کیا جاتا ہے جوابی امور کے واسطے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہی۔ قیمت معہ محصول (ایک روپیہ)

مینجر کایا پلٹ ہیر آیل - لکھنؤ

شیطان کی آنت

مین اکثر غور کرتا رہا ہون کہ آخر شعراء رد گردہ مین کیون نہین مبتلا ہوئے اور اگر ہوئے تو انھون نے اسکا تذکرہ کیون نہین کیا۔ جہان تک انکے "اعترافات" (کلیات اور دواوین) کا تعلق ہے یہ اعضاء رئیسہ کی ہر قسم کی بیماری مین مبتلا پائے گئے جن مین دل و جگر کو خاص امتیاز حاصل رہا ہے۔ اس قسم کے شاعرانہ امراض اور انکے نتائج و عواقب کی مکمل داستان شعراء لکھنؤ کے کلام مین زیادہ تر پائی جاتی ہے اسلیے مین نے عین حالت بیماری مین اس دفعہ لکھنؤ کا قصد کیا اور اس مقصد سے کہ وہان پہونچکر اس حقیقت کی تفتیش کرونگا جس کا تذکرہ اس مضمون کے اولین جملہ مین کیا گیا ہے یا بقول لکھنؤ والون کے جو سوال اس مضمون مین "چھوتے ہی" کیا گیا ہے

میرے نزدیک مرض کی کوئی نہ کوئی حد ہونا چاہئے، بصورت دیگر مریض کو اختیار ہے کہ وہ حد سے گذر جائے جسطرح یہ ہمیشہ تندرست رہنا بھی غیر طبیعی ہے اسیطور پر ہمیشہ بیمار رہنا بھی بدمذاقی ہے۔ پھر چونکہ یہ دور ترقی و تہذیب کا ہے یعنی تم جو چاہو کر سکو یا نہین تمھاری بیویان جو چاہین کر سکین، مین نے گردہ صاحب کی متواتر اور مسلسل کئی ماہ تک تالیف قلوب کی لیکن جب دیکھا کہ میرے اغماض اور چشم پوشی کو یہ ایک روشن خیال تعلیم یافتہ بیوی کے مانند میری کمزوری پر محمول کرنے لگے ہین تو پھر اس اندیشہ سے کہ کہین مین بالکل مہذب ہی نہ بن جاؤن مین نے ایکدن گردہ صاحب کو نوٹس دیدیا "بنابر دکھانے اس وجہ کے" کہ چونکہ اب تک میرا سلوک تمھارے ساتھ نہایت درجہ شریفانہ رہا ہے اور مین نے تمھاری زیادتیون پر چشم پوشی کی ہے لیکن تم اسکو میری کمزوری اور اپنی خوش نصیبی پر محمول کرتے آئے ہو اس لئے مین تمکو آخری بار متنبہ کرتا ہون کہ راہ راست پر آجاؤ ورنہ پھر سمجھ لو مین عمر بھر اور ہمہ وقت مہذب رہنے کا کسی طور پر پابند نہین ہون اور اپنے فطری حربہ جہالت سے تمھارا تدارک کرونگا۔ میری اس بجا اور باضابطہ نوٹس کا جواب ایک "برنجی قہقہہ" (اس ترکیب کے جواز مین "نقرئی تبسم" پر غور فرمائے) سے دیا گیا۔ یہی نہین بلکہ گردہ صاحب نے اور ہاتھ پاؤن پھیلائے اور نہایت بے باکی کے ساتھ جگر اور معدہ کے حدود مین اپنا اقتدار "شہنشاہت" پھیلانے لگے۔ جگر، معدہ، آنتین یہ سب ہماری نہایت صلح جو، مرنجامرنج اور وفادار رعایا تھین جن سے ہمکو عمر بھر آرام و اطمینان نصیب رہا۔ لیکن اطباء اور ڈاکٹرون نے تشخیص کیا کہ یہ کرتوت انہین کا ہے۔ گردہ صرف بدنام ہے۔ بحیثیت ایک جدید الخیال حکمران کے جو صرف ماہرین فن کے فتاوی پر حکومت کرتا ہے ہم ان وفادارون سے بدظن ہوگئے اور چونکہ بادشاہ کی بدظنی کی معنی جنگ و خونریزی کے ہین اسلئے ہم نے انکے خلاف معجون، عرقیات، جوشاندہ، حبوب، سفوف وغیرہ قسم کی "تادیبی ارضی و فضائی" مہمین روانہ کرنی شروع کردین۔ ان بیچارون نے صدائے احتجاج بلند کی کہ یہ سب گردہ کی بالشوزم یا شہنشاہیت ہے ہم لوگ ابتک وفادار خیر اندیش "برٹش سبجکٹ" ہین۔ چنانچہ ایک رات جبکہ زلف شب گردہ تک پہونچ چکی تھی ہم علیگڈھ سے کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ کے لئے روانہ ہوگئے اور ارادہ کرلیا کہ اس کمبخت گردہ کو بالکل "مٹیا برج" (اس لفظ کے معنی غور طلب نہین ہین

بلکہ اسکی ہیئت صوتی داد طلب ہے۔ بناڈاؤن گا۔ بیوی بچون سے کہدیا کہ حکیم صاحب (حکیم عبد اللطیف صاحب وائس پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ) کا اصرار ہے۔ وہ لکھنؤ کے خربزے کھلانے لیجارہے ہین تمھارے لئے بھی بھیجون گا۔ غرض دوسرے دن دوپہر کے قریب لکھنؤ پہونچ گیا اور جھوائی ٹولہ مین مقیم ہو گیا۔

چاردن تک حکیم صاحب کا مہمان رہا اور اس دوران مین بالائی، قفلی، پراٹھے، بریانی اور قورمہ کھاتا رہا اور حکیم صاحب کے تانگہ پر ہاضمہ اور میڈیکل کالج مین داخل ہونے کے ابتدائی مراحل طے کرتا رہا۔ ایکبار خیال آیا کہ جب تک میڈیکل کالج مین نہین داخل ہونا اطبائے جھوائی ٹولہ کو بھی اپنے مرض سے آشنا کرادون چنانچہ ایک روز صبح سے دوپہر تک نبض اور قارورہ کے ساتھ «نائی کا نوشہ» بنا رہا کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ حبس، تجر، ثقیل، «ولندیزی» زبان مین یہ مرض تشخیص کرتے رہے اسکے معنی کچھ بھی میری سمجھ مین نہ آئے اور دریافت کرنے کی یون ہمت نہ ہوئی کہ کہین واقعی ایسا ہی «تجر ثقیل» مرض بھی نہ ہو۔ بڑا انصافی ہو گی اگر اس سلسلہ مین حکیم صاحب کے تانگے اور گھوڑے کا تذکرہ نہ کیا جائے کیونکہ میرا خیال ہے اس تانگے مین سوار ہونے سے بہت سے امراض خود بخود زائل ہو سکتے ہین اور اتنے ہی غیر متوقع امراض پیدا بھی ہو سکتے ہین۔ تانگے کا گھوڑا بھی خواجہ سرا ہے یعنی مشکی اور آختہ۔ اس تانگے مین کامیابی کے ساتھ صرف وہ لوگ سوار ہو سکتے ہین جنکو موٹر سائیکل پر بیٹھنے کی مہارت ہو آپ بیٹھنے کا ارادہ کرین گے اور یہ چلدیگا ان «حرکات مذبومی» کی اطلاع حکیم صاحب نے پہلے سے دیدی تھی لیکن اسکی ضرورت نہ تھی۔ ہم بھی اپنے مکرم دوست سید عبد الجلیل صاحب کے تانگے پر بیٹھنے کی مشق کر چکے تھے۔ اسلئے ہمکو کوئی تشویش نہ تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ حکیم صاحب کا گھوڑا صرف «سلف اسٹارٹر» تھا اور جلیل صاحب کا «سلف اسٹارٹر» (Self starter) اور «کک اسٹارٹر» (Kick starter) دونون، دونون کے صرف رنگ مین فرق تھا ورنہ عادت و اطوار کے اعتبار سے یکسان تھے۔ مین نے ان تانگون سے دور رہ کر اکثر اس مسئلہ پر غور کیا ہے کہ حکیم صاحب اور جلیل صاحب دونون اتنے شریف النفس دوست پرست اور مخلص ہونیکے باوجود اس قسم کے بے لگام اور عافیت عامہ مین خلل انداز ہونے والے گھوڑے کیون رکھتے ہین اور اکثر اس مسئلہ پر غور کرتے کرتے مجھپر ضمیر انسانی کی بعض دلچسپ و متبائن کرشمہ کاریان بھی منکشف ہوئین یعنی ایک ہی جذبہ سے متاثر ہو کر دو شخص دو مختلف یا متضاد فعل کے مرتکب ہو سکتے ہین اور خراج تحسین بھی وصول کر سکتے ہین، مثال مین ان دونون گھوڑونکو پیش نظر رکھئے۔ حکیم صاحب نے طب و تحفظ کے نقطہ نظر سے اپنی مشکین نسب گھوڑے کو آختہ کرا ڈالا، جلیل صاحب نے انسانی نقطہ نظر سے اُسے گوارا نہ کیا۔ اب دیکھنا یہ رہ گیا ہے کہ اس طبی اور انسانی نقطہائے نظر مین کیا فرق ہے۔ یہ بحث زیادہ طویل ہو جائے گی اس لئے اب اسکو یہین ختم کر دینا چاہئے۔ بہرحال میرے نزدیک غالباً وہی فرق ہے جو ایک طبیب اور غیر طبیب مین ہونا چاہئے!

حکیم صاحب کے تانگہ پر بیٹھنے کے بعد کوئی شخص نہ اپنے آپکو محفوظ خیال کر سکتا ہے اور نہ دوسرون کو جو سڑک پر چل رہے ہون یا دوکان پر بیٹھے ہون، «چال جیسے کڑی کمان کا تیر»۔ تیور جیسے کسی دیہاتی تھانہ کا تھانیدار کسی دیہاتی ہی مینڈھے کے گھوڑے پر سوار ہو۔ جلیل صاحب کے موٹر کے مانند صبا رفتار نہین بلکہ انکے گھوڑے کے مانند طوفان رفتار۔

مرض اور ازالہ مرض کے سلسلہ مین حکیم صاحب کے ساتھ مین ڈاکٹر بھاٹیا صاحب کی کوٹھی میڈیکل کالج اور بعض دیگر

مقامات پر موٹر مین بھی گیا ہون لیکن تیز رفتاری کا رعب مجھ پر جیسا کچھ حکیم صاحب کے تانگے کا ہے موٹر کا کبھی نہین ہوا۔ اس تانگہ پر قطع مسافت اتنی ہی سریع اور شاید مرد افگن ہے جتنا خطرہ جسم و جان مستقیم۔ گومتی کے کنارہ یہ اس بے پناہ رفتار سے جا رہا تھا جیسے میجر سر سیگریو کا موٹر۔ مجھے خیال نہین بلکہ یقین تھا کہ اگر جادۂ مستقیم سے ایک آدھ درجہ بھی لگام ادھر اُدھر ہوئی تو پھر یہ تانگہ بلا تکلف گومتی کے لہرون سے دست و گریبان نظر آتا۔ یہ لکھنؤ میونسپلٹی کی غلطی اور ستم ظریفی ہے کہ اپنے سڑک اور دریا کے درمیان کسی قسم کی حدبندی نہین کی ہے میری تجویز ہے کہ اس بارہ خاص مین جو شخص یا ممبر میونسپلٹی قصوروار ہو اوسکو حکیم صاحب کے تانگے پر سوار کرا کے "ریور بنک روڈ" (River Bank Road) کی طرف ہانک دینا چاہیے۔

اس تانگے پر مین نے اکثر محسوس کیا ہے کہ میرا اصلی مرض یکلخت کافور ہو گیا ہے۔ لیکن دو چار دوسرے مرض پیدا ہو گئے ہین۔ ہمارے حکیم عبداللطیف صاحب کی ایک کمزوری ہے جس سے ممکن ہے وہ انکار کرین لیکن یہ یقینی ہے کہ اس سے نجات نہین حاصل کر سکتے۔ اور وہ برف ہے۔ میرا خیال ہے اگر گرمی کے موسم مین برف نہ ملے اور صرف قطب شمالی پر اسکا پتہ لگے تو حکیم صاحب یقیناً اپنے ہی تانگہ پر قطب شمالی کے لئے روانہ ہو جائین گے۔ ایکدن ہم سب، خدا رکھے، اسی تانگہ پر قارورہ کا امتحان کرانے کے لیے پتھالوجی ڈیپارٹمنٹ آئے۔ زینون پر چڑھتے اُترتے، مختلف مقامات پر آتے جاتے کم سے کم مین تو نہایت خستہ ہو گیا تھا۔ دوپہر ہو چکی تھی، دھوپ کی شدت، لو اور گرمی کا غلبہ، سوء اتفاق حکیم صاحب پر پیاس کا غلبہ ہوا فوراً مجھے ساتھ لے کر تانگے پر بیٹھ چوک کے لئے روانہ ہو گئے۔ مین نے دریافت کیا کہان کا قصد ہے کہنے لگے چوک چلکر برف پیون گا۔ تانگہ چوک مین اسطور پر داخل ہوا ہے جیسے کوئی بھونچال آگیا ہو۔ کسی دوکان والے کے پردہ سے الجھا، کسی کا سائن بورڈ سربسجود ہو گیا اور ہماری یہ حالت۔

رو مین ہے رخش "برف" کہان دیکھئے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب مین

کتنے برف والون کی دوکان راستے سے گذر گئی اور کتنے اپنی جان اور اعضاء و جوارح کی خیر مناتے اور ہمکو گھورتے اور بڑبڑاتے ہوئے ادھر اودھر کترا گئے گھوڑا اسطور پر بے محابا گذر رہا تھا جیسے بلوائیون کے ہجوم سے سوار پولیس کا دستہ۔ لیکن حکیم صاحب اسطور پر خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے گویا یہ سب کچھ متوقع بھی تھا اور خوش آیند بھی۔ میرا حلیہ ان "جاکیون" کا تھا جو گھوڑ دوڑ مین گھوڑون کی پشت پر نظر آتے ہین۔ عجب ثم العجب، گھوڑے نے ایک ایسے مقام پر جا کر دم لیا اور "جھینے لگا" جسکے ایک طرف "کارگاہ شیشہ گر"، دوسری طرف مٹی کے کھلونے والے اور اوپر "کم خرچ بالا نشینون" کا عشرت کدہ تھا۔ مجھے اس مقام کی تاریخ اور جغرافیہ سے کوئی واقفیت نہ تھی، میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ اس تانگے پر انسان سوائے تحفظ ذات کے گرد و پیش کے حالات و مناظر پر مطلق غور نہین کر سکتا۔ اور یہی نہین بلکہ اس پر سے اُترنے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک اپنی اعضاء و جوارح کو ٹٹولتا رہتا ہے کہ ان مین سے ہر ایک اپنے اپنے مقام پر صحیح سالم موجود بھی ہے یا نہین۔ لیکن جب مین نے دیکھا کہ حکیم صاحب کے چہرہ پر دائمی شگفتگی کے بجائے کچھ کبیدگی اور تنغص کے آثار پیدا ہین تو مین نے سمجھا کوئی بات بےموقع ضرور ہے۔

چنانچہ ہم سب ٹانگہ سے اتر آئے اور اُسے بدقت تمام ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا گیا جسے اگر بطور پر ایک طویل سائبان کہنا زیادہ موزون ہوگا - اس سائبان کے عرض مین تو کئی دروازے تھے لیکن طول مین صرف ایک در تھا - کشادہ و مسطح دوسرے کنارہ پر کوئی دروازہ نہ تھا - بلکہ محض ایک بلند دیوار - اس سائبان کا عرض زیادہ سے زیادہ چھ فٹ ہوگا - غرض تانگہ کھڑا کر دیا گیا اور ہم لوگ برف اور شربت کی مہم پر روانہ ہوئے - ابھی ایک لور اگلاس بھی ختم نہ کر پائے تھے کہ -

اک شور طوفان خیز اٹھا ہے

کے بجائے ایک شور مردم خیز اٹھا - ہو بچکر دیکھتے ہین تو گھوڑا اور تانگہ دونون سائبان مین داخل ہین اور سامنے کی دیوار پر چھاپہ مار رہے ہین گھوڑا - تانگہ - سائیس اور تماشائی سب کے سب دست افشان - پائے کوبان - نعرہ زنان - لڑکے تالی بجا رہے تھے - عورتین چیخ رہی تھین بوڑھے بد دعائین دے رہے تھے اور نوجوان کچھ ہماری مدد کر رہے تھے اور کچھ گھوڑے اور تانگے کی - غرضکہ کسی نہ کسی طرح تانگہ نکالا گیا اور ہم سب ایک دفعہ پھر میڈیکل کالج کے لئے روانہ ہوگئے اور وہان سے تقریباً دو بجے دنکو جھوائی ٹولہ واپس ہوئے - حکیم صاحب اس مہم سے ایسے مسرور و مطمئن تھے جیسے میجر سر سیگریو ۲۳۱ میل فی گھنٹہ کا موٹر ریکارڈ قایم کر کے تماشائیون کے ہجوم مین داخل ہو رہے ہین - اور میری یہ حالت کہ بس چلتا تو اپنے ساتھ ساتھ اس گھوڑے کو بھی میڈیکل کالج مین داخل کرا دیتا - سنا ہے آختہ ہونے سے قبل اس گھوڑے کی تاریخ اور زیادہ ہولناک تھی سازد رکھے جانے سے قبل پہلے تو اُسکی آنکھون پر پٹی باندھی جاتی تھی پھر گردن مین موٹی رسی ڈالکر دونون طرف سے دو دو آدمی رسی کا سرا مضبوط پکڑتے تھے اور پھر دوسرے دو آدمی مضبوط ڈنڈے لیکر وقتاً فوقتاً انکے ساتھ تفریح کرتے جاتے تھے لیکن باوجود اس قسم کے غیر شاعرانہ سلوک کے ایک دفعہ آپ نے کسی سائیس کا ہاتھ چبا ڈالا - ان اعمال حسنہ کے ہوتے ہوئے کوئی تعجب نہین اگر انکے آختہ کر دینے کا فیصلہ کر دیا گیا ہو - لیکن یہ سلوک میرے نزدیک کسی حد تک قبل از وقت اور جابرانہ تھا - بعض بزرگون کا خیال ہے کہ ہمکو جانورون سے بھی وہی سلوک کرنا چاہئے جو ہم خود بنی نوع انسان کیلئے روا رکھتے ہین - اس نظریہ کے ماتحت اس گھوڑے سے بلکل مختلف قسم کا سلوک ہونا چاہئے تھا - کسی ہندوستانی نوجوان کو بے راہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہین تو والدین جلد سے جلد اوسکی شادی کر دیتے ہین اور یہ شکنجۂ ازدواجی سارے شاعری خاک مین ملا دیتا ہے - اسیطور پر میرا خیال ہے اس گھوڑے کو آختہ کرنے کے بجائے متاہل زندگی بسر کرنے کا موقعہ دیا جانا چاہئے تھا - ممکن ہے کہ صاحب کے ذہن مین یہ خیال آیا ہو لیکن وقت یہ رہی ہو کہ اس جنس کی صنف نازک نے ان بزرگ کو "نامہذب" قرار دیکر مردود کر دیا ہو!

میرا خیال ہے یہ گھوڑا پوری طور پر آختہ نہین ہوا ہے اور یہ ناممکن بھی تھا - جب ان بزرگ کا یہ عالم ہو کہ اپنے فرایض منصبی ادا کرنے کے خلاف اسطور پر آمادہ جنگ رہتے ہون تو پھر کسی ایسے سلوک کو آسانی کے ساتھ کیونکر گوارہ کیا ہوگا جو سراسر انکے فرایض جنسی کے منافی تھا اگر اکس ریز (X-rays) سے انکا معاینہ کرایا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ آپریشن ٹھیک نہین ہوا ، اور بعض سرکش غدود قطع بُرید سے بچگئے ہین اور وہی آمادۂ فساد ہین -

مین نے کوشش کی تھی کسی عزیز، دوست، دشمن کو میرے ارادۂ عمل جراحی کی خبر نہ ہونے پائے لیکن مجھے کیا معلوم تھا پردۂ تقدیر نہین بلکہ پردۂ تحریر مین کیا ہے۔ لکھنؤ مین ہمارے دوست اور رفیق کار مسٹر مشیر احمد علوی بی۔اے (علیگ) ملگئے۔ ایک روز ذرا دیر کے لیے ملاقات ہوئی تھی، تھوڑی سی گفتگو ہوئی اور پھر ہم دونون رخصت ہوگئے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ہماری آمد اور ارادہ کی خبر لکھنؤ کے کسی روزنامہ مین موجود ہے۔ اب کیا تھا، راز کا افشا ہونا تھا کہ احباب و اعزہ صف اندر صف اور قطار اندر قطار چلے آرہے ہین اخطوط اور تار انکے علاوہ!

اب میرا زیادہ وقت موت و حیات کے فلسفہ یا تندرستی و مرض کے نظریہ پر بحث کرنے مین صرف ہوتا تھا کوئی شخص ایسا نہ تھا جسکے ذہن یا تجربہ مین کوئی بات ایسی نہ آئی ہو جو میرے ارادہ کے نامعقول یا نامسعود ہونیکے مقابلہ مین نص قطعی کا حکم نہ رکھتی ہو ایک صاحب نے فرمایا اس قسم کے عمل جراحی سے عہدہ برا ہوتے تو کسی کو دیکھا نہین۔ فلان شخص اپریشن کراتے ہی جان بحق ہوا۔ مین نے کہا میرا ارادہ جان بحق ہونیکا نہین ہے۔ یون اسکو کیا کیجیے گا لوگون کی شادیان بھی ہوجاتی ہین، مر بھی جاتے ہونگے۔ پھر اسکو کیا کیجیے۔ مین ایسی زندگی کو موت سے زیادہ ہولناک سمجھتا ہون۔ جس مین انسان زندگی کے فرائض اور لذائذ دونون سے محروم رہے۔ انسان اپنے بیوی۔ بچون، اعزہ اور احباب کی نسبت سے زندگی کو ناچیز یا محبوب سمجھتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انہین سے خاطر خواہ طور پر عہدہ برآ ہونا کامیاب اور کامران زندگی کی دلیل ہے۔ کیا اگر مین انکی تقویت یا تفریح کے بجائے انکے لئے بار گران ہو کر رہا۔ مانا۔ انکی ہمدردی اور شیفتگی میرے مریض وجود کو بار گران نہ سمجھے لیکن کیا ہوا اگر مین ہر دم و ہر لحظہ یہ محسوس کرتا رہا کہ یہ صورت حال بدلنے والی نہین ہے اور مین خود تکمیل فرایض کی مسرتون اور خوش آیند توقعات سے لطف اندوز ہونے کے بجائے جو زندگی کی ناگزیر شدائد اور تلخیون کو دلچسپ اور محبوب بناتی ہین صرف ایک پیکر حزین یا جسد معطل بنکر رہ گیا جسپر صرف حیات کی درماندگیون کا اطلاق ہوسکے۔ مین بذات خود زندگی کو ایک ذمہ دارانہ تفریح سمجھنے کا عادی رہا ہون اور ہر ایسی حالت یا واقعہ کو جلد سے جلد بھول جانے کا خوگر ہون جو زندگی کے اس مفہوم کا منافی ہو۔ لیکن اندنون مسلسل اور غیر شاعرانہ طور پر بیمار رہنے سے میری طبعی شگفتگی مضمحل ہونے لگی تھی اور یہی سبب ہے کہ مین نے ایک آخری اور قطعی فیصلہ پر پہونچنے کا جلد سے جلد عزم کرلیا۔ اب رہا یہ کہ مین جانبر نہ ہوسکوگا تو کیا ہوگا۔ بیوی بچون پر کیا گذرے گی۔ یہ صورت حال بھی ایک سمجھدار شخص کے نزدیک ناقابل تسخیر نہ ہونا چاہیے۔ ایک مجہول اور مریض شوہر یا باپ اپنے بیوی بچون کے لئے ایک متوفی باپ یا شوہر سے زیادہ حیثیت نہین رکھتا بشرطیکہ وہ اتنی دولت و ثروت کا مالک نہ ہو جو اسکے روزی کمانے یا نہ کمانے سے بے نیاز ہو۔ اور میری حالت ایسی نہین ہے۔ پس میرے نزدیک لوگون کی انتہائی گمراہی یہ ہے کہ وہ اپنے متعلقین کی صلاح و فلاح کا تنہا اپنے آپکو ذمہ دار سمجھتے ہین۔ اگر ایسا ہوتا تو آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا یا شاید دنیا اور اسکا نقشہ دونون ناپید ہوتے۔ دنیا مین کافی مثالین ایسی ملین گی جنمین

بیوہ اور یتیم کافی عافیت اور شہرت کے ساتھ داد حیات دے چکے ہین۔ اسی طرح کافی مثالین ایسی بھی ملین گی جہان شوہر اور باپ کی موجودگی مین بھی صرف محرومیان حصہ مین آئی ہین۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کی کمزوری ہے اور اسکی بے بنیاد دہشتین ہین جنکے سبب سے اوس نے اپنے مرنیکے عدم جواز مین یہ افسانے اور کمزور دلائل قایم کرلئے ہین۔ مرنے اور بیوی بچون کے چھوڑ جانے کی تو مصیبت عام ہے بہت کم گھرانے ایسے ہون گے جہان یہ ہولناک حادثے نہ پیش آئے ہون گے۔ اگر ہمارے گھر مین یہ مصیبت پیش آنیوالی ہے تو برا ماننے یا ضرورت سے زیادہ ماتم کرنیکے کیا معنی۔ ایک ایسا سانحہ جو تمام دنیا اور تمام خاندان کے لئے عام ہے آخر میرے خاندان کے لیے کیون نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ ہر شخص اور ہر خاندان کی کفیل خود دنیا اور اسکی بوالعجبیان ہین یا اگر ہمارے ناظرین زیادہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال نہ ہون تو مین کہون گا کہ اس مین تھوڑا بہت خدا کا بھی ہاتھ ہوتا ہے اور جب ہم خدا کے قائل ہین تو اسکی واضح یا پر اسرار قدرتون اور مصلحتون کا بھی قائل ہونا پڑیگا۔!!

میرے ایک دوسرے دوست اوستاد اور بزرگ۔ جو مرے خیال مین مجھے اسدرجہ عزیز رکھتے ہین جتنا شاید مین کوشش بھی کرون تو خود انکو یا کسی دوسرے کو عزیز نہین رکھ سکتا یا جس حدتک وہ میرے لئے قربانی یا ایثار کرسکتے ہین مین اونکے لئے نہین کرسکتا اور نہ شاید آمادہ ہوسکتا ہون، مرے اس ارادہ کے موئید تھے لیکن مین محسوس کرتا تھا کہ ان کا عزم و استقلال، محبت یا بشریت کی بنا پر مرے اس ارادہ سے کبھی کبھی متاثر اور متزلزل ہوجاتا تھا۔ چنانچہ مین نے ایک موقعہ پر بسبیل تذکرہ انسے عرض کیا کہ آپ دیکھتے ہین، مرض کی آئے دن کی مصیبت کیسی تلخ ہے آپکو یہ بھی معلوم ہے اس صورت حال کے ماتحت زندگی کا کوئی مقصد نہین رہ جاتا۔ آپ جانتے ہین اب اس کا علاج صرف اپریشن رہ گیا ہے۔ رہا یہ کہ عمل جراحی کامیاب ہوگا یا ناکامیاب۔ بصورت اول فہوالمراد، بصورت دیگر یہ دیکھنا ہے کہ اس انجام کا کیا انجام ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک آخری انجام پر وقوف نہ ہو اس پر حکم لگانا بے محل اور غلط طریقہ کار ہے۔ آخری انجام ایک ایسا سلسلہ لامتناہی ہے جسکی کسی کو خبر نہین۔ موت ہو یا زندگی یا کوئی بھی واقعہ کیون نہ ہو وہ انجام نہین ہے بلکہ صرف ایک جدید آغاز۔ ساری دنیا ایک مسلسل آغاز ہے انجام اسکے ہاتھون مین ہے جو آغاز مطلق اور انجام مطلق دونون ہے یا دونون سے بے نیاز! اس لئے میرے نزدیک انجام کو غیر معمولی اہمیت دینا اور وہ بھی ایسا انجام جو صرف چندروزہ ہو غیر ضروری اور غیر دانشمندانہ ہے لیکن فلسفہ اور آلہیات کی پیچیدگیون سے طبیعت اکثر سکون و تسکین نہین حاصل کرتی اس لئے اس مسئلہ پر صرف دنیاوی نقطہ نظر سے بھی غور فرمایئے۔ مین قسمت کا قائل ہون اور یہان مین قسمت کے آلہیاتی یا مذہبی مفہوم سے نہین بلکہ معنوی مفہوم سے بحث کرنا چاہتا ہون۔ میرے نزدیک قسمت نام ہے صرف "حصہ" یا "تقسیم" کا یعنی ہر شخص کو دنیا کی نعمتین اور دنیا کی محرومیان تقسیم کردیگئی ہین۔ مساوی اور عدم مساوی کا سوال نہین ہے۔ کسی شخص کو تندرستی۔ کسی کو دولت و قناعت، کسی کو ہمت و حیا، کسی کو زن و فرزند، کسی کو علم و فضل، کسی کو قبول عام ارزانی کیا گیا ہے۔ اسیطور پر محرومیان اور نامرادیان بھی حصہ مین آئی ہین، عام طور سے ہمکو جو

جو نعمت حاصل ہوئی ہے اور کوئی شخص ایسا نہین ہے جسکو کوئی نعمت حاصل نہ ہوئی ہو اسکو بالعموم ہم نظر انداز کر دیا کرتے ہین اور دوسرونکو جو نعمت حاصل ہے اسکو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہین حالانکہ دنیا کی مجموعی نعمتین مجموعی طور پر کسی کو کبھی نصیب نہین ہوئین اور نہ ہونگی اور بالفرض نصیب بھی ہوئین تب بھی میرا خیال ہے آپ اُسکو مطمئن نہ پائین گے۔ زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ قطرت کی طرف سے انسان کو جو نعمت عطا کی گئی ہو اُسپر قناعت کرے۔ اِن سے جایز طور پر زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائے اور دوسرون کو فائدہ پہونچائے۔

اب مجھے دیکھیے۔ آپ میرے سوانح زندگی سے واقف ہین خدا نے علم کی دولت عطا فرمائی۔ کھانے پینے سے خوش رکھا۔ جان نثار احباب و اعزہ دئے، شہرت و قبول عام ارزانی فرمایا، مجموعی اور انفرادی طور پر یہ نعمتین ایسی ہین جنکے وجود و حصول پر ہر سمجھدار انسان کو شکر گذار ہونا چاہیئے۔ میرے استاد محترم مولنا حاجی سید سلیمان اشرف صاحب جب پچھلے سال حج کے لیے تشریف لے گئے تھے تو کتنون نے آپ سے فرمائش کی تھی کہ خانۂ کعبہ مین پہونچکر انکے مختلف امور دینی یا دنیاوی کے بارہ مین دعا فرمائیگا۔ مولنا محترم کے پاس مین نے ایک عریضہ بھیجا تھا اور یہ استدعا کی تھی کہ حریم قدس مین میری طرف سے یہ عرض کر دیا جائے کہ اے خدا تیرا ایک ناچیز بندہ تیری دی ہوئی نعمتون کا شکر گذار ہے۔ وہ مانگتا نہین، اس کا صرف سجدۂ شکر قبول فرمایا جائے۔ آپ یقین فرمائین مین اپنی زندگی کو کامیاب سمجھتا ہون، اب اگر پیام رحلت آگیا ہے تو گھبرانا بے معنی ہے۔ اب تک خدا نے ہر خجالت و مصیبت سے محفوظ رکھا ہے، معلوم نہین آیندہ کیا پیش آئے، اِسوقت تک میری زندگی جیسی کامیاب اور مسرور گذری ہے وہ غالبًا میرے بعد میرے احباب اعزہ اور ملک و ملت کے لئے ایک سرمایہ نیک ہوگی اس کے علاوہ اور کیا چاہیئے، دوسری طرف اگر اس مرض کو میری زندگی کا دردناک پہلو تصور فرمائے تو اِس حقیقت کو بھی مدنظر رکھئے کہ مین اس مرض کی شدت اور سختی کے باوجود ہمیشہ غیر معمولی طور پر شگفتہ اور بشاش رہا ہون اور یہی نہین بلکہ جو لوگ مجھ سے وابستہ رہے ہین انکو بھی شگفتہ اور بشاش رکھ سکا ہون۔ پھر اس مرض کو عذاب جان یا میری زندگی کی محرومی کیون تصور فرمائے اچھا اِن سب کو جانے دیجیے۔ وہ لوگ جو مرض اور ازالہ مرض کے بارہ مین ماہرین فن کا درجہ رکھتے ہین انکی راے ہے کہ اپریشن ہو جانا چاہیئے۔ اسلیے جہانتک دنیاوی تدابیر میری جان بچانے اور مرض کے دفعیہ کے لئے کیجا سکتی ہین وہ کیجائین گی۔ بہت ممکن ہے جانبر ہو جاؤن، پھر اسوقت کی خوشی اور شادمانی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

قصۂ مختصر، ہم یورپین وارڈ کے ایک کمرہ مین پہونچ گئے۔

وہ مرا پہلے پہل داخل زندان ہونا!

نہایت پاکیزہ کمرہ، پاکیزہ سامان، پاکیزہ بستر، پاکیزہ ترسین اور ان سب سے زیادہ پاکیزہ سامان قطع برید اور مرہم پٹی جو نہایت کثرت، نہایت اہتمام اور انتہائی خوش سلیقگی کے ساتھ ایک میز پر ہمارے پذیرائی کے لئے موجود تھا۔ غسلخانہ

انگریزی طرز کا بنا ہوا، نہایت صاف ستھرا۔ کھانے کے لئے مرغ، دودھ، مکھن، توس، انڈے، غرض ہر قسم کے حوائج ضروری یا غیر ضروری سامان، کافی اور کافی سے زیادہ۔ لیکن ابھی بعض اور سہولتون کی تلاش وتحقیق کی طرف طبیعت مائل ہونے والی ہی تھی کہ جیتر بھاڑ کے سامان دیکھکر اوسان خطا ہوگئے۔ اتنے مین ایک سیم فام، سفید پوش۔ شیرین کام لیکن تلخ کار نرس داخل ہوئی اور قبل اس کے کہ مجھ سے کوئی اضطراری فعل سرزد ہو اسنے منہ مین تھرما میٹر ڈالدیا، نبض ہاتھ مین لے لی اور تنفس کا معائنہ شروع کردیا۔ تھوڑی دیر مین تھرما میٹر نکالکر کہا ملیریا کے مریض ہو مین نے کہا نہین بعض اعضاء رئیسہ کا، فرمایا حرارت ہے! مین نے کہا مجھے تو محسوس نہین ہوتی شاید اس فضا یا میرے بودے پن کا اثر ہو، غرضکہ پھر تھرما میٹر لگایا گیا اب مین بھی حواس مین آچکا تھا۔ چنانچہ حرارت اور بات دونون آئی گئی ہوئی۔

٣ بجے سے ٥ بجے تک ہر روز دن مین کئی کئی بار یہی مشغلہ رہتا۔ مڈیکل کالج مین جتنے طلبہ اور ڈاکٹر تھے ایکبار سب آکر مجھ عجوبۂ روزگار کو دیکھ جاتے، مرض کی داستان سناتے سناتے اور تلئین وعمل لیتے لیتے بدحواس ہو گیا۔ میرا خیال خیال ہے محض اس احتیاط کو مدنظر رکھکر کہ کوئی مریض کسی شاعرانہ حماقت کا مرتکب ہوکر اسپتال کے ڈسپلن مین مخل نہ ہو، ارباب میڈیکل کالج اس قسم کی بعض غیر شاعرانہ تدابیر اختیار کرتے رہتے ہین اور یہ تلئین وعمل اسی کا ایک شاخسانہ ہے، اپریشن سے ایک روز پہلے گروہ اور مضافات گردہ کا تبسمہ ہوا، یعنی سب سے پہلے رسمًا حجامت بنائی گئی اس کے بعد مختلف اقسام کے عروق اور روغنیات کی مالش کی گئی اور پھر روئی اور گاز رکھکر عمامہ باندھ دیا گیا۔ یہی دستار فضیلت کل اپریشن تھیٹر مین اُچھالی جانے والی تھی۔ اپریشن کے قبل کے مراحل ومراسم خود اپریشن سے زیادہ ہراس آفرین ہوتے ہین اور یہ کوئی نئی بات نہین ہے مصیبت کی آمد کا تخئیل (یا حالت منتظرہ) نمودار اور مصیبت سے زیادہ پریشان کن ہوتا ہے۔ چنانچہ جس روز اپریشن ہونیوالا تھا اسکی صبح ہر آنے والے نے بشارت دی کہ آج اپریشن ہوگا، ڈاکٹرون نے دلاسا دیا، نرسون نے پوچھا ڈرتے تو نہین، بعض صاحبون نے کہا "شاباش" اور کسی نے صرف "افسوس" پر اکتفا کیا۔ اعزہ پریشان اور افسردہ تھے دوستون پر یاس طاری تھا۔ ڈاکٹر اور نرسین مستعد اور آمادہ کار نظر آتی تھین۔ مجھے نوٹس دیا گیا کہ دس منٹ کے اندر تیار ہوجاؤ۔ مین نے وضو کیا۔ دو رکعت نفل ادا کی اور دعا مانگی "خدایا جو کچھ تو کر رہا ہے وہ بلکل صحیح اور درست ہے۔ اب تک تو نے مجھپر جو احسان وکرم کیا ہے تو علیم ہے مین کتنا شکر گذار ہون۔ ایک تمنا یہ البتہ ہے کہ اگر یہ آخری وقت ہے تو میری یاد کو مجھ سے محبت کرنے والون کے لئے آسان کردے، زندگی مین مین نے تجھے اکثر بھلایا ہے اس کے گواہ بہت ملین گے لیکن اس وقت صرف تجھے یاد کر رہا ہون اس کا گواہ صرف تو ہے"، اس کے بعد ایک ڈاکٹر نے آکر مارفیا کا انجکشن دیا اور دو خدمتگارون نے بیمار دنگی کرسی پر بٹھا کر اپریشن تھیٹر پہونچا دیا۔

کرسی سے اوترکر اپریشن تھیٹر مین داخل ہوا۔ جو میز بتائی گئی اوس پر لیٹ گیا، سرہانے سے ایک ڈاکٹر نے کلوروفارم دینا شروع کیا۔ مین نے سوچا دیکھون کلوروفارم کا اثر کسطور پر ہوتا ہے اس لئے یہ ارادہ کرلیا کہ بے ہوش

ہونے مین عجلت سے کام نہ لون بلکہ کلوروفارم کے اثر کی مدافعت کرون اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریبًا ۳-۴ منٹ تک کلوروفارم دیا گیا اور دماغ پر کچھ اثر نہین ہوا البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز حلق مین رہ رہ کر اٹکتی ہے اور سوزش پیدا کرتی ہے اس لئے مین نے دو دفعہ سر کو ایک طرف جھٹک بھی دیا۔ لیکن پھر مین نے خیال کیا کہ یہ تجربہ کچھ پُر لطف یا دلچسپ نہین ہے اور مجھے کلوروفارم کا اثر قبول کر لینا چاہیے چنانچہ مین نے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا اور ایک ہی سکنڈ مین یہ معلوم ہوا گویا دماغ دُھنی ہوئی روئی کے مانند تھا اور اس مین آگ لگا دیگئی پھر مجھے خبر نہین کیا ہوا۔

آنکھ کھلی تو مین نے اپنے آپ کو کمرے مین پایا۔ تکیون کے سہارے تقریبًا ۱۳۰ درجہ کے زاویہ پر لٹا دیا گیا تھا۔ سر پر سرو پانی مین تر کیا ہوا تولیہ لپیٹا ہوا تھا نہ اپریشن کی کوئی تکلیف تھی اور نہ کلوروفارم کا کوئی مخصوص اثر۔ مین نے دو اسپیشل نرسین بھی رکھ لی تھین جن سے دریافت کیا۔ اپریشن کیسا ہوا۔ جواب ملا نہایت کامیاب اور خاموش ہو جاؤ۔ مجھ پر بھی کچھ تکان سی غالب تھی تھوڑی دیر مین غافل ہو گیا یا سو گیا۔ سہ پہر مین آنکھ کھلی تو اپنے چھوٹے بھائی کو جنکو ہمہ وقت ساتھ رکھنے کی پہلے سے اجازت لے لی گئی تھی پٹی سے لگا ہوا بیٹھا پایا۔ کچھ دیر تک اپریشن کا حال پوچھتا رہا۔ پیاس غالب تھی۔ چند قاشین سنترہ کی کھائین اور پھر سو رہا۔ رات ہوئی اور تکلیف مین اضافہ ہوا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے گردہ کے مضافات کی رگین آتش سیال بن گئی ہین اور درد گردہ عود کر آیا ہے، یہ تکلیف ناقابل برداشت تھی۔ یہانتک کہ ایک ڈاکٹر اور نرس نے آکر مورفیا کا انجکشن دیدیا اور پھر صبح تک غافل رہا۔ یہ حالت صرف شب مین تین چار دن تک رہی اور دو روز مارفیا کا انجکشن لیتا رہا لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ سونے کے لئے منوم یا منشی چیزون کا عادی ہونا مضر ہے۔ اس لئے اسکی کوشش کرو کہ نیند خود بخود آجایا کرے۔ چنانچہ اس کے بعد پھر نیند آنے کے لئے نہ کوئی انجکشن لیا گیا اور نہ کوئی اور دوا استعمال کی گئی۔ دو تین راتین نہایت تکلف سے گذرین۔ مین نے اپنی تکالیف کا سبب پوچھا تو ڈاکٹرون نے جواب دیا یہ سب متعلقہ متاذی یا متاثر ہونے والے اعصاب کا کرشمہ ہے چونکہ گردہ کا اپریشن ہوا ہے اس لئے متعلق جتنے اعصاب ہین ان مین اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ یہ کیفیت محض عارضی ہے کچھ عرصہ مین خود بخود زائل ہو جائے گی۔ باوجود اسکے تین چار دن تک مین نے آہ دبکا اور اظہار مایوسی اور واماندگی مین کچھ ایسی بدمزاقی کا بھی ثبوت دیا کہ تیماردار پریشان ہو گئے اور نرسون و ڈاکٹرون نے کبھی کبھی کسیقدر درشت لہجہ مین میری خبر بھی لی۔ ایکدن صبح ڈاکٹر صدیقی اور ڈاکٹر ظریف صاحبان نے پوچھا کہ رات مین آخر مین اسدرجہ تکلیف دہ کیون ہو جاتا ہون۔ مین نے کہا بات یہ ہے کہ آپ لوگون نے گردہ کو تو بلکل "داغ جدائی" کر دیا اب ماتم گسار اعصاب کے حلقہ سے انکے دیرینہ رفیق کار کا "شور ماتم" اٹھتا ہے تو آخر شریک ماتم ہونے والا بھی کوئی ہو۔ یہ فرض مجھے ادا کرنا پڑتا ہے۔ چار پانچ دن کے بعد ہر تکلیف مین تخفیف شروع ہو گئی غالبًا ساتوین دن ٹانکے علیحدہ کر دئے گئے اور تقریبًا کوئی تکلیف دہ شکایت باقی نہین رہی۔ مین خود اٹھنے بیٹھنے لگا۔

تھوڑا بہت کمرہ مین ٹہلنے بھی لگا اور - خوب کھانے پینے لگا -

اب ہمکو اجازت دیدی گئی تھی کہ "کھاؤ پیو اور ٹہلو" چنانچہ سب سے پہلے مین نے خربزے کی فرمایش کی - موسم گرما اور خربزے دونون شباب پر تھے خربزے نہایت لطف سے کھائے گئے - دوستون اور اعزہ نے کھانے پینے کی چیزین خوب خوب بھیجین اور مین نے بھی انتہائی انتقامی جذبہ کے ساتھ انکی پذیرائی کی بیماری اور پرہیز میرے لیے ہمیشہ لازم ملزوم رہے، لیکن کوئی سلیم المذاق انسان ہندوستانی علاج و پرہیز سے عرصہ تک ہم آہنگ نہین رہ سکتا - اسلئے تھوڑی سی غور و فکر کے بعد مین ہمیشہ دوا اور پرہیز مین ایک حد اوسط یا مفاہمہ قائم کر لیا کرتا تھا - مثلاً ایک حکیم صاحب نے بتایا کہ پیٹھے کو کچل کر گردہ پر ضماد کیا جائے اور اس کا عرق پی لیا جائے - اس سے مین نے یہ نتیجہ نکالا اور اسپر کاربند بھی رہا کہ پیٹھے کی مٹھائی براہ راست کھائی جاسکتی ہے - ایکدن مین نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپلوگ لکھنؤ مین رہتے ہین اور ہر قسم کے امراض اور ادویات پر غور کیا کرتے ہین، کبھی اس سلسلہ مین لکھنؤ کا خربزہ بھی آپ کے ذہن مین آیا - آپ جانتے ہین آجکل ہر قسم کے علاج دنیا مین رائج ہین - کوئی پانی سے علاج کرتا ہے، کوئی دودھ سے، کوئی آفتاب کی شعاعون سے کوئی نمک سے کوئی فاقہ سے - کیا آپ مین خدا کا کوئی بندہ ایسا نہین پیدا ہوا جو امراض کا نہ سہی مریضون کا علاج، داخلی اور خارجی ہر قسم کے خربزون سے کرتا - کھانا، پینا، سیکنا، باندھنا سب کچھ خربزون سے کیا جاتا مثلاً ضماد، تکمید و تدہین علیگڑھ کے خربزون سے ہوتی، اور کھانے پینے مین لکھنؤ، جونپور یا ٹونک کے خربزے استعمال مین آتے!

میرے نزدیک ہسپتال سے زیادہ تکلیف دہ کوئی مقام نہین ہوتا - اس اعتبار سے نہین کہ وہان انسان کو رہنے سہنے کی کوئی تکلیف ہوتی ہے بلکہ محض اس بنا پر کہ یہان ہر ہر قدم پر ہر سمت اور ساری فضا مین سوا افسردگی، یاس، نالہ و شیون کے نہ کچھ نظر آتا ہے نہ کچھ اور محسوس ہوتا ہے درماندہ مریض اور حزین تیمار دارون کے تکلیف دہ منظر کو تندرست ڈاکٹر اور غالباً تندرست تر نرسون کی مستعدی اور کبک خرامی اور زیادہ وحشت یا افسردہ کن بناتی ہے - صفائی اور ستھراپن میرے نزدیک بہترین چیزین ہین - لیکن ہسپتال اور جیل خانہ کی صفائی اور ستھراپن میرے لئے اکثر وحشت انگیز ہوتا ہے مفصلات کے ہسپتال تو یون بھی کچھ معمولی اور ناصاف ہوتے ہین - وہان مرض اور مریض کا احساس زیادہ قوی یا موثر نہین ہوتا لیکن لکھنؤ میڈیکل کالج جسکی عمارت اور ساز سامان کو دیکھکر زیادہ صحیح معنون مین لکھنؤ ہی کے ایک مشہور شاعر کا شعر،

یہ کس رشک مسیحا کا مکان ہے   زمین جسکی چہارم آسمان ہے

بے اختیار یاد آجاتا ہے - میرے نظریہ کی ایک بین مثال ہے - ہر شخص پر نفسی نفسی کا عالم طاری ہوتا ہے کہین آہ وزاری ہے کہین نالہ و شیون اور کہین پر محض ایک گورستانی سکوت!

لیکن اس کا دوسرا پہلو اتنا ہی تابناک اور قابل قدر بھی ہے۔ عرفی کو آستانۂ محبوب سے

ہم شوق آمدہ بودم ہم حرمان رفتم

کہتے ہوئے پلٹنا پڑا تھا۔ لیکن ہسپتال بالخصوص لکھنؤ میڈیکل کالج کی حیثیت بلکل مختلف ہے۔ یہان مایوس آتا ہے اور بالعموم شادمان واپس ہوتا ہے۔ مشرقی شاعری یا دنیائے محبت مین چونکہ شاعر کو یہ حالت وحیثیت کبھی نصیب نہین ہوئی کہ وہ دیار محبوب مین مایوسانہ داخل ہوتا اور کامران واپس ہوتا اس لئے کافی غور وفکر کے بعد بھی مجھے کوئی شعر یا مصرعہ ایسا یاد نہ آیا جو عرفی کے مصرعہ کا جواب ہوتا۔

اس عمل جراحی کے بعد اکثر سوچتا ہون کہ موجودہ سائنس اور ایجادات نے فن جراحی کو کس حیرت انگیز درجہ تک بلند اور کامیاب بنادیا ہے اور ایک کامیاب اور ماہر فن سرجن کو اپنی استعداد اور اپنے فن کی کامیابی کا کیسا یقین محکم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بھاٹیا صاحب لکھنؤ میڈیکل کالج کے چیف سرجن ہین۔ انھون نے مجھے دیکھا اور حال سنا۔ کچھ دیر تک سکوت مین رہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی انکو مرض کی تشخیص پر پورا عبور نہین ہوا ہے تھوڑی دیر کے بعد کہا اچھا کپڑے اتار دیجئے اور ایک کوچ کی طرف اشارہ کرکے کہا اسپر لیٹ جائیے۔ انکے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مرض کی تہہ تک پہونچ جانے کا عزم کرچکے ہین۔ کچھ دیر تک صرف نظری جایزہ لیتے رہے۔ اسکے بعد جو ہاتھ ڈالا ہے تو معلوم ہوتا تھا کہ گویا مرض کو اپنے آہنی پنجہ مین گرفتار کرلیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر مین ایک مخصوص فاتحانہ لیکن دلنشین انداز تبسم کے ساتھ اپنا فیصلہ اس طور پر صادر کیا گویا تشخیص مرض ایک بہت معمولی سی بات تھی اور انکا غیر معمولی عارضی انہماک کچھ غیر ضروری سا تھا۔ حکیم عبدالمعید صاحب قبلہ جنکے خلوص، محبت اور ایثار وانسانیت کا مین اتنا ہی معترف ہون جتنا ایک شریف انسان کا شکر گذار قلب ہوسکتا ہے، ہمراہ تھے اس مرض کی نوعیت پر گفتگو فرمانے لگے۔ یہ مکالمہ کچھ فنی اور اصطلاحی حیثیت کا تھا جسکو مین پورے طور پر نہ سمجھ سکا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اپریشن کردیا جائے۔ مین نے دریافت کیا یہ آپریشن اندیشہ ناک ہوگا یا اُمید افزا، ڈاکٹر صاحب نے مسکراکر فرمایا ہر اپریشن خواہ جسم انسانی مین سوئی ہی چبھونا کیون نہ ہو اندیشہ سے خالی نہین لیکن آپ مطمئن رہین کامیابی کی پوری توقع ہے۔ میرے نزدیک میری تشخیص مکمل ہے اور چونکہ مین دیر مین اس نتیجہ پر پہونچا ہون اس لئے اُن پر نظر ثانی کرنے کے لیے آمادہ نہین ہون۔ چنانچہ بعد مین اکس ریز فوٹو اور قارورہ وغیرہ کے کیمیائی تحلیل اور جراثیمی امتحان نے ڈاکٹر صاحب کی تشخیص کی پورے طور پر تصدیق کی۔

بہرحال اپریشن ہوگیا اور جتنی کلفتین تھین وہ بھی گردہ کے ساتھ لکھنؤ میڈیکل کالج کے عجائب خانہ مین منتقل کردیگئین۔ مجھے تعجب ہے جسم انسان کے اندر سے کسی حصہ ماؤف کو اس طور پر علیحدہ کردینا کہ نظام جسمانی مین کوئی خلل نہ آئے بلکہ وہ ذریعۂ راحت بنجائے کتنا نازک، اہم، اور مشکل کام ہے جسے انسانی ذہن وفکر نے کسقدر آسان بنادیا ہے۔ ۲۵ منٹ تک کلوروفارم کی ماتحت بیہوش رکھنا اور پانچ چھ انچ لمبا شگاف دیکر ایک گردہ کو حرف غلط کی طرف مٹادینا اور پھر زخم کو ٹانکے دیکر مریض کو ہوش مین لانا اور ساری تکالیف سے آزاد کردینا کسقدر حیرت انگیز ہے۔

بعد مین معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بھاٹیا صاحب کیلئے اس قسم کے اپریشن محض ایک تفریحی حیثیت رکھتے ہین۔ یہی نہین بلکہ یہان آنے پر معلوم ہوا کہ پسلیون کو تراشکر پھیپھڑے پر عمل جراحی کر دینا اور پچکاری کے ذریعہ سے پیپ اور مادہ فاسد کو نکالدینا بھی یہان ہوتا رہتا ہے۔ اور ڈاکٹر بھاٹیا صاحب کے نزدیک۔

ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

کا مصداق ہے۔ بذات خود مین ڈاکٹر صاحب کے کمال فن کا اتنا ہی قائل ہون جتنا ملیریا کے علاج مین کونین کا یا عورتون کے ناقص العقل ہونے کا!

میری روزانہ دیکھ بھال کے انچارج ڈاکٹر صدیقی صاحب ام۔ بی۔ ایس تھے اور روزانہ کے ملنے والے ڈاکٹر ظریف صاحب (علیگ) ام۔ بی۔ ایس۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب کے بارہ مین میرا خیال ہے کہ کسی وقت وہ ذہانت اور خود اعتمادی مین اپنے استاد ڈاکٹر بھاٹیا صاحب سے کم نہ ہونگے۔ لیکن ابھی اسمین اتنا ہی عرصہ لگے گا جتنا کہ۔ ایک شاعر کے نزدیک "فتنہ" کو "قیامت" مین تبدیل ہونے کیلئے درکار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صدیقی کو مین نے اپنے بے بنیاد اندیشہ ناکیون لیکن صحیح شکایات مرض سے کافی پریشان کیا۔ اور انھون میرے اس قسم کی حماقت رائیون کا مضحکہ بھی خوب اُڑایا ہے۔ مین چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو وہ بیمار پڑ گئے اور ملیریا کے شکار ہوکر میرے ہمسایہ بنگئے۔ ڈاکٹر صدیقی کی تندرستی کچھ اسد رجہ "ادھوڑی استر" واقع ہوئی ہے کہ انکو ۱۰۲ درجہ کا بخار تھا اور خبر نہ تھی کہ بخار ہے۔ کہنے لگے مین عمر بھر بخار مین مبتلا نہین ہوا۔ اس لئے مجھکو احساس ہی نہین کہ بخار کیا چیز ہے اور کسطرح محسوس کیا جاتا ہے۔ مجھے ان سے خاص طور پر دلچسپی وانس ہے اور اس کا سبب انکا شگفتہ مزاج، غیر معمولی طور پر محنتی اور ٹنیس کا شایق ہونا ہے۔

ایسے لوگون کو دیکھکر مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ قضا و قدر کو مرض کی تقسیم مین زیادہ خوش مذاقی کا ثبوت دینا چاہیے ایک شگفتہ، آزاد اور وارستہ مزاج شخص کو صاحب فراش بنا دینا یقیناً بے معنی اور بد مزاقی ہے۔ ان لوگون کا کام مرض مین مبتلا ہونا نہین ہے۔ اس قسم کے لوگ تو صرف خوش رہنے اور خوش رکھنے کے لئے بنائے گئے ہین۔ ایک شخص جو زندگی اور معاشرت کے پابندیون سے آزاد ہے یعنی وہ جب چاہے کھائے پیے اور جب چاہے سو جائے، کام کرتے اور نہ کرنے مین کوئی چیز خلل انداز نہ ہوتی ہو۔ موقعہ پڑا تو وہ دھوپ اور لُو مین باہر گھوم رہا ہے اور جی چاہا تو تمام دن رات پڑا سو رہا ہے۔ کھاتے پینے کو جو کچھ ملا کھا پی لیا نہ اسکی شکایت کہ کھانا بُرا تھا یا دیر ہضم تھا اور نہ اسکی پرواہ کہ بہت اچھا تھا۔ نہ لباس کا غم اور نہ اچھے دھوبی اور نہ درزی کی تلاش۔ کبھی اس عالم مین ہے کہ نوکر پانی لائے اور گلاس منہ کو لگادے تو پانی پیا جائے اور کبھی ضرورت پیش آئے تو کوئین سے پانی کھینچ لانے مین بھی باک نہین۔ ایسے لوگون کو بیمار ڈالدینا۔ انکی اور مرض دونون کی توہین ہے اور یہ صرف "دھرن پر گھاس لادنے" کا مرادف ہے۔

بیمار ایسون کو ہونا چاہئے جو ہر چیز کا ایک پروگرام رکھتے ہون۔ ہر چیز مین احتیاط کے پابند ہون۔ برف نہین ہے تو زندگی دشوار وقت سے سونا یا کھانا نہ ملا تو چین بجبین۔ نوکر موجود نہ ہوا تو عضو معطل۔ دھوبی اچھا نہ ملا تو مکدر۔ درزی نے کپڑے خراب تیار کئے تو جامہ سے باہر۔ کسی نے تعریف کردی تو پھولے نہ سمائے اور کسی نے برا کہدیا تو شمشیر برہنہ، ڈرائنگ روم بھی ہے اور فرش فروش بھی، پنکھا بھی ہے اور حقہ بھی۔ اجابت کھل کر آئے تو زندگی دلچسپ اور ایسا نہ ہوا تو زندگی اور زندگی کے ساری متعلقات بلائے جان۔ ایسے لوگ بیمار پڑین تو بیماری کا پورا احترام بھی ہو۔ صاف بستر، صاف تولیہ صاف میز پوش۔ کہین سوڈا واٹر کی بوتلین بھیگ رہی ہین اور کہین چینی کے ظروف مین آش جو اور شوربہ رکھا ہوا ہے، ایکطرف سنترے رکھے ہوئے ہین دوسری طرف دوا کی شیشیان چنی ہوئی ہین ایک جانب "کھسل پڑنے" کے لیے "حاجتی" لگی ہوئی ہے ایک شخص پنکھا جھل رہا ہے دوسرا مکھیان، ہانک رہا ہے تیسرا ڈاکٹر یا حکیم کو بلانے جا رہا ہے۔ چوتھا دروازہ پر بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ کمرے مین سناٹا ہے اور تقریبًا ایک درجن دوست احباب اعزہ چارپائی کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے ہوئے ہین، مریض نے کروٹ کا ارادہ کیا اور ان مین سے ایک نے اُچک کر گلے مین یا کمر کے نیچے ہاتھ دیدیا۔ مریض نے بات کرنے کے لیے ذرا مونہ کھولا اور ان مین سے کسی نے آش جو سنبھالا اور کسی نے سنترہ کی قاب اور تیسرے نے اپنا کان مریض کے لبون سے لگا دیا۔ بقیہ نے ایکدوسرے کو آنکھ اور انگلی کے اشارہ سے دم بخود رہنے کی تاکید کی۔ غرضکہ یہ بیماری کے لطائف و ظرائف ہین۔ اور بیمار انہین لوگون کو ہونا چاہئے جو بیماری کے رکھ رکھاؤ پر قدرت رکھتے ہون۔

ڈاکٹر ظریف تو علیگڈھ کے گنہگارون مین سے ہین۔ انکے بارہ مین کیا کہنا۔ وہی خلوص، وہی آزادی، وہی بے تکلفی اور رواداری جو ایک علیگڈھ والے کو دوسرے علیگڈھ والے سے ہے۔ وہ جب کبھی آجاتے تھے تو پھر کیا تھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہین اور نہ مین مریض۔ وہی علیگڈھ ہے۔ وہی بیفکری ہے اور وہی فضا اور وقت، دلجمعی ہے اور خوش گپتی۔ مجھے اُن لوگون پر ترس آتا ہے جو علیگڈھ مین طالب علمانہ زندگی نہین بسر کر سکے ہین۔ علیگڈھ کے "واقف کار" اور "ہمدرد" بنکر اوس پر اعتراض کرتے ہین۔ اِن سے کوئی پوچھے کہ تم علیگڈھ کے مسرتون سے کیا واقف تمکو کیا معلوم اس نام مین کیا جاذبیت ہے۔ اور یہ نام کیسا محبوب ہے! بعض کہین گے دیکھتے نہین آج خود علیگڈھ والے علیگڈھ کو برا بھلا کہتے ہین، مین کہتا ہون یہ تمھاری کم فہمی اور سطحیت ہے جو ایسا کہتے ہو کوئی علیگڈھ والا علیگڈھ کو برا نہین کہتا کیونکہ وہ ایسا کر نہین سکتا۔ وہ علیگڈھ والونکو برا کہتا ہوگا اُس کے اور اسباب ہین جنپر یہان اظہار خیال کی ضرورت نہین اور کالج سے کون منحرف ہو سکتا ہے۔ کسی علیگڈھ والے کے سامنے علیگڈھ کا نام لیجئے پھر دیکھئے وہ چشم زدن مین کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے مصائب اور مناسب سب کچھ بھول جائے گا۔ اور تھوڑی دیر کیلئے اس کا تصور اسکو زمان و مکان سے آزاد کر کے اُسے مادر کالج کی آغوش مین پہونچا دیگا۔ وہی کمرے وہی ڈائننگ ہال،

وہی مسجد، وہی یونین، وہی کچی بارک، وہی کرکیٹ فیلڈ، وہی شرارتین، وہی صحبتین، وہی بیفکری، سب کچھ وہی جس سے وہ اب دور ہے۔

آنکھین اسکو ڈھونڈھتی ہین دل اس کا گرویدہ ہے

مین خود جب علی گڑھ سے باہر گیا اور کسی علی گڑھ والے سے ملاقات ہوئی تو کچھ ایسا معلوم ہونے لگا گویا خود کالج مین ہون۔ اور اب مجھے اجنبی یا غریب الدیار محسوس کرنے کی کوئی وجہ نہین ہے سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ایک علیگڈھ والا دوسرے علی گڈہ والے سے ملتا ہے تو پھر بالعموم اسکو تکلف رکھ رکھاؤ یا تصنّع کی ضرورت نہین محسوس ہوتی یہی نہین بلکہ ان چیزون سے نفرت ہو جاتی ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا ہم دونون ایکدوسرے کے پشتہا پشت سے واقف ہین۔ اس کا یہ مطلب نہین کہ ایکدوسرے کی کمزوری یا اس کے خاندانی حالت سے واقف ہوتے ہین بلکہ علی گڈہ بجائے خود ایک ،،قومیت،، ایک ،،خاندان،، معلوم ہونے لگتا ہے اگر ایک وایسرائے ہے اور دوسرا محض ایک کلرک لیکن دونون ،،پروردۂ علی گڑہ،، ہین تو اس طور پر ملین گے یا ملنے کا جی چاہیگا گویا دونون ایک سطح پر ہین وہی سطح جو علی گڑہ نے قائم کی ہے۔

بات مین بات نکلتی آتی ہے مین ایک وقت سفر کر رہا تھا، انبالہ کے اسٹیشن پر آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کوئی بزرگ نوٹ اور روپیون کا بٹوا میرے تکیہ کے نیچے سے نکالکر فرار ہو گئے ہین۔ مجھے جلد سے جلد منزل مقصود پر پہونچنا تھا اب ایک ایسے اجنبی مقام پر یہ حادثہ پیش آیا کہ تھوڑی دیر کے لیئے مین پریشان ہو گیا۔ مین کالکا پر اتنی دیر کے لیئے بھی نہین ٹھہر سکتا تھا کہ روپیون کے لیئے علی گڑہ تار دیتا۔ معاً خیال آیا دیکھون کوئی علی گڈہ والا تو سفر نہین کر رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر اتر کر دو ہی چار قدم گیا ہونگا کہ ایک صاحب میرے ہی طرف آتے نظر آئے۔ معمولی علیک سلیک کے بعد مین نے دریافت کیا آپ علی گڑہ سے آرہے ہین۔ فرمایا۔ ہان۔ مین نے کہا جا کہان رہے ہین، کہنے لگے شملہ بھائی کے پاس۔ مین نے پوچھا مجھے پہچانتے ہین کہا۔ جی ہان۔ مین نے کہا میری نقدی کوئی صاحب لے کر چلدیئے۔ آپ کے پاس جتنے روپے ہون مجھے دیدیجئے۔ آپکو علیگڈہ سے روپیہ پہونچ جائے گا۔ چنانچہ انھون نے کافی روپے دیدئے۔ مین نے علیگڈہ خط لکھدیا اور روپیہ انکے پاس شملہ پہونچ گئے، اور ساری تشویش لمحہ بھر مین ختم ہو گئی۔

،،داخل ہسپتال،، مریضون کی دیکھ بھال تقریباً تمامتر نرسون (Nurses) سسٹرز (Sisters) اور میٹرن (Matron) کے سپرد ہے اور یہ اپنے فرایض کو اس خوبی، تندہی اور ذمہ داری کے ساتھ ادا کرتی ہین کہ بیان سے باہر، انکی جفاکشی اور احساس ذمہ داری، نفاست، اور خوش سلیقگی کا اثر مجھپر نہایت اچھا اور گہرا پڑا ہے انکو سخت سے سخت اور پست سے پست کام کرنے مین کبھی عار نہین ہوا۔ اور مریض کی صحت اور عافیت کے مقابلہ مین یہ خود اپنی صحت اور عافیت کا

خیال نہین کرتین - ان مین انگریز بھی ہین - انگلو انڈین بھی اور ہندوستانی عیسائی بھی - لیکن جہانتک میرا خیال ہے انہین "مدھم روش" یہی تیسرے درجہ کی ہین!-

اُنکے اوقات فرایض ۸ بجے دن سے ۸ بجے رات اور ۸ بجے رات سے ۸ بجے دن ہین - اس دوران مین مشکل سے کھانے پینے کے لئے یہ ایک آدھ گھنٹہ کے لیے ساکت ہوتی ہین - ورنہ مسلسل مصروف و منہمک رہین گی - میرا اندازتو یہ ہے کہ ۱۲ گھنٹہ مین یہ کم سے کم پانچ چھ میل کی پیادہ مسافت تو ضرور طے کرتی ہین - مین یہان پر ایک خاص نرس کا تذکرہ ضرور کرونگا - اسکی ڈیوٹی رات کی ہوا کرتی تھی - مجھے نہین معلوم دوا دینے ٹمپریچر لینے اور عام دیکھ بھال کے جو اوقات ہین اس مین اس نے ایک منٹ کے تفاوت سے بھی کام لیا ہو، ہمیشہ ہر کام کو ٹھیک وقت سے ادا کرنا اس کا کام تھا - اپریشن کے بعد کی چار پانچ راتین مجھپر سخت گزرین - یہ ہمیشہ آجایا کرتی تھی - کبھی دوا لاتی، کبھی مارفیا کا انجکشن دیتی اور کبھی یون بھی خیریت پوچھ جاتی - ایک ہفتہ بعد جب مجھے کوئی خاص تکلیف باقی نہین رہی تھی تو یہ حسب معمول ۲ بجے رات کو ٹمپریچر لینے آئی، مین جاگ رہا تھا، پوچھا کیسے ہو! مین نے کہا یون تو اچھا ہون لیکن پڑے پڑے کچھ بیوقوف سا محسوس کرنے لگا ہون - کہنے لگی سوجاؤ یہ احساس جاتا رہیگا، مین نے کہا اس مین یہ خرابی ہے کہ پھر دوسرے احمق سمجھنے لگین گے - کہنے لگی یہ حالت پہلے سے بہرحال بہتر ہے - ایکدن مجھے برآمدہ مین ٹہلتا دیکھکر پوچھا کہو، تمھاری عجیب غریب احساس کا اب کیا عالم ہے - مین نے کہا کیا اس کا اندازہ تمکو ٹمپریچر سے نہین ہوا!!-

ہسپتال مین مریضون سے ملنے کے خاص اوقات ہین - مثلاً آج کل صرف پانچ سے سات بجے شام تک اسکے علاوہ کسی دوسرے وقت ملنا جلنا قطعاً ناممکن ہے لیکن ہم ہندوستانیون کو اس پابندی سے کیا سروکار - اُنکے نزدیک اُنکے اوقات فرصت اس قسم کی پابندیون سے بے نیاز ہین - اس سلسلہ مین بعض دلچسپ واقعات بھی پیش آئے - لیکن انکا ضبط تحریر مین لانا غیر مناسب ہے، یہان ایک "مسز پنکھرسٹ" تھین جو ملنے ملانے کے بارہ مین ہسپتال کے قواعد کی نہایت شدت کے ساتھ پابندی کرتی تھین - انکے تیور اور عتاب کو دیکھکر، عام طور پر غصہ، حقارت یا جھنجھلاہٹ محسوس کرنے کے بجائے انسان پر کچھ اس درجہ خجالت طاری ہوتی تھی کہ وہ بغیر زبان ہلائے ہسپتال سے باہر ہوجاتا تھا -

میرے ایک قدیم دوست، اسکول کے ساتھی لکھنؤ مین مل گئے، مین انکو شروع زمانہ طالب علمی ہی سے "بور" سمجھتا تھا جس کا اردو مفہوم کسی قدر "بلائے جان" "عافیت سوز" یا "مخل عافیت" ہوسکتا ہے - پستہ قد، چیچک رو، سیاہ فام، سبک خرام، ذرا چھچھلے، کافی بیوقوف لیکن اپنی دانست مین فرزانہ، عمر اپنی کبھی نہین بتاتے تھے - اور اس قسم کے تذکرہ سے بہت جلد غضبناک ہوجاتے تھے - انکو ہمیشہ اسکی حسرت رہی ہے کہ کوئی کردیتی حسینہ

انپر عاشق کیون نہ ہو گئی، ہر قسم کا لباس زیب تن فرماتے تھے۔ اور لوگون کے ہنسنے یا مذاق اُڑانے سے اِسے فوراً ترک بھی فرمادیتے تھے۔ بہت جلد فریفتہ ہوجانیکے عادی تھے۔ خود بخود کبھی نہین بلکہ دو چار آدمی اسبارہ مین اصرار کرین تو پھر انکا عاشق ہوجانا۔ یقینی تھا۔ یہ ہمیشہ ممنوعہ اوقات مین مرے پاس آتے اور نکالے نہ جاتے تو گھنٹون میرے مرض اور اپنے کارنامون پر اس طور سے گفتگو کرتے گویا مرض اور اپریشن کے اعتبار سے مین نرا احمق ہون اور اپنے کارنامون کے اعتبار سے یہ لارڈ ریڈنگ کے حریف! دنیا مین جتنے وبائی امراض یا آفات ارضی وسماوی ہوسکتے ہین، باری باری یہ سب کے مورد رہے۔ اِنکے اثرات کچھ تو جسم پر نظر آتے ہین اور بقیہ دماغ پر مستولی ہین۔ علی گڑھ کا خواب بھی نہین دیکھا ہے کہین علیگڈھ کے حالات اور وہانکے زندگی پر اس خود اعتمادی اور وثوق کے ساتھ گفتگو کرتے تھے گویا خود مین نے پندرہ سال تک علی گڑھ مین بھاڑ جھونکا ہے اور یہ کالج کے کھلنڈرے رہ چکے ہین یا کورٹ کے ممبر ہین۔ مجھپر ہمیشہ مہربان رہے اور اس کا سبب محض یہ ہے کہ مین نے ہمیشہ اپنے آپ کو ان کے سامنے ایک نیازمند کی حیثیت سے پیش کیا۔ اور انکی ہر حماقت پر سر تسلیم خم کیا۔

ہمارے دوست کو نرسون سے خاص دلچسپی تھی۔ اور اکثر اِنسے اُلجھنے یا سُلجھنے کی کوشش فرماتے اور مجھے اس وقت خاص لطف آتا جب یہ گھبرا کر یا غلط انگریزی کی رو مین "یس سر" (Yes Sir) یا "نو سر" (No Sir) فرماجایا کرتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن "مسنر نیکھرسٹ" سے یہ بھی گھبراتے تھے اور آتے ہی دریافت فرماتے "اور کیون جی کھین "اس" کے آنے کا تو وقت نہین ہے!"

ہمارے اِن دوست کو میرے کمرہ کا غسلخانہ بے حد پسند آگیا تھا۔ اور سپید، صاف اور کشادہ ٹب کو پانی سے لبریز دیکھکر اکثر غور فرمایا کرتے تھے۔ انکو معلوم نہ تھا کہ یہ غسل کرنیکا ٹب ہے۔ لیکن جب معلوم ہوا تو اس کا "پرچہ ترکیب استعمال" دریافت فرمانے لگے مین نے کہا اس مین نہانے کی مشق ہونا چاہیے۔ ورنہ اسمین داخل ہو کر نکلنا دشوار ہوجاتا ہے اور اکثر تو نادانستگی مین لوگون کی جانین تلف ہو گئی ہین۔ کہنے لگے اور یہ ٹب کے سرہانے لمبی لمبی برنجی سلاخین کیسی ہین مین نے کہا اس مین ایک لمبی رسی باندھ لیتے ہین اور نہاتے وقت اس رسی کو مضبوط پکڑے رہتے ہین اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ کودتے اچھلتے، اور ڈبکیان لگاتے رہتے ہین۔ کہنے لگے بھئی آخر تم لوگ کیسے نہاتے ہو۔ مین نے کہا دیکھئے نہین یہ ربڑ کا حلقہ رکھا ہوا ہے یہ "لایف بلٹ" ہے اسکو گلے مین ڈال لیتے ہین پھر ڈوبنے کا امکان نہین تھا۔ اصل مین یہ ربڑ کا حلقہ جسکے اندر ہوا بھردیجاتی ہے اُن مریضون کے بیٹھنے اور لیٹنے کے لیے ہوتا ہے جو عرصہ تک صاحب فراش رہے ہون یا جنکے عرصہ تک صاحب فراش رہنے کا امکان ہوتا کہ انکی بیٹھ یا کمر مجروح نہ ہونے پائے۔ کہنے لگے بھئی کچھ ہو اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات کہون۔

مین نے کہا شوق سے فرمائے، کہنے لگے مین ایکدن اس غسلخانہ مین نہانا چاہتا ہون - مین نے کہا بسم اللہ، ابھی کہنے لگے برہنہ نہانا تو شرعاً ممنوع ہے، مین نے کہا اپنی قمیص تہمد کے طور پر باندھ لو، فرمایا واہ پھر پہنون گا کیا، مین نے کہا میری قمیص بکس مین سے نکال لینا۔ بہت خوش ہوے، فوراً قمیص سے ستر پوشی کی، ربڑ کا حلقہ گلے مین ڈالا اور غسلخانہ مین داخل ہوگئے کہنے لگے ارے میان وہ رسی کہان ہے - مین نے کہا رسی تو شاید جلد نہ مل سکے - مین تو اُس کا کام کمربند سے لیا کرتا ہون یہ سنکر بیحد سرور ہوے - مین نے کہا دیکھو کوئی مشکل پیش آئے تو تکلف نہ کرنا آواز دیدینا، مین آجاؤنگا - یہ سنکر باہر نکل آئے اور فرمایا کہ کیا جی تمنے مجکو طفل مکتب سمجھ لیا ہے - مین نے کہا بھئی ناراض مت ہو - مین نے یونہی کہدیا آخر حرج ہی کیا ہے۔ فرمانے لگے اتنے احتیاط کے پابند تھے تو اپریشن ہی کیون کرایا، ابھی اور تقریر کرنے والے تھے کہ مین انکے حلیہ اور ارادہ دونون سے گھبرایا۔ مین نے کہا اچھا نہانا ہے تو جلدی کرو ورنہ پانی گرم ہو جائے گا اور سارا لطف جاتا رہیگا - غسلخانہ کا کواڑ بند نہ کرنا شاید مجھکو کوئی ضرورت پیش آجائے - غرض یہ گنگناتے ہوے غسلخانہ مین داخل ہوے، اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ ٹب مین دو مگرمچھ ایکدوسرے سے اختلاط یا اختلاف کر رہے ہین - تھوڑی دیر مین مین نے "مسز پنکھرسٹ" کے پاؤن کی چاپ سنی اور جھوٹ موٹ سوتا بنگیا - معزز خاتون داخل ہوئین، مجھے سوتا اور غسلخانہ مین بے پناہ ہنگامہ سنکر سیدھے غسلخانہ کی جانب بڑھین - چونکہ دروازہ اندر سے بند نہ تھا اور باہر سے معلوم بھی ہوتا تھا کہ بند نہین ہے ہماری ہیروئن دروازہ کھولکر یکلخت غسلخانہ مین داخل ہوگئین اور ساتھ ہی ساتھ دو بڑی چیخین سنائی دین ! -

اس دور ابتلا مین مجھپر جو گذرا وہ ظاہر ہے - احباب، اعزہ اور بزرگون نے تشویش اور اضطراب کے جو لمحات گزارے وہ میرے لئے بیماری مین پریشان کُن تھے اور اب جبکہ صحتیاب ہوکر پھر اُنکی صحبت سے لطف اندوز ہونے اور اُنکے دامن عافیت مین پناہ گزین ہونے جارہا ہون میرے لئے انتہائی باعث تشکر و مسرت ہین - میرا ایمان ہے کہ اس بارہ مین مین غیر معمولی طور پر خوش نصیب ہون - دعا ہے کہ انکو میرے لئے آیندہ پھر کبھی اتنا پریشان اور مضطرب نہ ہونا پڑے اور نہ کوئی اب موقع آئے کہ مین انکے لئے پریشان اور مضطرب ہون - آمین

خدا حافظ -

(رشید احمد صدیقی)

علم فراست الید | اگر آپنے ابتک نہین ملاحظہ کی تو اب طلب فرمائیے۔ قیمت علاوہ محصول (۱؎)
(مینجر نگار)

باب المراسلۃ والمناظرۃ

عبادت کی معنوی وصوری حیثیت

گزشتہ ماہ کے رسالہ مین بہ سلسلۂ ملاحظات مین نے عرض کیا تھا کہ اس مہینے کی اشاعت مین مدیرہ مُبصر کے اُس اعتراض کا جواب پیش کرونگا، جو مسئلۂ عبادت کے متعلق انھون نے مجھ پر کیا ہے۔ ہر چند بہ حالت موجودہ جبکہ بعض نہایت عزیز ہستیان بستر درد وعلالت "پر پڑی کراہ رہی ہین میرے لئے ایک لفظ لکھنا بھی دشوار ہے، لیکن اس خیال سے کہ ناظرینِ نگار اس مہینے ایفاءِ عدہ کے منتظر ہونگے، مختصراً اپنے خیالات پیش کرتا ہون۔ ہر چند یہ بحث بہت طویل وبسیط گفتگو کی محتاج ہے، لیکن افسوس ہے کہ پراگندگی حواس کی وجہ سے حد درجہ ایجاز واختصار سے کام لے رہا ہون۔

مئی کے باب الاستفسار مین جو کچھ مین نے مذہب کے متعلق لکھا تھا اسپر جناب ناطق نے جو اعتراضات کئے ہین ان مین سے صرف دو جواب طلب ہین (۱) اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم مخصوص مسلمانون کے لئے ہے اور انھین کو خطاب کیا گیا اس لئے "دایرۂ اسلام" سے خارج ہونے والے اس تعریف (definition) مین نہین آتے۔ (۲) مین نے لکھا تھا کہ جہان جہان کلام مجید مین عبادات کا ذکر ہے وہین ان کی غرض و غایت بھی بتادی ہے۔ اسپر جناب ناطق نے چند آیات کلام مجید سے پیش کرکے فرمایا ہے کہ ان مین عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کوئی غرض وغایت نہین بتائی گئی۔

امر اول کے متعلق باوجود اس اعتراف کے کہ آیت مین مسلمانون سے خطاب کیا گیا ہے اصول قرآن کے صرف خاص نکتہ کے اظہار پر کفایت کرونگا کہ تمام احکام اخلاقی خواہ انکا مخاطب کوئی ہو ہمیشہ عام ہوا کرتے ہین اور انکا دائرہ تمام عامۃ الناس کیلئے وسیع ہوا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ کلام مجید صرف مسلمانون کیلئے نازل ہوا ہے اور اس مین غیر مسلمانون کے لئے کوئی ہدایت موجود نہین ہے اگر محض کریم الاخلاق ہونا کوئی فعل محمود ہے تو وہ ہر جگہ اور ہر وقت ویسا ہی ہے۔ اور کوئی وجہ نہین کہ ناطق صاحب چونکہ وہ مسلمان ہین) اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے متقی کہلائین اور گنگا دہر کے مکارم صفات (غیر مسلم ہونے کے لحاظ سے) بالکل بے معنی چیز قرار دیئے جائین۔

چونکہ اخلاق حسنہ کا تعلق بالکل نظام تمدن سے ہے اسلئے ہر وہ شخص جس کے اخلاق بلند ہین سلسلۂ تمدن، کا ایک صالح فرد کہلائے گا اور اس غایت کے لحاظ سے اس کی تعریف کیجائے گی خواہ وہ کسی ملک وملت کا ہو۔ چنانچہ رسول اللّٰہ کا بعض غیر مسلم اکابر واعاظم کی تعریف کرنا اسی بنا پر تھا۔

امر دوم کے متعلق جناب ناطق کا اعتراض صرف اس عقیدہ کی بنا پر ہے کہ وہ عبادت کے معنی صرف روزہ نماز وغیرہ کے لیتے ہین، حالانکہ عبادت سے جو چیز مراد ہے وہ اس سے بہت بلند ہے اور کلام مجید مین کسی ایک جگہ بھی نماز کے مخصوص

ارکان کا ذکر نہ کرنا اسی بنا پر ہے کہ وہان عبادت سے مقصود کوئی خاص طریقۂ نیایش نہین تھا۔

کلام مجید مین چار لفظ یا ان کے مشتقات ایسے ہین جن سے بندگی کا مفہوم کھُلے طور پر ظاہر ہوتا ہے اور وہ چار لفظ "عبادت، صلوٰۃ، رکوع و سجود"، ہین۔ لیکن مین یہ ماننے کے لئے طیار نہین کہ ان مین سے کوئی لفظ ہماری موجودہ نماز کے لئے کلام مجید مین استعمال ہوا ہے۔

(۱) لفظ صلوٰۃ، عربی زبان کا لفظ نہین ہے بلکہ وہ ارمی زبان سے لیا گیا ہے اور اس امر کا ثبوت کہ اس سے مراد موجودہ ہیئت نماز نہین ہے خود قرآن سے دو طرح ہو سکتا ہے ایک تو یہ کہ غیر مسلم لوگون کے طریقۂ عبادت کو بھی جو نماز سے بالکل علیحدہ چیز تھی لفظ صلات سے تعبیر کیا گیا ہے ملاحظہ ہو سورۂ انفال کی چھبیسوین (۲۶) آیت:۔ وما کان صلاتھم عند البیت الا مکاءً وتصدیۃ ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر طریقۂ عبادت کو خواہ وہ نماز کی صورت مین ہون یا ناقوس و گھنٹہ کی صورت مین صلات کہہ سکتے ہین۔

دوسرا ثبوت اس امر کا کہ صلوٰۃ کے معنی نماز کے نہین بلکہ خیر و برکت اور دعا کے معنی مین بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، ذیل کی آیتون سے ہوتا ہے:۔

(۱) ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی ۔ یہان لفظ صلات کی نسبت خدا اور ملائکہ کے ساتھ کیگئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ میان اور ان کے فرشتون نے کبھی نماز نہین پڑھی۔

(۲) یاایھا الذین آمنو صلو علیہ وسلمو تسلیما۔ یہان صلوٰۃ کے معنی کھلے طور پر دعا اور طلب خیر و برکت کے ہین۔

تیسرا ثبوت اس امر کا کہ صلوٰۃ سے مقصود مخصوص حرکات نہین ہین۔ یہ بھی ہے کہ صبح کی عبادت کو سورۂ بنی اسرائیل مین "قرآن الفجر" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے اسی طرح سورۂ طٰہٰ مین صلوٰۃ کو صرف تسبیح و تہلیل بتایا ہے:۔

وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا ومن انائ اللیل واطراف النھار لعلک ترضی

دوسرا لفظ عبادت ہے جس کے مشتقات کی چند آیتین جناب ناطق نے نقل کی ہین اور اپنے پندارمین اس کا مفہوم صرف نماز قرار دیا ہے حالانکہ جب لفظ صلوٰۃ، موجودہ نماز کے لئے کلام مجید مین استعمال نہین ہوا تو لفظ عبادت اور اس کے مشتقات نماز کے معنی مین کیا استعمال ہو سکتے ہین۔ کلام مجید مین ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ۔ اگر لیعبدون سے مراد نماز پڑھنا ہو تو معنے یہ ہونگے کہ انس و جن صرف اسلئے پیدا کئے گئے ہین کہ ہر وقت نمازین پڑھتے رہین یا نماز کی طرح کوئی نہ کوئی عبادت کرتے رہین، حالانکہ حقیقت یہ نہین ہے اور عبادت یا نماز کی تقسیم اوقات خود اس کو ظاہر کرتی ہے کہ ہر وقت عبادت کرتے رہنا مقصود نہین ہے۔ اب رہگئے الفاظ رکوع و سجود کے جن سے بظاہر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ نماز کے رکوع

وسجود مراد ہین۔ سو خود کلام مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ رکوع کے معنے گھٹنون پر ہات رکھکر جُھک جانے کے ہین اور نہ سجود کا مفہوم یہ ہے کہ سر کو زمین پر ٹیک دیا جائے۔

سورۂ رحمان مین ارشاد ہوتا ہے:- والنجم والشجر یسجدان حالانکہ ان مین سے کوئی اپنا ماتھا زمین پر نہین رگڑتے۔ اس طرح سورۂ نحل مین:- وللہ یسجد مافی السموات ومافی الارض من دابۃ و الخ حالانکہ یہ بھی غلط ہے کہ کائنات مین جو چیز ہے وہ ہر وقت اپنی پیشانی کو زمین پر ٹیکے رہتی ہے۔

رکوع کا لفظ بھی جھک جانے کے معنی مین نہین آیا ہے جس کا ثبوت سورۂ آل عمران کی یہ آیت ہے:- یامریم اقنتی لربک واسجدی وارکعی مع الراکعین۔ اس آیت مین جناب مریم کو ہدایت ہوتی ہے کہ سجدہ کرو اور رکوع کرو رکوع کرنے والون کے ساتھ۔ اگر رکوع وسجود سے مراد مسلمانون کی نماز کا رکوع وسجود ہو تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ اُسوقت یہود ونصاریٰ کے طریق عبادت کی بھی یہی صورت تھی۔ حالانکہ اُن کی نماز مین اسلامی نماز کا رکوع وسجود کبھی شامل نہین تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ رکوع وسجود کا مفہوم وہ نہین ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

اسلئے کلام مجید مین لفظ عبادت، صلوٰۃ، رکوع وسجود سب ایک ہی معنی مین استعمال ہوئے ہین اور وہ معنی یقیناً ظاہری اوضاع نماز سے بہت بلند ہین۔

وہ معنی کیا ہین، وہ مفہوم خداوندی کیا ہے؟ اس کو ظاہر کرنے کے لیے جس طرح دفتر کے دفتر ناکافی ہین اسی طرح صرف ایک فقرہ بھی کافی ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ ان تمام الفاظ مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر کیفیت عبودیت پیدا کرے۔ اور عبودیت نام ہے قوانین فطرت رموز قدرت اور سنن الٰہیہ پر کاربند ہونے کا اور اُس قوتِ بے ہمتا کے برکات ونعایم پر شکر ادا کرتے ہوئے ان سے فایدہ اُٹھانے کا۔ صلوٰۃ کو تسبیح وتہلیل کہنا اسی بنا پر ہے اور جن وانس کو عبادت ہی کے لئے پیدا کرنے کا بھی یہی منشا ہے، ورنہ صرف خدا کے نام کو انگلیون پر شمار کرتے رہنا محض جھک جانا یا سجدہ مین گر پڑنا بالکل فعل عبث ہے اور اُس سے کوئی نتیجہ مترتب نہین ہوتا۔ مین نے جو یہ عرض کیا تھا کہ کلام مجید مین جہان جہان عبادت کا حکم دیا ہے وہین اس کی غرض وغایت بھی ظاہر کردی ہے اس بنا پر تھا کہ یہ تمام الفاظ خود اپنے مفہوم کے لحاظ سے اسقدر بلند وعمیق ہین کہ محض ظاہری ورسمی طریق عبادت پر منطبق نہین ہوسکتے اور اپنے اندر وہ تمام ہدایات پوشیدہ رکھتے ہین جو واقعی ایک نماز کو نماز بنانے والے ہین۔ پھر کلام مجید مین صرف بلاغت سے کام نہین لیا گیا بلکہ کہین کہین اُس کی وہ صراحت بھی کردی گئی ہے جس کے جناب ناطق صاحب محتاج ہین اور غالباً تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر والی آیت انھین بھی معلوم ہوگی۔

ابتداءِ اسلام مین نماز کا رواج نہ تھا۔ بعد کو نہ محض یہود ونصاریٰ کے تقلید مین بلکہ اس لئے بھی کہ نظام جماعت قایم رکھنے کے لئے اور اجتماعی حیثیت پیدا کرنے کے لئے کوئی صورت پرستش ونیایش کی پیدا کرنا چاہیے، نماز کا موجودہ طریقہ پیدا کیا گیا، جو یقیناً نہایت عمدہ ہے اگر واقعی اس کی اصلی غرض وغایت فوت نہ ہوجائے۔

مین نماز کا مخالف نہین ہون بلکہ اس کو بہترین طریق عبادت جانتا ہون لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ کلام مجید مین اس نماز کا کہین ذکر نہین ہے اور نہ خدا کی بتائی ہوی عبادت کسی رسم و رواج یا ظاہری نقوش و حرکات کے پابند ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر مصالح اجتماعی کی بنا پر ایک صورت قائم کر دی گئی ہے تو اس کی پابندی یقیناً فرض ہے اور اس کا تارک نظام قومی اور سوسائٹی کا مجرم ہے۔ "نیاز"

(۲)

مغالطہ کو دیکھ کر

علامہ "نیاز"!

تسلیم، "نگار" اشاعت جون کا "مغالطہ ذرا ہٹا کر" میرے سامنے ہے، آخری فقرہ ملاحظہ ہو۔

ایک صاحب۔ اور مین جن کا .... تا .... معنون کر دیا جائے گا"

صدیقی صاحب کا یہ عالی پایہ مضمون واقعی بلا تعنون رہنا ناموزون ہے انھین اس انتساب کے لئے ایک ایسے عقیل کی ضرورت ہے۔ جسے خداداد عقل کے ساتھ علم غیب پر بھی کچھ دسترس حاصل ہو۔

مین قہستانی دنیا کا ایک فرد لمعاتِ علوم و فنون سے ہرچند بیگانہ ہون، تاہم رموز و اسرارِ حیات سے کلیۃً ناواقف نہین اعقل مخصوص سے گو بے بہرہ ہون۔ لیکن شعور عام سے مستثنیٰ نہین مجھے آغاز سے صاحب تصنیف بننے کا شوق تا بحد دیوانگی دامنگیر ہے کئی دفعہ دماغ مین سمایا۔ کہ گلستان کو رومن مین لکھ کر صاحبِ تصنیف ہونے کا اعزاز حاصل کرون، کبھی خیال آیا کہ ہیملٹ کے سرورق سے شیکسپئر کا نام کاٹ کر مفت مین اجارہ دارِ "بقاءِ دوام" ہو جاؤن، بسا اوقات خیال کرتا ہون۔ کہ جرمنی مین جا کر "آبِ حیات" اپنے نام پر طبع کرا دُن، یہ سب کچھ دماغ مین آتا ہے، لیکن کرتا اسلئے نہین، کہ شاید کوئی موضوع حسبِ ذوق مِل جائے۔ اور ہم بلا منتِ غیرے واصلِ منزل ہون۔

آج رشید صاحب کا یہ وعدہ دیکھکر کہ وُہ اس مضمون کا انتساب صرف اُس صاحب سے کرینگے۔ جو تمام دنیا کو مبتلائے مغالطہ سمجھنے والے کا نام بتلا دین۔ کچھ عرض کرنا چاہتا ہون۔

یہ صاحب خود رشید احمد صدیقی ہین جو تمام عالم کو زندانی مغالطہ سمجھنے کے خوگر ہین۔

حضرت نیاز! دیکھیے۔ گو مین آپ کے رسالہ کا باقاعدہ خریدار نہین اور اسلئے کسی رعایت کی تمنا آپ سے یا کسی ایسے ایڈیٹر سے رکھنا (جب کے رسالہ ہم ہر ماہ مفت پڑھ لیتے ہون) "عبث ہے، تاہم آپ کی آزادہ روی، بلند عزمی، فراخ مشربی اور "علما بر اندازی" پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے امید واثق ہے، کہ آپ رشید احمد صاحب کے ہان تعنون کے لئے صرف میرا نام پیش فرمائینگے، مجھے رشید احمد صاحب کا پتہ معلوم نہین، ورنہ مین انھین اسقدر متاثر کرتا۔ کہ وہ چار و ناچار یہ انتساب منظور فرما لیتے

اب کے اتفاقاً صاحبِ انتساب ہونے کا ایک زرین موقعہ بروئے کار آگیا ہے، اور اس لئے کہ ہمین صاحبِ تصنیف وصاحبِ انتساب بننے کا جنون "بلا مبالغہ" تا "بحد مبالغہ" ہے، اسلئے "ہم" کمرر آپ سے ملتجی ہوتے ہین (ہم کا لفظ اسلئے استعمال کر رہا ہون۔ کہ مین اور میرے اشواق متعددہ مل کر یقیناً صیغۂ جمع بنانے مین کامیاب ہو رہے ہین، آخر حضرت ابراہیم بھی تو انھین مختلف ولولون، اور متعدد۔ آرزو ہائے عمل کی بنا پر "امتہ واحدہ" بن گئے۔ ہم کیون "ہم" تک باین ہمہ ہنگامہائے شوق نہ بن سکین، کہ آپ ہماری پر زور الفاظ مین سفارش فرما کر ہمین صدیقی صاحب کے بلند پایہ مضمون کا انتساب حاصل کرنے مین کامیاب بنا دین، ہم بشرطِ کامیابی آپکے دربارِ بے نیاز مین متعدد تحفہ ہائے نیاز بصورت ذیل پیش کرینگے۔

(۱) ہم ریش مبارک کے بقیۃ الآثار کو رخصت فرما دین گے۔

(۲) ہمین عربی سے کچھ لگاؤ پیدا ہو رہا ہے آپکے خاطر ترک فرما دین گے۔

(۳) آپ کا ایک مضمون پڑھ کر نمازون کی تعداد مین ۲ اور ۵ کی نسبت سے کمی کر دی تھی، آیندہ کے لئے انشاءاللہ مضمون جدید کے ماحصل کو دیکھتے ہوئے شکل وصورت مین حسب خواہش تغیر وتبدل کر دین گے۔

(۴) مذہب وملت کے نظام کہنہ کو برہم کرتے ہوئے ہم ایک ایسے آزاد حریت، دوست اور سہل ممتنع دین کی بنیاد ڈالین گے، کہ جو خدائے عالم کے بجائے متمدن دنیا کی نئے پود کا صحیح ترجمان ہو گا۔

(۵) ہم دنیا کے ہر مسئلہ پر آلہیاتی ہو یا طبعیاتی، نفسیاتی ہو یا نباتاتی منطقی ہو یا فقہی الغرض کسی علم سے تعلق رکھتا ہو، بے ساختہ، بے تحاشا اور بے باکانہ قلم اُٹھائینگے، نقص بیان، ضعفِ استدلال اور نقاہت معقولیت پر تابناک الفاظ اور جمیل تراکیب کا حجاب ڈال دینگے۔

(۶)۔ آئمۂ کرام کی فقہی موشگافیون، کبرائے ملت کی آئینی نکتہ سرائیون محدثین ماضیہ کی جگر گداز عرق ریزیون او متکلمین اولی کی تابناک کاوشون کو ہفوات سے زیادہ وقعت نہین دینگے۔

(۷)۔ الغرض (حسب تجویز نو) مطبع "نگار" کے نوزائیدہ دن کو اپنا رہبر، مجلدات نگار کو صحفِ مقدسہ تسلیم کرتے ہوئے اپنی ہر تحقیق کا منتہا اپنی ہر جستجو کی آخری منزل الہامات نیاز کو قرار دون گا۔

میرا خیال ہے۔ کہ الہامات "نیاز" مین سے نگارستان کے افسانے خصوصیت سے قابل تمسک ہین، کیوپڈ وسائکی۔ حمرا کا گلاب یہ وہ ایمان طلب تحریرات ہین، جنکی ہر سطر (خصوصاً جبکہ موضوع تحریر صنف نازک کی ستم شعاریان ہون) حلقۂ ایمان کے لئے پیغام انہدام ہے، گو ایمانِ مستان اس سے حیاتِ نو مستعار لیتا ہے۔

یبوست حیات افراد کے لئے پیام اجل ہے، نتیجۃً نگارستان کا ہر افسانہ افسانہ کی ہر سطر۔ ہر سطر کا ہر حرف شورش سے لبریز ہے، اس سے بحث نہین، کہ وہ ہیجان دنیاء روح مین ہو، یا عالم عناصر مین۔ بہرحال یہ مسئلہ طول طلب ہے (اگر آپ

اجازت دین تو مین ایک "قہستانی فرد نگارستان یا "کلام نیاز" پر ایک نومسلمانہ تنقید لکھکر بھیجون، جسے آپ نگار مین شایع کرین - اور اس طرح مجھے اہل تصانیف کی فردوسی صف مین جگہ مل جائے) اسلئے اس وقت مجرمانہ نقاشی کے لئے عفو طلب ہوتا ہون -

نیازمند

غلام جیلانی برق - بی اے

نگار:- آپ کی یہ تحریر نگار مین شایع کی جاتی ہے اس لئے مضمون نگار تو آپ ہو ہی گئے اور اس طرح غالباً آپ کے بڑھے ہوئے "ہیجان علمی" کی یک گونہ تسلی ہو گئی ہو گی - رہا معاملہ تعنون کا سو، اس پر مجھے اختیار نہین - اگر رشید احمد صاحب کے نزدیک آپ کا یہ "التشاف" واقعی صحیح و درست ہے تو کوئی وجہ نہین کہ وہ اپنے "مغالطہ" کا انتساب جناب کے نام نامی سے نہ کردین، حالانکہ اس وقت تک آپ کا "مغالطہ" مین مبتلا ہونا "بحد مبالغہ" کیا بلکہ "بحد ضرورت" بھی کسی جگہ سے ثابت نہین ہوتا۔

آپ نے جو تحفہ ہائے نیاز پیش کرنے کا وعدہ کیا ہے ان کے جواب مین سوائے اس کے کیا عرض کر سکتا ہون کہ۔

"کہین نظر نہ لگے نہ اُن کے دست و بازو کو"

یہ سب توفیق کی باتین ہین جو ازل سے "باندازۂ ہمت" عطا ہوتی ہین -

ممکن ہے کہ دفتر نگار آپ کے ان ہدایائے گرانمایہ کے خاطر خواہ قدر نہ کر سکے لیکن یہ یقینی ہے کہ جس وقت "قہستانی" دنیا کی تاریخ مرتب کی جائیگی تو اس کے سرنامہ کو سب سے پہلے جناب ہی کے اسم گرامی کے طغرا سے مزین کیا جائے گا اور "نادر لاثانیت" صرف آپ ہی وہان کے "بطل اعظم" اور "صاحبقران اکبر" تسلیم کئے جائینگے - لیکن اگر ناگوار خاطر نہ ہو، تو عرض کردن کہ براہ کرم پہلے "فلسفۂ تہذیبہ" کے اصول کا مطالعہ ضرور فرمایئے تاکہ آیندہ آپ اپنی فطری "سیر چشمی" اور "غیر معمولی رواداری" کے زیر اثر آکر اُن اشیاء سے محروم نہ ہو جائین جو ہر چند "کالائے بد" تو نہین ہو سکتین، لیکن پھر بھی "ریش خاوند" تک پہونچنے کے لئے بیتاب نظر آتی ہین -

(۱)- ہم کو معلوم نہین کہ آپ کی ریش مبارک کے "آثار باقیہ" واقعی "خضاد یہ عجم" کی حیثیت رکھتے ہین یا نہین اگر ایسا ہے تو ان کے قایم رکھنے مین بھی کوئی مضایقہ نہین کہ "خزان" کو دیکھ کر بھی "بہار" کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے - اور اگر ایسا نہین تو پھر آپ خود ہی انصاف فرمایئے کہ تحفہ کس چیز کا ہوگا؟ "بقیۃ آلِ آثار" کا یا اس "قضا" کا جہان سے وہ محو کئے گئے ہین -

(۲) - آپ عربی سے اپنا لگاؤ ترک کیجئے یا نہ ترک کیجئے، لیکن اس سے "لاگ" بھی نہ رکھئے کہ آپ کی اور ہر ذہین آدمی کی انشاء کی جان وہی ہے۔ آپ کا یہ تحفہ آپ کو بے برگ و بار کردیگا اور ہمین کسی کی تباہی منظور نہین۔

(۳) - اگر ہمین آج معلوم ہو جائے کہ واقعی آپ نے کبھی نماز پڑھی تھی، تو ہم آپ کو مشورہ دین کہ ۲۱ اور ۵ کی نسبت سے گھٹانے کے بجائے آپ اُسے ۵ اور ۵۰ کی نسبت سے بڑھا دین رکیونکہ ایک حدیث کے مطابق اصل مین نماز پچاس ہی وقت کی فرض ہوئی تھی لیکن جناب موسیٰ کے مشورہ سے رسول آخر الزمان نے خدا سے بعد التجاء مکرر اُسے اتنا مختصر کردیا)۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ آپ بھی انھین لوگون مین سے معلوم ہوتے ہین جو یہ تمنا رکھتے ہین کہ کاش اُس وقت وہ بھی ہوتے اور رسول اللہ سے اصرار کرکے نماز کو بجائے ۵ کے صفر تک پہونچا دیتے جس مین اضعافی قوت ۵۰ سے بھی زیادہ ہے۔

(۴) - متمدن دنیا کا ساتھ دینا والا جو مذہب ہے وہی اسلام ہے۔ ہمین آپ کی اس بے خبری پر تاسف ہے کہ جس سہل ممتنع دین کی آپ بنیاد ڈالنا چاہتے ہین وہی مذہب و ملت کا نظام کہنہ ہے آپ وہی کیون نہ کہین جو کسی شہید صداقت نے کہا تھا "من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را"

(۵) آپ کا یہ تحفہ چونکہ یکسر "طنزیات" سے متعلق ہے اسلئے اگر یہ تحفہ بھی ہے تو شاید اُس قسم کا جیسے کلیوپیٹرا اپنے جاندادگان الفت کو سرشار لذت کرنے کے بعد "جام زہر" کی صورت مین پیش کیا کرتی تھی اسلئے تصور سے کام لیکر ہم کسی کے "لب شکرخا" کا جواب تلخ سمجھ کر اس کا بھی شکریہ ادا کرنے کے لئے طیار ہین۔

(۶) - اکابر متقدمین کی کاوشون کو آپ کا ہفوات سمجھنا اگر دنیا سے انھین "وحی یوحی" تسلیم کرسکتا ہے تو اس "نیشتر کی خلش" بھی ہمارے لئے بہت کچھ باعث لذت ہوسکتی ہے۔

(۷) - مجلدات نگار کو صرف زبان سے صحف مقدمہ کہنا کافی نہین۔ "تصدیق بالجنان" ایمان کی ضروری شرط ہے اور آپ کی تحریر کا سارا انداز تو کفار عرب کا "راعنا" نظر آتا ہے در آنحالیکہ آپنے کلام مجید مین یہ بھی دیکھا ہوگا۔ "واللہ یستہزئ بھم و یمدھم فی طغیانھم یعمھون"

نگارستان کے متعلق آپ نے جو اظہار خیال فرمایا ہے اس کا تعلق چونکہ مدیر نگار سے نہین بلکہ مصنف نگارستان سے ہے اس لئے اس باب مین اگر شرمندۂ احسان ہونگے تو وہ نہ کہ ہم۔ — اڈیٹر

ہمیشہ یاد رکھئے

(۱) خط و کتابت میں نمبر خریداری درج کرنا (۲) جوابی امور کیلئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا۔ (۳) بیس ۲۰ تک پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع کرنا (۴) منی آرڈر کے کوپن میں نمبر خریداری درج کرنا۔

(منیجر نگار لکھنؤ)

باب الاستفسار

علم غیب

(جناب محمد نواز صاحب خلش - دیوالہ)

آجکل ضلع میانوالی میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ آیا نبی صلعم کو علم غیب جزءً تھا یا کلاً، براہ نوازش بذریعہ رسالہ نگار مطلع فرما کر ممنون کیجئے۔

اس سوال کے جسقدر مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہو سکتی ہے بالوضاحت بیان فرمائیں، یعنی (۱) علم غیب سے کیا مراد ہے (۲) جزءً یا کلاً سے کیا مراد ہے (۳) حضرت آدمؑ کو علم غیب عطا فرمایا گیا تھا یا نہیں۔

(**نگار**) کچھ زمانہ قبل یہ مسئلہ شمالی ہند میں اٹھایا گیا تھا اور مولویوں نے خوب خوب داد شجاعت دی تھی۔ زبانی مناظرے ہوئے، تحریری ہجادلے ہوئے۔ سب دشتم اور تکفیر کے حربے استعمال کئے گئے۔ لیکن آخر کار جو نتیجہ اس نوع کے نزاع و بحث کا ہوا کرتا ہے وہی ہوا یعنی تھوڑے دنوں کے بعد ہر فریق اپنی اپنی جگہ تھک کر بیٹھ گیا اور کچھ پتہ نہ چلا کہ نبی آخر الزماں کو علم غیب حاصل تھا یا نہیں؟"

تمام ان مسایل میں جن کا تعلق کلام مجید سے ہو، ہم لوگوں کی بڑی غلطی یہ ہوا کرتی ہے کہ خود کلام پاک سے سمجھنے کے بجائے منقولات، روایات اور تفسیرات وغیرہ کی جستجو کرنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں باہم تعارض و تضاد پا کر رہی سہی کیفیت مطمئنہ بھی کھو بیٹھتے ہیں، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ابوحنیفہ کی تقلید کریں یا شافعی کی، امام احمد کا کہنا مانیں یا امام حنبل کا، رازی کے لکھے کو صحیح مانیں یا غزالی کی تحریر کو، اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ باوجود تباین و تضاد کے جو ان اکابر کے اقوال یا احادیث کے روایات میں پایا جاتا ہے، ایک مولوی اس امر پر بھی مجبور کرتا ہے کہ سب کو صحیح مانو کسی کو غلط نہ سمجھو، گویا وہ اس بات کا قایل ہے کہ دو نقطوں کے درمیان ایک سے زیادہ خط مستقیم کھینچے جا سکتے ہیں۔

بظاہر اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ اصل چیز کلام مجید ہے، لیکن عمل یہ ہے کہ اصل سمجھا جاتا ہے اقوال مفسرین کو اور اسکے اتباع میں کلام پاک سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ کلام مجید کا علم آسان نہیں اور ہر شخص کو اسکی جسارت نہ کرنا چاہئے، لیکن میں اس بت پرستی کو بھی ناجائز سمجھتا ہوں کہ متقدمین کے اقوال کو "وحی یوحیٰ" قرار دیا جائے اور ان کی ہر بات خواہ سمجھ میں آوے یا نہ آوے ضرور تسلیم کر لیا جائے کیونکہ جب علم قرآن کی وسعت اتنی زبردست ہے کہ کوئی انسان اس کے تمام رموز کو نہیں جان سکتا تو پھر جس طرح میں کے ماہر و عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا،

صاحب کشاف وجلالین بھی نہیں کر سکتے، البتہ فرق یہ ہے کہ اگر ان سے دس غلطیوں کا امکان ہے تو مجھ سے بیس یا اس سے زاید کا، لیکن اس کے کیا معنی کہ ان کی ہر "غلطی" اجتہاد تسلیم کیجائے اور باوجود غلطی ہونے کے بھی، ثواب کے مستحق ہوں اور میری ہر بات خواہ وہ کتنی ہی قرین عقل وانصاف کیوں نہ ہو، محض اس لئے غلط قرار دیدی جائے کہ اس سے قبل کسی نے ایسا نہیں لکھا، حالانکہ اگر نہیں لکھا تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے، نہ کہ مجھ پر، لیکن ہم لوگوں کی کورانہ تقلید اس حد تک بڑھ گئی ہے اور اپنے حواس وادراک کو اس درجہ بیکار بنالیا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ تمہارے چہرہ پر بھی آنکھیں ہیں تو ہم اسکا یقین کرنے کے بجائے خود اس کو اندھا سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر عقول انسانی کی ترقی کا دروازہ واقعی بند ہوگیا ہے اور مبدء فیاض اپنے تمام انعامات ختم کرکے اب بالکل معطل ہوگیا ہے، تو خیر، ورنہ ہر شخص کا ایمان خود اسکی ذاتی چیز ہے اور اسی کے اطمینان نفس سے اس کو متعلق ہونا چاہیئے۔ اگر متقدمین کے اقوال سے اس کو طمانینت قلب حاصل نہیں ہوتی بلکہ خود غور کرکے کسی نتیجہ پر پہونچنے سے اسکو اطمینان حاصل ہوتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اسے کافر ومرتد کہہ دیں اور اس کو مجبور کریں کہ نہیں تجھے تو "صاحبین" یا "شیخین" ہی کے ساتھ جنت و دوزخ میں جانا ہے اور خدا نے صرف متقدمین ہی کو صحیح راستہ بتایا تھا اور وہی اسکے "روح القدس" تھے۔

مدعا اس سے یہ ہے کہ چونکہ ہمارے یہاں کے علماء اکثر وبیشتر مسائل میں کلام مجید میں غور کرنے کے بجائے منقولات کو لے بیٹھتے ہیں، اور خود اپنی عقل، اپنے تدبر وتفکر اور اپنے اجتہاد سے کام نہیں لیتے، اس لئے وہ نہ اوروں کو مطمئن کر سکتے ہیں اور نہ خود ہوتے ہیں، یہی حال مسئلہ غیب کے جھگڑے کا ہوا کہ چند دنوں تک باہم دست وگریبان رہنے کے بعد خاموش ہوگئے اور کوئی لٹریچر ایسا نہ چھوڑا جس سے کسی شخص کو اطمینان ہو سکتا۔

میرے نزدیک غیب کا مسئلہ نہایت صاف وآسان مسئلہ ہے اور ہمیں کسی نہ کو نہ زیادہ عقل آرائی کی ضرورت ہے اور نہ کسی بحث ونزاع کی۔

لفظ غیب یا غائب لغوی معنے میں ہر اس امر کو کہتے ہیں جو مستور ہو، آنکھوں سے نظر نہ آئے اور جس کا ہم زمان ومکان متعین نہ کر سکیں۔ چنانچہ جب کوئی آواز کسی ایسے مقام سے آتی ہے جس کا پتہ نہیں ہوتا یا جو نظر نہیں آتا تو عربی زبان میں اسکو اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

"وسمعت الصوت من وراء الغیب"

اب دیکھنا یہ ہے کہ کلام مجید میں اس لفظ کا استعمال لغوی معنے سے ہٹ کر تو نہیں ہوا؟ قرآن میں متعدد جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ سب سے پہلے تو سورۂ بقر کی بالکل ابتداء میں "یومنون بالغیب" نظر آتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت میں "غیب" کے جو یہ معنے لکھے ہیں (کہ آنکھ بند کر کے ایمان لاتے ہیں) ان سے مجھے اختلاف ہے۔ اس کا جو مفہوم عبداللہ ابن عباس نے ظاہر کیا ہے وہی درست معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے "الغیب ھو اللہ" یعنی غیب سے

مراد خدا کی ذات ہے۔ چونکہ خدا کی ذات مستور ہے اور نظر نہیں آتی اس لئے اس کو لفظ غیب یا غائب سے تعبیر کرنا، بالکل لغوی معنے کے لحاظ سے ہے جسمیں کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔

سورۂ آل عمران میں جب جناب مریمؑ کو ان کی تطہیر و پاکیزگی کا یقین دلاتے ہوئے اطاعت و عبادت کی ہدایت کیگئی تو اسکے ساتھ ارشاد ہوا کہ :-

ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک

یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تجھے بتلاتے ہیں۔ یہاں غیب کے معنی خواہ خدا کے لیجئے یا محض عالم مستور کے (جو "عالم الشہادۃ" کا ضد ہے) کوئی فرق نہیں ہوتا اور وہی لغوی معنے بدستور قایم رہتے ہیں۔

دو مقام پر صاف صاف علم غیب کے متعلق اظہارِ حقیقت کیا گیا ہے :-

سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے :- "وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمہا الا ھو"

یعنی خدا ہی کے پاس غیب کے خزانے یا کنجیاں ہیں جن کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔ دوسری جگہ سورۂ جن میں مرقوم ہے :-

"عالم الغیب فلا یظہر علے غیبہ احداً الا من ارتضیٰ من رسول"

یعنی وہ عالم الغیب (خدا) اپنا بھید کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر اسپر جسے وہ رسالت کے لئے چن لے۔ بظاہر الیسا معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ انعام، سورۂ جن کی آیتیں متعارض ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ سورۂ انعام میں جو حقیقت ظاہر کی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے یعنی یہ کہ رموز غیب کا جاننے والا صرف خدا ہے اور سورۂ جن میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ان رموز کو وہ اپنے رسولوں پر ظاہر کر دیتا ہے۔

اس طرح گویا سورۂ جن سے یہ امر روشن ہو گیا کہ خدا رسولوں کو علم غیب عطا کرتا ہے۔ لیکن فیصلہ کرنے سے قبل دو باتوں پر غور کر لینا ضروری ہے ایک یہ کہ عالم غیب، عالم مستور، رموز غیب وغیرہ سے کیا مراد ہے اور علم کی کتنی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

عالم غیب اور عالم شہادت، دو عالم مانے جاتے ہیں۔ عالم شہادت تو وہ جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے یا جس کا ہم کو علم ہو چکا ہے اور عالم غیب وہ جو ہماری نگاہ اور ہمارے حواس و ادراک سے پوشیدہ ہے۔ اور یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ "عالم شہادۃ" بہ نسبت عالم غیب کے نہایت مختصر ہے۔ انسانی معلومات کا نقص اور انکی تنگی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ جو کچھ انسان کو معلوم ہے اور جن امور کا وہ اپنے آپ کو محقق کہتا ہے وہ بھی اسے پوری طرح نہیں معلوم، چہ جائیکہ تمام کائنات اور رموز کائنات و آفرینش سے آگاہ ہونا۔ الغرض انسان کے سامنے جو کچھ ہے وہ عالم غیب کا نہایت ہی حقیر و مختصر سا حصہ ہے جس کا علم اس کو حاصل ہو گیا ہے اور جس کو ہم عالم الشہادۃ کہتے ہیں وہ بھی کسی وقت

عالم الغیب ہی میں داخل تھا۔

علوم حاضرہ کی تمام تحقیقات، فنون جدیدہ کی تمام معلومات کسی وقت سب عالم غیب ہی میں داخل تھیں جو بعد کو عالم الشہادت میں داخل ہوئیں، علم الکیمیا کے تمام نظریے، علم طبقات الارض کے تمام انکشافات طبیعیات کے جملہ مسایل الغرض اسوقت کے ، ام معلومات سب عالم غیب سے متعلق تھے جواب عالم الشہادت میں آگئے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کونسے غیب کے خزانے ہیں جو آیندہ انسان کو عطا ہونے والے ہیں، اسلئے یہ کہنا کہ غیب کا علم رسول کو نہیں تھا اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ کلی علم کسی انسان کو حاصل ہو ہی نہیں سکتا لیکن جزئی علم ہر انسان کو حاصل ہے چہ جائیکہ انبیاء و رسل جو بہر نوع زیادہ مکمل انسان تھے۔

علم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جسے علم کنہ و حقیقت کہتے ہیں دوسرا علم علت و معلول۔ قسم اول کا علم تو یقیناً سوائے ذات باری کے کسی کو نہیں ہو سکتا، لیکن قسم دوم کا علم ہر انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور عقل و دماغ کے تفاوت سے اس میں بھی مدارج ہوتے ہیں۔ اگر اسکی زیادہ تشریح کی ضرورت ہے تو یوں سمجھ لیجئے کہ ایک انسان یہ تو سمجھ سکتا ہے کہ جب دو چیزیں آپس میں ملیں گی تو ایک تیسری چیز یہ رونما ہوگی، لیکن وہ "کیوں" کا جواب نہیں دے سکتا، کیوں کا علم صرف خدا کو ہے اور انسان ابتک بقدر یک دانۂ خردل بھی اسکو حاصل نہیں کر سکا ہے۔

اب اگر انبیاء یا رسول اللہ کے متعلق کہا جائے کہ وہ کنہ و حقیقت کا علم رکھتے تھے تو میں اسکے ماننے کیلئے طیار نہیں، لیکن جس طرح اور دوسرے انسانوں کو بعض نوامیس قدرت کا "علم معلولی" ہو سکتا ہے، اسی طرح ان کو بھی حاصل تھا، البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کا علم، ان کی عقول عالیہ اور نفوس ذکیہ کی وجہ سے زیادہ بلند و وسیع رہا ہو۔ اب ذرا مادی دنیا سے بالکل جدا ہو کر صرف روحانی عالم میں آجائیے تو یہاں بھی وہی صورت نظر آئے گی۔ اسوقت مسمریزم، ہپناٹیزم، قوت مقناطیسی، اخبار عن الغیب، پیشین گوئی، قرأۃ افکار (دل کا حال معلوم کر لینا) یا اس قبل رمل، جفر، نجوم وغیرہ کے ذریعہ سے احکام صادر کرنا، یہ سب علم غیب ہی سے متعلق ہیں اور انسان دماغ کو مخصوص طور پر تربیت کرنے کے بعد یہ تمام باتیں بتا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی علم کنہ و حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ نتیجہ ہے اس قوت کا جو خاص مشق کے بعد بلا کسی اصول و ضابطہ کے کسی امر کے طرف رہبری کرتی ہے۔ انبیاء چونکہ قدرت کی طرف سے نہایت ہی اعلی دماغ لیکر آئے تھے اس لئے اگر وہ کوئی پیشین گوئی کر دیتے تھے، یا کسی امر غیر معلوم کے متعلق کوئی صحیح حکم لگا دیتے تھے تو حیرت کی کوئی بات نہیں اور نہ اسکو علم غیب سے متعلق کرنے میں کوئی غلطی ہے۔

آپ کے دوسرے سوال کا جواب بھی اسمیں آگیا کیونکہ اگر آدم کسی پیغمبر کا نام تھا تو پیغمبر ہونے کی وجہ سے اور اگر اس سے مراد محض انسان ہے تو انسان ہونے کی وجہ سے اسپر بھی عالم غیب کے انکشافات ہونا مستبعد نہیں تھا، سب سے پہلے جب انسان نے پتھروں کے اوزار بنا کر ان سے کام لیا تو یہ بھی علم غیب ہی تھا اور آج جبکہ انسان ہوا میں اڑتا پھر رہا ہے،

غیب ہی کے خزانہ کا عطیہ ہے اور کل جب وہ کرۂ قمر میں اپنی نوآبادیوں کی بنیاد ڈالے گا، اور ساہل مریخ کے ساتھ لاسلکی ٹیلی فون قایم کرے گا، اس وقت بھی یہ سب عالم غیب ہی کے ایک جزو کا انکشاف ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان اگر اس سے زیادہ ترقی کرکے وہ کچھ ہو جائے جسے انسان نہیں کہہ سکتے تو بھی وہ مجبور و جاہل ہی رہیگا، اور کنہ و حقیقت کا علم یا عالم غیب کی وسعت و پہنائی کا انکشاف اس پر کبھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے دماغ میں اس ادراک کی اہلیت ہی موجود نہیں۔

نیاز

نگار بک ایجنسی کی زیر طبع کتابیں

نگارستان یعنی حضرت نیاز کی بہترین شاہکاروں کا مجموعہ ختم ہوگیا ہے۔ اسکے دوسرے اڈیشن کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ جسمیں پہلے اڈیشن سے بہت زیادہ اضافہ ہوگا۔

شاعر کا انجام حضرت نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، جسمیں زور انشار، بلندی تخیل، ندرت بیان اجرت ادا اور جذبات حسن و محبت کا اظہار معجزانہ طور پر کیا گیا ہے۔ اور جس کی نسبت عام طور پر یہ فیصلہ ہوگیا ہے کہ ایسا مست و پر شباب افسانہ، عبارت کی ایسی رنگینی اور خیال کی ایسی بلندی کے ساتھ اردو میں کوئی نہیں لکھا گیا۔

فلسفہ مذہب سید مقبول احمد بی۔ اے کا تمام وہ سلسلۂ مضامین جو اس عنوان سے نگار میں مسلسل شایع ہوچکا ہے اور جسکو ملک نے حد درجہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔

سانس کے عجائب ہندوؤں کے بہت سے پوشیدہ علوم میں سے ایک علم سانس کا بھی تھا جس کی مدد سے وہ بیماروں کو اچھا کرتے تھے، ماضی و مستقبل کا حال بتاتے تھے، نیک و بد ساعتوں کی تعیین کرتے تھے، اور اسی طرح کے بہت سے عجیب و غریب اعمال محض سانس کی مدد سے دکھاتے تھے۔ اس علم کے تمام راز اس کتاب میں محفوظ کر دئے گئے ہیں اور ہر شخص اس کے مطالعہ بعد حیرت انگیز طور پر پیشین گوئیاں کر سکتا ہے۔

ان کتابوں کی درخواستیں درج رجسٹر ہورہی ہیں اور جن کی درخواستیں پہلے سے درج ہو جائیں گی ان کیساتھ کوئی خاص رعایت کی جائے گی جس کا فیصلہ بعد کو ہوگا۔

”منیجر نگار لکھنؤ“

"........ ولے بخیر گزشت"

میری انکی محبت کا فسانہ اپنے آغاز و انجام اور تمام درمیانی کڑیوں کے لحاظ سے بہت مختصر تھا۔ سینما ہال کے اندر جب کہ بجلی کی روشنی عورت کو خدا جانے کیا چیز بنا دیتی ہے (مرد کا حال نہیں معلوم کہ وہ عورت کی نگاہ میں اسوقت کیسا نظر آتا ہے) انہوں نے مجھے دیکھا۔ اور میں نے انکو، تماشہ کے دوران میں ایک خاص منظر کے اثر سے ان پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ میں نے سنبھال لیا، اُدھر سے شکریہ، اِدھر سے اظہار عجز و انکسار پیش کیا گیا۔ اس کے بعد ڈرامہ پر تنقید، فلسفۂ محبت پر ہلکی سی گفتگو ہوئی۔ دوسرے دن صبح کی چار کی دعوت اور شام کو انتہائی بے تکلفی ——— یہ تھا اس محبت کا انجام جس کے متعلق ایک ایشائی شاعر خدا جانے کیوں یہ لکھتا ہے :۔

من کردہ ام آغاز بہ پایاں کہ رساند

میں ہفتہ میں صرف دو بار سینما جانے کا عادی تھا۔ لیکن اب روز کی شرکت ضروری ہوگئی۔ اس سے قبل بکس کے اندر بیٹھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ ہال کے تاریک ہونے کے بعد بکس کی چار سیٹوں کو جب صرف دو آدمی گھیرے ہوتے ہیں تو تماشہ کی طرف سے کیوں بالکل آنکھیں پھیر لی جاتی ہیں۔

بیوی نے ایک دن پوچھا "آجکل روز سینما جانے کی ضرورت کیوں پیدا ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے تو ہفتہ میں صرف دو بار کا معمول تھا۔ آجکل کیا روز نیا تماشہ ہوتا ہے" ——— ان کی گفتگو سے ہمیشہ ایک خاص قسم کی ہیبت اپنے اوپر طاری ہوتے ہوئے محسوس کیا کرتا ہوں، خاصکر اسوقت جبکہ کسی معاملہ میں خطا میری ہو۔ میں انکے پہلے ہی فقرہ سے تقریباً بدحواس سا ہوگیا تھا لیکن انکے آخری فقرہ نے خود جواب کی طرف میری رہبری کی اور میں نے گھبرا کر کہا "ہاں، آجکل روز نیا تماشہ ہوتا ہے۔

یہ سن کر وہ خاموش ہوگئیں، پھر میں نے موضوع بدلنے کے لئے فوراً ہی ان کے بھائی کا ذکر شروع کر دیا جن کا خط شام کی ڈاک سے آیا تھا۔

——— "آپ نے دیکھا میری پکفورڈ کی یہ ایکٹنگ کس حد تک غیر فطری تھی"

——— "نہ صرف غیر فطری بلکہ بالکل غیر جمالیاتی"

——— "یہ لوگ کیوں اسے "محبوبۂ عالم" کہتے ہیں۔ اسمیں آخر وہ کونسی بات ہے جو کسی اور میں نہیں ہو سکتی"

——— "لوگ ہر اس چیز کو "محبوب" بنانے کے عادی ہیں جو انہیں نہ ملے۔ حالانکہ میرے نزدیک یہ بالکل غلط اصول ہے"

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور ہال کی تاریکی میں اس نے اپنا سر میری آغوش میں رکھدیا گویا وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔

فلم تیزی کے ساتھ "چک چک" کرتا ہوا ختم ہوا۔ روشنی سے ہال جگمگا اٹھا۔ اور سب سے پہلی چیز جس نے مجکو چونکایا، وہ ایک ہاتھ تھا۔ جس نے میرے شانوں کو جھنجوڑ کر رکھدیا۔

——— "چلئے سواری کا انتظام کیجئے۔ میں تنہا ہوں"۔ یہ میری بیوی کی آواز تھی۔ میری حالت کیا ہوئی ہوگی؟ اسکا صحیح اندازہ تو اسی وقت ہو سکتا۔ جب کوئی شخص میرے اس وقت کی حالت کا فلم تیار کرلیتا۔ لیکن مختصراً و تشبیہاً یوں سمجھ لیجئے کہ اسوقت سارا کرۂ ارض مجھے دلدل نظر آرہا تھا اور میں اس میں نہایت تیزی سے سمایا جارہا تھا۔

میری بیوی یوں تو صحیح معنے میں بیوی ہے، لیکن ہے آجکل کی بیوی ہر ہر بات پر محاسبہ کرنے والی، تنقید کی اہلیت رکھنے والی۔ اور ہر طرز عمل کا سبب دریافت کرکے غیر مطمئن رہنے کی حالت میں "ستیاگرہ" اور "سوراج" کا اعلان کردینے والی، اور حقیقت یہ ہے کہ میں انکی اس آزادی سے برہم بھی نہیں تھا۔ لیکن رات بغیر میرے علم کے، مجھے دھوکا دیکر، جاسوسی کی غرض سے سینما پہونچ جانا اور وہاں اپنے آپ کو ایک سخت ٹریجڈی کی صورت میں میرے سامنے پیش کرنا۔ یہ باتیں اسدرجہ غیر معمولی اور غیر متوقع تھیں کہ جب میں اپنے حواس میں آیا اور رات کی تنہائی میں ان پر غور کیا، تو یکسر ناقابل برداشت نظر آئیں ——— میں بہت صبح اٹھکر باہر چلا آیا اور غور کرنے لگا کہ دیکھئے نتیجہ کیا ہوتا ہے ——— دفعۃً اندر سے خادمہ آئی اور ملازم کو آواز دی کہ ٹیکسی لاؤ اور اندر آکر اسباب باندھو بیگم صاحب چھوٹے میاں (یعنے اپنے بھائی) کے پاس جائیں گی" ——— ٹیکسی لاؤ! اسباب باندھو! ——— "اب واقعی میرا غصہ بڑھنے لگا اور "الرجال قوامون علی النساء" کی آیت پر نہایت انہماک سے غور کرنے لگا۔

یہاں تک کہ میں نے بھی عزم کرلیا کہ جاتی ہیں تو جائیں۔ نہ روکوں گا اور نہ خود بلاؤں گا ——— اس کے بعد ہی میرا خیال اپنی نئی محبوبہ کی طرف منتقل ہوا اور اس کی بری باتیں بھی مجھے اچھی معلوم ہونے لگیں ——— "وہ کسقدر مہذب و شائستہ ہے، کیسی محبت کرنے والی اور کسدرجہ جمیل ہے ——— اگر بیوی نہیں رہنا چاہتیں تو مناسب ہے طلاق حاصل کرلیں۔ میں بھی آزاد ہوجاؤں گا اور پھر مس ...... سے شادی کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوگا، اسی روک کی وجہ سے میں نے ہمیشہ شادی کے ذکر کو ٹالا، لیکن اب خدا کی طرف سے اسباب پیدا ہورہے ہیں" یہ سوچتے ہوئے میں نے خط کا کاغذ نکالا اور قلم ڈبو کر لکھنے والا تھا کہ مس ...... کا آدمی آیا اور یہ رقعہ دیکر چلا گیا۔

"کل رات کے واقعہ نے میرے خیال کی دنیا کو بدل دیا ہے ممکن ہے آپ اب بھی مجھے مبتلائے فریب

رکھنے کی کوشش کریں۔ بہر حال آیندہ کبھی مجھے مخاطب کرنے کی زحمت نہ گوارا کیجئے، میں آپ کی محبوبہ کے طرزِ عمل سے خوش ہوئی کہ اُس نے آپ کے پُر فریب خط و خال کو یوں میرے سامنے بے نقاب کر دیا۔ اُمید ہے کہ اب آپ نکاح کے وعدہ کو میری طرف سے منتقل کرکے اُنہیں کی خدمت میں پیش کریں گے۔ میں آج نینی تال جا رہی ہوں۔

خط پڑھ کر ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے، سر چکرانے لگا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ بدن کا جوڑ جوڑ ڈھیلا ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر تک اس نیم مردہ حالت میں گزرنے کے بعد پھر ردِ عمل شروع ہوا، اور بیوی کے تمام محاسن ایک ایک کرکے میرے سامنے آنے لگے۔ اب مجھے کچھ ہنسی بھی آ رہی تھی کہ بیوقوف نے میری بیوی کو اپنا ہی جیسا آبرو باختہ سمجھ لیا ——— اب یہ جوش پوری قوت کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ اور کشاں کشاں مجھے اندر لئے جا رہا تھا۔

——— "جی ہاں، اب میرا یہاں رہنا بیکار ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی بیوی گھر میں نہیں رہ سکتی جب سینما کا پروگرام روز بدلنے لگے۔

ان کے اس فقرہ پر بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا "اچھا اگر آج سے میں یہ عہد کر لوں کہ سینما کا پروگرام روز نہ بدلے گا تو بھی تم نہ مانو گی، چلی جاؤ گی"

——— "ہاں چلی جاؤں گی"

——— کیوں

——— "اس لئے کہ تمہارا کیا اعتبار"

جب ضد دلائل کے حدود میں آتی ہی تو ضد نہیں بلکہ رواداری ہو جاتی ہے۔ اسی لئے میں نے اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہا اور حلف کی تمام ممکن صورتوں کے ساتھ میں نے انہیں یقین دلایا کہ آیندہ کبھی بغیر تمہاری اجازت کے سینما کیا معنے گھر سے باہر قدم نہ نکالوں گا، کیونکہ ممکن ہے کہ پھر تمہیں مغالطہ ہو جائے اور تم ایک غیر عورت کو جس سے مجھے سوائے وقتی گفتگو کے کوئی واسطہ نہ ہو، میری محبوبہ سمجھنے لگو"

——— "اچھا اگر اس عورت سے تمہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور کل ہی اتفاق سے تمہاری ملاقات وہیں سینما میں ہو گئی تھی تو مجھ سے جھوٹ کیوں بولے کہ آج کل پروگرام روز بدلتا ہے"

——— "واللہ بیگم، یہ بات خود میری سمجھ میں نہیں آتی کہ میں کیوں جھوٹ بولا، لیکن خیر جانے دو، یہ کوئی ایسا بڑا جھوٹ نہیں کہ تم آیندہ کے لئے بھی مجھے سچ بولنے کا اہل نہ سمجھو ——— اور ہاں، دیکھو آج میں نے جاوید مرحوم کے کلام پر تبصرہ کیا ہے، کل ہی سے خیال کر رہا تھا کہ تمہیں

ایک شعر سناؤں گا، دیکھو کیا خوب لکھا ہے:-

بس اک بوسہ پر اتنی بحث زیبا ہی نہ تایاں ہے
نگاہیں نیچی کر لو، خیر، اچھا لے لیا ہوگا

——— "چلو ہٹو، مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں"

ان کے "چلو ہٹو" کا میرے پاس صرف ایک ہی "مسکرت" جواب ہوا کرتا ہے۔ جس سے ان کا منہ بند ہو جاتا ہی اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس سے کام نہ لیتا۔

"سنیما میں اب بھی جاتا ہوں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس دن کے بعد سے پھر کبھی سنیما کا پروگرام روز نہیں بدلا"

نیاز

تذکرۂ خندۂ گل
یا
ظریف شاعروں کا تذکرہ

مکمل ہو کر شایع ہو گیا ہے اور ان حضرات کے نام روانگی شروع ہو گئی ہی جنکی پیشگی رعایتی رقم وصول ہو چکی ہی، رعایتی میعاد خریداری ۲۰ جون کو ختم ہو گئی اسلئے اب جو صاحب طلب کرینگے انسے معہ محصول للعہ (چار روپیہ) لئے جائیں گے۔

یہ تذکرہ اُردو زبان میں بالکل نئی چیز ہی جسمیں ۳۰ سے زاید ظریف شاعروں کے حالات، انکے لطایف اور کلام کا انتخاب دیا گیا ہی۔ یہ کتاب تنہائی کی بہترین مونس، غمزدہ دل کیلئے باعث تفریح اور ایک محقق کیلئے نادر خزینہ ہے۔

حجم معہ فہرست و سرورق ۲۹۴ صفحات یہ کتاب صرف نگار بک ایجنسی لکھنؤ سے معہ محصول للعہ مل سکتی ہی۔

پرتاب ۱۲ر
روہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی عہ ر
ملکہ زنوبیہ ۳ر
قرۃ العین ۳ر
مخدرات ۸ر
جویائے حق للعہ
لعبت چین عہ ر
فاتح مفتوح ۸ر
بابک خرمی ۸ر
الفانسو ۱۲ر
ایام عرب ۸ر
قیس ولبنیٰ ۸ر
یوسف ونجمہ ۸ر
زوال بغداد ۸ر
مینا بازار عہ ر
مقدس نازنین ۸ر
رویۃ الکبریٰ ۸ر
فلپانا ۸ر
شوقین ملکہ عہ ر
منصور موہنا ۸ر
حسن انجلینا ۸ر
ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
فردوس برین ۸ر
حسن کا ڈاکو ۸ر
دربار حرام پور ۱۰ر
غیب دان دلہن عہ ر
بدر النساکی مصیبت ۸ر

میوۂ تلخ ۸ر
نیکی کا پھل عہ ر

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق ۸ر
قاسم وزہرہ عہ ر
نیرنگ جمال ۸ر

میر ولی اللہ بی اے

بندگی عار
کاس الکرام سے ر
لسان الغیب جلد اول سے
" دوم
" سوم
" چہارم
نمکدان فصاحت ۸ر
بادۂ ناب عہ ر

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری ۸ر
بہرام کی گرفتاری عہ ر

مولانا نیاز فتحپوری

گہتان جلی عار
گہوارۂ تمدن عار
نگارستان عار
صحابیات ۸ر
تاریخ الدولتین ۸ر

سید سجاد حیدر بی اے

زہرا ۱۳ر
جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲ر
خیالستان ۸ر
ثالث بخیر ۸ر

حکایات واحتساسات ۸ر

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

سراب فیشن ۸ر
بالشوک شہزادی ۸ر
شہید وفا ۸ر
ممتاز بیگم ۸ر
شعلۂ رنگین ۸ر
محاصرۂ پیرس عہ ر
شیخ چلی عہ ر
بہادر ترک ۸ر
بہرام کی دلہن ۸ر
انقلاب فرانس ۸ر
حسن بنارس ۸ر
فطرتی جاسوس ۸ر
ترکی حرم سرا ۸ر
جنگ طرابلس ۸ر
بہرام چور ۸ر
زر پرست ۸ر
گنجی کا راز ۸ر
عبدالرحمٰن ناصر عار
عروس مصر عار
سیلاب خون ۸ر
کرشمہ ۸ر
وفادار دلہن ۸ر
طواف زمین عہ ر

سیاحت زمین ۸ر
سیاحت عہ ر
نازنین مراکش ۸ر
سمندر کی سیر ۸ر
اسرار بالشوزم ۸ر
روح لیلیٰ سے ر
امین بک ۸ر
حجاج بن یوسف ۸ر
یوسف پاشا ۸ر
انقلاب عثمانی ۸ر
نیلی چھتری ۸ر
بہرام کی آزادی ۱۲ر
بہرام کی گرفتاری عہ ر
بہرام کی سرگزشت عہ ر
پراسرار قتل عار

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب سے
بزم خیال عہ ر
مشاطۂ سخن عہ ر
انشائے نسوان ۶ر
مکاتیب محسن الملک ۸ر
لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸ر

مراثی

مراثی دبیر ۸ر
مراثی انیس ۸ر
مراثی ضمیر عہ ر

مراثی مونس ۱۲ر
مراثی دلگیر ۱۲ر

تذکرۃ الشعرا

تذکرۂ حسینی ۱۱ر
گلشن ۱۰ر
سراپائے سخن عہ ر
سوانح نظیر اکبرآبادی عہ

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز ۸ر
کلیات عراقی ۱۲ر
دیوان حافظ ۸ر
دیوان نعمت خان عالی عہ ر
کلیات انوری ۸ر
دیوان بیدل ۱۰ر
کلیات سعدی ۸ر
دیوان عرفی ۱۲ر
کلیات جامی ۸ر
کلیات غالب ۸ر
کلیات صائب ۱۲ر
کلیات حزین ۱۲ر
دیوان عنصری ۱۴ر
دیوان ظہیر فاریابی ۶ر
دیوان غنی کشمیری ۶ر
دیوان ناصر علی ۵ر
دیوان ہلالی ۶ر
کلیات جلال اسیر ۸ر

دواوین اردو

دیوان حسن دہلوی ۶ر
کلیات ظفر ۱۲ر

کلیات مومن عہ ر
دیوان ناسخ ۸ر
کلیات میر ۸ر
کلیات سودا ۸ر
کلیات انشا ۸ر
کلیات نظیر اکبرآبادی عہ ر
گلزار داغ ۸ر
دیوان رند ۹ر
دیوان ذوق ۱۲ر
کلیات اسمٰعیل عار
مراۃ الغیب عہ ر
صنمخانۂ عشق عار
فریاد داغ ۸ر
دیوان قاتل ۸ر
دیوان شہیدی ۸ر

عجائب وغرائب

عجائب المخلوقات تصویر رنگین
" باتصویر سادہ للعہ
مجمع الفنون ۸ر
طلسم فرنگ عار
کارخانۂ عالم عہ ر

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین ولیلیٰ ۱۲ر
فریب حسن عار
سوزن عشق ۸ر
روز الیمبرٹ ۸ر
ناول اسرار ۸ر
شام جوانی ۸ر
طلسمی فانوس ۱۲ر

نگار بک ایجنسی
نظیر آباد لکھنؤ

تصانیف مولانا نیاز فتحپوری

صحابیات

جس میں عہد سعادت کے ۵۸ خواتین کے مستند حالات درج ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا کی خاص زبان و انشا میں ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے
قیمت فی جلد ۶ر

نگارستان

زیر طبع ہے

شاعر کا انجام

زیر طبع ہے

شہاب کی سرگزشت

اردو میں پہلا فسانہ ہے جس میں نفسیاتی تخلیل کے لحاظ سے سیرت نگاری کی گئی ہے۔ یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ اردو میں اس سے بہتر تخیل اور بلند انشا کا فسانہ کوئی شائع نہیں ہوا۔
قیمت فی جلد عہ؍

جذبات بھاشا

ہندی شاعری میں جو لوچ اور کیفیت ہے اس کا علم انھیں کو ہو سکتا ہے۔ جنھوں نے اس زبان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کو دیکھئے اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجئے۔
قیمت فی جلد ۱۲ر

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان مصری مشہور مورخ اسلام کی تاریخ تمدن اسلامی کے ایک حصہ کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسی تاریخ پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔
قیمت فی جلد عہ؍

علم فراست الید

یعنی ہات کی لکیروں کو دیکھکر ایک شخص کی سیرت اور اس کے ماضی و مستقبل کے حالات معلوم کرنے کا علم۔ اس فن پر ایک سلسلہ مضامین نگار میں شایع ہوا تھا۔ اب اسے خوبصورت جیبی سائز میں مرتب کیا جارہا ہے اور آخر دسمبر ۱۹۲۸ء تک شایع ہو جائیگا۔ اس کتاب میں اس فن کے تمام مشکلات اسقدر آسان زبان میں حل کئے گئے ہیں کہ ہر شخص مطالعہ کرنے کے بعد نہایت معمولی مشق سے ہات دیکھکر صحیح احکام صادر کر سکتا ہے قیمت فی جلد عہ؍

ظریف شاعروں کا تذکرہ
یا
تذکرۂ خندۂ گل

اردو و فارسی کے جتنے ظریف شاعر گزر چکے ہیں یا اب موجود ہیں ان سب کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف اور نمونۂ کلام کے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب اپنی موضوع اور دلچسپی کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب ہے حجم ۵۰۰ صفحات قیمت مع محصول للعہ؍

خاک پروانہ

مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ، جن کی شہرت و قبول کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جینی زبان میں بھی اسکے ترجمے ہوئے ہیں
قیمت علاوہ محصول عہ

(مینجر "رسالہ "نگار" نظیر آباد لکھنؤ)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

قواعد رسالہ "نگار"

۱- رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے۔

۲- رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا

۳- خط کتابت کیوقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جسپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کردیئے جاتے ہیں

۴- جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۵- مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہییں۔

۶- سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازمی ہے

مولانا نذیر احمد
- نبات النعش ۹/
- مراۃ العروس ۱۰/
- توبۃ النصوح ۱۲/
- موعظۂ حسنہ ۱۴/
- رویائے صادقہ ۱۴/
- ایامیٰ ۱۴/
- فسانۂ مبتلا ۱۴/
- ابن الوقت ۱۴/
- مصائب غدر ۱۲/

مولانا شبلی
- سیرۃ النبی جلد اول
- " دوم
- " سوم
- الفاروق عا/
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم عا/
- سفرنامہ مصر و شام عا/
- علم الکلام عا/
- الکلام عا/
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی عہ/
- شعر العجم جلد اول ۔/
- " دوم
- " سوم
- " چہارم ۔/
- " پنجم عا/
- موازنہ انیس و دبیر ۔/

مضامین عالمگیر ۸/
- آغاز اسلام ۸/
- کلیات فارسی عا/
- کلام شبلی اردو ۸/

امیر مینائی
- صنم خانۂ عشق عا/
- مراۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین ۸/
- ضیائے سخن عہ/
- مکاتیب امیر مینائی

رتن ناتھ سرشار
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار عا/
- الف لیلہ طرز ناول عہ/
- کامنی
- سوانح عمر عیار

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذی ۸/
- حاجی بغلول ۸/

[پنڈت]
- پیاری دنیا ۸/
- کایا پلٹ ۸/
- میٹھی چھری ۶/
- طرحدار لونڈی عہ/
- طلسمی فانوس

جوالا پرشاد برق
- مرنالنی ۱۲/
- مار آستین ۱۲/
- بنگالی دلہن ۱۲/
- معشوقۂ فرنگ ۱۲/

بسم اللہ

نگار

فہرست مضامین ستمبر سنہ ۱۹۲۹ء

ملاحظات ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲
ہندی اور بابلی علم الاصنام کی مشابہت محمد نعیم الرحمن ایم اے ۹
بازگشت (فسانہ) مجنوں گورکھپوری ۱۶
ہندوستان کیونکر فتح ہوا عبدالقیوم رسا ۲۷
انارکسٹ (فسانہ) طالب باغپتی ۳۷
تصوف اسلام سید عبدالمالک آروی ۴۳
چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۹
فسانہ عجائب کے اجزاء ترکیبی «نقاد» ۵۷
مشرقی مآثر۔ فلکیات و ریاضی میں بدر اصلاحی ۶۷
ایک سیاح کی ڈایری ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۱
منظومات ناطق ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۵
باب الاستفسار ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۲
ہوا کا ترانہ (نظم) طفیل احمد شمیمی بی، اے ۸۷
سیر کہسار (نظم) حافظ غازی پوری ۹۱
تربیت اطفال (نظم) محمود۔ اسرائیلی ۹۳
تحریص عمل (نظم) امین حزیں ۹۳
غزلیات ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹۴
معلومات ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹۵-۹۶

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۶) ستمبر ۱۹۲۹ع شمار (۳)

ملاحظات

آپ کو معلوم ہے کہ مذہبیات عالم میں سب سے زیادہ مہتم بالشان رفیع المرتبت و جلیل القدر ساعت از ابتدائے ظہور آدم تا ایندم کونسی ہے۔ وہ ۲۶ صفر ۱۳۴۸ھ یوم شنبہ مطابق ۳ اگست ۱۹۲۹ع وقت ۲ بجے دن کی ہے جبکہ آفتاب ۱۲ درجہ، ۲۰ دقیقہ، ۴۰ ثانیہ پر اپل بہ عقرب قایم تھا اور تمام نجوم سعد کا قران اعظم فرنگی محل لکھنؤ کی محلسرا پر نور افگن

اللّٰہُ اکبر اللّٰہُ اکبر لا الٰہ الا اللّٰہُ

واللّٰہُ اکبر اللّٰہُ اکبر وللّٰہِ الحمد ط

حضرت قبلہ مولینا قطب الدین عبدالوالی صاحب مد ظلہ فرنگی محلی سرپرست انجمن معید الاسلام نے دعوت خاص دی اکناف ہند کے تمام ممتاز علماء کرام اور اکابر رہنمایان قوم کا ادیٹر نہمت کی زبان میں شاندار اجتماع ہوا لامذہبی اور دہریت کے انسداد کی تدابیر پر غور و مشورہ کیا گیا اور اس طنطنہ و دبدبہ اور اس شوکت و جبروت کے ساتھ کہ

تزلزل در ایوان کسرے فتاد

راویان خجستہ اطوار و پیام رسانان ذی جاہ و وقار متفقہ طور پر یوں زمزمہ پرداز ہوتے ہیں کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ یہ اجتماع فرنگی محل میں برپا ہو رہا تھا،

امریکہ میں بہ مقام واشنگٹن، ایران میں بمقام طہران، ترکی میں بہ مقام انگورا، روس میں بمقام لینن گراڈ، اطالیہ میں بمقام وٹیکن، اور نظیر آباد میں بمقام دفتر نگار سخت خطرناک زلزلے کے آثار محسوس ہوئے، روشنی کے منارے بجھ گئے، مشینیں چلتے چلتے رک گئیں کلیساؤں کے گھنٹے زمین پر آرہے، ماہی زمین نے کروٹ لی قطب اپنی جگہ سے ہٹتے ہٹتے رہ گیا اور کوہ طور پر بجلی چمک چمک کر

سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلَائِکَۃِ وَالرُّوحِ

جناب مولانا قطب الدین عبد الوالی صاحب نے اپنی "مؤثر و ایمان آفریں" انداز میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:-

لامذہبیت اور زندقہ کا سیلاب ہندوستان میں ابھر رہا ہے اور تحریروں و تقریروں میں جس طرح مذہب کو بازیچہ بنایا جا رہا ہے وہ آپ حضرات سے پوشیدہ نہیں، افغانستان ایران جس طرح آزاد ہو رہے ہیں وہ ایسی چیز نہیں ہے جس کا اثر ہندوستان پر نہ پڑے، اس لئے ضرورت ہے کہ علمائے کرام بہت جلد اپنے فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ادا کرنے کے واسطے میدان عمل میں اتر آئیں۔

اس کے بعد "متعدد مولاناؤں" نے جنہیں بہ لحاظ حجم مولانا شوکت علی و بہ لحاظ اختصار مولانا آزاد سبحانی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں اپنی "قیمتی تقریروں" میں "فاضل مقرر" کی تائید کرتے ہوئے علماء کرام کی مستعدی و فرض شناسی کی ضرورت کا اعتراف کیا اور اس طرح گویا اصولاً تحریک کی ضرورت پر مہر توثیق ثبت ہوگئی۔

اس کے بعد مولانا شہید انصاری نے بعض "بزرگان قوم" کے خطوط کا خلاصہ سنایا جنہوں نے اس مقصد سے اظہار ہمدردی کیا تھا اور پھر "مختلف علماء کرام" کا ایمان افروز اور خلوص پرور بیان پیش ہوا جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ:-

مغربی تعلیم۔ یورپی معاشرت اور فرنگی مادہ پرستی کا ایک خطرناک اثر ہندوستان میں یہ ہوا کہ بہت سے لوگ آزادی مذہبی بلکہ لامذہبی کا شکار ہو رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ارکان دین میں ترمیم کی ضرورت ہے کوئی سمجھتا ہے کہ دین کی مطلقاً ضرورت نہیں کسی کا خیال ہے کہ دینی علماء مذہبی آزادی و ترقی کے لئے سنگ راہ ہیں اور جس قدر جلد ممکن ہو ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ غرض آزادی مذہبی مختلف صورتوں میں نمایاں ہو رہی ہے اور روز بروز اندر ہی اندر جدید نسل کے قلوب میں گھر کر رہی ہے، یہاں تک کہ بعض نام نہاد حاملان دین بھی اس سیلاب میں بہہ گئے ہیں ہندوستان کے نوجوان مختلف جماعتوں کے نام سے منظم ہو رہے ہیں جو علی الاعلان کہتے ہیں کہ کسی مذہب کو زندہ نہ رہنے دو۔ اور قصر مذہب کی اینٹ سے اینٹ بجا دو ان لوگوں نے مذہب کے خلاف عام بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ اور نئے فتنہ کے احیاء و ابقا میں سرگرمی کا اظہار کر رہے ہیں اس مہلکہ عظیم سے اگرچہ دیگر اقوام کو بھی نقصان پہونچیگا لیکن وہ قوم (مسلمان) سب سے زیادہ خسارہ میں رہیگی جنکی قومیت سیاست اور وطنیت سب مذہب ہی ہے اور جنکی اخروی نجات کا انحصار اسلام ہی پر ہے، ان حالات اور ان کے خوفناک نتائج کو محسوس فرما کر انجمن مؤید الاسلام فرنگی محل لکھنؤ نے ۲ و ۳ اگست ۱۹۲۹ء کو ہندوستان کے ہر طبقہ کے علماء کو مدعو کیا اور مقتدر اعیان ملت سے بھی مشورہ لیا گیا۔ اس جلسہ مشاورت نے بالاتفاق مقتدر علماء کی ایک کمیٹی بنا دی جو اسباب لامذہبی کے انسداد پر غور کریگی۔ سر دست ہم دستخط کنندگان یہ اعلان کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ قوم مسلمین کی پناہ و حفاظت اور انکی دینی اور دنیوی نجات اسلام اور صرف اسلام ہی سے وابستگی پر منحصر ہے۔ آزادی و بے مذہبی کی

ترقی یافتہ قومیں آجتک نام نہاد مسیحیت کی پرستش کرتی ہیں۔ بائیس کروڑ ہندو برادران وطن اسکی سر فروشانہ جد و جہد کر رہے ہیں کہ ویدک دھرم کی ہر رسم کی حفاظت کی جائے۔ ہمارا اسلام دین فطرت ہے اور خالق فطرت کی حکیمانہ تشریحات کا مقدس مجموعہ ہے وہ جہاں روحانیت و اخلاق کا بحر ذخار ہے وہاں حب وطنیت اور سچی آزادی کا بھی علم بردار ہے، لہذا ہر کلمہ گو کا فرض ہے کہ وہ پکا اور سچا مسلمان بنے۔ اسلام ہی اسکی عقاید کی روح ہے اور وہی اسکی زندگی کے ہر لحہ میں ہیرو راہ نما نیز اوسے چاہیئے کہ اپنے قول و فعل کی تمام طاقتوں سے لامذہبی اور الحاد کو پامال کرے اور خدا کے بندوں کو خدا کی بغاوت سے روک دے۔ اس بارہ میں داعی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اُسوۂ حسنہ ہمارے لئے بہترین ہادی ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ دین و دنیا کے اس محسن اعظم کی ہر سنت کو زندہ رکھیں اور خود زندہ رہیں۔

اس کے بعد بعض علمار کرام کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور یہ ڈرامہ اس طرح ختم ہوا، کہ دستور العمل بنانے کے لئے مولانا آزاد سبحانی اور سید جالب کا انتخاب کیا گیا:۔

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

یہانتک تو "اس اہم جلسہ" کی کارروائی کا بیان تھا جو ۳۰ اگست کو فرنگی محل میں لامذہبیت و دہریت کے انسداد کے لئے قایم ہوا، لیکن آیئے ساتھ ہی ساتھ "اس جلسہ" اور "ارکان جلسہ" کی حقیقت پر بھی اک نظر ڈال لیں، کیونکہ ممکن ہے یہ کہانی پھر دوبارہ آپکے سننے میں نہ آئے۔

سب سے پہلا سوال ان جلسہ کرنے والوں سے یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے آپکو علمار کرام میں کس استحقاق سے شمار کرتے ہیں اور ایک عالم کی وہ کیا خصوصیات ہیں جن کا حامل وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔

کیا فرنگی محل کی سکونت، کیا دیوبند کا قیام، کیا درس نظامی کی چند کتابوں یا اس سے بھی زیادہ "یک خروار کتابوں" کا مطالعہ ایک شخص کو علمار کرام میں شامل کر سکتا ہے؟ کیا عالم نام ہے صرف اس شخص کا جو بالکل مقلدانہ اور غیر مجتہدانہ طور پر چند مسایل فقہیہ کا علم رکھتا ہو، کیا ایک عالم کا تشخص منحصر ہے محض اس امر پر کہ اسنے چند کتابیں حدیث کی پڑھ لی ہوں، کیا عالم کی پہچان یہی ہے کہ وہ عمامہ و عبا سے کبھی منفک نظر نہ آتا ہو، کیا عالم حقیقتاً وہی ہے جو صرف خوش بیان واعظ اور خوش الحانی سے مثنوی مولانا روم کے اشعار پڑھ سکتا ہو؟ کیا عالم اسکو کہتے ہیں جو اپنے آپکو مسجود دنیا سمجھے اور اپنے سوا سارے عالم کو حقیر و ذلیل۔ اگر واقعی ایک شخص انہیں خصوصیات کا حامل ہونے کے بعد عالم کہلائے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے تو کس کے منھ میں زبان ہے کہ اس جلسہ کی اہمیت سے انکار کرے۔ لیکن اگر عالم کہتے ہیں خبض شناس فطرت کو، اصلاح ملک و قوم کے لئے تمام دنیاوی اغراض کو ترک کر کے ایثار و قربانی کا عملی درس دینے والے کو، اس صالحیت و صلاحیت کے حامل کو جسکے لئے وراثت ارض کا وعدہ خدائے قدوس نے کیا ہے، ان صلحار بے نفس کو جو سینوں کو بغض و حسد سے، دلوں کو نفاق و ریا سے پاک کر کے محض خالصتہً للہ ہدایات خداوندی پر عامل ہو کر دوسروں کے لئے دلیل راہ بنتے ہیں، اور اگر عالم کی ذات عبارت ہے اس استقامت عمل، اس استواری عزم اور اس روحانیت اخلاق سے جس کا لازمی نتیجہ دنیا میں ہمیشہ ایک اور صرف ایک، (انتم الاعلون) ظاہر ہوا ہے، تو میں کہونگا کہ علمار کرام کے لئے یہ زیادہ موزوں ہوتا کہ وہ دوسروں کے ایمان کا جائزہ لینے کے

بجائے پہلے خود اپنے ہی اخلاق و اعمال کا احتساب کرتے اور دوسروں کی اصلاح پر متوجہ ہونیکے بجائے پہلے وہ اپنی ہی اصلاح سے فارغ ہوجاتے اور بجائے قال کے وہ صرف اپنا حال پیش کرتے کہ دنیا از خود انکی طرف جذب ہوجاتی

آج فرنگی محل میں علمائے کرام کی ایک جماعت ملک کے اندر دہریت و لامذہبیت کی اشاعت پر ماتم کرنے کے لئے فراہم ہوجاتی ہے، لیکن اس سے قبل کبھی اس کی توفیق اس کو نصیب نہیں ہوتی کہ وہ ضلالت و گمراہی کی تقسیم کرکے یہ متعین کرتی کہ اگر دنیا لامذہبیت کی بلا میں گرفتار ہے تو وہ خود صراط مستقیم سے منحرف ہونے میں کس نوع کی گمراہی کا اپنے آپ کو مجرم قرار دیتی ہے

جہانتک اعلان و نمائش کا تعلق ہے بیشک یہ اپنے آپ کو علمائے کرام کہنے والا گروہ بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یقیناً وہ نماز بس زیادہ پڑھتا ہے، پیشانی پر اثر سجود کو بھی نمایاں کرلیتا ہے، صیام کے سلسلہ میں ہزاری روزہ بھی ترک نہیں کرتا اور جب حج کو جاتا ہے تو وہاں سے خاک شفا کی تسبیح اور ماء زمزم بھی اپنے احباب وغیرہ کے لئے لاتا ہے۔ لیکن اگر ایمان و اسلام کا تعلق بطون سے ہے، اگر عبادات سے مقصود تزکیہ نفس و اخلاق اور تصفیہ قلب و روح ہے، تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ محشر میں ان علمائے کرام کیلئے کوئی علیحدہ صف قائم کیجائیگی

آج یہ "علمائے کرام" کا گروہ اس کا تو شاکی نظر آتا ہے کہ "لوگ مذہبی آزادی بلکہ لامذہبی کا شکار ہورہے ہیں" لیکن خود اپنے گریبان میں منہ ڈالکر یہ غور کرنیکی توفیق کبھی نہیں ہوتی کہ یہ "دور آوردہ تست" تو نہیں ہے، وہ زمانہ گیا جب ایک طرف "حق را بسجودے و نبی را بدرودے" کا افسوں کارگر ہوجاتا تھا اور دوسری طرف دامن امید پُر۔ اب دنیا ایک خاص اضطراب میں مبتلا ہے، علوم و فنون کی ترقی سے عقول انسانی ترقی یافتہ ہوکر مطالبہ کررہی ہیں کہ سب سے زیادہ مدعی صداقت مذہب، سب سے زیادہ ثبوت اپنے فطری ہونے کا دے اور علماء کی تنگ نظری، بیکسی و بیچارگی، تہی مائگی و ناداری کا یہ حال ہے کہ اگر انکے منقولات کے دفتر کو نظر انداز کردیا جائے تو بجز سوائے کافر کہدینے اور گالیاں دینے کے اور کوئی ذریعہ دفاع ان کے پاس نہیں رہجاتا کیونکہ خود اپنے اندر کوئی قوت اخلاق و روح کی ایسی ہے نہیں جو دوسروں پر اثر ڈال سکے

جس وقت کسی گوشہ سے یہ صدا آجاتی ہے کہ "علما کا جلد سے جلد خاتمہ کردیا جائے کیونکہ وہ آزادی و ترقی کے لئے سنگ راہ ہیں" تو یہ اپنی گردن چھڑانے کے لئے بہت اچھلتا کودتا ہے، لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ جو چیز عملاً بیکار ہوجاتی ہے وہ اصولاً آپ ہی حذف ہوجایا کرتی ہے، اسکا خاتمہ تو اسیوقت ہوگیا جب اُس نے دین کو ذریعہ رزق قرار دیا۔ خدمت دینی کا منصب خدا نے اسیوقت اس سے چھین لیا جب اس نے اپنے آپکو ایک بت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا

وہ یہ زبان سے تو ضرور کہتا ہے کہ:۔

"ہمارا اسلام دین فطرت ہے، خالق فطرت کی حکیمانہ تشریح کا مقدس مجموعہ ہے، وہ سچی وطنیت اور سچی آزادی کا علمبردار ہے"

لیکن عمل کے لحاظ سے اسکی تعلیم یہی ہوتی ہے کہ اسلام نہ وطنیت کا حامی ہے نہ آزادی کا علمبردار، نہ اسمیں کوئی حکیمانہ تعلیم ہے اور نہ مصلحانہ تبلیغ، بلکہ وہ بالکل غیر فطری، غیر آئینی، اور غیر مہذب مذہب ہے جو دنیا میں صرف خود غرضی اور نفس پرستی کی اشاعت کے لئے رونما ہوا

ایک عالم یہ ضرور کہتا ہے کہ:۔

"داعی اسلام رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے بہترین ہادی ہے"

لیکن نہ وہ اسوۂ حسنہ کے مفہوم سے واقف ہے اور نہ داعیِ اسلام کے اخلاق و عادات سے، اس نے اس قسم کے چند الفاظ محض گرمیِ سخن قایم رکھنے کے لئے یاد کر لئے ہیں، قلب و روح کی حرارت کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا یہ علمار تاریخ اسلام سے مطلق واقف نہیں اور کیا انہیں نہیں معلوم کہ جب عہد عباسیہ میں اسلام کو ایک خدائی و فطری مذہب کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا اور دیگر ملل و مذاہب کے علمار و حکماء کو اس کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی گئی تو کتنے جدید مسایل بر روئے کار آئے اور اس عہد کے علمار و متکلمین نے کس وسعت نظر اور مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ اور کیونکر انہوں نے منقولات کو علیحدہ رکھکر صرف معقولات کی مدد سے فریق مخالف کو اسلام کا مدّاح بنا لیا۔ پھر آج جبکہ عباسیہ کے وقت سے زیادہ علم کی روشنی پھیل چکی ہے، اسوقت سے کہیں زیادہ تنقید و تحقیق کے ذرایع لوگوں کے ہاتھ آگئے ہیں، آپکا اپنے منقولات کا دفتر لے کر بیٹھ جانا کیا فائدہ پہونچا سکتا ہے، اور اگر آپ یہ دعویٰ کریں کہ نہیں آپ معقولات میں بھی اپنے خصم کو ساکت کر سکتے ہیں، تو معاف فرمائیے میں اسکو سوائے "دخل در معقولات" کے اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آپکے یہاں کے معقولات تو اب دفترِ پارینہ ہیں اور معقولات جدیدہ کی آپ کو ہوا بھی نہیں لگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسوقت کی جماعت علمار کرام بالکل ایک (FOSSIL) متحجر چیز ہے اور موجودہ کاروبار حیات میں اسکا وجود مایۂ اعتبار و بینش کی حیثیت تو رکھ سکتا ہے، لیکن اسے سرمایۂ حیات و زندگی نہیں کہہ سکتے

میں ان تمام "علمار کرام" سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اسوقت تک انہوں نے کونسی دینی خدمت انجام دی ہے؟ کیا حلال و حرام کے معمولی مسایل بتا دینا، کیا مساجد میں امامت کر لینا، کیا مجالس میلاد میں وعظ کہہ دینا، کیا رنگون و برما جا کر جاہل و احمق مسلمانوں سے خلافت و تبلیغ کی بے معنی تحریک کے لئے چندہ وصول کر لانا، کسی آریہ کی کتاب کا جواب لکھ لینا، تقلید و عدم تقلید کے مسئلہ میں مناظرہ کر لینا، ایسی اہم خدمات ہیں جو ایک شخص کو علمار میں داخل کر سکتی ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان علمار کرام میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کو صحیح معنوں میں ہادی و مرشد یا عالم و فاضل کہہ سکیں

جہانتک علم ظاہر کا تعلق ہے ان کی بے مایگی کا یہ عالم ہے کہ سوائے ان چند دقیانوسی کتابوں کے جو انہوں نے کسی وقت مدرسہ میں پڑھ لی ہیں اور جنکی صحت پر اب بھی انہیں ایسا ہی ایمان ہے جیسے اندھے کو اپنے زوال بینائی کا، انکو کچھ خبر نہیں کہ دنیا میں کتنے اور علوم و فنون رونما ہو گئے ہیں اور عقل انسانی نے کسقدر ترقی کر لی ہے، نہ انکا مطالعہ وسیع، نہ انکی معلومات عامہ درست، نہ انکا ذہن ترقی یافتہ، نہ انکی عقل صحیح و پختہ، نہ ان میں بالغ نظری ہے نہ نکتہ رسی، نہ مصلحت اندیشی ہے نہ دیدہ وری، دوسری قوموں کے علوم و فنون سے واقف ہونا تو درکنار ان غریبوں کو خود اپنے یہاں کے علوم کی بھی خبر نہیں، یہانتک کہ اگر آج ان سے دریافت کیا جائے کہ اسوقت سب سے بہتر کتاب فن تنقید میں کونسی سمجھی جاتی ہے تو وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے، وہ اب بھی یہی سمجھے ہیں کہ جو ایک درجن کتابیں انہوں نے پڑھ لی ہیں، اس سے زیادہ علوم اسلامی کے حدود وسیع ہو نہیں سکتے، اور وہ زمانہ کی رفتار سے اسقدر بیگانہ ہیں کہ اگر آج مصر کی جدید کتاب انکے سامنے رکھدی جائے تو وہ ایک صفحہ بھی اسکا نہ سمجھ سکیں گے اور حیران رہ جائینگے کہ یہ کونسی نئی زبان اسقدر جدید اصطلاحات کے ساتھ پیدا ہو گئی ہے۔ یہ ہے انکی عربی دانی کا حال، فارسی زبان چونکہ آتش پرستوں کی ہے اسلئے وہ اسے کیا حاصل کر سکتے ہیں، رہ گئی اردو، سو اسکے متعلق شاید وہ فخر کے ساتھ کہہ سکیں گے کہ اس میں کمال حاصل کرنا انکی شان کے منافی ہے، مغربی علوم و فنون کا کیا ذکر، ان غریبوں کو تو انکے نام بھی نہیں معلوم

علم باطن جس کا تعلق یکسر اخلاق و روحانیت سے ہے، اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ اس کا دعویٰ شاید انہیں بھی نہ ہوگا اور بجز اس کے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لفظ فقیر کا اضافہ کر کے ایک ہلکی سی جسارت اس نمائش کی کریں اور زیادہ ان کے بس کی بات نہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دنیا انہیں خوب جانتی ہے۔ رہی اس گروہ کی قوت عمل سو اسکی مثالیں بھی کثرت سے موجود ہیں اور آگرہ کا وہ منظر سامنے ہے جب اس سے کہیں زیادہ جوش و قوت کے ساتھ مذہبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی تھی، لیکن اسکا دوسرا جلسہ ہونیکی نوبت اسوقت تک نہیں آئی۔

پھر جب حالت یہ ہے تو میں حیران ہوں کہ یہ اپنے منھ سے اپنے آپ کو بغیر کسی استحقاق بعید کے بھی "علمائے کرام" کہنے والا گروہ (بقول صاحب کن "حظوظ نفس" کے ماتحت اس جسارت پر آمادہ ہوا ہے) اور دہریت و لامذہبیت کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے، جبکہ وہ ابھی تک یہی نہیں سمجھ سکا کہ جسکو وہ "لامذہبیت" کے نام سے موسوم کرتا ہے حقیقتاً اسلام وہی ہے، اور موجودہ اضطراب حقیقتاً مذہب کے محو کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ انہیں علمائے کرام کے بت توڑنے کے لئے پیدا ہوا ہے

یہ لوگ بالکل غلط کہتے ہیں کہ اسوقت بیدینی اور لامذہبیت کے خیالات پھیلتے جا رہے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا اب علماء سوء کے عذاب کو اپنے اوپر زیادہ عرصہ تک مسلط نہیں رکھنا چاہتی اور اس کو مٹا دینے کے لئے آمادہ ہو گئی ہے اس لئے جو کچھ اس جلسہ میں بیان کیا گیا، بالکل خلاف حقیقت ہے اور صداقت سے یکسر دور، جو خوف انہیں اپنی ذوات سے متعلق ہے اسے اسلام سے کیوں وابستہ کرتے ہیں۔ اور اگر اسلام عبارت انہیں کی ذات سے ہے تو پھر یقیناً انہدام اسلام ہی انسان کا فرض اولین قرار پائے گا

اس جلسہ کی کارروائی میں متعدد جملے ایسے نظر آتے ہیں جن سے انتہائی انہماک اور مستعدی کا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جو کمر ہمت آج فرنگی محل کی مجلس امیں کسی گئی ہے وہ داور حشر کے سامنے ہی کھلے تو کھلے لیکن میں اس کے اعتراف میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ

ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

گزشتہ دو ماہ کے اندر جو مطبوعات موصول ہوئے ہین، ان پر اس مہینے کے نگار مین ریویو نہین کر سکا، ماہ آیندہ مین اسکا امکان ہے لیکن انھین کتابون مین ایک چیز ایسی موصول ہوئی ہے جس کا ذکر مین جلد سے جلد کر دینا چاہتا ہون اور وہ قانون مسعودی جلد چہارم کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے جو نوشتہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی طرف سے بہ طلب آرا شایع کیا گیا ہے۔

قانون مسعودی، البیرونی کی نہایت معرکۃ الآرا تصنیف ریاضیات فلکی پر ہے جس کے ترجمہ کا خیال سب سے پہلے نواب محمد اسحاق خان مرحوم کو پیدا ہوا تھا لیکن یہ ارادہ قوت سے فعل مین نہ آسکا

اب ہمارے فاضل دوست مسٹر محمد فاروق ام اس سی اس خدمت کے لئے منتخب ہوئے ہین انھون نے فی الحال صرف ۸ صفحات کا ترجمہ (بزبان انگریزی) معہ حواشی و استدراکات کے پیش کیا ہے اور موضوع کی دشواری کے لحاظ سے جس وقت اس کوشش پر نگاہ کیجاتی ہے تو بقول ہمارے ایک دوست کے فاروق صاحب کو بالکل "دیوتا" ماننا پڑتا ہے۔ انھون نے چار قدیم نسخون سے مقابلہ کر کے

اصل کتاب کو مرتب کیا ہے اور پھر اس کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ جو (اصطلاحات ریاضی کو علیحدہ کرنے کے بعد) بے انتہا صاف و سلیس ہے، ہر اس تفصیل و تشریح کا اضافہ کیا ہے جو اس کتاب کو سریع الانتقال الی الذہن بنانے کے لئے ضروری تھا۔

ہمارے نزدیک جناب فاروق کا یہ کارنامہ ان کی اُس قوت کامنہ کا اعجاز ہے جس کا علم شاید انھیں بھی اس سے قبل نہ رہا ہوگا۔ ہمکو امید ہے کہ ارباب یونیورسٹی اب اس سلسلہ کو منقطع نہ ہونے دینگے اور فاضل مترجم کو ہر وہ آسانی فراہم کرینگے جو اس کام کو جلد انجام تک پہونچانے مین مفید و معاون ہوسکے۔ ترجمہ کے ساتھ اصل کتاب کی عبارت بھی ایک مرتب کی تمام ذمہ داریون کے ساتھ درج کتاب کی گئی ہے اور اس طرح فاروق صاحب بیک وقت دو نہایت مشکل مگر بے انتہا ضروری خدمت علم انجام دے رہے ہین۔

اس اشاعت کا پہلا مضمون ہمارے فاضل دوست پروفیسر محمد نعیم الرحمان ام۔ اے کا ہے جو آیندہ ماہ مین غالبًا ختم ہوجائے گا، تعارف و تقریب کی ضرورت نہین کیونکہ صاحب مضمون اور مضمون دونون خود آپ اپنی سفارش ہین۔

مجنون کا فسانہ ماہ آیندہ مین ختم ہوجائیگا۔ چونکہ مجنون کے اکثر افسانے ہارڈی کے مطالعہ کا نتیجہ ہوتے ہین اس لئے ان مین ایک خاص قسم کے دل دُکھا دینے والی ٹریجڈی کا پایا جانا ضروری ہے۔ ہر چند وہ ہارڈی کی طرح خدا کو صرف اہرمن سمجھنے والے تو نہین ہین لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا سے کچھ زیادہ خوش بھی نہین ہین۔

انارکسٹ، ایچ۔ جی ویلس (عہد حاضر کی نہایت ہی مشہور انشاپرداز) کے ایک فسانہ کا ترجمہ ہے۔

جناب بدر اصلاحی کا مضمون مشرقی مآثر پر خوب ہے۔ فسانہ عجائب اس ماہ مین ختم ہوگیا ناظرین نے اس مضمون کو پسند کیا اور نقاد کے تحقیق کی کافی داد دی لیکن مجھے کہیں کہیں اُن سے جادۂ اعتدال چھوڑ دینے کی شکایت ضرور ہے

تین مضمون اُن حضرات کے ہین جنھون نے اپنے نام کے اظہار کی اجازت نہین دی اور تینون مضمون چونکہ تنقیدی ہین اس کے لئے اظہار نام کی چندان ضرورت بھی نہ تھی۔

جناب ناطق کی غزل پر جو تنقیدی مضمون موصول ہوا تھا وہ کافی حذف کرنے کے بعد شایع کیا جارہا ہے، اب بھی بعض مقامات کے لب ولہجہ سے مجھے اختلاف ہے۔

آیندہ اشاعتون مین بعض نہایت ہی دلکش و مفید مضامین شایع ہونے والے ہین منجملہ اُن کے ایک کلام حزین پر تبصرہ ہے جو بہت کاوش سے لکھا گیا ہے، اس طرح مصحفی کی شاعری پر ایک صاحب نے جو یادگار مصحفی ہین بسیط مضمون روانہ کیا ہے۔ مین نے بھی ایک افسانہ لکھا تھا جو اس ماہ مین نہ شایع ہوسکا آیندہ اشاعت مین درج ہوگا۔ ایک مختصر سا مضمون میرا حجاب کی شاعری پر آئندہ اشاعت مین درج ہوگا جو سلطنت اودھ کے عہد شباب کی ایک شاعر امیرزادی تھی اور حقیقتًا شعر کہتی تھی اسیطرح مولانا کیفی چریاکوٹی کا ایک عالمانہ مضمون مومن کی شاعری پر شایع ہوگا

ظفر کے متعلق جو حضرات مضامین لکھ رہے ہین ان کو یہ اطلاع دیدینا ضروری ہے کہ ماہ ستمبر بہت قریب ہے اور زیادہ سے زیادہ اکتوبر کے اخیر تک ظفر نمبر کی کتابت شروع ہوجائے گی

نیاز

ہندی اور بابلی علم الاصنام کی مُشابہت

متھیا (دیومالا، متھالوجی، علم الاصنام، خرافیات، وغیرہ جس نام سے چاہئے اُسے موسوم کیجئے) ایک جامع اصطلاح ہے اور اُن تمام قصون اور روایتون پر حاوی ہے جو دُنیا کی مختلف اقوام مین قدیم اور قدیم ترین زمانے مین رائج تھین اور جن پر وہ ایسا ہی راسخ اعتقاد رکھتے تھے جیسا آج ہم اپنی جدید سے جدید معلومات پر رکھتے ہین۔ اور زیادہ تفصیل سے یون کہا جاسکتا ہے کہ ان روایات مین آفرینش کی ابتدا، کائنات کی پیدائش، خدائی یا انسان سے بالاتر اشخاص کی پیدائش اور اُن کے اعمال اور افکار سے بحث ہوتی ہے کہ یہ حضرات کیونکر پیدا ہوئے، اُنھون نے کیا کیا کمالات حاصل کئے، کون کون سے کارہائے نمایان کئے، تمام بنی نوع انسان یا اپنے خاص فرقے اور قبیلے کی انھون نے کیا کیا خدمت کی، دُنیا کی حکومت مین انھون نے کیا حصہ لیا، انسان کے ساتھ اُن کی دوستی اور دشمنی کا کیا رنگ تھا، خود اُن کے آپس مین تعلقات کیا اور کیسے تھے، وغیرہ وغیرہ، دنیا کی ہر قوم اپنی زندگی کی ابتدائی منزلون مین ایسی روایات اور خُرافات کا ذخیرہ رکھتی تھی۔ ان مین سے اکثر قومون کی متھیا دریافت کی جا چکی ہے اور جو باقی ہین ان کے متعلق علم حاصل کرنے کی برابر کوشش کی جارہی ہے

مختلف ملکون اور قومون کی متھیا کے مطالعہ مین ایک نہایت دلچسپ بات جو فوراً ذہن مین آتی ہے یہ ہے کہ کئی کئی اقوام اور ممالک کے باشندون کے خیالات اور عقیدے آپس مین ایک دوسرے سے بہت کچھ مشابہ تھے، نہ صرف یہ کہ ایک ہی خاندان کی مختلف اقوام کے خیالات ایک ہی اسلوب اور نہج پر نظر آتے ہین، بلکہ مختلف خاندانون کے اور ایک دوسرے سے معقول فاصلے پر بسنے اور رہنے والی قومون کے خیالات بھی آپس مین مُشابہت رکھتے ہین۔ اس وقت ذیل کی سطرون مین بابل اور ہندوستان کی متھیا کی مشابہت دکھانا مقصود ہے۔ اس غرض سے مجھے جو جو روایات اور قصے ایسے مل گئے ہین جن مین بابل اور ہندوستان آپس مین شریک ہین، وہ قلمبند کر دیئے ہین، ہندوستان کی قدیم عظمت اور جلال کے ثبوت کے لئے غالباً یہی چند مثالین فی الحال کافی ہونگی

لیکن قبل اس کے کہ بابلی اور ہندی علم الاصنام یا متھیا کی روایات کی مُشابہ تصویرون کو پیش کیا جائے یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات کا زمانہ (عام اس سے کہ وہ بابل کے متعلق ہو یا ہندوستان کے) معین کرنا نہایت دشوار ہے۔ اس ضمن مین صرف دو باتین کہی جاسکتی ہین۔ ایک تو یہ کہ ان روایات کا زمانہ غالباً تین اور چار ہزار سال قبل مسیح سے لے کر ایک ہزار اور پانچ سو سال قبل مسیح تک کا ہے، دوسرے یہ کہ اغلب امر یہ ہے کہ یہ روایات بابل سے ہندوستان پہنچی ہین اب خواہ اُنہین آریا قوم وہان سے اپنے ساتھ لائی ہو (اور یہ امر آجکل مستشرق علماء کے ہان زیر بحث ہے)

؎ خواہ ہندی سوداگرون اور سیاحون کے

ذریعہ سے ہمارے ملک مین پہنچ گئی ہون ۔ اور اس لحاظ سے غالباً ہندی کی ان روایتون کا زمانہ بابلی روایتون کے بعد آتا ہے۔
چونکہ زمانہ کا ذکر ہو رہا ہے، اس لیے سب سے پہلے اسی سے شروع کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ جگ

ہندی (اور اسی طرح یونانی اور آئرلینڈی) متھیا مین دُنیا کی عمر کو چار زمانون مین تقسیم کیا گیا ہے۔ چاندی (سفید) سونا (زرد)، برنج (سُرخ) اور لوہا (سیاہ)، جن کو ہمارے ملک مین بالترتیب کرت جگ، ترتیت جگ، دواپر جگ اور کل جگ کہتے ہین۔ قدیم ہندی حساب سے ایک مہا جگ ۴۳۲۰۰۰۰ (تینتالیس لاکھ بیس ہزار) برس کا ہوتا ہے اسی طرح اہل بابل کا عقیدہ تھا کہ اُن کے ہان "طوفان" سے پہلے دس بادشاہ راج کر چکے تھے اس تمام مدت کا مجموعہ ۱۲۰ (ایک سو بیس) "سروی" ہوتا ہے، اور چونکہ ایک سروی مین ۳۶۰۰ (تین ہزار چھ سو) برس ہوتے ہین، اس لیے ۱۲۰ سروئی ۴۳۲۰۰۰ (چار لاکھ بتیس ہزار) برس کے برابر ہوئی۔ اس رقم کو اگر دس سے ضرب دیا جائے تو وُہی ہندی مہا جگ کے تینتالیس لاکھ بیس ہزار سال پیدا ہوتے ہین۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل اور ہندوستان دونون مین وقت اور جگہ (زمان و مکان) کا اندازہ کرنے کے لئے دس (۱۰) اور چھ (۶) کے ہندسون سے بہت کام لیا جاتا تھا، کیا عجب ہے کہ ہندی اور بابلی حساب کے طریقہ کی بناء ایک ہی ہو، اور یہ امر بھی نہایت دلچسپ ہے کہ آجکل تمام دُنیا ایک ڈگری سے لے کر گھنٹہ تک (جو وقت کی پیمائش کے اُصولی ذریعے ہین) ۱۰ x ۶ (= ۶۰) ہی کے حساب سے کام کر رہی ہے!

۲۔ برہما....

جس طرح ہندی متھیا مین (چھوٹے چھوٹے دیوتاؤن سے قطع نظر کرکے) تین بڑے خدا مانے گئے ہین، اسی طرح اہل بابل کے بھی تین بڑے خدا تھے۔ بابل کی خدائی تثلیث مین آنیع، بعل، انلیل اور آنُم کو بالکل وہی خدائی کاروبار سپرد تھے (بلکہ اب بھی ہین!) وشنوجی کی طرح آنیع بھی دُنیا کا پالنے پوسنے، زندہ سلامت رکھنے اور حفاظت کرنے والا تھا، شوجی کی مانند بعل انلیل کو مارنے اور غارت، برباد، ہلاک اور تباہ کرنے کی خدمت سپرد تھی، اور برہما جی کی طرح انُم دیوتا بھی سب کا پیدا کرنے والا اور سب کا باپ تھا، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودی قوم کا ایک حصہ جب عرصہ تک ایک اکیلے "یہوا" کا نام سنتے سنتے اور جپتے جپتے تنگ آگیا تو اُس نے اُسے معزول کرکے پھر ایک مرتبہ باپ، بیٹا اور روح القدس کے نام سے اپنے پُرانے تین خداؤن کو زندہ کرکے بٹھا دیا اور اپنے اس کمال کی داد کو پاک و بے گناہ یسوع مسیح کے نام پر وقف کر دیا چنانچہ دُنیا کی انسانی آبادی کا ایک معتدبہ حصہ آج بھی ان کی داد دے رہا ہے۔ ملک اشوریا کا خدا اشور جگ دیوتا تھا، ہندوستان کے برہما کی طرح وہ بھی پرماتما اور پرمیشور تھا، سارے جہان کا خالق، نگہبان، محافظ اور ہلاک کرنے والا تھا آگ، پانی، زمین، ہوا، آسمان، سورج، چاند، ستارون اور بجلی کا بھی خدا تھا، گویا آنُم اور اشور وہان کے برہما تھے

۳۔ اِندر

بابلی متھیا میں رُمن دیوتا ہوا، گرج اور بجلی کا دیوتا تھا، وہ پانی برساتا، اناج پیدا کرتا اور باہم لوگوں میں فساد ڈالتا اور لڑائیاں کراتا تھا، وہ عموماً پہاڑ وں پر رہتا تھا اور وہیں سے اپنے فرائض منصبی ادا کیا کرتا تھا، وہ مغرب سے آریا قوم کی رَو کے ساتھ چل کر پنجاب کے راستے ہمالیہ پہنچا اور وہیں قیام کیا، یہاں وہ 'اندر' دیوتا کے نام سے مشہور ہوا۔ اندر دیوتا کے بھی بعینہٖ وہی سب کام ہیں جو بابل میں 'رمن' کے سپرد تھے، وہ بابل میں 'تمّوز' کے نام سے سردی اور آندھی کے، اور ہندوستان میں 'اندر' کے نام سے خشک سالی کے دیوؤں کو قتل کرکے پانی برساتا اور اناج پیدا کرتا تھا، وہاں بابلی اور یہاں ہندوستانی اپنے اس اَن داتا کو خوش رکھنے کے لئے انسانوں کی قربانیاں چڑھاتے (اور اس غرض کے لئے عموماً غیر ملکوں سے لوگوں کو قیدی بنا بنا کر لاتے) تھے اس خدمت کے معاوضہ میں ان داتا انھیں کھانے پینے کو دیتا تھا! بابل کے رمن کی طرح ہندوستانی اندر بھی ہر سال مرجاتا تھا۔ چنانچہ مہابھارت (آدی پرب) کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ پانڈو بھائی اصل میں پانچ پرانے اندر تھے جو اپنے اپنے وقت میں مرچکے تھے

بابل کا میرودخ دیوتا اپنے باپ آئیع کے مرنے کے بعد اژدھوں کے مارنے کی خدمت پر سرفراز ہوا تھا، اسی طرح ہندی اندر نے بھی اپنے باپ دیوس کو مار کر اس کے خدائی کاموں کو اپنے ذمے لے لیا تھا

بابلی دیوتا آئیع ہندی اندر کی طرح مختلف قسم کی صنعت اور دستکاری میں کمال رکھتا تھا، اکثر ضرورت کے وقت آئیع اپنے (خلیج فارس کے) گھر میں سے نکل کر اپنے بندوں کو نہریں کھودنا، کھیتی باڑی کرنا، دھات کا کام کرنا، مٹی کے برتن اور اینٹیں بنانا اور اُن سے مندر اور عبادت گاہیں تیار کرنا سکھاتا تھا۔ اُس نے اس دنیا کو بالکل اسی طرح بنایا تھا جسطرح کوئی معمار مکان بناتا ہے۔ اندر دیوتا نے بھی اپنے ہتھوڑے اور بسولے کے ذریعہ اسی طرح یہ تمام کائنات بنا کے رکھ دی تھی جیسے اُس وقت کے ہمارے آریا آباؤ اجداد لکڑی کو کاٹ، چھیل اور جوڑ کر اپنے گھر بنایا کرتے تھے۔

ہندی اندر بیک وقت بابلی آئیع، رمن اور میرودخ کے برابر تھا!

۴۔ اگنی

ہندی متھیا میں اگنی آگ کا دیوتا ہے۔ ویدوں کے بھجنوں اور روایتوں میں اُس کا نام اکثر پایا جاتا ہے، اُس کی مورتی میں دو چہرے، تین ٹانگیں اور سات بازو ہوتے ہیں، اور عموماً اُس کے ساتھ ایک مینڈھا ہوتا ہے۔ اسی طرح بابلی متھیا میں گرّو، گِشبار، گِبل اور نسکو آگ کے دیوتا تھے۔ ہندوستان نے ان چار کے مقابلے میں اپنے ایک ہی دیوتا کو دو چہرے اور سات ہاتھ دے رکھے تھے۔ اس لحاظ سے پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان بابل پر فوقیت لے گیا۔

لے تاکہ اُس کی قربانی کرکے اُسے جلایا جاسکے۔ قربانی اور آگ اکثر قدیم قوموں کے ہاں لازم ملزوم چیزیں تھیں۔ ہندی مسلمان بھی بقرعید کے دن کباب کھانے کے بہت شوقین ہیں! مگر ایک بزرگ ایک مرتبہ فرماتے تھے کہ شب برات میں اگنی دیوتا بہت خوش رہتے ہیں

گو یہ یقین کے ساتھ نہین کہا جاسکتا کہ بابلی بھی ہمارے آباؤ اجداد کی طرح اپنے ان دیوتاؤن کو زندگی اور رُوح کی بنا (جس کا ظہور جاندارون کے بدن کی گرمی مین پایا جاتا ہے) سمجھتے تھے یا نہین، لیکن یہ ضرور ہے کہ قدیم (اور غالباً آجکل کے بھی) ہندوستانیون کی طرح اُن کے ہان بھی آگ کو جادو ٹونے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، مُردے کو جلاکر راکھ کردینے کا قاعدہ جو آج تک ہندو گھرانون مین باقی ہے، اُس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ قدیم آریا یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اُن کے مُردے آگ مین بھسم (یا یون کہئے کہ اگنی دیوتا کی ذات والاصفات مین فنا - فنا فی النار) ہوکر براہ راست سورگ (جنت) مین پہنچ جاتے تھے، اسی طرح اہل بابل بھی کبھی کبھی اپنے مُردون کو جلایا کرتے تھے، قدیم سمیا طیقی قومون مین قربانی کے وقت جانورون کو (اور بعض اوقات انسانون کو بھی) آگ مین بھسم کردینے کا عقیدہ اور عمل بالکل عام تھا، اہل بابل کا (مذکور بالا) نُسکو دیوتا ہمارے ملک کے اگنی دیوتا کی طرح دیوتاؤن کا دُوت (قاصد) بھی تھا - چنانچہ جب میرودخ دیوتا کو بابل کے تمام دیوتاؤن کی سرداری ملی ہے تو اُس نے نسکو ہی کو آیع دیوتا کے پاس اس ترقی منصب کی خبر پہنچانے کیلئے قاصد بنا کر بھیجا تھا -

اسی طرح بابلی دیوتا تموز (جس کے نام پر سُریانی تقویم کے ایک مہینہ کا نام بھی تموز ہے، جو ہمارے بیساکھ جیٹھ اور انگریزی جون جولائی کے وقت مین ہوتا ہے) اور اگنی دیوتا کی چند صفات آپس مین مشترک ہین تموز دیوتا "شفا دینے والا" تھا، اگنی "سب طرح کی بیماریون کو دور کرنے والا" تھا، تموز گھن گھرج آواز کا دیوتا تھا، اگنی بھی ایک مست سانڈ کی طرح چنگھاڑتا تھا، تموز اور اگنی دونون بڑے دلاور اور جنگجو تھے، دونون بڑے بڑے دیوون کو مارتے اور قتل کرتے تھے، اہل بابل کے ہان تموز دیوتا کا ایک کام یہ بھی تھا کہ وہ رات کے وقت آسمان کی رکھوالی کرے - اس حیثیت مین وہ لوگ اُسے بکرے کی صورت مین تصور کرتے تھے، روایت ہے کہ ایک مرتبہ بابل مین طرح طرح کی بیماریون کی وبا پھیلی، تو لوگون نے عاجز آکر میرودخ دیوتا سے دُعا کی کہ انھین ان وباؤن سے بچائیے، اور اس کے ساتھ ہی انھون نے ایک بکرا لے کر اُسے خوب بنایا سنوارا اور میرودخ کے نام پر جنگل مین چھوڑ دیا[1] - دیوتا نے بکرا قبول کیا، اور اپنے بندون کو وبا سے نجات دی - وہ بکرا آسمان پر پہنچ کر ستارہ بن گیا (جسے آجکل کی اصطلاح مین قطب ستارہ کہتے ہین) - چنانچہ عربی زبان مین اب بھی اُس کو "جدی" (بکری کا بچہ) کہا جاتا ہے، اسی طرح ہندی متھیا مین بھی اگنی دیوتا اور ورُن دیوتا کا بکرے سے تعلق ہے - قدیم آریا لوگ اپنے مردون کا کریاکرم کرتے وقت اس نیت سے بکرا قربان کیا کرتے تھے کہ اس طرح وہ دیوتاؤن کو خبر کردین کہ ایک نئی رُوح اس دنیا سے اُس دنیا مین داخل ہورہی ہے اور دیوتاؤن کی پناہ اور سرپرستی کی خواستگار ہے!

۱؎ ممکن ہے یہی بکرا ان بکرون کا مورث اعلیٰ ہو جن کو آج بھی ہمارے بعض دیندار بھائی خوب بنا سنوار کے بزرگان دین اور اولیاء اللہ کے نام پر چھوڑ دیتے ہین! پھر اُن بکرون سے نہ معلوم ان کا کیا رشتہ ہے جن کو ہمارے ملک کے جادوگر اور سیانے کالی مائی کے نام پر قربان کرتے اور ان کا خون پی کر اپنے معتقدین کے حق مین حیرت انگیز پیشگوئیان کرتے ہین؟

۵۔ سورج

بابل مین سورج دیوتا کا نام شمش (عربی شمس۔ سورج) تھا۔ وہ قسمت اور تقدیر کا مالک تھا، سب زندہ اور مُردہ ہستیون کا خدا تھا، وہ سب سے بڑا منصف، سب سے بڑا قانون ساز تھا، اور سب سے انصاف کا برتاؤ کرتا تھا۔ وہ بدکاری کا دشمن تھا، گناہ سے سخت نفرت رکھتا تھا، صدق اور خلوص کا عاشق تھا، اپنے پوجاریون مین سچائی اور ایمانداری کی روح پھونکتا اور گناہگارون کو سزا دیتا تھا، وہ دُنیا کو روشن کرتا تھا اور اُس کے نُور کی شعاعین دنیا کے ہر ہر کونے مین پہنچتی تھین۔ وہ ہر چیز کو دیکھتا اور ہر انسان کے خیالات کو جانتا اور پڑھ سکتا تھا۔ کوئی چیز اُس سے پوشیدہ نہ تھی۔ اُس کا ایک نام مِتر بھی تھا۔

ہمارے ملک کے ویدون (خصوصاً رگ وید) مین مِتر دیوتا وَرُن کا ہمزاد تھا۔ یہ دونون انسان کی زندگی کی مدت مقرر کرتے اور اُس کی نگہبانی مین مصروف رہتے تھے۔ وہ سورج اور چاند کے راستون اور عملون کا اندازہ اور اُن کی تعین کرتے تھے، وہ ہوا، پانی اور موسم سب سے اُن کے ٹھیک ٹھیک وقت پر کام لیتے تھے۔ وہ ہر گھر مین ہر شخص کے نگہبان اور سرپرست تھے، اور گناہگارون کو سزائین دیتے تھے، وہ زمین پر پانی برساتے تھے۔

جس زمانے مین آریا لوگ پنجاب مین تھے اور وَرُن اور مِتر کی پوجا کرتے تھے وہ اپنے مُردون کو جلاتے نہین تھے بلکہ "مٹی کے گھرون" مین دفن کرتے تھے۔ یہی حال شمش کے پوجنے والون کا بابل مین تھا، ہندوستان کے یَم دیوتا کی طرح بابل کا مِتر دیوتا بھی اِس دنیا سے جانے والی روحون کا بادشاہ تھا، یہ روحین جس ملک مین رہتی تھین اُس مین پہنچنے کے لئے (بابلی اور ہندی دونون عقیدون کے مطابق) بڑے بڑے پہاڑون اور "موت کی ندی" کو پار کرنا پڑتا تھا،

یہی مِتر ایران مین مِہر (سورج) کے نام سے جلوہ گر تھا!

۶۔ طوفان

بابلی روایت کے مطابق پیرنپشتیم[1] نے گلگمیش[2] سے طوفان کا واقعہ جس طرح بیان کیا تھا وہ مختصراً یون ہے۔ دریاے فرات کے کنارے شُرپَگ کے شہر مین سب دیوتاؤن کا مجمع ہوا اور اُنھون نے متفق طور پر یہ طے کیا کہ زمین پر پانی کا ایک طوفان پہنچنا چاہیئے۔ ایَع دیوتا نے (جو عقل کا خدا تھا) پیرنپشتیم کو (خواب مین) یہ ہدایت کی کہ چونکہ ہم سب دیوتاؤن کی یہ مرضی ہے کہ زمین پر ایک سخت طوفان بھیجین، اس لئے تم اس سے خبردار رہو اور اُس مین ہلاک ہونے سے بچنے کے لئے اپنے مکان کو توڑ کر ایک بہت بڑی سی کشتی بناؤ، اور جب طوفان شروع ہو تو اپنے سارے خاندان اور اسباب وغیرہ کو لے کر اُس کے اندر رہو بیٹھنا اور دروازہ بند کر کے کشتی کو پانی کے بہاؤ پر چھوڑ دینا تاکہ تمھین حفاظت اور احتیاط سے کسی مقام پر پہنچا دے۔ اس ہدایت کے

---

[1] پیرنپشتیم کی حیثیت بابلی روایت مین وہی ہے جو (اُس سے ماخوذ) یہودی روایت مین (حضرت نوح (علیہ السلام) کی ہے ۱۲ [2] گلگمیش کو گویا بابل کا بھیم یا ہنومان سمجھنا چاہیئے۔ اس کا ذکر ابھی آئیگا ۱۲ [3] یہ "زبردستی"، ملاحظہ ہو، کیون نہ ہو آخر دیوتا تھے، جو کچھ چاہتے تھے کرتے تھے!۔

مطابق پیر پنشتیم (جسے مین آئندہ اختصار کے خیال سے صرف پیر کہونگا) نے ایک بہت بڑی کشتی تیار کی، جو ایک سو بیس ہاتھ لانبی اور اسی قدر چھوٹی تھی اور اُس مین اوپر نیچے چھ منزلین تھین۔ اس کشتی کے بننے مین پورے چھ دن لگ گئے، اور جب ساتوین دن تیار ہو گئی تو پیر نے اپنے گھر کے سب لوگون کو اُس مین بٹھا دیا، پھر اپنا تمام ساز و سامان، گھر کا کل اسباب، سونا چاندی زیور، نوکر چاکر، جانور اور کھانے کے لئے اناج غلہ وغیرہ، غرض یہ کہ سب کچھ اس کشتی کی چھ منزلون مین بھر دیا، اُسی روز رات کے وقت دیوتاؤن نے خوب پانی برسایا۔ پیر نے آیَع دیوتا کی ہدایت کے مطابق سب دروازے بند کر لئے اور کشتی کو پانی کے بہاؤ پر چلنے دیا۔ پھر کیا تھا، بادل خوب گرجے اور کڑکے، بجلیان کوندین، زمین کے جتنے بھوت پریت اور دیو جن تھے سب کے سب زمین کے اندر سے اپنی اپنی مشعلین لیے کر باہر نکل آئے اور خوب جی کھول کے بادل اور بجلی کی مدد کی۔ ایک دن کے اندر رہی اندر یہ حال ہو گیا کہ ساری زمین پر سوا پانی کے اور کچھ نظر نہین آتا تھا! آخر اشتر دیوی کو زمین والون پر رحم آیا، اور اُس نے دیوتاؤن سے التجا کی کہ اب انسانون پر رحم کرو۔ تب کہین چھ دن اور چھ رات کے بعد پانی کم ہونا شروع ہوا۔ پیر نے یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ کہین کسی جگہ خشکی بھی نمودار ہو گئی ہے یا نہین، پہلے ایک فاختہ کو اڑایا، مگر اُسے کہین پاؤن رکھنے بھر کی جگہ نہ ملی اور وہ مایوس ہو کر پھر کشتی مین واپس آگئی۔ اس کے بعد پیر نے یکے بعد دیگرے ایک ابابیل کو، پھر ایک کوّے کو اڑایا۔ ابابیل تو فاختہ کی طرح مایوس ہو کر واپس آگئی، مگر کوّا ایسا گیا کہ پھر نہ آیا۔ اس کے غائب ہو جانے سے پیر کو یقین ہو گیا کہ کہین نہ کہین ضرور خشک زمین نکل آئی ہے، آخر جب ایک پہاڑ پر پہنچ کر اُس کی کشتی رکی، تو وہ خود بھی اترا اور اپنے تمام انسان اور حیوان رفیقون کو بھی اُتارا۔ سب نے مل کر دیوتاؤن کا شکر ادا کیا اور اُن کے نام پر چڑھاوے چڑھائے[1]۔ رفتہ رفتہ کچھ عرصہ کے بعد پیر کے خاندان مین پھر وہی اگلی سی چہل پہل ہو گئی، اور دُنیا کی آبادی مین اضافہ ہونے لگا۔

ہندی متھیا کی روایات کے مطابق اہل ہندوستان کا عقیدہ ہے کہ دُنیا کی زندگی کے چار زمانے ہین کرت جگ، تریت جگ، دواپر جگ اور کلجگ۔ اور ہر جگ کے خاتمہ پر ایک بڑا سا طوفان آتا ہے جس سے دنیا فنا ہو جاتی ہے، یا یون کہئے کہ اسی طوفان کے اُٹھنے سے ایک جگ ختم ہوتا ہے اور اُس کے بعد سے نیا جگ قائم ہوتا اور نئی دنیا آباد ہوتی ہے۔ مہابھارت (بان پرب) مین ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دُنیا مین انسانون کی آبادی اتنی بڑھ گئی کہ زمین پر اُن کے رہنے سہنے اور چلنے پھرنے کی جگہ باقی نہین رہ گئی اور دھرتی ماتا کے جوڑ جوڑ مین درد ہونے لگا، تو وہ گھبرا کے نارائن جی (سب سے بڑے دیوتا) کے پاس گئین اور اپنی ساری بپتا سنا کر اُن کی کرپا اور دیا چاہی؛ نارائن نے اُن کا یہ دُکھ دُور کرنے کے لئے ایک بڑا سا طوفان بھیجا، جس سے سب انسان فنا ہو گئے۔ اس کے بعد پھر آہستہ آہستہ انسانون کو پیدا کر کے زمین کو آباد کر دیا

---

[1] اس استبدادی طرز عمل کے بعد یہ ستم ظریفی قابل داد ہے، وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا!

مہابھارت کی اس روایت کے علاوہ طوفان کی ایک اور ہندی روایت "ست پت براہمن" مین درج ہے اور منوجی سے متعلق ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز صبح کو جب منوجی نے نہانے کے لئے پانی مانگا تو اُس مین ایک چھوٹی سی مچھلی تھی، جس نے اُن کے ہاتھ مین بیٹھ کے باتین شروع کین اور کہا کہ ایک طوفان آنے والا ہے اور مین اس شرط سے تمھین اس سے بچانے کا وعدہ کرتی ہون کہ تم میری اس طرح حفاظت کرو کہ پہلے مجھے ایک چھوٹی سی گھڑیا مین رکھو، پھر ایک تالاب مین رکھو اور جب مین اتنی بڑی ہو جاؤن کہ اس تالاب مین نہ سما سکون تو مجھے احتیاط سے سمندر مین چھوڑ دو۔ منوجی نے اُس کی حفاظت کا وعدہ کیا، اور بڑی سی ناؤ بنا کے اُس مین ہو بیٹھے۔ کشتی کے تیار ہوتے تک وہ مچھلی بڑھتے بڑھتے اتنی بڑی ہو گئی کہ تالاب مین نہین سماتی تھی تب منوجی نے اُسے سمندر مین ڈالدیا مچھلی کی پیشگوئی کے مطابق ایک زبردست طوفان آیا اور اُس نے دنیا کے سب جانداروں کو ہلاک اور برباد کر دیا۔ منوجی کی ناؤ اس سراسیمگی کے عالم مین ڈگر ڈگر کرتی پھرتی تھی کہ ان کی وہی مچھلی اُن کو سہارا دینے کو آموجود ہوئی۔ منوجی نے اپنی ناؤ کو اُس کے سر سے باندھ دیا، اور اُس نے اُسے لے جا کر اُتر طرف کے (غالبًا ہمالیہ) پہاڑون پر رکھ دیا۔ منوجی وہان اُتر گئے اور جیسے جیسے پانی ہٹتا اور کم ہوتا گیا وہ بھی نیچے کو آتے گئے۔ جب میدان مین پہنچ گئے تو انھون نے دیوتاؤن کے نام پر چڑھاوے چڑھائے اور قربانیان کین دیوتاؤن کے دل بھی آخر پسیج گئے اور انھون نے اپنی دیا سے دھرتی کو پھر نئے سرے سے آباد کر دیا۔

بھاگوت پران مین طوفان کا قصہ یون لکھا ہے کہ ایک دفعہ جب برہما جی سو رہے تھے ایک راکھشس سارے وید چُرا کرلے گیا ہری دیوتا ایک مچھلی کا بھیس بھر کے راجا ستیاورت کے پاس گئے، جو صرف پانی پی پی کے زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ یہ مچھلی (منوجی کی مچھلی کی طرح) بڑھتی رہی یہان تک کہ بیس لاکھ میل لانبی ہو گئی۔ راجا ستیاورت نے طوفان سے بچنے کے لئے ایک بڑی سی ناؤ بنائی (یا اُسے کہین سے مل گئی) جس مین وہ بہت سے برہمنون کو ہمراہ لے کر داخل ہو گیا۔ جب راجا نے برہمنون کی ہدایت سے دیوتاؤن کی تعریف کے بھجن گائے، تب کہین اُسے اس آفت سے خلاصی کی صورت نظر آئی۔ ہری دیوتا نے اُس راکھشس کو قتل کر دیا اور اُس سے سب وید جو وہ چرا لے گیا تھا چھین لئے اور ستیاورت کو اُس کی تپسیا اور بھجن گانے کے انعام مین ساتوان منو بنا دیا۔

(باقی)

"محمد نعیم الرحمن" ام۔ اے

تصویر زیب النسا بیگم

جو دربار عالمگیری کی ایک بے مثل مصورہ نادرہ کی قلمکار ہے اور بعد تحقیق و تنقید بسیار اس کی صحت کی توثیق ہو چکی ہے یہ تصویر تین خوشنما رنگ سے طیار کی گئی ہے اور ۲۲ء کے نگار مین شایع ہو چکی ہے قیمت معہ محصول (۸/)

"مینجر نگار"

تصویر رقاصہ

بنگال کے مشہور نقاش و مصور مزمدار کی ایک بہترین تصویر جو حضرت نیاز کے مشہور مضمون رقاصہ کے گجراتی ترجمہ کے ساتھ کلکتہ کے مشہور گجراتی رسالہ نوجیتن مین شایع ہوئی تھی۔

قیمت .... (۴/)

"مینجر نگار"

بازگشت

(بہ سلسلۂ ما سبق)

(۱۰)

دوسرے دن شام کو ممتاز دکان سے کسی قدر دیر کرکے آیا۔ ادریس خلاف معمول گھر پر موجود نہ تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کہین سیر کو گیا ہے۔ آج یہ پہلی بار ادریس بغیر ممتاز کو ساتھ لئے سیر کے لئے نکل گیا تھا۔ ممتاز اس سیرگاہ کو جانتا تھا۔ اسکی زبان سے اضطراری طور پر نکل گیا

نئے فتنون مین اب چرخ کہن کی آزمائش ہے

یہ کہکر وہ اپنے گھر چلا گیا۔ اسدن رات کو پھر نہ وہ ادریس سے ملنے گیا اور نہ ادریس نے اسکو بلایا۔ مگر وہ تمام رات متفکر رہا

ادریس قصداً ممتاز سے پہلو بچا کر نکل گیا تھا۔ اور اسکے قدم بے اختیار اسکو تیواری پور کی سمت لئے جا رہے تھے۔ آج وہ عمر مین پہلی بار ایسے نازک وقت پر تنہا سے گذر رہا تھا لیکن اپنے خیالات مین کچھ اس طرح گم تھا کہ اسکو اسکا مطلق احساس نہ ہوا۔ جنگل سے باہر نکل کر اسکی نگاہین سب سے پہلے اس طرف کو اُٹھین جہان کل اُسنے مریم کو دیکھا تھا۔ مریم وہان نہ تھی۔ ادریس کی مایوسی دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ اپنے دل مین ایک ایسی گرانی محسوس کرنے لگا جسکو برداشت نہین کیا جا سکتا۔ اس گرانی کو لئے ہوئے پلٹنا چاہتا تھا کہ ایک طرف سے ایک لطیف و نازک آہ سنائی دی۔ آہ مین ایک کیفیت تھی جسکو گرد و پیش سے خاص مناسبت تھی۔ ادریس کی نظر اُٹھ گئی۔ مریم دریا سے کچھ فاصلہ پر جنگل سے قریب ایک ٹیلہ پر بیٹھی تھی۔ اُسنے ادریس کو دیکھ لیا تھا۔ ادریس نے جب اسکو دیکھا تو اسکی نگاہین جھک چکی تھین وہ ادریس سے زیادہ دور نہ تھی

ادریس دم بخود ہو کر اسکو دیکھنے لگا۔ مریم آنکھین نیچی کئے بیٹھی رہی۔ رہ رہ کر اسکے منہ سے وہی دہیمی آہ نکل رہی تھی جسکے معنی ادریس سمجھ نہ سکا۔ ایسی بھیانک تنہائی مین رات کی بلاؤن سے مریم کی بے پروائی اس بات کی دلیل تھی کہ اسکو دنیا مین کسی چیز کا ڈر نہین ہے۔

ہوا کے ہلکے جھونکون مین ترنم تھا کہا جا سکتا ہے کہ جنگل کی روحین اپنی زبان مین باتین کر رہی تھین اور مریم بھی انکی گفتگو مین شریک تھی اسکی آہون کا سلسلہ بدستور قائم تھا۔ اسکی صورت پر یاس و حرمان کا رنگ چھایا ہوا تھا جسکو شام کے دہندلکے نے اور بھی بڑھا دیا تھا۔ ادریس پتھر کی مورت بنا ہوا اسکو دیکھ رہا تھا اسکو یہ بھی خیال نہ تھا کہ اگر کسی نے اسکو اس حالت مین دیکھ لیا تو کیا کہیگا۔ مریم بھی کبھی کبھی ایک غلط انداز نگاہ ادریس پر ڈال لیتی تھی۔ ادریس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ وہ اسکو اپنی کنپٹی کی رگون مین محسوس کر رہا تھا۔ اسکا دل اس "دوشیزۂ صحرا" سے ہم کلام ہونے کے لئے تڑپ رہا تھا مگر اُسنے اپنے اندر اتنی جرات نہ پائی۔

رات اپنا جادو جگا رہی تھی۔ اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ خواب کیطرف مائل تھا ہر چیز پر ایک ہیبت و جلال کا رنگ پھر رہا تھا پرندے بسیرا لے رہے تھے۔ شب بیدار جانورون نے اپنی گشت شروع کر دی تھی۔ اور ادریس اور مریم نے اپنی اپنی

جگہ سے جنبش بھی نہ کی۔ مریم کا گھر تو خیر قریب تھا مگر ادریس اپنے گھر سے اسقدر دور تھا اور راستہ اسقدر ہولناک، کہ ایک ہوش و حواس والے آدمی کے دلمین محض اسکے خیال سے کپکپی پیدا ہو جاتی لیکن ادریس بر خود غلط اتنا تھا کہ اسکو اسوقت مریم کے سوا ہر چیز اسکے احاطۂ شعور سے نکل گئی تھی

تھوڑی دیر بعد مریم نے حرکت کی اور ٹیلے سے اُتر آئی گویا ابتک وہ اسی پُر اسرار تاریکی کا انتظار کر رہی تھی اور ادریس کا دل اس زور سے دھڑکنے لگا کہ اسکے سارے جسم مین ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا اور وہ اسی جگہ بیٹھ گیا۔ اب مریم کی آنکھین ادریس پر جمی ہوئی تھین۔ وہ ادریس کے پاس آئی اور پوچھا "آپ کون ہین اور کہان جانا چاہتے ہین؟ آپ تو صورت سے بیمار معلوم ہوتے ہین

ادریس کی زبان سے ایک حرف نہ نکلا۔ وہ مریم کا مُنہ تکتا رہا۔ مریم اپنے اعصاب مین ایک لہر سی محسوس کرنے لگی وہ ادریس کی حالت کا اتنی دیر مین بہت کچھ صحیح اندازہ لگا چکی تھی۔ اُسنے بڑھکر ادریس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا "آپکو بخار تو نہین ہے؟ ادریس مین اب مقاومت کی تاب نہ تھی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور چاہا کہ جلدی سے بھاگ کر مریم سے الگ ہو جائے اور اپنے گھر کا راستہ لے۔ مریم اسکی نیت سمجھ گئی۔ اُسنے ادریس کا ہاتھ تھام کر کہا ٹھہرئے مین آپکو یون نہین جانے دونگی۔ آپ بتا دیجئے کہ آپکو کیا ہوا ہے" ادریس بے دست و پا ہو کر رُک گیا۔ مریم کا حکم اسوقت ایک ملکہ کے حکم سے کم نہ تھا۔ اور اس حکم مین نہ جانے کونسی قوت تھی جسنے ادریس کے رگ و پے مین ایک جوش پیدا کر دیا۔ اسکی بیزبانی دور ہو گئی اور اب وہ اس قابل تھا کہ اپنی زبان سے شرح آرزو کر سکے

اُسنے مریم کو پیار کی نگاہ سے دیکھکر کہا "کیا بتاؤن مجھکو کیا ہوا ہے۔ وہی ہوا ہے جو ایک بار مجھکو غارت کر چکا ہے۔ مین سمجھا تھا کہ اب اس بلا سے مین ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا ہون۔ آہ مجھکو اپنی طبیعت کا کتنا غلط اندازہ تھا!"

مریم پھر کہا "آخر کچھ بتائیے تو وہ کونسی بلا ہے؟"

ادریس نے بیساختہ مریم کے دونون ہاتھ اپنے ہاتھ مین لے لئے اور کہا "مین دو دن کے اندر تمکو بری طرح چاہنے لگا ہون مین نے کل ساری رات ٹہل ٹہل کر کاٹی ہے۔ رہ رہ کر تمہارے خیال کو دل اور تمہاری صورت کو آنکھون کے سامنے سے ہٹانا چاہتا تھا مگر آخر کار اپنا چاہا کچھ نہ ہوا اور آج مین پاگلون کی طرح یہان تمکو کھڑا اتنی دیر سے دیکھ رہا ہون اور جی نہین بھرتا"

مریم نے اپنے تیور سے بغیر کسی قسم کی حیرت یا سراسیمگی کا اظہار کئے ہوئے پوچھا "آپنے مجھکو اس سے پہلے کب دیکھا تھا؟"

ادریس نے کل کی سرگذشت بیان کر دی اور پھر رابعہ کے ساتھ اپنی ناکام محبت کا واقعہ بھی من و عن بیان کر کے کہا "مریم شاید میرے مقدر مین یہی ہے کہ مین محبت کی آگ مین بھٹکتا رہون۔ مین نے کل تمکو ایک نظر دیکھا اور دیکھتے دیکھتے تمہارا ہو کر رہ گیا۔ دیکھو اسکا انجام کیا ہوتا ہے!"

مریم کو معلوم ہو گیا کہ وہ بلا کسی قسم کی جد و جہد یا پیشہ دوانی کے اپنی منہ مانگی مراد پا چکی ہے اسلئے اُسنے فوراً تکلف

اور اجنبیت کا پردہ ہٹا دیا اور ایک آہ کرکے کہا "تو آپ اسقدر ہراسان کیون ہوتے ہین؟ محبت تو مزے کی چیز ہے۔ کم از کم مجھکو تو اسمین بڑا مزہ مل رہا ہے۔ مین آپ سے پہلے یہ چوٹ کھا چکی ہون۔ آپ میری صورت دیکھ کر بے قابو ہو گئے۔ مین تو آپ کا نام سنکر تڑپنے لگی تھی۔ اللہ اللہ اسکے بعد مین نے آپکی صورت دیکھنے کے لئے کیا کیا نہین کیا۔ آپ آج صرف دو تین گھنٹون تک دیکھتے رہے ہین۔ اور مین بشن گڈھ کے میلے کے دن صبح سے شام تک آپکی صورت دیکھتی رہی ہون" مریم نے بھی اپنی داستان سنا دی اور پھر کہنے لگی "وہ چاہت میری طرف سے شروع ہوئی اور یہ میری چاہت کا اثر ہے جسنے آپکو یون بے چین کر رکھا ہے اور یہ میری چاہت کا ثبوت ہے" مریم نے ادریس کا منہ چوم لیا۔ ادریس مبہوت ہو گیا۔ اسکو اپنے حواس پر اعتماد نہین رہا۔ اسکو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ خواب مین ہے اور یہ سب کچھ خواب مین ہو رہا ہے

دونون طرف کی آگ برابر تھی۔ مریم اور ادریس ایک دوسرے کے ساتھ جیسا اس ایک رات مین کامیاب ہوئے شاید دو چاہنے والے ساری عمر گریۂ تمنا مین گذار دینے کے بعد بھی نہ ہوتے ہون

(۱۱)

دن گذرتے دیر نہین لگتی۔ پورے پانچ مہینے گذر گئے اور ادریس آنے والی پیچیدگیون سے بے خبر مریم کے ساتھ روزانہ شام کے تین چار گھنٹے خود فراموشی کے عالم مین بسر کرتا رہا۔ محبت کے تیور چھپنے نہین۔ ادریس کے چلن سے سب واقف ہو گئے اور رفتہ رفتہ وہ لوگون کی نظرون مین گر گیا۔ اور یہ سب مریم کی بدولت۔ اچھے برے کا واقعی کوئی صحیح معیار ہے یا نہین؟ اخلاقیات کے اس مسئلہ سے یہان بحث نہین۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا مین وہ معیار رائج نہین۔ دنیا والے جب کسی چیز کو اپنے گون کی نہین پاتے یا اسکو اپنے توقعات کے خلاف پاتے ہین تو اسکو برا سمجھنے لگتے ہین۔ ادریس کی نئی زندگی لوگون کے توقعات کے خلاف تھی اسلئے قطعاً بری تھی

ادریس نے سکینہ کو جس کوفت مین مبتلا کر دیا تھا اسکو اتنے دنون وہ ضبط کئے بیٹھی رہی۔ اسکی مایوسیون کی کوئی حد نہ تھی لیکن ابھی اسکو امید تھی اور قوی امید تھی کہ ادریس خود بخود پھر راہ راست پر آ جائیگا۔ آخرکار یہ امید بھی موہوم ثابت ہوئی۔ مجبوراً سکینہ نے ایکدن جبکہ ادریس دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا اس ذکر کو چھیڑ کر کہا "ادریس تمکو سوجھی کیا ہے؟ کوئی اس طرح بھی اندھا بھی ہوتا ہے؟ آخر مریم کہانکی پکا ڈلی ہے جو تم اسکے پیچھے یون باؤلے ہو رہے ہو؟ ایک آبرو باختہ ہرجائی کے ہاتھوں بک کر خاندان کا نام کیون ڈبوتے ہو؟ میری امیدون کا سارا دارومدار تم پر تھا۔ اف کیسے کیسے ارمان میرے دل مین تھے! ان کا پورا ہونا تو درکنار مین دیکھتی ہون کہ تم الٹے میرا منہ کالا کر رہے ہو۔ خدا کو مانو۔ ہوش مین آؤ۔ دیکھو دنیا نے تم کو کس عزت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا ہے۔ کم از کم اسکا تو پاس کرو۔ آج دو روز ہوئے فیض آباد سے خط آیا ہے۔ مین نے مناسب موقع نہ پا کر تم سے ذکر نہین کیا۔ میرے بھائی جنھون نے ابتک اپنی بھکارن بہن کی بات بھی نہین پوچھی تھی اب چاہتے ہین کہ تمکو اپنی دامادی مین لے لین۔ یہ صرف اسلئے کہ تم ہونہار ثابت ہوئے اور تمھاری لیاقت نے تمھاری مفلسی کے عیب پر

پردہ ڈال دیا ہے۔ شاہدہ کو مین نے بچپن مین دیکھا ہے۔ صورت شکل والی ہے اور تمھارے منہ لائق ہے۔ لیکن مین بھائی سے کیا کہون اور کس برتے پر کہون؟ تم اپنی روش بدلو تو انکو اس نسبت کی منظوری کی اطلاع دیدون،،

ادریس سر جھکائے مان کی جھڑکیان سنتا رہا۔ اسکے بعد اسنے اپنے کو مجسم سنجیدگی بناکر جواب دیا "امان مین نے آجتک تم سے اس بارے مین ایک حرف اسلئے نہین کہا کہ مجھے اندیشہ تھا کہ تمکو میری باتون سے کوئی دکھ نہ پہنچ جائے۔ لیکن اب تمنے خود میری دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے۔ اسلئے اب میرا فیصلہ بھی سن لو اور اس فیصلہ کو اٹل سمجھو۔ رابعہ سے بدمزہ ہونیکے بعد مین نے قسم کھائی تھی کہ اب کسی عورت سے کوئی سروکار نہ رکھونگا اور اپنی تمام عمر تجرد مین بسر کردونگا مگر ارادہ بہ حیثیت ارادون کے پورے نہین ہوتے۔ میری زندگی نے ایک دوسری کروٹ لی۔ مجھے اس مریم سے دلبستگی پیدا ہوگئی۔ تم نے آج اچھی طرح اپنے دل کا غبار نکال لیا اور مریم کو جو جی مین آیا کہہ ڈالا اور مین نے چپ چاپ سن لیا۔ لیکن اب مین کہے دیتا ہون کہ آئندہ اسکی شان مین ایسے تبرے سننے کے لئے تیار نہ ہونگا۔ تم جو چاہو سمجھو۔ مین مریم کو اپنے حق مین سیتا سمجھتا ہون اور اسکو اپنی تمام عمر کا ساتھی بنانا چاہتا ہون۔ مجھے ٹھیک معلوم نہین کہ زمانہ کی ناسازگاریون نے تم پر کیا اثر ڈالا ہے لیکن مین اپنی ذات سے زندگی کے ہاتھون بری طرح مٹ چکا ہون اور اب دنیا کے رسم و رواج اور تکلف و تصنع کی تاب نہین لا سکتا۔ مریم ہرجائی ہے تو ہوا کرے۔ شیخ سید نہین تو نہ ہو۔ مین اسکو دنیا کی شریف زادیون پر ترجیح دیتا ہون اور مجھکو یقین ہوگیا ہے کہ اگر اب مین کسیکے ساتھ خوش رہ سکتا ہون تو مریم کے ساتھ۔ تم فیض آباد میرا صاف انکار لکھ بھیجو۔

سکینہ کا پیمانہ صبر پہلے سے لبریز تھا۔ بیٹے کی اس صاف گوئی نے اسکو چھلکا دیا۔ اسکا چہرہ تمتما اٹھا۔ آج وہ ایک دوسری سکینہ تھی۔ جس مان نے ابتک ادریس سے کبھی سختی یا ترشی کے ساتھ بات بھی نہین کی تھی آج وہ غضبناک تھی۔ ادریس کا فیصلہ سنکر اسنے بھی اپنا مختصر فیصلہ سنا دیا "مین اس قحبہ کا نام آئندہ پھر کبھی سننا گوارا نہین کر سکتی اگر تمکو اپنے ارادہ سے باز نہین آنا ہے تو آج سے مجھے اپنی صورت نہ دکھانا،،

یہ سنکر ادریس کے تیور بدل گئے۔ اسکی صورت سے جلال و جبروت ٹپکنے لگا۔ آج وہ دبی ہوئی قوت کام کر رہی تھی جسنے اسکو زندگی کی تلخیون کو شربت کی طرح پی لینے کے قابل بنا دیا تھا اور رابعہ کو اکدم خاطر انداز کرکے یکسوئی کے ساتھ علمی مشاغل مین منہمک ہوگیا تھا۔ ادریس نے سنگدلی اور بے مہری کے ساتھ مان کو جواب دیا "بہتر ہے،، اور فوراً اٹھکر باہر چلا گیا اور پھر مان کو اپنی صورت نہین دکھائی۔

بات کی بات مین ادریس کو مان سے نفرت ہوگئی۔ اسکو یہ یقین ہوگیا کہ دنیا کے رسوم و قیود نے نہ صرف سکینہ کی آنکھون پر بلکہ اسکے دل پر بھی پردہ ڈال دیا ہے۔ اور وہ ان بندشون پر اپنے بیٹے کی مسرتون کو قربان کر دینا چاہتی ہے۔ جسوقت ادریس مان سے کبیدہ ہوکر باہر آیا تو ممتاز کو انتظار کرتا ہوا پایا جب سے ادریس مریم مین محو ہوا

ممتاز کو رام نگر مین سونیکی نوبت نہیں آئی ادریس نے اسکو اپنے ساتھ سونیکے لئے بلانا چھوڑ دیا تھا۔ اب ادریس کو اپنی تنہائیوں مین لذت ملنے لگی تھی اور وہ تنہا رہنا چاہتا تھا۔ ممتاز سے بظاہر اب بھی وہی لگاؤ تھا لیکن حقیقتاً اب ادریس کی ساری گرمجوشی سارا تپاک دوسرے مرکز کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ ممتاز کے ساتھ جو کچھ گفت و شنید ہوتی وہ زیادہ تر معاملات تک محدود ہوتی تھی ممتاز اسکو خوب محسوس کر رہا تھا مگر ادریس کو ابھی چھیڑنا اُسنے مناسب نہین سمجھا تھا۔ آج نہ جانے کیون اسکے دل نے کہا کہ چلو ایک بار اپنی سی کر آئین اور آنیوالی زندگی کا اونچ نیچ ادریس کے ذہن نشین کرآئین۔

ادریس باہر نکلا تو ممتاز کو اسکے تیور دھندلے نظر آئے۔ ادریس نے اسکو اپنی اس حالت پر غور کرنیکا موقع نہین دیا اور پوچھا "کہو ممتاز کیسے آئے؟ کیا دکان سے متعلق کوئی خاص بات ہے؟"

ممتاز نے بڑی جرأت کی اور کہا "نہین تمھاری ذات سے متعلق ہے۔ برا نہ مانو تو کہون" "کہو" ادریس نے تامل کرتے ہوئے جواب دیا۔

ممتاز آنکھین جھکا کر کہنے لگا "کہنا یہ ہے کہ تمنے یہ جو نئی زندگی اختیار کی ہے اس مین شاید کافی سوچ بچار سے کام نہین لیا گیا ہے۔ مین اپنی جگہ یہی سمجھے ہوئے ہون کہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ آنکھین بند کرکے کر رہے ہو۔ ادریس مین وعظ و پند کی غرض سے نہین آیا ہون۔ میرا دل نہ جانے کیون دھڑک رہا ہے کہ کہین ایک دن تمکو یہ کہکر رونا نہ پڑے کہ

"آہ ہی دل لگا تھا کس گھڑی کا"

ادریس پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ ممتاز کوئی اسی قسم کی بات کہنے والا ہے۔ اسنے ایک تلخ تبسم کے ساتھ کہا "ممتاز معلوم ہوتا ہے آج ساری دنیا نے اپنی پند و نصیحت سے مجھکو رہ راست پر لے آنیکا بیڑا اُٹھا رکھا ہے۔ مگر خیر اپنی خیر اندیشی کا مختصر سا جواب سن لو مریم کو دیکھتے ہی میرے اندر ایک دبی ہوئی آگ بھڑک گئی اور اس سے ملنے کے بعد مجھکو معلوم ہو گیا کہ مین اسقدر آشفتہ اور دلگیر کیون رہتا ہون۔ مریم نے مجھے بتا دیا کہ مین کس درد کا مارا ہوا ہون اور اسکا علاج کیا ہے۔ مین محبت کا بھوکا تھا۔ محبت میرے خمیر مین ہے۔ مجھکو کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جسمین مین کھو کر رہ جاؤن۔ وہ چیز مریم کی صورت مین مجھے ملگئی

جلوہ کرد کہ من ہم ہمہ او گردیدم

اس سے زیادہ مین کہنا سننا نہین چاہتا"

ممتاز تھوڑی دیر تک ادریس کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر اُسپر ایک مایوسانہ نگاہ ڈالتا ہوا وہان سے چلا گیا۔ ادریس اپنے کمرہ مین جا کر لیٹ رہا اور سوچنے لگا۔ وہ بہت دنون سے ارادہ کر رہا تھا کہ مریم کے ساتھ شادی کرلے اور یکبارگی تمام جھگڑون کو اُبھار کر ختم کر دے۔ اُسنے اشارۃً مریم سے دو ایک دفعہ اپنے ارادہ کا اظہار بھی کیا تھا۔ مریم اسکے جواب مین ادریس کو صرف پیار کر کے رہگئی تھی ادریس نے بھی زیادہ اصرار نہین کیا تھا۔ مگر اب وہ اس بات پر تل گیا تھا کہ آج ہی مریم سے اس مسئلہ پر واضح گفتگو کرکے کوئی فیصلہ کرلے

ساون کا آخری موسم تھا صبح سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ہوا مین ایک فردوسی ٹھنڈک تھی۔ بستر پر کروٹین بدلتے بدلتے

ادریس کو نیند آگئی اور پھر جو آنکھ کھلی تو سورج مغربی افق تک پہنچ چکا تھا۔ ادریس جلدی سے اٹھا اور منہ ہاتھ دھوکر سرپرتیا کی راہ لی مریم ابھی نہین آئی تھی۔ ادریس جنگل کے اتر پورب ایک کنارے بیٹھکر انتظار کرنے لگا۔

۱۲

رات ہو چلی تھی۔ بارش بند تھی۔ لیکن آسمان کی فضا مکدر تھی۔ چاند کا کہین پتہ نہ تھا تاروں کی روشنی مدہم تھی۔ اردگرد بارش کے پانی سے جل تھل ہو رہا تھا۔ اندھیرے مین سطح آب کی روپہلی چمک دلون کو ہیبت و جلال سے معمور کر رہی تھی۔ کونہ کونہ سے عبرتناک صدائین نکل رہی تھین اور ادریس اپنے مقدر پر غور کر رہا تھا۔ اُسنے رام نگر کی "صحرائی زندگی" اسلئے اختیار کی تھی کہ اسکو ہیئت اجتماعی اور اسکی لغو اور لاطائل شورشون سے نجات ملجائے اور وہ رسم و روایت کی جانگسل زنجیر سے آزاد ہو کر راحت و سکون کی سانس لے سکے۔ مگر اب اسکو معلوم ہوا کہ یہان بھی وہی خدا پوجا جاتا ہے اور یہان کا باوا آدم بھی وہی ہے۔ دنیا مین رہکر دنیا کے جنجال سے آزادی چاہنا ایک خواب بے تعبیر ہے۔ پھر ان تمام جھگڑون اور محنتون سے گلوخلاصی حاصل کرنیکے لئے انسان عدم آباد کی راہ کیون نہین لیتا جہان یقیناً آسودگی نصیب ہے۔ ادریس اپنے خیال مین یہان تک پہنچا تھا کہ اسکو غالب کا یہ کہنا یاد آگیا

"وائے وان بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور مین ذوقِ تن آسانی مجھے"

ادریس کی توجہ کا مرکز بدلگیا اور اب وہ آسمان کی فضا مین گم ہو گیا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ یہ کوئی خیالی پرواز نہین ہے بلکہ جسمانی معراج ہے۔ وہ "چاند"۔ "سورج"، "قوس قزح"، "ذات الفرس" اور "مسلسلہ" کی سحابی دنیا کی سیر کر رہا تھا جہان وہ سکون ہی سکون محسوس کر رہا تھا۔ یہ دنیا لطافتون سے آباد تھی اور یہان اُن آلائشون کا خواب بھی کسی نے نہین دیکھا تھا جن سے اس "خراب آباد" کا ذرہ ذرہ مملو ہے۔

ادریس کی افلاک نوردی نہ جانے اسکو کہان کیجاتی اگر کسی کے قدمون کی آہٹ اسکو چونکا نہ دیتی۔ اب وہ پھر اسی گرد و غبار کی کثیف دنیا مین سانس لے رہا تھا جہان آدم اور انکے بہکانیوالے پھینکے گئے تھے۔ ادریس کو آواز پر کان لگائے ہوئے مشکل سے چند لمحے ہوئے ہونگے کہ کسی نے سریلی لہجے مین کہا "آج مجھے دیر ہو گئی۔ دادا آج کچھ بیمار مین انھین کے کامون مین لگی رہی"۔ ادریس کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ مریم اسکی گود مین تھی۔ دونون کے ہونٹ ملے اور محبت کے عہدنامہ پر ایک تازہ مہر لگ گئی

چوبیس گھنٹے کے بچھڑے ہوئے دلون نے جب ایک دوسرے کے ساتھ جی کھول کر اپنے اپنے ارمان نکال لئے تو ادریس کو یاد آیا کہ وہ گھر سے کیا سوچ کر چلا تھا۔ اُسنے اپنی آواز کو غیر معمولی طور پر سنجیدہ اور متین بنا کر کہا "مریم مجھے تم سے آج ایک بات کہنا ہے"!

"وہ کیا؟ یہی کہ ہم اب اپنی محبت کو نہین ختم کر دین تو اچھا ہے؟" مریم نے بات کاٹ کر پوچھا

"نہین مریم نہین۔ مجھ پر ظلم نہ کرو۔ مین تمھاری اتنی محبت کرتا ہون کہ اسکے درد سے میرے دل و دماغ پھٹے جا رہے ہین۔ مین نے اس سے پہلے بھی محبت کی ہے مگر وہ محبت نہ تھی ایک خواب تھا۔ لاؤ مین تمھاری چاند سی صورت کو پھر غور سے

دیکھون - اسمین اور اُن بے شمار صورتون مین جنکو ابتک دیکھ چکا ہون کیا فرق ہے؟ کچھ نہین - مگر نہین اتنا فرق ہے جتنا کہ سورج اور خاک کے ذرون مین - مریم تمھاری آنکھون مین نشہ ہے جسکو مین اپنے رگ و پے مین ساری ہوتے ہوئے محسوس کر رہا ہون مین نے شراب پی ہے مگر اس نشہ کا تجربہ مجھے کبھی نہین ہوا تھا - ادریس نے مریم کا منہ پھر چوم لیا

مریم نے افسردہ لہجہ مین کہا "مین نے آج دن مین خواب دیکھا ہے کہ آپ بلا وجہ مجھ سے خفا ہو کر چلے گئے ہین اور پھر میرے رونے دھونے کا آپ پر کوئی اثر نہین ہوا - مین نے کیسے کیسے خدا کیواسطے دلائے لیکن آپنے مڑ کر مجھے دیکھا بھی نہین - میرا دل کانپ رہا ہے کہ دیکھیئے اس خواب کی تعبیر کیا ہوتی ہے"

"بیکار جی نہ کڑھایا کرو - یہ سب تمھارا وہم ہے اور کچھ نہین" ادریس نے جواب دیا "مین آج اسی مسئلہ کو طے کرنے آیا ہون - ہمارے دن یون کب تک بسر ہونگے - جہان تم ہر طرح سے میری ہو وہان شرعاً بھی میری ہو جاؤ - اب زیادہ غور و تامل کا وقت نہین ہے - صرف ایک بات میرے دلمین کھٹکتی ہے - اس کھٹک کو دور کر دو پھر جس تاریخ کو مناسب سمجھو ہم یہان سے کہین دور جا کر شادی کر لین - مین یہ جاننا چاہتا ہون کہ رؤف کے ساتھ تمھارے تعلقات کس قسم کے تھے؟"

مریم مسکرا دی - اسکی مسکراہٹ مین خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ شرارت بھی تھی - ادریس نے کہا "سچ بتانا ورنہ میرے دل کا بوجھ بڑھتا جائیگا" مریم نے کہنا شروع کیا "رؤف میان نے خود مجھے چھیڑ کر مجھ سے راہ و رسم پیدا کی مین اُن سے بھاگتی رہی - وہ میرا پیچھا کرتے رہے - آخرکار مجھے بھی ایسے بیدرد کی بے بسی مین مزہ آنے لگا - مین اُنکے سارے قصے سُن چکی تھی - مین اُن سے کھلکر ملنے لگی لیکن آپکو یقین ماننا ہے تو مانئے کہ آجتک رؤف میان نے میرے جسم کو چھوا تک نہین ہے - نہ جانے مجھ مین کیا تھا کہ میرے سامنے اُنکے ہاتھ پاؤن ڈھیلے رہتے تھے - جس تاریخ سے مین نے آپکی صورت دیکھی اُن سے ملنا بالکل چھوڑ دیا ہے - مجھے کہنا نہین چاہیئے - اُنھون نے میرے قدموں پر گر کر خوشامدین کی ہین کہ مین اُن سے دامن نہ چھڑاؤن لیکن مین نے اُن سے کھلے الفاظ مین کہدیا کہ مجھے اُن سے دراصل کبھی کوئی لگاؤ نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے اور نہ زبردستی کی عشقبازی ہو چکی - رؤف میان اسکے بعد بھی اپنی سی کرتے رہے مگر آخرکار مجھے پتھر کی طرح اٹل دیکھکر صبر کرکے بیٹھ رہے - مین اُنکی زمین مین بسی ہوئی ہون - وہ اگر آج چاہین تو مجھکو یہان سے اُجاڑ سکتے ہین - مجھے اسکی بھی پروا نہین ہے - مین تو آپ کا سودا مول لے چکی ہون" مریم نے سلسلہ ختم کرکے ادریس کو غرور و پندار کے ساتھ دیکھا - ادریس نے اطمینان کی سانس لی اور مریم کو لپٹا کر کہا "تو آج سنیچر کا دن ہے - آیندہ جمعہ کو تم میری بیوی ہو گی - جمعہ کا دن مبارک دن ہے"

مریم کے چہرہ سے ایک بیچینی کا اظہار ہونے لگا - وہ کچھ دیر چپ رہی - ادریس نے پوچھا "کیون؟ کیا تمکو منظور نہین ہے؟"

مریم نے ایک آہ کرکے کہا "منظور مجھے سب کچھ ہے مگر نہ جانے کیون میرا دل کہتا ہے کہ آپ مجھ سے شادی کرکے خوش نہین رہ سکینگے - میرے اندر بیوی بننے کی قابلیت بہت کم ہے - کیا یہ ممکن نہین کہ ہم ہمیشہ یونہی رہین؟ اچھا اس ذکر کو جانے دیجئے - دیکھئے چاند بادل کے پردون سے باہر نکل آیا - اسکی دھیمی روشنی مین آپ مجھے محبت کے دیوتا معلوم ہوتے ہین - آئیے اس رُت اور اس گھڑی سے

سے جو کچھ حاصل ہو سکے حاصل کرلین۔ آنے والی گھڑیون کی بابت جب مین سوچتی ہون تو طرح طرح کے وسوسے دل مین پیدا ہونے لگتے ہین"

مریم کی آنکھین نم آلودہ تھین۔ ادریس پر ایک نشہ سا چھا گیا اور اسنے مریم کی کمر مین ہاتھ ڈالکر اُسکو لپٹا لیا اور خوب پیار کیا وہ اس سے پہلے بھی مریم کے مُنہ سے اسی قسم کی شاعری سُن چکا تھا اور اسکو معلوم ہو گیا تھا کہ اس پیکر نور کو اگر باقاعدہ تعلیم و تربیت دیجاتی تو وہ ہندوستان مین ایک چیز ہوتی۔ آج ادریس مریم کی باتون سے دیر تک لذت نہ اُٹھا سکا۔ اسکو ایک قطعی فیصلہ پر پہنچنا تھا۔ اُسنے پھر کہا "مریم ذرا سوچو۔ دنیا بڑی بُری جگہ ہے۔ بلا شرع کی زنجیر مین جکڑے ہوئے ہمارا اس طرح ملتے رہنا معیوب سمجھا جا رہا ہے اور ہر طرف شورشین پھیل رہے ہین۔ ہم دونون بدنام ہو رہے ہین۔ شادی کے بعد مجھے دنیا کے کہنے سننے کی مطلق پروا نہ ہو گی"

"لیکن آپکی مان کیا کہین گی" مریم نے رکتے ہوئے پوچھا

ادریس نے بلند آہنگی سے جواب دیا "اُنکا جو جی چاہے کہین۔ مجھے اسکی بھی پروا نہین۔ مین نے اُنکے روٹی کپڑے کیلئے کافی سامان کر دیا ہے۔ اُنکو میرے نہ ہونے سے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ اب اگر وہ بیٹے کی خوشی مین شرکت کرنا چاہتی ہین تو کرین ورنہ مین سمجھونگا میرے کوئی مان نہ تھی۔ مین ساری دنیا کی آسائشون کو تج دونگا اور تھاری جھونپڑی کو بہشت سمجھکر تمھارے ساتھ رہونگا۔ للہ مریم تم میرے سوال کو رد نہ کرو اور شادی کا اقرار کرو ورنہ مین پھر کہین کا نہ ہونگا"

مریم مجبور ہو گئی۔ وہ اپنا دل خون کر سکتی تھی مگر ادریس کو آزردہ کرنا اسکو گوارا نہ تھا۔ اُسنے صرف ایک شرط پیش کی اور وہ یہ تھی کہ شادی کے بعد بھی وہ اسی طرح بے پردہ سیر و تفریح کیا کریگی۔ ادریس نے شرط منظور کر لی اور مریم نکاح پر آمادہ ہو گئی وہی جمعہ کا مبارک دن نکاح کا دن ٹھیرا۔

جمعہ کا وہ دن بھی آگیا۔ مریم اور ادریس دو دن غائب رہے۔ اسکے بعد جو لوٹے تو گھر گھر اسکا چرچا تھا۔ ہر شخص یہی کہہ رہا تھا کہ ادریس کے دماغ مین ضرور کچھ فتور ہے جو اونچے خاندان کی پریزادیون کو چھوڑ کر ایک بے نام و نسب بد قماش بھکارن کو یون گھر مین بٹھا لیا۔ نکاح کے مفصل حالات کا پتہ نہین۔ اتنا معلوم ہے کہ ادریس مریم کو لیکر بستی چلا گیا تھا اور وہان قاضی اور گواہون کو جمع کر کے خاموشی کے ساتھ نکاح پڑھوا لیا۔ دیکھنے والونکا بیان ہے کہ جب دونون واپس ہوئے ہین تو اُنکے چہرون پر اس بشاشت اور شگفتگی کی کوئی جھلک نہ تھی جسکی ایسی حالت مین توقع کی جا سکتی تھی

ادریس کی زندگی مین اب کوئی کمی نہ تھی۔ جس چیز کی اُسنے آرزو کی وہ اسکو "دربردۂ تقدیر" سے ملگئی۔ اب اسکو آسودہ ہونا چاہیے لیکن نکاح کے چند ہی گھنٹون کے بعد سے وہ اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کرنے لگا جسکو وہ خود بھی نہین سمجھ سکتا تھا کہ کیا ہے۔ وہ مریم کی صورت دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہو رہا تھا مگر اسکے دل کے اندر جو کانٹے کھٹکنے لگے تھے اُنکا علم سوائے اسکے دل کے اور کسی کو نہ تھا

مریم اب ادریس کیلئے کوئی دیوی یا پری یا دیفی کی کوئی کاہنہ نہ تھی بلکہ دنیا کی ایک معمولی عورت تھی جس کیلئے اسکو دنیا کے طعنون اور سرزنشون کا مقابلہ کرنا تھا۔ مریم اب زمانہ کے تند جھونکون سے محفوظ رہنے کیلئے ادریس کے سایۂ دامن کی محتاج تھی

ادریس مریم کے ساتھ اپنے گھر مین نہ رہ سکتا تھا۔ وہ اپنے قول کا سچا نکلا۔ اُسنے رسول شاہ کی جھونپڑی مین بود و باش اختیار کرلی۔ اس جھونپڑی کو اُسنے اپنی ضرورتون کے مطابق پھر سے بنوایا اور تیواری پور مین ایک نیا مکان تعمیر کرانیکی فکر مین لگ گیا

مدرسہ اور دکان کا کام بدستور جاری رہا۔ ممتاز ضروری معاملات مین اب بھی ادریس سے ملکر اس سے مشورہ لیتا رہتا تھا مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونون کے درمیان ایک گہری خلیج حائل ہوگئی ہے۔ ادریس کو مدرسہ کے ساتھ وہی انہماک تھا۔ مگر وہ چارون طرف بدنام ہو رہا تھا اور مدرسہ کا کام خود بخود سست ہونے لگا تھا

(۱۳)

سات مہینون کی مدت مین ادریس کو ہر طرف کی انگشت نمائیون سے پناہ ملگئی اور اب کہا جا سکتا تھا کہ مریم اور ادریس دونونکو یکسوئی نصیب ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ادریس پر ردعمل شروع ہو گیا تھا۔ وہ اگر چھپتا نہین رہا تھا تو اسکا یہ خیال جڑ ضرور پکڑ گیا تھا کہ اُسنے مریم کے ساتھ شادی کرنے مین غیر معمولی عجلت کو راہ دیا۔ مان کے چھٹ جانیکا غم اسپر مستزاد تھا اور وہ اس غم مین بھی بہت کچھ گھل رہا تھا۔ ادریس بھی اپنی مان کی طرح بات کا بکا آدمی تھا۔ اُسنے ایک بار بھی سکینہ سے ملنے کی آرزو ظاہر نہین کی مگر مریم سے اسکا درد چھپا نہ تھا۔ ادریس مریم سے ہنس ہنس کر میٹھی میٹھی باتین کیا کرتا تھا اور مریم اسکی ہنسی مین دُکھے ہوئے دل کی ایک جھلک دیکھ لیتی تھی

دو تین مہینون سے ادریس کی آنکھین سوجی ہوئی تھین۔ پہلے تو اسکو معمولی آشوب سمجھا گیا اور اسکی وجہ کثرتِ مطالعہ بتائی گئی لیکن کچھ دنون سے چارہ گرون کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ ادریس کی آنکھین کہین عمر بھر کیلئے بیکار نہ ہو جائین۔ گورکھپور کے ایک ڈاکٹر کا علاج شروع ہوا۔ ادریس کی آنکھون پر پٹی بندھ گئی اور روشنی سے پرہیز کرنیکی سخت تاکید ہو گئی۔ ادریس اب رسول شاہ کی جھونپڑی مین دن رات ایک اندھیری کوٹھری مین بند رہنے لگا۔ اب اسکا دماغ اپنی پوری جولانی کے ساتھ زندگی کی ناکامیون پر غور کر رہا تھا۔ اسکی اُمیدون کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور اسپر یہ سنگین حقیقت روشن ہو چکی تھی کہ مریم کے ساتھ آسودہ رہنا اس کے لئے اور بھی دشوار ہے

ادریس کا ادھر یہ حال تھا۔ اُدھر مریم کی مایوسیان بھی کچھ کم نہ تھین۔ شادی سے پہلے وہ طرح طرح کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اُسکی طبیعت اس خانقاہی زندگی سے اب اُچاٹ ہو چکی تھی۔ اُسنے ادریس کو لکھنؤ اور دوسرے بڑے شہرون کی پرتکلف زندگی کا ذکر کرتے ہوئے سنا تھا جو اسکو دلفریب اور خوش آئند معلوم ہو رہی تھی۔ اُسنے کئی بار ادریس سے کہا بھی تھا "آپ ناحق ایسے ایسے شہرون کو چھوڑ کر اس اُجڑے دیار مین اپنی زندگی کو خاک مین ملا رہے ہین۔ آپنے ایسی ایسی مشقتون کے بعد علم حاصل کیا۔ اس سے آپکو فائدہ اُٹھانا چاہیے تھا جن شہری دلچسپیون کا آپ ذکر کرتے ہین کاش وہ مجھے میسر ہوتین"۔ ادریس ہنس کر اسکا جواب دیتا تھا "مریم تمکو اس زندگی کا تجربہ نہین ہے اسلئے اُسکی آرزو نہ کرو مین جانتا ہون کہ وہ کیسی بےچین زندگی ہے اسلئے اس سے پناہ مانگتا ہون"

شادی کے بعد مریم نے زبردست تحریک شروع کی کہ ادریس اس کورده کو چھوڑدے اور کسی دور و دراز شہر مین ذریعۂ معاش تلاش کر کے اسکے ساتھ تعیش کی زندگی بسر کرے۔ ادریس برابر ٹالتا رہا۔ آخرکار ایک روز مجبور ہو کر اُسنے نہایت حقارت اور بیدردی سے کہدیا "مین تمھاری اس خواہش کو پورا کر کے اپنی زندگی کو عذاب نہین بنا سکتا"۔ مریم نے پھر کچھ نہ کہا مگر اس جواب سے اسکو جو ملال ہوا وہ کبھی اسکے دل سے گیا نہین۔

... مریم کو سب سے بڑا صدمہ یہ تھا کہ اب ادریس بات بات مین اس سے بگڑ جاتا تھا اور سخت سست کہنے لگتا تھا۔ مریم سب کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن ادریس کی چڑھی ہوئی تیوریان اور اسکی ہر وقت جھڑکیان اسکے لئے زہریلے نشتر سے کم نہ تھین ادریس تھوڑی ہی دیر بعد مریم کو خوشامدین کر کے منانے لگتا تھا اور مریم من بھی جاتی تھی مگر مریم کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اب اسکو تمام عمر انھین کانٹون مین رہنا ہے جنکو خود اُسنے اپنے دل کے خون سے سینچ سینچ کر پرورش کیا ہے۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ ادریس باوجود اپنے دعوی کے مان کو نظر انداز نہین کر سکتا اور چونکہ اپنے کئے کی لاج بھی ہے اسلئے مان سے معافی مانگ کر مصالحت بھی نہین کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ سارا نزلہ "عضو ضعیف" پر گرتا ہے اور مریم موردِ عتاب بنتی ہے۔ اب اسکو یہ فکر تھی کہ کسی طرح مان بیٹے مین ملاپ ہو جائے۔ اس ملاپ سے اسکو یقین تھا کہ ادریس کی کوفت تو قطعاً دور ہو جائیگی اور بہت ممکن اسکی خود اپنی زندگی بھی خوشگوار ہو جائے۔ اس خیال سے ایک دن جبکہ ادریس رات بھر کی بیخوابی کے بعد دوپہر کو سو رہا تھا مریم اُٹھی اور ایک چادر سر سے لپیٹ کر رام نگر کیطرف چلی۔ ادریس کے مکان پر پہنچکر وہ سیدھی اندر داخل ہو گئی۔ سکینہ ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ گھر مین کوئی دوسرا نہ تھا۔ مریم سکینہ کو سلام کر کے اسکے پاس بیٹھ گئی۔ سکینہ نے مریم کو کبھی دیکھا نہین تھا۔ مریم نے اسکو حیرت کا موقع نہین دیا۔ اور بلا کسی تمہید کے اپنا تعارف کرایا۔ سکینہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ مریم نے چند منٹ کے اندر نہایت اختصار کے ساتھ ادریس کی اندوہناک حالت بیان کر دی اور پھر آنکھون مین آنسو بھر کر کہنے لگی "آپ مجھے جو چاہئے سمجھئے اور جو چاہئے کہئے۔ مین آپکو اپنی مان سمجھتی ہون۔ گنہگار مین ضرور ہون لیکن اس گناہ پر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔ مین نے آپکے بیٹے کو اس نادانی سے بہت روکنا چاہا مگر اُنھون نے میری ایک نہ سنی اور اب اگر وہ اپنے کئے پر پچھتا نہین رہے ہین تو آپ سے یون چھٹ جانیکے ملال مین گھُل ضرور رہے ہین اگر آپ نے سچے دل سے اُنکو معاف نہ کیا تو مجھے ڈر ہے کہ نصیب دشمنان اُنکی جان پر آبنے گی۔ اگر آپ یہ چاہین کہ مین اُنکو چھوڑ دون تو مین اسپر راضی ہون بشرطیکہ وہ مجھکو چھوڑ سکین۔ میرا خدا مالک ہے۔ کسی نہ کسی طرح زندگی کٹ ہی جائیگی"

مریم کا لب و لہجہ اتنا دردناک تھا کہ پتھر بھی پانی ہو سکتا تھا مگر سکینہ پر اس کا اُلٹا اثر ہوا۔ اسکا چہرہ سرخ ہو گیا اور اسکی صورت سے غیظ ٹپکنے لگا۔ اسمین شک نہین کہ مریم کی صورت اور اسکی باتون کا اسپر کافی رعب چھا گیا تھا اور اسمین بھی شک نہین کہ وہ ادریس پر جان نثار کر سکتی تھی لیکن کسی طرح اس خیال کو اپنے دل سے دور نہ کر سکتی تھی کہ وہ سید ہے اور مریم کوچہ و بازار کی ایک رذیل بدمعاش عورت ہے۔ اُسنے اپنے غصہ مین کانپتے ہوئے ہاتھ سے "دور باش" کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اپنی سفارش اپنے پاس رکھو اور اپنی چرب زبانی سے کہین اور جا کر کام لو۔ مجھے معلوم ہے کہ ادریس کو میری ضرورت نہین ہے ورنہ

آج وہ مجھ سے یون منہ موڑ کر میری محبت کو تم پر نہ قربان کر دیتا۔ اب تم ادریس کو بھیک سمجھ کر مجھے واپس دینے کے لئے تیار ہو؟ شاید اب کوئی اور نگاہ پر چڑھ گیا ہے۔ بس اب یہان سے چلی جاؤ اور پھر میرے گھر مین اپنے قدمون کی برکت نہ لانا"۔ سکینہ کو اسوقت دیکھنے والے جلاد سمجھتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ضد اور آن والی عورت تھی اسکو اپنی سیادت پر گھمنڈ تھا ورنہ آج وہ مریم کو ضرور اپنی بہو تسلیم کر لیتی۔ مریم آنکھو مین آنسو بھرے چلی گئی۔ سکینہ اسدن شام تک پڑی سسکیان لیتی رہی۔

مریم رام نگر سے ملول و دلگیر چلی تھی اور راستہ بھر سکینہ کے برتاؤ پر غور کرتی رہی۔ پر تیا کے قریب پہنچتے پہنچتے اسکا رنج غصہ سے بدلگیا اور اب اسکے خیالات نے پلٹا کھایا۔ سکینہ کے انداز سے اسکو یہ معلوم ہوا تھا کہ اگر مان بیٹے ملگئے تو اب اسکی اپنی زندگی مصیبت ہو گی۔ اسکو یقین ہو گیا تھا کہ سکینہ کبھی اسکی دوست نہین ہو سکتی۔ مریم نے اسی جگہ قسم کھائی کہ جہانتک اسکا بس چلیگا وہ یہی کوشش کرتی رہیگی کہ ادریس اور سکینہ مین میل کی کوئی صورت نہ نکلنے پائے۔

مریم جنگل کے اندر سے ہو کر نہین جا رہی تھی بلکہ اس کھلے ہوئے راستہ سے جا رہی تھی جو آمی اور جنگل کے درمیان سے گذرتا ہے۔ آدھے سے زیادہ راستہ طے ہو چکا تھا۔ مریم اپنے خیالات مین گم تھی۔ اتنے مین بائین طرف سے کسی نے اسکا نام لیکر پکارا۔ آواز آشنا سی تھی مریم چونک پڑی۔ دیکھا تو جنگل کے کنارے رؤف کھڑا تھا۔ رؤف نے نگاہون سے التجا کرتے ہوئے کہا "اگر کوئی ہرج نہ ہو تو اتنی مدت کے بعد دو باتین مجھ سے بھی کرتی جاؤ"۔ مریم ہچکچاتے ہوئے رک گئی۔ رؤف قریب آگیا اور چند منٹ تک مریم کو پرستارانہ نگاہون سے دیکھتا رہا۔ مریم نے گھبرا کر کہا "مجھے جلد گھر پہنچ جانا چاہئے۔ کہئے آپکو کیا کہنا ہے"۔ رؤف نے محسوس کر لیا کہ مریم اب وہ مریم نہین ہے۔ اسلئے کہ اسکے لہجہ مین آج وہ اکڑ وہ خودداری وہ معصومانہ سرکشی نہ تھی۔ رؤف نے ایک آہ کر کے کہا "خدا جانے تمنے اپنی زندگی بنائی یا نہین مگر مجھکو تو بُری طرح مٹی مین ملا دیا۔ یون تو بظاہر مین جیسا تھا ویسا اب بھی ہون مگر کہہ نہین سکتا تمھاری صورت دیکھنے کو تمھاری باتین سننے کو ترستا ہون۔ اب اور کوئی آرزو کرنا تو بیکار ہے لیکن کیا یہ امید بھی ناجائز ہے کہ کبھی کبھی اپنی صورت دکھا دیا کرو۔ تم آزاد اب بھی ہو اور اتنا کر سکتی ہو۔ کہو تو مین اسی جگہ روز آیا کرون"۔ مریم نے سراسیمہ ہو کر جلدی سے جواب دیا "نہین آپ اسکی کوشش نہ کیجئے۔ مین بدنام ہو جاؤنگی۔ ہان اگر آپ کی حسرت صرف اسقدر ہے تو مجھ سے جب کبھی ہو سکیگا آپکو اپنا شامت زدہ منہ دکھا دون گی"۔ مریم رخصت ہو جانا چاہتی تھی۔ مگر رؤف نے پوچھا "کیون مریم شامت زدہ کیون؟ کیا تم خوش نہین ہو؟"۔ مریم نے ملاقات کو مختصر کرنے کے لئے کہا "مجھے کوئی شکایت نہین۔ مجھے خدا کا دیا سب کچھ ملا ہے۔ لیکن اسکا کیا علاج کہ مین دنیا مین خوش رہنے کے لئے نہین بنائی گئی ہون۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو یقیناً خوش ہوتا"۔ یہ کہکر وہ وہان سے روانہ ہو گئی۔

ادریس ابھی سو رہا تھا۔ مریم بیٹھکر اپنی گذشتہ اور موجودہ زندگی کا موازنہ کرنے لگی۔ کیا اسکے حق مین یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ بلا کسی قسم کی زنجیر مین اپنے کو جکڑے ہوئے اپنی تمام عمر گذار دیتی؟ یا اگر اسکو کسی کا پابند ہی ہونا تھا تو کیا رؤف ادریس سے زیادہ مستحق اور اس سے زیادہ موزون آدمی نہ تھا؟ آج پہلا دن تھا کہ مریم نے رؤف کو قدر کی نگاہون سے دیکھا تھا۔ لیکن ادریس کے مقابلہ مین رؤف کا خیال آتے ہی اسکو اپنی ذات سے شرم آنے لگی اُسنے "توبہ توبہ" کہکے فوراً اس خیال کو اپنے ذہن سے دور کر دیا اور آہستہ سے ادریس کو جا کر جگا دیا۔ ادریس کے فرشتون کو بھی خبر نہ تھی کہ مریم اتنی دیر مین کہان کہان ہو آئی اور کیا کیا کر آئی مریم نے بھی ادریس سے آج کے واقعات کا کوئی ذکر نہین کیا

(باقی) مجنون گورکھپوری

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز

اور

قبضۂ ہندوستان کی دلچسپ داستان

ہم نے ہندوستان کس طرح فتح کیا؟ یہ سوال کہ ہمنے ہندوستان کس طرح فتح کیا، اُن سوالات سے جنکو مین نے گذشتہ سلسلۂ تقریر مین اُٹھایا تھا، قطعی مشابہ نہین ہے۔ دنیائے جدید مین ہمارے نوآبادکارون نے یقیناً ایک وسیع خطہ پر تصرف کر لیا تھا لیکن وہ بیشتر غیر آباد تھا، جن مشکلات کا اسکو مقابلہ کرنا پڑا زیادہ تر وہان کے دیسی باشندون کی طرف سے نہین تھین بلکہ یورپ کی دوسری قومون کی رقابت سے پیدا ہوی تھین۔ مین کسی حد تک بیان کر چکا ہون کہ رفتہ رفتہ کن کن طریقون سے ہم نے ان حریفون پر فوقیت حاصل کی۔ اس سوال کا جواب گو بادی النظر مین بالکل کھلا ہوا نہین معلوم ہوتا تاہم اسکا دریافت کر لینا زیادہ مشکل نہین۔ برخلاف اسکے یہ سوال کہ ہندوستان کس طرح فتح ہوا پہلی ہی نظر مین نہایت پریشان کن معلوم ہوتا ہے۔ یہان آبادی گنجان تھی، یہان کا تمدن، (گو اسکا سرچشمہ بالکل مختلف تھا) ایسا ہی حقیقی اور قدیم تھا جیسا ہمارا اپنا۔ ہم نے یورپ کی تاریخ مین متعدد مثالین ایسی دیکھی ہین کہ ایک سمجھدار قوم کو جو زبان و مذہب مین اپنے حملہ آورون سے قطعی مختلف تھی، فتح کرنا بالکل ناممکن ہو گیا ہسپانیہ کی پوری طاقت اسّی سال مین بھی ڈچ کے صوبون کو جنکی آبادی نہایت مختصر تھی نہ فتح کر سکی۔ یہی حال پرانے زمانہ مین سوئٹزرلینڈ والون اور حال مین یونانیون کا تھا کہ وہ مغلوب نہ ہو سکے۔ اور ٹھیک اُسی وقت جب ہم نے ہندوستان کی فتح کا پہلا قدم اُٹھایا، ہم امریکہ کے ۳۰ لاکھ باشندون کو جو ہماری ہی نسل سے تھے تاج برطانیہ کا وفادار رکھنے مین ناکام رہے۔ یہ کیسا عجیب اجتماع ضدین ہے! انگریزون نے جنگ امریکہ کی سی مایوس کن نااہلی کبھی نہین دکھلائی اسوقت بظاہر یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ انکے عروج کا زمانہ ختم ہو گیا اور انگلینڈ کا زوال شروع ہو گیا، لیکن اُسی وقت ہندوستان مین وہ بحیثیت ایک ناقابل مقاومت فاتح کے نظر آرہے تھے اور اپنی اسی فوقیت کو دیکھکر وہ اپنے کو بہادرون کی ایک قوم سمجھنے لگے تھے۔ اس اختلاف کی کیا تشریح ہو سکتی ہے؟

تاریخ کا مطالعہ اسقدر سطحی نگاہ سے . . . . کیا جاتا ہے کہ یہ اختلاف بالکل . . . نظر انداز ہو جاتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ہماری نظرون کے سامنے فتح کی ایک جھلک آجاتی ہے جسکی وجہ سے ہم خیال کرتے ہین کہ باوجود ان تون کے اُسوقت ہمارے اندر آثار حیات موجود تھے۔ یقیناً (اگرچہ اس اختلاف کی تاویل کتنی ہی مشکل معلوم ہو) اسمین کوئی شبہ نہین ہے کہ بارہا ہندوستان مین پلاسی یا دوسرے موقعون پر ہماری فوجون نے خوفناک مشکلات کے باوجود فتوحات حاصل کین۔ اگر ہم یہان اپنی قومی برتری پر ناز کرین اور محسوس کرین کہ ہندوٗن کے مقابلہ مین ہم خوفناک لوگ ہین تو کوئی مضائقہ نہین۔

لیکن سچ مچ کیا یہ دعویٰ اس مشکل کو رفع کر سکتا ہے؟ فرض کرو کہ ایک انگریز سپاہی ۱۰ یا ۲۰ ہندوؤن کے برابر ہے۔ کیا اسوقت بھی یہ قیاس مین آسکتا ہے کہ انگریزون نے سارے ہندوستان کو فتح کر لیا جس وقت یہ فتح شروع ہوی انگریزون کی کل تعداد ۱۲ ملین (ایک کروڑ ۲۰ لاکھ) تھی اور ہندوستان کے علاوہ انکو دوسری جگہون پر بھی لڑائیان درپیش تھین۔ کلائیو کا کچھ زمانہ یورپ کی جنگ ہفت سال مین پڑتا ہے اور جب ہم نپولین سے برسرپیکار تھے تو لارڈ ویلزلی ہندوستان مین بڑے بڑے ملحقات کا اضافہ کر رہا تھا ہماری سلطنت فوجی نہین ہے۔ اُس زمانہ مین ہم کوی زبردست نبرد آزما فوج رکھنے کے قابل نہین تھے اور نہ ہمکو اس کا دعویٰ تھا۔ اسطرح یورپ کی جنگون مین ہم عام طور پر بحری بیڑون سے کام لیتے تھے اور جب خشکی پر مقابلہ کی نوبت آتی تو کسی اپنے حلیف کے طرفدار ہو جاتے۔ چنانچہ کبھی آسٹریا کا ساتھ دیتے اور کبھی پروشیا کا۔ باوجود اپنی بری طاقت کی کمزوری کے ایسے وقت مین کیونکر ممکن تھا کہ ہم ہندوستان کے بڑے حصہ پر فتح حاصل کرتے جسکا رقبہ تقریباً ۱۰ لاکھ مربع میل اور آبادی ۲۰ کروڑ تھی۔ اسکی وجہ سے ہماری فوجی قوت اور خزانہ پر کتنا بار پڑا ہوگا۔ تاہم کسی وجہ سے یہ بار کبھی محسوس نہین ہوا۔ یورپ کی جنگون نے ہم پر اتنا قرض لاد دیا جو کبھی ادا نہ ہو سکا۔ لیکن ہندوستان کی جنگون سے ہمارے قومی قرضہ مین مطلق اضافہ نہین ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جو کچھ محنت و مشقت ہمکو وہان برداشت کرنا پڑین انکا کوی اثر باقی نہ رہا۔

اسلئے ضرور اس موجودہ خیال مین کچھ غلطی ہے کہ انگلینڈ سے سپاہی ہندوستان گئے اور انھون نے اپنے شجاعت اور ذہنی تفوق کی بدولت سارے ملک کو فتح کیا۔ ۱۸۱۸ء مین مرہٹون سے جو بڑی لڑائی ہوی اس مین ہمارے ایک لاکھ سے زیادہ سپاہی تھے لیکن یہ کسقدر حیرت کا مقام ہے یہی وہ زمانہ ہے جب جنگ نپولین کے بعد ہماری بے سروسامانی اور بے بضاعتی حد درجہ المناک تھی۔ کیا یہ ممکن تھا کہ جنگ واٹرلو کے تین ہی سال بعد ہم ہندوستان مین اتنے بڑے پیمانہ پر جنگ مین مصروف ہوتے اور ہمارے پاس اتنے سپاہی ہوتے جتنے لارڈ ولنگٹن کے پاس اسپین مین بھی نہ تھے۔ پھر اس وقت بھی ہندوستان مین ہماری فوجی قوت صرف ۲ لاکھ نفوس ہے صرف دو لاکھ سپاہی! درانحالیکہ ہماری سلطنت بھی فوجی سلطنت نہین ہے!!

درحقیقت مین جس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہون تم اسکو سمجھ رہے ہو۔ ہم سب جانتے ہین کہ یہ ہندوستانی فوج خالص انگریزی نہین ہے بلکہ اسمین غالب عنصر دیسی فوج کا ہے۔ ۲ لاکھ مین سے صرف ۶۵۰۰۰ یعنی ایک تہائی سے بھی کم اسمین انگریز سپاہی ہین اور یہ تناسب غدر کے بعد سے قائم کیا گیا جب سے کہ انگریزی سپاہ مین اضافہ اور دیسی فوج مین تخفیف کی پالیسی شروع ہوئی۔ اسطرح غدر کے وقت انگریزی سپاہ کی تعداد صرف ۴۵۰۰۰ تھی اور اُسکے مقابلہ مین دیسی سپاہ ۲۳۵۰۰۰ تھی یعنی انگریزی سپاہ ہندوستانی سپاہ کے بقدر ۱/۵ تھی پھر ۱۸۰۰ء مین دیکھتا ہون کہ انگریزی سپاہ ۲۵۰۰۰ تھی اور دیسی سپاہ ۱۳۰۰۰۰ یعنی ۱/۵ سے بھی کم۔ یہی تناسب ۱۷۷۳ء مین بھی تھا جسوقت برطانوی ہند اور ریگولیٹنگ ایکٹ وجود مین آئے۔ اسوقت کمپنی کی فوجی قوت ۹۰۰۰ یوروپین اور ۴۵۰۰۰ دیسی سپاہ پر مشتمل تھی۔ اس سے قبل یوروپین سپاہ کا تناسب مین اس سے بھی کم پاتا ہون یعنی صرف ۱/۶ اگر اسی طرح ہم پیچھے ہٹتے جائین تو دیکھین گے کہ شروع شروع مین ہندستانی فوج کلیتہً دیسی ہی تھی، یوروپین سپاہ کا اسمین نام بھی نہین تھا۔ کرنیل جسنے (Col. Chesney) اس کے متعلق تاریخی نقطۂ نگاہ سے یون لکھا ہے،،

"کمپنی کی ہندوستانی فوج ۱۷۴۸ء مین وجود مین آئی جب فرانسیسیون کی دیکھا دیکھی اپنے تحفظ کے لئے اُسنے مدراس مین ایک مختصر دستہ سپاہ کا مرتب کیا۔ ٹھیک اُسی وقت یوروپین سپاہ کا ایک دستہ بھی مرتب ہوا جسمین وہ ملاح شامل تھے جو جہاز کے کام سے فاضل بچتے تھے یا وہ لوگ ہوتے تھے جنکو کمپنی کے جہازران انگلینڈ سے پھنسا کر لاتے تھے۔"

کمپنی کی ابتدائی لڑائیون مین، جنکی بدولت اسکو استحکام نصیب ہوا، ہر موقع پر (محاصرہ ارکاٹ محاصرہ پلاسی، اور بکسر مین) اسکے دیسی سپاہیون کی تعداد یوروپینون سے زیادہ تھی۔ یہان پر ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ ہمارا یہ خیال نہین ہے کہ دیسی سپاہ لڑنے مین نالائق تھی یا میدان جنگ مین سارا بوجھ یوروپینون ہی پر پڑتا تھا جس شخص کا ایسا طفلانہ خیال ہو۔ ایسا خیال عام طور سے مورخین اپنے غرور قومیت مین ظاہر کرتے ہین۔ اسکو یہ سنکر ہرگز متعجب نہین ہونا چاہئے کہ انگریز مصنفین دیسی سپاہ کی حقیقت کا اندازہ کرنے مین بالکل قاصر تھے۔ میکولے نے کلایو پر جو مضمون لکھا ہے اسکو پڑھو۔ تم اسمین ایسے تعریفی کلمات بھرے پاؤگے، "شاہی قوم"، "سمندر کی بہادر اولاد"، "کلایو اور اُسکے ہمقوم انگریزون سے کوئی مقابلہ نہین کر سکتا تھا"۔ لیکن اگر ایک مرتبہ تسلیم کر لیا جائے کہ دیسی سپاہ ہمیشہ انگریزون سے تعداد مین زیادہ تھی اور ہر موقع پر جنگی لیاقت مین انگریزون کے ہم پلہ تھی تو ہماری کامیابی کا سارا دعوی جسکی بنا ہماری غیر محدود فطری شجاعت کی برتری پر ہے، متزلزل ہو جائگا۔ جن لڑائیون مین ہماری فوج دشمن کے مقابلہ مین "ایک اور دس" کی نسبت رکھتی تھی اگر ہم کہین کہ ایک انگریز دس دیسی کے برابر تھا تو یہی بات ایک دیسی سپاہی کے لئے بھی صادق آسکتی ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ دونون سپاہ مین فرق تھا لیکن یہ فرق قومیت کا نہین تھا بلکہ ڈسپلن اور فن جنگ کا اور اکثر اوقات بلاشبہ سپہ سالاری کا تھا۔

تم دیکھوگے کہ مِل (Mill) نے "فتح ہند" کی جو سرسری تفصیل لکھی ہے اسمین انگریزون کی اس فطری برتری کا کہین ذکر نہین ہے۔ وہ لکھتا ہے "ہندوستان کی فتح دو اہم باتون کے دریافت پر منحصر تھی۔ پہلی یہ کہ دیسی فوج یورپین فوج کے مقابلہ مین بے قاعدہ ہوتی ہے اور دوسری یہ کہ یورپین ملازمت مین رہنے والی دیسی سپاہ کو فوجی قواعد سکھانا آسان ہوتا ہے۔ یہ دونون باتین فرانسیسیون نے دریافت کی تھین"۔

اگر ہم تسلیم بھی کر لین کہ انگریزی سپاہ لڑنے مین دیسی سپاہ سے عمدہ تھی اور مشترکہ فتوحات مین اول الذکر کا حصہ زیادہ تھا تو بھی یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ انگریزی قوم نے ہندوستانی قوم کو فتح کیا۔ .... ہندوستانی قومون کو اس فوج نے زیر کیا جسمین صرف ⅕ حصہ انگریزی عنصر تھا۔ ہم ان کامیابیون مین نہ صرف اپنی کارگذاری کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے ہین بلکہ شروع سے ان کی حقیقت ہی کو غلط سمجھتے اور غلط بیان کرتے ہین۔ بھلا فوج کا ⅘ حصہ کس قوم کی سپاہ سے تھا۔ دیسی ہندوستانیون سے۔ لہذا یہ کہنا کہ ہندوستان کو غیر ملکیون نے فتح کیا مشکل سے صحیح ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کو خود ہندوستانیون نے فتح کیا۔ اگر ہم ہندوستان کو فرانس یا انگلینڈ کی طرح متحد القوم سمجھنے مین برسرحق ہوتے، حالانکہ ہم نہین ہین، تو کبھی نہ کہتے کہ وہ غیر ملکی دشمنون سے دب کر چُور چُور ہو رہا تھا۔ بلکہ ہمکو کہنا چاہئے کہ اُسنے فتنہ و فساد اور طوائف الملوکی سے نجات حاصل کرنے کے لئے صرف ایک حکومت کے آگے گردن جھکا دی اگرچہ وہ حکومت غیرون ہی کی تھی۔

ہندوستان کی یہ تعریف یا اُسکے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ سیاسی اعتبار سے متحد تھا قطعی غلط اور مبالغہ آمیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان نہ تو سیاسی اعتبار سے اور نہ کسی دوسرے صحیح مفہوم مین ہندوستان تھا۔ یہ لفظ محض ایک جغرافیای اصطلاح ہے یہی وجہ تھی کہ ہندوستان اس آسانی کیساتھ فتح ہوگیا۔ بالکل یہی حالت اطالیہ اور جرمنی کی تھی جو نپولین کے پنجہ مین آگئے تھے۔ کیونکہ درصل اطالیہ اور جرمنی کا وجود حقیقی معنون مین تھا ہی نہین انمین قومیت کا جذبہ بالکل مفقود تھا۔ نپولین جرمنی کی ایک ریاست کو دوسری ریاست کے مقابلہ مین کھڑا کردیتا یا جب وہ اسٹریا یا پروشیا سے برسرپیکار ہوتا تو اُسکی حلیف بویریا اور ورٹمبرگ کی ریاستین ہوتین جس طرح نپولین نے دیکھا کہ وسط یورپ مین فتوحات حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہایت کامیاب ہے اُسی طرح ڈوپلے نے شروع شروع ہندوستان مین بھی قیام سلطنت کے اس طریقہ کو موثر پایا بشرطیکہ وہان کسی یورپین حکومت کے مستحکم کارخانجات ہون۔ اُسنے دیکھا کہ یہان ہر ایک ریاست دوسری ریاست سے خانہ جنگی مین مبتلا ہے اگر انکی باہمی لڑائیون مین کوی غیر ملکی دخل دیدے تو بلاشبہہ انکی قوت متوازن کرنیکی کنجی اسی کے ہاتھ مین ہوگی۔ ڈوپلے نے اس تجویز پر عمل کیا۔ چنانچہ ہندوستان مین اہل یورپ کی سلطنت کی ابتدا اُسوقت ہوی جب فرانسیسیون نے حیدرآباد کی اُس لڑائی مین دخل دیا جو نظام الملک اعظم کی جانشینی کے سوال پر ۱۷۴۸ء مین ہوئی تھی۔

اسلئے حقیقت امر یہ ہے کہ ہندوستان کو اجنبیون سے مغائرت ہی نہین تھی جسکی وجہ یہ تھی کہ وہان قومی اتحاد مفقود تھا۔ اور صحیح معنی مین نہ ہندوستانی ہندوستانی تھے اور نہ غیرملکی غیر ملکی اس حد تک، جیساکہ مین نے اشارہ کیا ہے، یورپ مین بھی اسکی مثال موجود ہے۔ جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہین کہ ہندوستان کو انگریزون نے دیسی سپاہ کی مدد سے فتح کیا تو ہمکو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہان قومیت کا احساس اس سے کہین زیادہ مردہ ہوچکا تھا جتنا کہ اسّی سال ہوے جرمنی مین تھا۔ نپولین نے بویریا کو آسٹریا کے خلاف یا دونون کو روشیا کے خلاف لڑا دیا، لیکن اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ بویریا، آسٹریا یا پروشیا کو آپس میں لڑا دے کیونکہ ان میں کچھ نہ کچھ احساس قومیت کا موجود تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نپولین ایک معاہدہ کی رو سے بویریا کے صدر سے آسٹریا پر حملہ کیوقت ایک فوج حاصل کرتا ہے لیکن وہ محض روپیہ کی بدولت جرمنون کی فوج مرتب کرکے خود جرمنی کو نہین فتح کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان مین ایسا ہی ہوا۔ یورپ کے اندر اگر تم اسکی مثال سمجھنا چاہو کہ ہندوستان کو ایسی فوج نے فتح کیا جسمین ⅘ دیسی سپاہ تھی اور صرف ⅕ انگریزی تو تم فرض کرو کہ انگلینڈ نے فرانس پر حملہ کیا اور فرانسیسیون کو معقول تنخواہ دیکر اسقدر کافی فوج بھرتی کرلی کہ فرانس فتح ہوگیا۔ اُف یہ خیال ہی کسقدر ہیبتناک ہے! تم متعجب ہونگے کہ فرانسیسی فوج اور جب چاہے فرانس پر حملہ کرے۔ تاہم اگر تم غور کرو تو محسوس کروگے کہ ایسا ہونا ممکن تھا بشرطیکہ فرانس کی گذشتہ تاریخ مختلف ہوتی۔ ہم خیال کرسکتے ہین کہ فرانس مین قومیت کا جذبہ کبھی پیدا ہی نہین ہوا اور یہ بہت آسان ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہین کہ بارھوین صدی شاہ پیرس اور شاہ رُون (Rouen) کی خانہ جنگیون سے بھری ہوی ہے۔ ہم اپنے سلسلۂ خیال کو آگے بڑھائین تو دیکھینگے کہ فرانس کے مختلف حصون مین جو حکومتین قائم تھین اُنمین کی بیشتر غیر ملکی تھین یعنی ملک پہلے ہی سے غیر ملکی حکمرانون کے جوے کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ایسے ملک مین اگر خارجی اثرات سے ایسی ابتری رونما ہوجائے کہ کرایہ پر لڑنا ایک منفعت بخش پیشہ سمجھا جانے لگے تو ملک زر پرست اور پیشہ ور سپاہیون سے بھر جائیگا۔ ایسے سپاہی ہر حکومت سے لڑنے کے لئے تیار ہوجائینگے چاہے وہ ملکی ہو یا غیر ملکی۔

ہندوستان کی حالت بالکل ایسی ہی تھی۔ انگریزون نے وہان غیر ملکی غلبہ کی بنا نہین ڈالی کیونکہ وہ پہلے ہی سے موجود تھا

اس موضوع کے متعلق ہم نے ایک مخصوص غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ یورپین قوم سے مراد وہ قوم ہے جو ایک خاص حصۂ ملک پر قابض ہو۔ ہمارے نزدیک ایسی قومیت معمولی شے ہے حالانکہ یہ نہایت غیر معمولی ہے۔ اسی قومیت کے تخیل پر ہماری حب الوطنی اور تمام قومی خصائل حمیدہ کی بنا ہے ہندوستان مین ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قومیت کا مفہوم بالکل پراگندہ ہے۔ یہی نہین کہ گیارھوین صدی سے ملک اسلامی حملون سے محصور تھا بلکہ اگر ہم اس سے اور پہلے نظر کرین تو دیکھینگے کہ مختلف قومین ایک دوسرے سے مل جل گئی ہین، ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ کیے ہوے ہے۔ وہ سنسکرت بولنے والی آرین قوم جو برہمنیت کی خالق ہے جو ہندوستان مین نام نہاد اتحاد قائم کرنے کی دعویدار ہے خود ایک حملہ آور قوم ہے اور بحیثیت حملہ آور ہونے کے اپنے اندر قدیم اقوام کو جذب کرنے سے قاصر رہی۔ یورپ مین قدیم قوم بالکل غائب ہو چکی ہے یہان تک کہ یورپین زبانون مین اُسکے وجود کا کوئی نشان نہین باقی ہے برخلاف اسکے ہندوستان مین قدیم اقوام ہر جگہ ظاہر ہین۔ وہان کی مروجہ زبانین سنسکرت کی مسخ شدہ شکلیں نہین ہین بلکہ سنسکرت اور قدیم زبانون کی آمیزش کا نتیجہ ہین۔ جنوبی ہند مین تو ان زبانون مین سنسکرت کی بُو بھی نہین ہے۔ برہمنیت جو بادی النظر مین عالمگیر معلوم ہوتی ہے نظر غائر سے مطالعہ کرنے پر محض چند اصول فلسفہ کے مبہم مجموعہ کا نام رہ جاتی ہے۔ جسنے متضاد اور بے جوڑ اوہام یگانگت کی جھلک پیدا کر دی ہے۔ لہذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہندوستان مین وہ بنیادی دعوی ہی مفقود ہے جسپر مغرب کے اصول سیاست کی بنیاد ہے۔ وہان وہ قومیت ہی نہین جسپر قومی حکومت ممکن ہو۔ اسکے ثبوت کے لئے ہمکو بہت پیچھے جانے کی ضرورت نہین ہے بس اتنا دیکھنا کافی ہے کہ محمود غزنی کے زمانہ سے ہندوستان مین اسلامی حملہ کا ایک مستقل سیلاب آتا رہا۔ مغلون کی آمد سولھوین صدی مین تھی اور اس سے بہت پیشتر وہان کی اکثر حکومتین اسلامی تھین۔ اس لئے اُسی وقت سے ہندوستان کی اکثر ریاستون مین قومیت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ حکومتون کی بنیاد اب عدل و انصاف پر نہین تھی۔ انکو اب حق نہین باقی رہا کہ وہ قومیت اور حب الوطنی کے نام پر اپیل کرین۔

ان حالات کے اندر ہندوستان کی فتح کی تشریح ہندوستانیون کو دوسری قومون سے فروتر سمجھے بغیر ممکن ہے۔ بنا برآن کوئی وجہ نہین کہ ہم خواہ مخواہ انگریزون کو دوسری قومون سے اعلی خیال کرین۔ ہمارے نزدیک انسان کا اپنے ملک کی خاطر غیر ملکیون سے لڑنا ایک فرض ہے لیکن لیکن سوال یہ ہے کہ اُسکا ملک کیا ہے؟ جب ہم اس خیال کا تجزیہ کرتے ہین تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ انسان ایک ایسی قوم مین پیدا ہو کر پرورش پاے جو بطور ایک بڑے خاندان کے سمجھی جاتی ہو اور وہ فطری طور پر ملک کو بمنزلہ اپنی مان کے سمجھتا ہو لیکن اگر قوم کی ترکیب ایسی نہین ہے بلکہ اس مین دو یا تین قومون کی آمیزش ہو جو آپس مین ایک دوسرے سے نفرت کرتی ہون اور زیادہ سے زیادہ اپنے گانون کو گھر سمجھتی ہون تو ایسی صورت مین وہان کے باشندون کا کوئی قصور نہین اگر انمین بجاے حب الوطنی کے گانون کی محبت ہو۔ پہلے پہل غیر ملکی جوے کو اپنے کندھے پر رکھنا اور بیچیز ہے اور ایک غیر ملکی جوے کو ہٹا کر دوسرا غیر ملکی جوا رکھنا بالکل دوسری چیز ہے۔

ہندوستان کی فتح کا تعجب خیز پہلو یہ نہین ہے کہ وہ انگریزون کو نصیب ہوی بلکہ یہ ہے کہ انگلینڈ کو اس کے لئے کوئی محنت یا کوشش نہین کرنا پڑی۔ ہم اتنی بڑی آبادی فتح کرنے مین مصروف تھے جو یورپ کی آبادی کے برابر تھی لیکن انگریزون نے نہ تو کوئی ٹیکس دیا، نہ انگریزی حکومت نے قرضہ لیا نہ کبھی جبری فوجی بھرتی ہوی، نہ کبھی آدمیون کی قلت محسوس ہوی اور نہ ہمکو دوسری جنگون کے جاری رکھنے مین کوئی وقت ہی محسوس ہوی۔ بظاہر یہ صورت ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے لیکن مین نے اسکی وجہ بیان کر دی ہے جہان تک ان لڑائیون کی مالی حالت

کا تعلق ہے وہ عام اصول جنگ کے مطابق تھی۔ فتح ہمیشہ اپنا خرچ آپ برداشت کرتی ہے۔ نپولین کو کبھی مالی پریشانی نہین ہوی کیونکہ وہ ہمیشہ انھین کے صرفہ پر رہتا تھا جنکو مغلوب کرتا تھا۔ اسی طرح ہندوستان بھی ہندوستان ہی کے روپیہ سے فتح ہوا۔ اب صرف یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آخر فوج کس طرح فراہم ہو سکتی تھی۔ اور یہ مشکل بھی رفع ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہین کہ اس فوج کا بڑا حصہ ہمیشہ دلیسی سپاہ پر مشتمل ہوتا تھا

اگر ہم بغور دیکھین تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان پر حصول سیادت کے لئے لفظ "فتح" کا استعمال صرف ناموزون ہی نہین بلکہ قطعی مغالطہ آمیز ہے۔ کیونکہ اس طرح ہم ہر واقعہ کو ایسی صورت مین تقسیم کرنے کے مرتکب ہونگے جس سے وہ دراصل مشابہ نہین ہے بلاشبہ اس سے قبل مین نے اچھی طرح بیان کر دیا ہے کہ جب کبھی یہ لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے کہین زیادہ جامع تعریف کا متقاضی ہوتا ہے بہ نسبت عام طور سے لوگ اسکی کرتے ہین نیز یہ کہ اسکے ایت سے دوسرے معنی بھی ہوتے ہین۔ یقیناً یہ لفظ اسی موقع پر استعمال ہوتا ہے جب ایک سلطنت دوسری سلطنت کے خلاف کوئی قدم اُٹھاتی ہے، دو سلطنتون مین جنگ ہوتی ہے ایک حکومت کی فوج دوسرے کی فوج پر حملہ آور ہوتی ہے اور اسکو درہم برہم کر دیتی ہے یا ایسی ذلیل صلح پر مجبور کرتی ہے جو اُسکی آزادی سلب کرنیوالی ہوتی ہے۔ اسی کا نام صحیح معنون مین فتح ہے۔ اب چونکہ ہم کہتے ہین کہ انگلینڈ نے ہندوستان کو فتح کیا تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ ان دونون ملکون کے درمیان اس قسم کا کوی واقعہ ہوا۔ سکندر اعظم نے جب مملکت فارس کو فتح کیا تو حکومت مقدونیہ اور حکومت فارس کے درمیان جنگ ہوی تھی جسکا نتیجہ فارس کی شکست مین ظاہر ہوا۔ جب سیزر نے گال (Gaul) فتح کیا تو وہ جمہوریت روم کی طرف سے ایک عہدہ پر ممتاز تھا۔ وہان کی سنیٹ نے اسکو سلطنت رومہ کی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ لیکن ہندوستان مین اس قسم کا کوئی واقعہ نہین تھا شاہ انگلینڈ نے نہ تو مغل بادشاہ سے اور نہ کسی راجہ یا نواب ہی سے اعلان جنگ کیا۔ سلطنت انگلینڈ کو ہندوستان کی فتح سے کبھی کوئی تعلق نہ ہوتا اگر اول الذکر کو فرانسیسون سے پانچ مرتبہ جنگ کی نوبت نہ پڑی ہوتی جب فرانسیسی قبضہ ہندوستان مین اچھی طرح جم گیا تو انگریزون کو اُنسے لڑنے کی ضرورت لاحق ہوی۔ اور چونکہ انکی بعض لڑائیان ہندوستان مین ہوئین اسلئے قدرتاً ایک حد تک ایسٹ انڈیا کمپنی اور دیسی ریاستون سے بھی انکا تعلق ہو گیا۔ اگر ہم اس واقعہ کی ماہیت کو واضح طور پر سمجھنا چاہتے ہین تو چاہئے کہ کہ صورت حالات کو جو بالکل اتفاقی بھی نظر انداز کرکے غور کرین، اُسوقت ہم دیکھینگے کہ ہندوستان مین درحقیقت کوئی ایسی بات نہین ہوئی جسکو "فتح" سے تعبیر کیا جا سکے حقیقت یون ہے کہ چند سوداگر ہندوستان کے ساحلی شہرون مین آباد ہو گئے۔ جب سلطنت مغلیہ کو زوال شروع ہوا اور بدامنی رونما ہوی تو انھون نے مجبوراً اپنی فوجی تنظیم کی اور کچھ فوج بھی ملازم رکھ لی۔ ان فوجون کی مدد سے انھون نے رفتہ رفتہ سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا حسن اتفاق سے یہ سوداگر انگریز تھے جنکی ملازمت مین کچھ انگریزی سپاہ بھی تھی۔

اب اسکو غیر ملکی "فتح" نہین کہہ سکتے البتہ اندرونی انقلاب کہہ سکتے ہین۔ کسی ملک مین جب حکومت کو زوال ہوتا ہے اور بدامنی کا دادورہ شروع ہو جاتا ہے تو عام قاعدہ یہی ہے کہ ملک کی باقی ماندہ منظم قوتون مین زور آزمائی شروع ہو جاتی ہے اور جو سب سے زیادہ زبردست ثابت ہوتی ہے وہ اپنی حکومت قائم کر لینے مین کامیاب ہو جاتی ہے۔ مثلاً فرانس مین جب مجلس باربن (Bourbon) کو

زوال ہوا تو پیرس کی میونسپلٹی نے جو برسر اقتدار تھی سلطنت کی عنان اپنے ہاتھ مین لے لی۔ اور پھر تھوڑے ہی دنون بعد جب اُسکو زوال ہوا تو بوناپارٹ نے اپنی فوجی حکومت قائم کرلی۔ ہندوستان بھی سنہ ۱۷۵۰ء مین سلطنت مغلیہ کے انحطاط کیوجہ سے بدامنی مین مبتلا تھا۔ یہ انحطاط سنہ ۱۷۰۷ء مین اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے شروع ہوا۔ ہر جگہ چھوٹے چھوٹے صاحب اثر سرداروں نے منظم ہو کر برسر اقتدار ہونا چاہا۔ یہ طاقتین عام طور سے جیسا کہ ہندوستان کا دستور تھا، کرایہ کے سپاہیون پر مشتمل تھین جو یا تو کسی مغلیہ صوبہ کے گورنر کی ماتحتی مین ہوتین یا کسی صاحب اختیار اور دلیر لٹیرے کی سرکردگی مین یا کسی مقامی قوت کی زیر قیادت جو مغلون کے استیلاء سے قبل موجود تھی اور جسنے کبھی پوری طرح انکی سیادت کو تسلیم نہین کیا مین ہر قوت کی ایک ایک مثال دونگا مثلاً حیدر آباد کی ریاست، اسکو نظام نے قائم کیا جو شاہان مغلیہ کا ایک صوبہ دار تھا۔ ریاست میسور، اسکی بنا حیدر علی نے ڈالی جو ایک بہادر مسلمان سپاہی تھا۔ مرہٹون کی طاقت کا بانی پیشوا تھا، یہ ایک برہمنی طاقت تھی اور قدیم ہندوستان کی حالت کو پیش کرتی تھی۔ لیکن یہ سب کی سب طاقتین کرایہ کے سپاہیون پر بھروسہ کرتی تھین ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتین لوٹ وغارتگری کرتی پھرتین۔ شاید یورپ نے کبھی یہ صورت نہین دیکھی۔ البتہ کاروئنگین ایمپائر (Caro- lingian Empire) کی شکست کے موقع پر ایسی ابتری رونما ہوگئی تھی۔

نئی طاقتون کے عروج کے لئے یہ صورت حالات البتہ خاص طور سے معاون تھی۔ دوسری صورتون مین فتح کیلئے ضروری ہے جیسا کہ مین نے کہا ہے، کہ ایک زبردست قوت اپنے ہاتھ مین ہو۔ کوئی شخص تاوقتیکہ اسکے پاس منظم حکومت اور فوج نہ ہو فتح کا منصوبہ نہین کرسکتا۔ لیکن چونکہ یہان حالات مختلف تھے لہذا اُنکے اسباب بھی مختلف ہوگئے۔ حیدر علی کے پاس سوائے اُسکے دل ودماغ اور قوت بازو کے کچھ نہ تھا مگر وہ سلطان میسور ہو گیا۔ کرایہ کے سپاہی ہر جگہ تھے اور جو شخص انکا متہ روپیون سے بھر دیتا یا اپنے رعب طاقت سے اپنا طرفدار کرلیتا وہ انکی ملازمت مین آجاتے۔ اور جس کسی کے پاس ایسی فوج ہوتی وہ ہندوستان کے زبردست سے زبردست صاحب اختیار کا ہمسر بن جاتا کیونکہ حکومت کی شکست کے وقت صرف فوجی قوت ہی ایک قوت باقی رہ جاتی ہے۔

اب ان مختلف مقامی طاقتون مین اگر کوئی طاقت تھی جو ایسے مخصوص حالات مین سلطنت قائم کرنے مین کامیاب ہوسکتی تھی تو وہ ان سوداگرون کی تھی جنکی ساحلی شہرون مین کوٹھیان تھین۔ بلاشبہ وہ غیر ملکی تھے، لیکن، جیسا کہ مین نے بیان کیا ہے، غیر ملکی ہونا ہندوستان مین کوئی مضائقہ نہین تھا۔ ہندوستان کی بیشتر سلطنتین غیر ملکی تھین شاہان مغلیہ خود غیر ملکی تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس حیرت انگیز خوش نصیبی کی بڑی توصیف کیجاتی ہے۔ بیشک یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی خوش نصیبی کی گذشتہ مثال نہین ملتی اور اسی وجہ سے اسکے امکان کے متعلق پیشین گوئی کا کسی کو خیال نہین ہوسکتا تھا۔ لیکن چونکہ اسکی توجیہ دشوار نہین ہے اور اسکے اسباب بالکل ظاہر ہین اسلئے اسکو معجزہ نہین کہہ سکتے ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس واقعی کچھ سرمایہ تھا، اسکے قبضہ مین دولت تھی، سمندر تھا، اُسکے پاس دو تین قلعے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک کمپنی تھی جسکے لڑائی مین مارے جانے یا کسی بیماری سے مرنے کا مطلق اندیشہ نہین تھا۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک معمولی حیثیت کا شخص اٹھتا ہے اور بڑی بھاری سلطنت کا مالک بن جاتا ہے لیکن ہمکو تعجب نہین ہوتا کیون، اسلئے کہ اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اُس سے زیادہ قابل تعجب ہے۔ کارسیکا (Corsica) کا ایک غریب نواب تھا اُسکے چھوٹے لڑکے نے صرف استبدادی قوت کی مدد سے یورپ کے غالب حصہ کو

اپنے قابو مین رکھا۔ کیا یہ واقعہ ایسٹ انڈ کمپنی کے ہندوستان فتح کرنے سے زیادہ حیرت خیز نہین ہے؟ بونا پارٹ نے بغیر کسی رفیق اور بغیر ایک پیسہ کے سلطنت قائم کرلی۔ لیکن ۲۰ سال سے کم کی مدت مین اسکو کھو بھی دیا۔ اسی طرح حیدر علی سندھیا یا ہلکر کا عروج زیادہ تعجب خیز تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے زیادہ انکو اپنے عروج کیلئے قسمت کا مرہون منت ہونا پڑا۔ مین چاہتا ہون کہ تم اس واقعہ کو بالکل الگ ایک مخصوص حیثیت سے دیکھو۔ یہ ایک ریاست کی دوسری ریاست پر فتح نہین تھی۔ اسمین دو حکومتین کم از کم براہ راست متعلق نہین تھین اور نہ ہی اس کا رشتہ کسی غیر ملکی کے ہاتھ مین تھا۔ یہ ہندوستان کی سوسائٹی مین ایک اندرونی انقلاب تھا اور اسکو اُن ناگہانی حکمت عملیون یا تغلب و تصرف سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو کسی جماعت کی اندرونی بے چینی کو ختم کر دے۔ آؤ ایک لمحہ کے لئے ہم فرض کرلین کہ یہ سوداگر جو صاحب اثر و نفوذ بن بیٹھے اجنبی نہین تھے۔ اس سے واقعہ کی نوعیت مین کوئی فرق نہین آئیگا۔ فرض کرلو کہ بمبئی مین کچھ پارسی سوداگر تھے جب انھون نے اپنی تجارت کو بدامنی سے نقصان پہونچتے دیکھا تو یک جہت ہو کر کچھ قلعے بنا لئے اور فوجین بھی فراہم کرلین اور بعد ازان خوش قسمتی سے انھون نے اچھے اچھے جنرل بھی مقرر کر لئے۔ اس صورت مین اُنکے ساتھ بھی یہی بکسر اور پلاسی کا معاملہ پیش آتا اور وہ بھی شاہان مغلیہ سے کسی صوبہ کی دیوانی حاصل کرنے مین کامیاب ہو جاتے جو اُنکی سلطنت کی بنیاد ہوتی اور ایک وقت مین سارے ہندوستان پر پھیل جاتی۔ لہذا اس صورت مین بھی واقعہ مادی طور سے وہی ہوتا لیکن اُسوقت وہ اپنی اصلی روشنی مین دکھائی دیتا اور ہم اسکو اندرونی انقلاب سے تعبیر کرتے کیونکہ عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ ایک جماعت اپنے وجود کو معرض خطر مین دیکھکر بدامنی فرو کرنیکی کوشش کرتی ہے۔

اگر ایسا ہوا ہوتا تو کوئی تعجب نہ ہوتا۔ پھر اس لحاظ سے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج بہت ہی کم قابل تعجب ہونا چاہئے کیونکہ کمپنی مذکور کا قریبی تعلق یورپ سے تھا جہان سے وہ بوقت ضرورت فوجی امداد طلب کر سکتی تھی جو ظاہر تھا کہ ہندوستانی فوج سے زیادہ لائق اور قواعد دان تھی۔ ڈوپلے نے جسنے ہندوستان کی فتح کا ایسا صاف اصول دریافت کیا محسوس کرلیا کہ ہندوستانی فوج یورپین فوج کے سامنے ایک لمحہ نہین ٹھہر سکتی لیکن اُسنے یہ بھی اندازہ کر لیا کہ ہندوستانیون مین یورپین ڈسپلن قبول کرنے اور یورپین قابلیت کیساتھ جنگ کرنیکی پوری استعداد موجود ہے بشرطیکہ انکو تعلیم دی جائے۔ یہ تھی وہ کنجی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ مین تھی جسکی بدولت اُسنے ہندوستان کی مختلف طاقتون مین نہ صرف اپنے وجود کو قائم رکھا بلکہ ان پر غلبہ بھی حاصل کیا۔ یہ غلبہ کسی ناقابل انتقال جسمانی یا اخلاقی برتری کے سبب نہین تھا جیسا کہ ہم خیال کرتے ہین، بلکہ فوجی تنظیم و تربیت کے سبب سے تھا اور یہ باتین ہندوستانیون مین بھی پیدا کی جا سکتی تھین۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے ایک بڑی سہولت اور بھی تھی۔ یہ تو یقینی ہے کہ وہ سلطنت انگلیشیہ کی نمائندہ نہین تھی، لیکن انگلینڈ کے ساتھ اسکا تعلق اُسکے حق مین بہت کارآمد تھا بیشک روپیہ اور آدمیون کی فراہمی، جنکی بدولت ہندوستان فتح ہوا، خاص کمپنی کے ذمہ تھی، لیکن چونکہ شاہی فرمان کی رو سے وہ ہندوستان اور چین کی تجارت کی واحد اجارہ دار تھی اسلئے سلطنت انگلشیہ اور پارلیمینٹ کو اس کیساتھ دلچسپی کا ہونا قدرتی تھا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ انگریزی قوم نے ان معرکہ آرائیون کو انگلینڈ اور فرانس کی باہمی جنگ کی حیثیت سے دیکھا اور بڑی خوشی سے ان مین امداد بھی کی۔ یہ واقعہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن اکثر اس پر کافی غور نہین کیا جاتا ہندوستان مین انگریزی فتح کی ابتدا کمپنی اور کسی دیسی طاقت کی باہمی آویزش سے نہین ہوی بلکہ فرانسیسیون کی اُس خوفناک کوشش سے جو دکن پر

غلبہ حاصل کرنے کیلئے کی گئی۔ اُنھون نے حیدر آباد کی جانشینی کے معاملہ مین دخل انداز ہو کر کوشش کی کہ بمبئی اور مدراس سے انگریزون کا قدم اکھاڑ دین۔ مشرق مین ہماری پہلی بیش قدمی فرانسیسی حملہ کی مدافعت مین تھی۔ اس وقت سے ستر سال تک یعنی جب نپولین سے ہماری لڑائیان ختم ہوگئین، ہندوستان مین ہماری لڑائیان کم وبیش فرانسیسیون سے مدافعت کی شکل مین ہوتی رہین۔ اگرچہ یہ جنگین سلطنت انگلشیہ کے نام یا بوتے پر نہین ہوئین لیکن انجام کار انکی شکل ایک حد تک قومی جنگون کی ہوگئی۔ اور ان سے انگلینڈ کو نہایت گہری دلچسپی تھی۔ اسی لئے کمپنی کی فوج کو بڑی حد تک شاہی فوج سے مدد دی جاتی تھی اور ۱۷۸۵ء سے جب لارڈ کارنوالس ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہو کر ایک لائق مدبر کی حیثیت سے سیاسی اور فوجی معاملات کی نگہداشت کے لئے بھیجا گیا تو پارلیمنٹ مین کمپنی پر حملے، لارڈ کلائیو کے خلاف تحریک ملامت، ہسٹنگز کے خلاف تعزیری کارروائی، کمپنی کے معاملات سمجھانے کیلئے پے بہ پے کوششیں، جن سے ایک مرتبہ ۱۷۸۳ء مین انگلینڈ کی سیاسی دنیا مین ہلچل ہی مچ گئی تھی، اور اسی طرح کی دیگر کارروائیون نے ہماری ہندوستانی معرکہ آرائیون کو قومی جنگ کی شکل دیدی اور انھین وجوہ سے کمپنی کو بمنزلہ انگریزی قوم کے سمجھا جانے لگا۔ اس طریقہ سے کمپنی کو عملی طور پر یورپ کی ایک اول درجہ کی سلطنت کے اعتماد وشہرت سے تقویت پہونچ رہی تھی اگرچہ اس سلطنت نے کمپنی کی امداد ان لڑائیون مین قطعی نہین کی جنکی بدولت ہندوستان فتح ہوا۔

مہتم بالشان تاریخی واقعات کے لئے اکثر "حیرت انگیز" یا "عجیب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن جس آزادی کیساتھ انکا استعمال ہماری فتح ہندوستان کیلئے کیا جاتا ہے اُس آزادی کیساتھ کسی دوسرے واقعہ کیلئے نہین۔ ایک واقعہ حیرت انگیز یا عجیب ہو سکتا ہے لیکن یہ بالکل ضروری نہین ہے کہ اُسکی توجیہہ بھی دشوار ہو ہندوستان کی فتح اس معنی مین البتہ نہایت حیرت انگیز ہے کہ اسکی نظیر گذشتہ زمانہ مین نہین ملتی، اسلئے اسکی توقع اُن لوگون کو نہین تھی جنھون نے ڈیڑھ صدی تک ہندوستان مین کمپنی کے معاملات کا انصرام کیا۔ بلاشبہہ job charnock، josia child یا Pitt گورنر مدراس کو (جو لارڈ چیتھم کا دادا تھا) کبھی خواب مین بھی خیال نہ ہوا ہوگا کہ ایک دن ہم پیشوا اور خود مغل شہنشاہ کے اختیارات کو سلب کرلینگے۔ لیکن یہ واقعہ اس معنی مین بالکل حیرت انگیز نہین ہے کہ اسکے حقیقی اسباب کا دریافت کرنا مشکل ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد جب ہندوستان مین کوئی صاحب اختیار مرکزی حیثیت کا باقی نہین رہ گیا تھا جسکا جی چاہتا صاحب اختیار بن جاتا، جو چاہتا اپنی حکومت قائم کر بیٹھتا، اگر اسوقت ایک تجارتی کمپنی نے جسکے پاس کرایہ کی فوج رکھنے کیلئے کافی روپیہ تھا ان سورماؤن کا مقابلہ کیا اور اُنکو مغلوب کیا تو کون سا تعجب کا مقام ہے۔ خصوصاً اس صورت مین کہ اُسکے پاس یورپین باقاعدہ فوج اور سپہ سالار تھے، اسکی پشت پر انگلینڈ کی سلطنت کی قوت تھی اور اُسکے مشیر انگریز مدبر تھے۔

مین نے جو کچھ بیان کیا اسکا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کی فتح عام معنی مین فتح نہین تھی۔ اسلئے کہ یہ کسی سلطنت کا فعل نہین تھا، اسکو کسی سلطنت کی فوج یا روپیہ نے نہین حاصل کیا۔ مین نے یہ بات اس لئے ظاہر کردی ہے تاکہ اس بیان سے کہ انگلینڈ نے ہندوستان کو فتح کیا جو الجھن پیدا ہو وہ رفع ہوجائے۔ ہندوستان انگلینڈ سے ہزارون میل دور ہے، اسکی آبادی یورپ کے برابر ہے پھر بھی یہ فتح اس صورت مین ہوئی کہ انگلینڈ کوئی فوجی سلطنت نہین تھی اور نہ اس عظیم الشان فتح مین اُسنے کوئی تکلیف اور محنت برداشت کی نہ ایک پیسہ خرچ کیا۔ اس لئے اس کے معنے یہی ہون گے کہ انگلینڈ نے ہندوستان کو فتح کیا ہی نہین،

بلکہ یہ چند انگریزون کی خوش نصیبی تھی جو سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت حسن اتفاق سے ہندوستان مین سکونت پذیر تھے اور حیدر علی یا رنجیت سنگھ کی طرح عالی اقتدار ہو گئے۔

تاہم عملی نتیجہ کے لحاظ سے یہ واقعہ ہندوستان پر انگلینڈ کی فتح ہی ثابت ہوا۔ اسلئے کہ اب جب یہ تمام عمل مکمل ہو چکا ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی غائب ہو چکی ہے ہم دیکھتے ہین کہ ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند ہین اور ایک سکریٹری جو انگریزی کابینہ کا ممبر ہے اور انگریزی پارلیمنٹ مین بیٹھتا ہے ہندوستان کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہے انگلینڈ نے بحیثیت ایک سلطنت کے ہندوستان کو حاصل نہین کیا پھر بھی اب یہ اُسکے سر پڑ گیا ہے۔ یہ ایک مثال تھی اُس عام اصول توسیع کی جو اہل یورپ کے ان تمام بیرونی مقبوضات مین کار فرما رہا ہے جو کولمبس کے زمانہ سے برابر حاصل ہوتے رہے ہین اہل یورپ کتنے ہی دور دراز ممالک مین گھومتے، اُنکی کامیابی کتنی ہی حیرت انگیز اور عجیب ہوتی لیکن وہ کبھی یورپین شہریت کو ترک نہین کر سکتے تھے۔ کارٹیز (Cortez) اور پزارو (Pizarro) نے امریکہ کی ایک ایک ریاست کو اپنے قدمون سے روند ڈالا، جہان گئے بغیر سعی و محنت کے عالی اقتدار بن گئے، اگرچہ میکسکو مین وہ مونٹیزوما (Montezuma) کی حکومت کو ذرہ برابر خاطر مین نہین لائے۔ لیکن چارلس پنجم کی سیادت سے سرتابی کرنا تو کجا اسکا خیال تک کرنیکی جرأت نہ کر سکے۔ حالانکہ چارلس پنجم بحر اٹلانٹک کے اُس پار تھا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جو فتوحات وہ اپنی ذاتی شجاعت سے بلا امداد غیرے حاصل کرتے اسپین قدرتی طور پر انھین ضبط کر لیتا یہی حال انگریزون کا ہندوستان مین ہوا۔ ۱۷۶۵ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی سلطنت مغلیہ مین ایک نام نہاد علی عہدہ پر فائز تھی۔ لیکن انگریزی پارلیمنٹ دعویدار تھی کہ جو مقبوضات کمپنی حاصل کریگی وہ پارلیمنٹ کے ماتحت ہونگے۔ پارلیمنٹ کی بحثون مین مغل بادشاہون کا نام شاید ہی آتا تھا اور غالباً یہ سوال کبھی زیر بحث نہین آیا کہ آیا وہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے صوبون کا انتظام ایک غیر ملکی حکومت کے ہاتھ مین دینا پسند کرینگے۔ کمپنی بیک ساعت دو سلطنتون کا جزو تھی، ایک طرف تو شاہ انگلستان کے فرمان کی رو سے وہ کمپنی تھی اور دوسری طرف مغل بادشاہ کی ماتحت ایک دیوان۔ لیکن جس طرح کارٹیز نے مونٹزوما کو نیست و نابود کر دیا اُسی طرح کمپنی مذکور نے مغل شہنشاہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا، اور پھر چپ چاپ اپنے غیر محدود مقبوضات کو انگلینڈ کے سپرد کر دیا انجام کار جنگ پلاسی کے ایک صدی بعد کمپنی شکست ہو گئی اور خود بھی ہندوستان سے سلطنت انگلشیہ کے حق مین دست بردار ہو گئی۔

(باقی)

عبد القیوم رسا

شہاب کی سرگزشت

جناب نیاز فتحپوری کا وہ معرکۃ الآرا افسانہ جو سیرۃ نگاری، نفسیاتی تحلیل، بلندی خیال، زور تحریر، ندرت بیان، نزاکت تخئیل اور قوت انشا کے لحاظ سے ادب اردو مین ایک بالکل نئی اور نادر چیز ہے۔ اول بار اسکا مطالعہ انسان کو کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے، دوسری بار اسکا مطالعہ حقیقت سے قریب کر دیتا ہے، اور تیسری مرتبہ کے مطالعہ کے بعد انسان اسکے لذات مین بالکل غرق ہو جاتا ہے۔ اگر پسند نہ ہو تو مطالعہ کے بعد واپس کر دیجئے اور اپنی قیمت لیجئے
معہ محصول ڈاک (عہ) قیمت ملیگا۔

"مینیجر نگار" لکھنؤ

انارکسٹ

"اور یہ" ماہر جراثیم نے شیشہ کے ملے ہوئے ٹکڑون کو خردبین کے نیچے رکھتے ہوئے کہا "یہ مشہور و معروف مرض ہیضہ کے زہریلے جراثیم ہین، آپ سمجھے — کالرا کے جراثیم!!"

اجنبی خردبین مین بغور دیکھنے لگا، وہ یقیناً اس وضع کی باتون کا عادی نہین معلوم ہوتا تھا اسلئے کہ اُسنے بالکل گنوارونکی طرح دوسری آنکھ کو اپنے ہاتھ سے ڈھک لیا اور کہنے لگا ——— "کچھ یونہی سا دکھائی دے رہا ہے"

"اس پیچ کو گھماؤ" ماہر جراثیم نے کہا "غالباً خردبین تمھارے لئے صحیح فوکس پر نہین ہے، نگاہ مین بھی اختلاف ہوتا ہے، بس ——— ہان ...... ایک خفیف سی گردش، ادھر یا اُدھر ——— اب تو صاف نظر آتا ہے؟"

"ہان بیشک، اب صاف ہے" اجنبی نے کہا "کچھ زیادہ چیزین نہین ہین، پانچ سات چھوٹے چھوٹے گلابی اور نیلے دھاگے کے سے ٹکڑے، پناہ بخدا! اور یہی حقیر ٹکڑے، یہی بے وجود ذرات مجتمع ہو کر ایک مکمل شہر کو برباد کرتے ہین ——— کسقدر حیرت انگیز بات ہے!!"

وہ کھڑا ہو گیا اور شیشہ کے ٹکڑے کو خردبین کے نیچے سے نکالکر اپنے ہاتھ کو کھڑکی کی روشنی مین بڑھا دیا۔

"کچھ نظر نہین آتا" اُسنے شیشہ کو بغور دیکھتے ہوئے ذرا تامل سے کہا "کیا یہ زندہ ہین اور اب بھی خطرناک ہین؟"

"جی نہین، انھین تجربہ کیلئے ہلاک کر دیا گیا ہے۔ خدا کرے ہم اسی طرح دُنیا کے تمام جراثیم کو ہلاک کر سکتے!"

"میرے خیال مین تو شاید آپ اپنے گھر مین ایسی چیزین زندہ اور اصلی حالت مین بھی رکھنے کے عادی ہونگے اور مطلق خوف نہ کرتے ہونگے" اجنبی نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا۔

"بلکہ یون کہئے کہ ہم ایسا کرنے پر مجبور ہین، مثلاً یہان" وہ ایک الماری کی طرف بڑھا اور سربمہر نلکیون کی ایک قطار مین سے ایک نلکی اُٹھا کر کہنے لگا،

"یہ زندہ چیز موجود ہے، مرض کالرا کے اصلی زندہ اور متحرک جراثیم! ——— یعنی سرِ بند خطرناک مرض ہیضہ! کیا سمجھے؟"

"جی! ہیضہ!!" اجنبی نے جسم مین ایک کپکپی محسوس کرتے ہوئے نلکی کو دیکھ کر کہا "خدا کی پناہ، پروفیسر صاحب آپ نہایت خطرناک ہین!!"

ماہر جراثیم نے نووارد کے چہرہ کے تغیرات کو غور سے مطالعہ کیا، یہ شخص اُسکے ایک نہایت ہی گہرے دوست کا تعارفی رقعہ لیکر تجربہ گاہ دیکھنے کی غرض سے آیا تھا۔ اُسکی پھٹی پھٹی آنکھین، سیاہ اور بے ترتیب بال، گھبرائی ہوئی صورت، پریشان انداز، خود ساختہ حیرت، بناوٹی خوف — یہ وہ تمام باتین تھین جنکو ماہرِ جراثیم شبہ کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اُسکے دوست نے اجنبی کو سائنس کا محض مبتدی طالبعلم ظاہر کیا تھا۔

جس خوفناک موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی اُسکے لحاظ سے ہر اجنبی غیر معمولی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہین رہ سکتا تھا۔ مگر اجنبی کی

حیرت سے ایک قسم کا اطمینان ظاہر ہو رہا تھا اور یہی بات مشتبہ تھی۔

یکایک ماہر جراثیم نے نلکی کو اپنی نگاہوں کے سامنے کرتے ہوئے کہا ''بیشک! انسانی تباہی اور بربادی اس نلکی میں بند ہے۔ اس چھوٹی سی نلکی کو صرف شہر کے مرکزی آبیار میں توڑ دیجئے اور ان حقیر، غیر محسوس، زندہ جراثیم سے جو آلۂ خوردبین کی پوری قوت سے محض ذرات نظر آتے ہیں، اور جنھیں نہ شامہ محسوس کرتا ہے نہ ذائقہ، اتنا کہدیجئے ——— ''جاؤ، بڑھو، پھیلو، اور ہر پانی پر اپنی حکومت قائم کرلو''، ——— آپ دیکھینگے کہ موت، پُراسرار، نامعلوم موت!! نامحسوس، بلائے بےدرماں موت!! خونخوار کرب افزا موت!! تمام شہر پر مسلط ہو جائیگی، اور ہر ممکن ناممکن گوشہ تک اُسکی رسائی ہو جائیگی۔ کہیں وہ خاوند کو بیوی سے اور بچہ کو ماں سے جُدا کردیگی، کہیں مدبر کو اُسکے فرض سے اور مزدور کو اُسکے مصائب سے چھڑا دیگی۔ وہ پانی کے نلوں سے گذریگی، سڑکوں پر چھاپے ماریگی، گھروں میں بےتکان گھُس جائیگی اور ہر اُس شخص کی زندگی اُسکا ٹیکس ادا کریگی جو اُبلا ہوا پانی پینے کا عادی نہیں ہے۔ وہ کنوؤں میں پہونچ جائیگی، ترکاریوں میں سرایت کر جائیگی، اور برف میں منجمد ہو جائیگی

وہ مویشیوں کے حوضوں میں، پارک کے چشموں میں، جابجا صرف جاندار وں کے حلق تک پہونچنے کا انتظار کرتی ہوگی۔ بازمین میں جذب ہو کر صدہا ایسے چشموں اور کنوؤں میں نمودار ہو جائیگی، جہاں اسکی موجودگی کا کسی طرح قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا ———

غرض صرف ایک مرتبہ اُسے شہر کے آبیار تک پہونچا دیجئے، پھر قبل اسکے کہ دوبارہ اُسے گرفتار کیا جاسکے وہ اس دُنیا کے سب سے بڑے شہر کو آبادی سے بےنیاز کردیگی''۔

وہ یکایک رُک گیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی کہنے لگا ''لیکن یہاں یہ بالکل مقید ہے، قطعًا بےبس، عضوِ معطل، آپ سمجھے ——— ہم بالکل محفوظ ہیں''، اجنبی نے سر کی جنبش سے اقرار کیا، اُسکی آنکھوں میں ایک قسم کی چمک پیدا ہوئی۔ لیکن صرف کھانس کر رہ گیا۔

''یہ انارکسٹ، بدمعاش ——— بالکل بیوقوف ہیں، قطعًا اندھے ہیں جو اس قسم کی چیزیں موجود ہونیکے باوجود بم استعمال کرتے ہیں میرے خیال میں تو ....''

زنجیر چھونے کی ایک ہلکی سی جھنکار، اور دروازہ کھٹکنے کی ایک خفیف سی آواز کمرے کے مشرقی گوشہ میں پیدا ہوئی، ماہر جراثیم نے پلٹ کر دیکھا

''صرف ایک منٹ کیلئے ہو جاؤ!!''، اسکی نوعمر بیوی نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

جب وہ دوبارہ اپنی تجربہ گاہ میں داخل ہوا تو اجنبی اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔

''معاف کیجئے گا، مجھے مطلق خیال نہ رہا اور میں نے آپکا ایک گھنٹہ ضائع کر دیا۔ چار بجنے میں صرف بارہ منٹ باقی ہیں۔ مجھے ساڑھے تین بجے روانہ ہو جانا چاہئے تھا، لیکن آپکے دلچسپ لیکچر میں محو ہو گیا، اب اجازت دیجئے، وقت میں بالکل گنجائش نہیں ہے، مجھے چار بجے ایک دوست سے ملنا ضروری ہے''۔

اجنبی شکریہ ادا کرتا ہوا کمرے سے گذر گیا، ماہر جراثیم دروازہ تک اُسے پہونچا کر خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں واپس آگیا، وہ اپنے ذہن میں نو وارد کی ظاہری شکل و شباہت پر تبصرہ کر رہا تھا۔

"عجیب آدمی تھا" اُسنے زیرلب کہا "یقیناً خطرناک! وہ زہریلے جراثیم کا بیان کتنی دلچسپی سے سُن رہا تھا اور شیشی کو کیسی للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا" کسی بیچین خیال کے ماتحت وہ یکایک اُٹھا۔ وہ کش کے پاس بنچ پر جھک کر کچھ دیکھا، تیزی سے جھپٹ کر اپنی میز پر کچھ ڈھونڈا، جیبون مین ہاتھ ڈال کچھ ٹٹولا اور بھاگ کر دروازہ پر آگیا۔

"غالباً مینے اُسے بڑے کمرے کی میز پر رکھ دیا ہے" اُسنے ذرا اونچی آواز سے کہا "منّی!" ——— "جی!" کہین دور سے ایک زنانی آواز آئی۔

"مین ابھی جب تمسے بات کرنے آیا تھا، تمنے میرے ہاتھ مین کوئی چیز تو نہین دیکھی سچ بتادو پیاری منّی! جلدی بتادو!!"

"کچھ نہین، پیارے جان! خیریت تو ہے؟"

"تباہی! بربادی!!" ماہر جراثیم نے کہا اور بدحواسی کے ساتھ دروازہ کی طرف دوڑا، ایک لمحہ بعد وہ شارع عام پر تھا منّی نے دروازہ کھلنے کی آواز سُنی اور کسی نامعلوم خطرے کے خیال سے بھاگ کر کھڑکی مین سے جھانکنے لگی۔ سڑک پر ایک نحیف الجثہ، بدوضع سا آدمی ایک کرایہ کی گاڑی مین سوار ہو رہا تھا اُسکا خاوند، ننگے سر، سلیپر پہنے ہوئے مجمع کو چیرتا ہوا بدحواسی سے گاڑی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ ایک سلیپر اُسکے پیر سے نکل کر سڑک پر رہ گئی تھی مگر اُسے مطلق پرواہ نہ تھی۔

"خداوندا! یہ دیوانہ تو نہین ہوگیا ہے، سائنس نے اُسکا دماغ تو خراب نہین کر دیا ہے" منّی دل ہی دلمین کہہ رہی تھی۔

وہ کھڑکی کھول کر اُسے پکارنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ اجنبی نے اپنے چارون طرف نگاہ ڈالی، اور بالکل اُسی قسم کی دماغی خرابی کا اثر اُسکی صورت سے ظاہر ہونے لگا جسمین اُسکا خاوند مبتلا معلوم ہوتا تھا۔ اُسنے ایک لایعنی سا اشارہ ماہر جراثیم کی طرف کیا اور گاڑی والے کے کان مین کچھ کہا۔ گاڑی کا دروازہ بند ہوا چابک مارنے کی مسلسل آواز سُنائی دی، گھوڑے کی ٹاپ سڑک پر گونجی اور ایک لمحہ بھر مین گاڑی آگے آگے اور ماہر جراثیم دیوانون کی طرح ننگے سر ننگے پاؤن پیچھے پیچھے دوڑتے ہوئے سڑک پر دکھائی دیئے اور موڑ پر پہونچکر دونون نگاہ سے غائب ہوگئے ———

منّی تقریباً ایک منٹ تک کھڑکی سے جھانکتی رہی اور پھر کمرے مین واپس آگئی وہ بیحد متحیر تھی۔

"جان حد سے زیادہ مذاق پسند ہے!" اُسنے دل ہی دلمین سوچا "مگر اس زمانہ مین، دن دھاڑے ایک شریف آدمی کا ننگے سر ننگے پاؤن لندن کی شارع عام پر دوڑ لگانا! کتنی شرمناک حرکت ہے!؟"

ایک روشن خیال اُسکے دماغ سے گذرا! اُسنے تیزی سے اپنی ٹوپی اوڑھی، خاوند کے جوتے لئے، ہال مین آئی اور کھونٹیون پر سے اُسکا ہیٹ اور کوٹ اُتارا، دروازہ پر پہونچی اور ایک گاڑی کو جو خالی سڑک پر سے گذر رہی تھی کرایہ کر لیا۔

"سیدھے سامنے والے راستہ پر چلو وہان سے ہیولاک کریسنٹ پر موڑ لو اور راستہ مین ایسے شخص پر نگاہ رکھو جو ہاف کوٹ پہنے ہوئے ننگے سر ننگے پیر بھاگ رہا ہو!"

"ہاف کوٹ پہنے ہوئے ننگے سر ننگے پیر؟ - بہتر ہے معزز خاتون! ابھی لو" یہ کہکر کوچبان نے گھوڑے کو چابک لگایا اور کچھ اس اطمینان سے گاڑی بڑھائی گویا تمام زندگی اسی پتہ پر گاڑی ہانکنے مین بسر ہوئی ہے۔ چند منٹ بعد تانگہ والون اور آوارہ لوگون کے ایک مجمع نے جو ہیورسٹاک ہل کے

اڈے پر جمع رہتے ہین بڑے تعجب سے ایک گاڑی کو گذرتے دیکھا جسکی طوفانی رفتار میونسپلٹی کے قانون سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی

جب تک گاڑی گذری سب خاموش رہے، اُسکے بعد ایک بیفکرے نے کہا ”ابے یار دیکھا تمنے ہکو کو اکس شان سے ہانک رہا تھا“

”وہ تڑاتڑ چابک مار رہا ہے مرا یار، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مڑ گیا!“ دوسرے نے کہا ”اور لو ایک اور پاگل آرہا ہے! —— یہ اُس سے بھی تیز ہے“ تیسرے نے کہا ”ارے —— یہ تو چچا جان رج ہیں، تو نے ٹھیک کہا یار، یہ ضرور کسی کو پاگل خانہ لئے جارہا ہے!“ چوتھے نے کہا۔

”میرے خیال مین تو یہ ہکو کا پیچھا کر رہا ہے“ پہلے نے کہا

یہ خیال آتے ہی اڈے کے تمام تانگے والے بے ترتیبی سے چلانے لگے۔

”سرپٹ چھوڑدے ہکو“ —— ”بھاگ چچا، بھاگ!!“ ”گردن پہ مار گردن پہ!!“ —— ”آخ اسی دوڑ پہ فیصلہ ہے!“ —— ”دیکھو رہ گیا ہے تھوڑی سی دور!!“

”یہ لو اور آمد!!“ ایک نے پیچھے مڑ کر کہا

”سمجھ مین نہین آتا یار، آخ کیا ہیمسٹیڈ مین سارے گاڑی والے پاگل ہوگئے ہین یا انکی کوئی شرط ہوئی ہے؟“ دوسرا بولا

”ابکی دفعہ سبزے والے کی باری ہے“ تیسرا بولا

”اسمین تو کوئی عورت ہے! —— ہان ہم سمجھ گئے اگلا آدمی بہت خوش قسمت ہے اور اسکے ہاتھ مین یہ کیا ہے یار؟“

پانچوان بولا

بھگوڑے عاشق کی ٹوپی!“ پہلے نے جواب دیا

”کتنی شوخ تیزی ہے!! —— چچا جان رج سی تو ٹھیک ایک اور تین کی نسبت ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا —— ہاہاہا!!“

منی جسوقت اس مجمع کے پاس سے گذری تو متفقہ طور پر اُسکے گھوڑے کو سراہا گیا اور عام طور پر تالیان بجائی گئین۔ اُسے بہت ناگوار گذرا لیکن اپنے فرض سے مجبور تھی۔ وہ ایک طوفانی رفتار سے ہیورسٹاک ہل، سی۔ ٹی، ہائی اسٹریٹ وغیرہ سے گذر گئی۔ اُس کی آنکھین بوڑھے جارج کی پشت پر لگی ہوئی تھین جو اُسکے خاوند کو اپنی صبا رفتار گاڑی مین اُڑائے لئے جارہا تھا

سب سے اگلی گاڑی مین جو شخص بیٹھا تھا وہی سب سے زیادہ مضطرب نظر آرہا تھا۔ اُسکے دونون ہاتھون کی مٹھیان بند تھین جنمین سے ایک کے اندر جراثیم کی تباہ کن نلکی تھی۔ اُسکے چہرہ پر خوف اور پریشانی کی علامتین نمودار تھین بالخصوص وہ اسوجہ سے زیادہ پریشان تھا کہ اپنا کام کرنے سے پہلے کہین گرفتار نہ ہوجائے۔ اسی پریشانی کے ساتھ اُسے خوف بھی تھا اور وہ صرف اپنے سنگین، وحشیانہ اور ہولناک جرم کے خیال سے۔

”کوئی انارکسٹ مجھ سے قبل اس عجیب و غریب طریقہ کار کو معلوم نہین کر سکا کسی کے سر ایسی شاندار فتح کا سہرا نہین بندھ سکا“ وہ اپنے ذہن مین سوچ رہا تھا ”اوکل، ویلائنیٹ اور تمام مشہور و معروف ہستیان جو انارکی مین شہرۂ آفاق ہو چکی ہین اُسکی نگاہون مین حقیر معلوم ہوتی تھین، صرف شہر کے مرکزی آب بار کو معلوم کرنا اور اُسمین شیشہ کی نلکی کو توڑنا شرط تھا، پھر کیا تھا، پھر تو وہ تمام نراجیون کا متفقہ بادشاہ تھا۔

اُسنے جس ذہانت کے ساتھ سازش کو مرتب کیا تھا وہ یقیناً قابلِ داد تھی۔

تعارف کیلئے جعلی خط بنانا، تجربہ گاہ مین داخل ہونا، ماہر جراثیم کو دھوکہ مین ڈالنا، اور معہ نلکی کے تجربہ گاہ سے نکل آنا:۔

"اب دُنیا یقیناً میرا نام سنیگی" اُسنے ایک کامیابی کی سانس لیتے ہوئے کہا "یہ تمام لوگ جو مجھسے نفرت کرتے رہے ہین، مجھے پس پشت ڈالتے رہے ہین، دوسرون کو ترجیح دیتے رہے ہین، میری محبت کو بار سمجھتے رہے ہین، بالآخر میری اہمیت کا اندازہ کرینگے، موت! موت!! صرف موت!!! ---- اُنھون نے ہمیشہ مجھے فضول اور بیکار آدمی سمجھا ہے، تمام دُنیا مجھے پس پشت ڈالنے کے لئے ساز باز کر رہی تھی۔ اب مین بتادونگا کہ ایک شخص کو تنہا چھوڑ دینا، اُسکی قدر نہ کرنا کیا مصیبت لا سکتا ہے!!"

"یہ کونسی سڑک ہے؟ ---- سینٹ اینڈریو...... بیشک! دوڑ کا کیا نتیجہ رہا؟" اُسنے کھڑکی سے سر نکالکر پشت کی طرف دیکھا، ماہر جراثیم مشکل سے پچاس گز پیچھے تھا۔ "یہ بُرا ہوا، افسوس! اب مین پکڑا جاؤنگا اور ساری اُمیدون پر پانی پھر جائیگا" اُسنے اپنی جیب ٹٹولی اور نصف گنی کا ایک سکہ نکالکر ڈرائیور کی مٹھی مین دیدیا۔ "اور انعام ملیگا۔ بھگائے چلو اور صرف پہلی گاڑی کے گھوڑے کو تھکا دو!!" اُسنے چلا کر کہا

"بہت اچھا حضور!" ڈرائیور نے گنی کو جیب مین ڈالتے ہوئے دو تین چابک لگائے

کھڑکی کا کھلا ہوا کواڑ کسی چیز سے ٹکرایا، گاڑی ڈگمگائی اور انارکسٹ نے تختہ پکڑنے کے لئے بیساختہ وہ ہاتھ بڑھا دیا جس مین جراثیم کی نلکی تھی۔

نلکی ٹوٹ گئی، شیشی کا آدھا حصہ گاڑی کے تختون پر اُسکے پیر کے برابر آ گیا۔ انارکسٹ کے مُنہ سے بیساختہ آہ نکلی اور اپنی جگہ پر ساکت رہ گیا، اب وہ ایک ایسی مایوسانہ نگاہ سے جسمین بے بسی جھلک رہی ہو سیال مادہ کے اُن دو تین قطرون کو جو گاڑی کے تختہ پر بکھر گئے تھے دیکھ رہا تھا۔

"خیر!" کچھ دیر بعد اُسنے کانپتے ہوئے کہا "پہلا شکار مین ہی سہی! کچھ پرواہ نہین، بہرحال شہید ہونا بھی ایک عزت ہے، تاہم.......

...... یہ نہایت ہی بے موقعہ موت رہی، خدا معلوم یہ چیز اسی قدر مہلک ہے یا نہین جسقدر بتلایا جاتا ہے"

اُسے ایک فوری خیال آیا اور اپنے پیرون کے درمیان کوئی چیز ٹٹولنے لگا، ایک چھوٹا سا قطرہ اب بھی ٹوٹی ہوئی نلکی مین باقی تھا وہ اُسے بلا تامل پی گیا "اب جسقدر میری موت یقینی ہے اُس قدر جراثیم کا پھیلنا بھی لازمی ہے" اُسنے دل ہی دلمین کہا اور ماہر جراثیم کا خیال آیا جس سے بچنا از اندازِ ضرورت معلوم ہوتا تھا، چنانچہ دنگٹن اسٹریٹ مین اُسنے ڈرائیور سے گاڑی رکوالی اور اُتر پڑا

زمین پر اُسکا پیر پڑتے ہوئے ڈگمگا رہا تھا اور سر چکرایا جاتا تھا۔ اُسنے گاڑی والے کو رخصت کردیا اور سینہ پر دونون ہاتھ رکھ کر ماہر جراثیم کے انتظار مین سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ اُسکے چہرے سے جلال اور آنکھون سے شاہانہ رُعب ٹپک رہا تھا، فوری موت کے خیال نے اُسے ہر نوع شاندار بنا دیا تھا۔

"زندہ باد - مزاج!!"

''دوست تمہاری آمد بعد از وقت ہے میں اُسے پی گیا ——— ہیضہ پھیل چکا ہے!'' ماہر جراثیم نے اپنا چشمہ درست کر کے تعجب سے اُسے دیکھا ——— ''پی گئے!

اچھا کیا۔ تم انارکسٹ تھے، مجھے اب معلوم ہوا'' ...... ''وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر کہتے کہتے رک گیا اور تبسم اُسکے ہونٹوں کے نقطۂ اتصال پر کھیلنے لگا اُسنے اپنی گاڑی کا دروازہ اُترنے کے لئے کھولنا چاہا مگر انارکسٹ نے ڈراما کے مخصوص انداز میں اشارے سے ''الوداع'' کہا اور پشت پھیر کر آہستہ آہستہ واٹرلو برج کی طرف چل دیا۔ مرض پھیلانے کیلئے وہ اپنا جسم سڑک سے گذرنیوالے ہر آدمی سے قصداً مس کرتا ہوا جا رہا تھا

ماہر جراثیم اُسکے خیال میں اس قدر منہمک تھا کہ مِنّی کے یکایک سامنے آجانے پر اُسنے مطلق اظہار تعجب نہ کیا وہ پیار کے لہجہ میں اُس سے کہنے لگا

''پیاری مِنّی تمنے بہت اچھا کیا کہ میرے جوتے اور ٹوپی لیتی آئیں'' اور بدستور انارکسٹ کو دور سڑک پر جاتے ہوئے دیکھتا رہا

''تم بیٹھ جاؤ!'' اُسنے اُسی طرح سڑک کی طرف تکتے ہوئے کہا مِنّی کو اب یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اُسکا خاوند حواس خمسہ کھو چکا ہے چنانچہ اُسنے گاڑی میں بیٹھ کر مایوسی کے لہجہ میں ڈرائیور کو گاڑی ہانکنے کا حکم دیا۔

''میرے جوتے؟ پیاری مِنّی!'' پروفیسر نے اپنی بیوی سے دریافت کیا گاڑی مُڑ گئی اور دُور سڑک پر سیاہ چیز جو رفتہ رفتہ آدمیوں کے ہجوم میں غائب ہوتی جا رہی تھی گھوڑے کی آڑ میں آگئی ——— پروفیسر بے ساختہ قہقہے لگانے لگا۔

''یہ ایک ہی ہوئی ——— حالانکہ ...... !''

''مِنّی تمہیں معلوم ہے کیا ہوا؟ سُنو! یہ آدمی آج تیسرے پہر مجھ سے ملنے کیلئے آیا، جانتی ہو کون ہے؟ انارکسٹ! ...... چیخنے چلانے کا کام نہیں، خاموشی سے سُنے جاؤ! ورنہ اسطرح میں باقی ماندہ قصہ نہیں کہہ سکتا ...... سمجھ گئیں۔ میں اُسے متحیر کرنا چاہتا تھا، یا یوں کہو کہ بیوقوف بنانا چاہتا تھا، مگر مجھے مطلق علم نہ تھا کہ یہ انارکسٹ ہے۔ بالکل اطمینان سے میںنے جراثیم کی وہ نلکی اُسے دکھائی جس کے بارے میں میںنے تمسے تذکرہ کیا تھا کہ بندروں کے جسم پر نیلے دھبّے ڈال دیتی ہے اور وہ آپس میں خوب لڑتے ہیں مگر میںنے اُسے بالکل بیوقوف بناتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ اس میں ایشیائی ہیضہ کے زندہ جراثیم بند ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُسے لیکر لندن کے تمام پانی میں زہر ملانے کی غرض سے بھاگ گیا میںنے اُسکا پیچھا اس لئے کیا کہ اس میں دو تین اجزا نہایت کمیاب ہیں اور تیل کے ساتھ ملکر انتہائی زہریلے جراثیم بنا دیتے ہیں۔ بہرحال وہ اُس مادہ کو پانی میں ملا کر کم از کم اس مہذب شہر کی تمام زندہ چیزوں کو نیلا ضرور بنا دیتا۔ مگر اچھا ہوا کہ وہ خود ہی اُسے پی گیا معلوم نہیں اب کیا ہوگا۔ لیکن تمہیں یاد ہے اس سے وہ کُتیا نیلی ہو گئی تھی، اُسکے بچوں پر نیلے داغ پڑ گئے تھے اور چڑیا کے گہرے آسمانی پر نکل آئے تھے۔ یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ مشکل یہ ہے کہ اب مجھے دوبارہ اسے تیار کرنے کی زحمت اُٹھانی پڑیگی۔

اور ہاں، تم یہ گرم کوٹ کیوں لائی ہو؟ کیا میں اسے پہنوں؟ ——— کیوں؟ اسلئے کہ راستہ میں مسز جیبر نہ مل جائیں ——— پیاری مِنّی! مسز جیبر ایسی نہیں ہیں لیکن پھر بھی کیا مجھے مسز جیبر کے ڈر سے کوٹ پہننا ——— اچھا لو ......''

(ایچ۔جی۔ویلس)

طالب باغپتی

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

(بہ سلسلۂ سابق)

ڈاکٹر ابر کرامبی[1] اور اسکے نظریات خواب

عالم رویا مین دماغی کیفیت کو دو مفصلۂ ذیل حصون مین تقسیم کرسکتے ہین،

(۱) وہ خیالات جو دماغ مین ظاہر ہوتے ہین، اپنے وجود حقیقی ہونے کا یقین دلاتے ہین، اور عالم بیداری کی طرح جب ہملوگ اپنے خیال کو اشیائے موجود فی الخارج سے مقابلہ کرتے ہین تو یہ یقین صحیح نہین ہوتا،

اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم رویا مین جو صورتین ظاہر ہوتی ہین وہ حقیقی معلوم ہوتی ہین، مثلاً خواب مین ہملوگ کوہ و دشت، چٹیل میدان، سر بفلک عمارات، اور بڑے بڑے سمندر دیکھتے ہین، تو معلوم ہوتا ہے، انکا وجود حقیقی ہے خیالی نہین، جسطرح بیداری مین کوئی منظر وجود حقیقی کا احساس پیدا کرتا ہے، خواب مین بھی یہی ایقانی کیفیت ہوتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ عالم بیداری مین ہملوگ جب اپنے خیال کو ان مناظر سے مقابل کرتے ہین، تو انہین موجود فی الخارج پاتے ہین اور عالم رویا مین جو مناظر ہمارے پیش نظر ہوتے ہین انہین صرف ذہن ہی سے تعلق رہتا ہے، خارج عن الذہن ان کا وجود نہین پایا جاتا

(۲) خیالات اور تصورات ایک ایسے قانون ائتلاف کے ماتحت دماغ مین مربوط ہو جاتے ہین، جس پر انسانی تصرف نہین ہوتا ہملوگ خیالات اور تصورات کے سلسلہ مین تغیر نہین کرسکتے، اور نہ انہین اپنے ارادہ سے وقفہ دیسکتے ہین،

قانون ائتلاف (ASSOCIATION) فلسفہ کی ایک اصطلاح ہے، ڈاکٹر صاحب کے قانون کی تفصیل یہ ہے کہ خیالات اور تصورات مستلزم ہوتے ہین یعنی جب ایک خیال پیدا ہوتا ہے، تو اسی قسم کا دوسرا خیال پیدا ہو جاتا ہے، اکثر حفاظ کو دیکھا ہوگا جہان پڑھتے پڑھتے رک گئے پھر وہان سے نہین بڑھتے، اور جہان بتا یا گیا (خواہ وہ ایک ہی لفظ ہو) پھر سلسلہ شروع ہو گیا، یہ اسی قانون کا نتیجہ ہے، ڈاکٹر موصوف کہتے ہین کہ جس طرح کسی خیال کے عناصر پر انکے باہم مربوط ہوتے وقت عالم بیداری مین ہمارا تصرف رہتا ہے، ویسا عالم رویا مین نہین، مثال کے طور پر جذبہ شہوت کو لے لیجئے، خیالات شہوانیہ کے اندر جب مرابطہ پیدا ہونے لگے، تو عالم بیداری مین ہملوگ مذہب اور ہیئت اجتماعی کے خوف سے ان عناصر خیال کو باہم مربوط ہی نہ ہونے دینگے، اور بالفرض یہ خیال ہوا بھی تو اسے عملی جامہ نہین پہنا سکتے اسکے برخلاف

---

[1] ڈاکٹر ابر کرامبی انگلستان کا ایک مشہور عالم گذرا ہے اسنے ایک کتاب لکھی جو ایک ہی جلد مین دو حصون کے اندر پائی جاتی ہے، اسکا نام "قوائے عقلیہ، و احساسات اخلاقیہ" ہے پہلے حصہ مین ایک سکشن کے اندر اسنے خواب کے متعلق مبسوط مباحث کئے ہین، سنہ ۱۹۲۵ء مین خاکسار نے اسکا ترجمہ کیا تھا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب مین تعلیم سے فارغ ہی ہوا تھا اور نظر ثانی نہ کرسکتا تھا اب مین نے پھر اس کو دیکھا اور ضروری حذف و اضافہ کے بعد اس بحث کے سلسلہ مین پیش کر رہا ہون ۱۲

عالم رویا میں ان عناصر کے باہم مربوط، اور منتظم ہو کر عملی صورت اختیار کر لینے پر ہمارا دست تصرف نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے زہاد و صوفیا، علما اور صلحا خواب کے اندر ایسے مناظر سے مقابل ہوتے ہیں، جنکے متعلق عالم بیداری میں انہیں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، عالم بیداری میں ہرگز ایسا فعل ان سے سرزد نہ ہوتا، جو عالم رویا میں ان سے ہو جاتا ہے اسکی توجیہہ ڈاکٹر صاحب کے اس قانون سے ہوتی ہے

ڈاکٹر موصوف نے تکوین خواب کی چار علتیں قرار دی ہیں اور ہر ایک کے ضمن میں انہوں نے تاریخی اور ذاتی تجربات درج کئے ہیں، یہاں پر تفصیلات کی توگنجایش نہیں لہذا، ڈاکٹر صاحب کے صرف چار دن عنوان بیان کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے، موقعہ ہوا تو خواب کے متعلق عضویات اور نفسیات کی حیثیت سے بحث کیجاویگی اور ڈاکٹر ابر کرامبی کی تمام تفصیلات پیش کیجاوینگی۔

(۱) جدید حادثات، اور جدید دماغی جذبات سے جو باہم مخلوط ہو کر ایک مسلسل سلسلہ میں مربوط ہو جاتے ہیں یا قدیم و جدید واقعات، کی مخالطت سے کسی احساس کے ذریعہ سے جو انہیں سے ہر ایک کیساتھ کم و بیش متحد رہتا ہے گو دوسری حیثیت سے ان جدید حادثات و دماغی جذبات یا جدید و قدیم واقعات کی کڑی باہم ملی نہو، اور انمیں انتشار و تشتت ہو، ایک خواب کی تکوین ہوتی ہے

(۲) تصورات کے وہ سلسلے جنھیں تاثرات جسمی کے باعث قانون ایتلاف وجود میں لاتا ہے۔

(۳) انسان بعض ایسے خواب دیکھتا ہے جنمیں ان معاملات یا اشیا کے متعلق جو دماغ سے غائب یا فراموش ہو گئے ہیں قدیم ایتلافات کی معاودت ہوتی ہے

ڈاکٹر صاحب اس کلیہ کے متعلق لکھتے ہیں، کہ ایسے خواب کی علت دریافت کرنا ناممکن ہے، اور انمیں بعض ایسے ہیں، جنھیں ان کلیات میں سے جن سے فی الحال ہم لوگ واقف ہیں کسی کلیہ کے ماتحت نہیں رکھ سکتے

(۴) عادات کا میلان (یا شوق) یا ایک دماغی جذبہ خواب کی شکل میں متشکّل ہو جاتا ہے، اور وہ کسی فطری واقعہ کی بدولت عملی صورت اختیار کر لیتا ہے

خواب کے متعلق جدید تجربات

میرے ایک نہایت ہی مخلص دوست ہیں جنکی روایت میرے خیال میں ایسی ہے جسطرح میرے نزدیک خود اپنی روایت، وہ اکثر خواب دیکھا کرتے ہیں، جنھیں انھوں نے اپنے سوانح زندگی میں جستہ جستہ نقل بھی کر دیا ہے، گو انکی موجودہ زندگی نے ایک دنیا دارانہ صورت اختیار کر لی ہے، لیکن اپنی ابتدائی زندگی کا خواب جب وہ مجھ سے بیان کرنے لگے، تو میں نہایت متاثر ہوا، چونکہ میں انکی ابتدائی زندگی سے واقف ہوں اسلئے وہ میرے نزدیک ایک ثقہ راوی ہیں، پہلے وہ ایک غریب طالب العلم تھے، خموشی، اور کنارہ کشی انھیں زیادہ محبوب تھی، تلاوت قرآن اور نماز انکا مشغلہ عزلت تھا، وہ کہتے تھے کہ حیات کے اس دور میں برابر یہی خواب دیکھا کرتا تھا، کہ مسجد یا کسی دوسری جگہ پر قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہوں، اور بعض آیات پر فرط رقت میں زار زار رو رہا ہوں اور اسی حالت میں میری نیند کھل جاتی تھی، خواب کے اندر فارسی کے بعض اشعار پڑھتے پڑھتے، جنمیں ترک دنیا بے ثباتی عالم، حب الٰہی اور درد و محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں، ان پر اکثر وجد انگیز کیفیات طاری ہو جاتی تھیں اور روتے روتے انکی نیند کھل جاتی تھی ایکدن خواب میں انھوں نے دیکھا کہ ایک سائبان میں صف باندھے، دس بارہ اشخاص بیٹھے ہیں، انکی وضع قطع بالکل صوفیانہ تھی، نیچا جبہ، عمامہ،

لانبی واڑھی، مقدس اور بارعب چہرہ دیکھکر میرے دوست پر نہایت کیفیت طاری ہوئی، اور وہ ایک بزرگ کے نزدیک جو دائین جانب شروع صف مین تشریف فرما تھے پہونچکر اظہار عقیدت کے جذبہ بے اختیار مین، انکا دست مبارک چومنے لگے، انھون نے میرے دوست کی گردن جھکائی اور انکی پشت پر ہات پھیر کر فرمایا "یہ خوب پڑھیگا" میرے دوست ایک غریب اور ناپرسان حال انسان تھے علوم وفنون سے انھین چندان دلچسپی نہ تھی، لیکن انکی بعد کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھون نے یقیناً یہ خواب دیکھا ہوگا، اور وہ بزرگ ایک "سروش غیبی" تھے، میرے دوست نے اپنے سوانح زندگی مین ایک اور پر لطف خواب لکھا ہے، جسے مین انھین کے الفاظ مین لکھدیتا ہون،

ابا کا خط

۱۹ اکتوبر ۱۹۲۵ء دوشنبہ

ابا آج سے چودہ سال بیشتر راحت ابدی کی نیند سو چکے دنیا کے کس پردہ مین ڈھونڈھنے سے بھی آپکا پتہ نہین مل سکتا، ہان آپکی مقدس اور خدا پرست صورت نے اتفاقاً خواب مین آکر دلکو البتہ مغموم و پریشان کیا ہے، ۱۹ اکتوبر کو بوقت شب آخر مین نے والد ماجد کا ایک خط پایا، اس خط کی نوعیت اور تحریر عجیب دلکش تھی، مضمون سے لاڈ و پیار اور شوق ملاقات مترشح تھا، نیند کھلی تو خط کا مضمون مینے یاد کرلیا، یہ خط کا خلاصہ نہین بلکہ حقیقی الفاظ ہین جو نظام غیبی کے ماتحت میرے محبوب اور چہیتے والد مرحوم کے قلم سے نکلکر عالم رویا مین مجھ تک پہونچے، مینے دیکھا......... مسجد کے نزدیک چوک پر مین کھڑا ہون، دفعتہً ڈاکیہ نے ایک خط لاکر دیا، یہ پوسٹ کارڈ تھا اسکے ساتھ ایک زرد رنگ کا پرچہ چسپان تھا جو اکثر رجسٹری شدہ خطوط مین رہا کرتا ہے۔

مضمون خط

"......... کے دو مضامین مجھے موصول ہوئے جن سے علم و ہنر ٹپکتا ہے......... میرا لڑکا ہے جسکی خبر (۱۱ جسکا مفہوم میرے ذہن مین اسوقت یہ آیا ۱۹۱۷ء اور طرز مضمون سے یہی معلوم ہوتا تھا صرف کتابت کی غلطی تھی) کے بعد سے مجھے کچھ معلوم نہین جب سے مینے مضامین پائے ہین، کھانا پینا گانا بجانا ملنا جلنا سب ترک ہوگیا ہے"

باپ کی محبت اور انکے خط کے مطالعہ نے مجھے کچھ ایسا وارفتہ اور غریق بحر فنا بنادیا، کہ مین ہمہ تن چشم بنکر خط کا مرقومہ بالا مضمون پڑھتا رہا نیند کھلی تو ایک پژمردگی اور یاس کا عالم تھا، والد کے فراق کا غم تازہ ہوگیا اور اس سن و سال مین بھی آنسو ٹپک پڑے۔

میرے دوست ایک اور خواب کا تذکرہ کر رہے تھے جو بالکل امام غزالی کے رویائے آگہی سے ملتا ہوا ہے، چونکہ میرا قلب اس قسم کے احساسات کے سمجھنے سے عاری ہے، اسلئے مین اسکی صحیح اہمیت ذہن نشین نہین کر سکتا لیکن ایک ثقہ راوی کی روایت نظر انداز کرنے کو جی نہین چاہتا، وہ کہتے تھے ایک دن مین سفر مین تھا، مغرب کی نماز مین کچھ دیر ہوگئی ایک مسجد مین جاکر فوراً نماز پڑھی، انھین قرآن مجید کا کچھ حصہ بانی یاد تھا، مغرب کی نماز سے فارغ ہونیکے بعد وہ وہین بیٹھ رہے، اور سورۂ جن سے لیکر ۲۹ پارہ کے اخیر تک زبانی تلاوت کی، اور عشا کی نماز پڑھکر اپنی منزل پر لوٹ آئے وہ اپنے بال بچون سے ملنے جارہے تھے، لہذا دل کسی اور شوق کا گرفتار تھا، لیکن تعجب ہے کہ انہون نے خواب مین دیکھا کہ مین وطن کی ایک سڑک پر ہون جسکے ادھر ادھر شیشم کے بڑے بڑے درخت ہین ایسا سمان بندھا ہوا ہے، جیسے موسم بہار مین بدلی چھائی ہو، اور

بوندین گرنے ہی کو ہون، ایسے سنسان، مگر دلکش مقام مین عالم پر کامل سکوت طاری تھا نہ وہان کسی انسان کا گذر تھا، نہ کوئی آواز سنائی دیتی تھی اسوقت انھون نے دیکھا کہ مین راماین کے لہجہ مین ہندی کی ایک غزل پڑھ رہا ہون، (حالانکہ وہ ہندی غزلیات سے واقف نہین) انکی آواز مین نہ معلوم اسوقت کہان سے ایسا سوز وگداز پیدا ہو گیا تھا، کہ وہ خود حیران تھے معلوم ہوتا تھا ترنم کی دلکشی نے اور لہجہ کا پر درد سوز انکے بازؤن مین پر لگا دینگے اور وہ اڑکر عالم بالا مین پہونچ جاوینگے، انکی آنکھون کے سامنے سے معلوم ہوتا تھا پردے اُٹھ رہے ہین اور گویا انکے سامنے تو ایس الٰہیہ کے جلوے موجود ہین، ہرچند اس جلوہ گاہ مین انھون نے، نہ کوئی صورت دیکھی نہ کوئی آواز سنی، لیکن انکے وجدان کو یہ احساس ہوا، کہ گویا انکے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہین

امام غزالی اور انکی صوفیانہ زندگی

۱۰۹۵ء سے امام غزالی کے عہد تصوف کی ابتدا ہوتی ہے، اسکے بعد آپکی زندگی کا کچھ حصہ تو ایک صوفی کی طرح بادیہ پیمائی مین گذرا، اور کچھ صوفیانہ عقاید کی تعلیم و تلقین مین، آپنے ۱۱۱۱ء مین وفات پائی، اور اپنے تمام تجربات صوفیانہ آپنے خود اپنی زندگی مین قلم بند کئے ہین، جو عربی مین اپنی لطافت اور کمال اظہار کے اعتبار سے فقید المثال کتاب ہے، امام موصوف اپنے صوفیانہ رجحان کو مفصلہ ذیل الفاظ مین بیان کرتے ہین

میری توجہ طریقت صوفیہ کی طرف مبذول ہوئی، مین جانتا تھا کہ انکے جادہ طریقت پر رہروی کیلئے اصول اور عمل دونون ذرایع ضروری ہین، اسکا اصول یہ ہے، کہ انسان اپنے نفس سے تمام صفات وخصوصیات خبیثہ دور کردے، یہانتک کہ انسان کا دماغ صرف ناموس الٰہیہ کے جلوہ سے معمور ہو جائے، میرے طریقت صوفیہ کا اصول اسکے علمی اوراد و وظائف کی بہ نسبت زیادہ سہل تھا، اسلئے مینے اسے جاننے کیلئے انکی کتابونکا مطالعہ شروع کیا، (یہان امام غزالی نے تصوف کی چند کتابونکے نام لکھے ہین) مینے انکے اصولی فکر و عقاید پر عبور حاصل کرلیا، اور انکی طریقت کے متعلق مجھے وہ تمام معلومات حاصل ہو گئے، جو مطالعہ یا سماعت سے حاصل ہو سکتے ہین

مجھ پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ مطالعہ کے ذریعہ سے طریقت کے خصایص کا علم حاصل نہین ہو سکتا، اسکے لئے ذوق سلیم کی ضرورت ہے اسکے بعد امام غزالی نے ایک خطیبانہ انداز مین بیان کیا ہے کہ اسمین جو حفظان صحت کے اصول وقوانین سے واقف ہے، اور جو خود صحیح اور تندرست ہو کسقدر فرق ہے، ایک وہ شخص جو صرف شرب اور بانگ نوشانوش کی تعریف جانتا ہو، اس شخص سے جو لذت شرب سے پرکیف اور "دو گاہے مے شبانہ وگہ بادۂ صبوح" کی نشاط آفرینیون سے سرشار ہو کسقدر ممتاز حیثیت رکھتا ہے "بادہ پیمائی" جسکا "وظیفہ صبح" اور "ورد شام" ہو وہ بادہ پیمائی کی تعریف اور لذت خمار کے علمی لطائف ناواقف ہوتا ہے، "سے ایک وارفتہ کرنے والی مستی ہوتی ہے وہ لذت خمار سے ایک نشاط نفس حاصل کرتا ہے، اور بس، ایک سنجیدہ اور زاہد منش انسان تعریف خمار تو جانتا ہے بادہ پیمائی کے متعلق اسے علمی اور طبی اصول سے تو واقفیت ہوتی ہے، لیکن وہ لذت شرب سے بالکل ناآشنا ہوتا ہے، اسی طرح جب ایک طبیب بیمار ہوتا ہے احفظان صحت کے اصول، اسباب مرض اور دفعیہ کے اسرار سے تو واقف رہتا ہے، لیکن صحت اس سے مفقود رہتی ہے، ماہرین تصوف اور رہروان طریقت کے درمیان یہی فرق ہے

مجھے اسکا یقین ہو گیا، کہ صوفیہ کے نزدیک "احوال" اہمیت رکھتے ہین نہ کہ تعریفات اور یہ کہ جو کچھ علمی ونظری مباحث کے

ذریعہ ممکن تھا، مجھے حاصل ہوگیا، بقیہ معلومات مطالعہ و سماعت کے ذریعہ نہین حاصل ہوسکتے بلکہ انکے لئے "ذوق" کی ضرورت ہے، اور ایک زمانہ معینہ تک عملی اوراد و وظایف کی،

ان علوم کے ذریعہ جو مینے پڑھے تھے، اور ان طریقون کی وساطت سے جو مینے اقسام علوم (عقلی و نقلی) کی جستجو مین اختیار کئے تھے، میرا عقیدۂ توحید، رسالت اور آخرت کے متعلق راسخ ہوگیا تھا، ایمان کے یہ بنیادی عقاید میرے نفس مین اثبات کامل کے ذریعہ نہین جاگزین ہوتے تھے، بلکہ سلسلۂ ایتلاف، اور تجربات کے ذریعہ حاصل ہوتے تھے یہ بات مجھ پر ظاہر ہوگئی، کہ مجھے نجات اخروی کی امید صرف اتقا اور نفس کو مطلوبات شہوانیہ سے محفوظ رکھنے سے ہی ہوسکتی ہے، اور یہ کہ اسکی ابتدا یہ ہے، کہ قلب کو عالم مادی کے تعلقات سے منقطع کردیا جائے۔

ان خیالات کے پیدا ہونے سے مین سمجھنے لگا کہ مین زندگی کے ایک نہایت اہم دور سے گزر رہا ہون، آخر کار ایک دن مینے ارادہ راسخ کرلیا، کہ بغداد سے ہجرت کر کے حیات کی تمام کامرانیون سے دست بردار ہوجاؤنگا لیکن ابھی تک مین پس و پیش مین تھا صبح کو مین ترک دنیا کا ارادہ کرتا تھا، تو شام کو اسمین انقلاب رونما ہوجاتا میرے ارادہ مین استقلال نہ تھا، مطلوبات شہوانیہ "دامن دل" پکڑ کر کہتے تھے کہ "جا اینجاست"، اور ایمان کا ایک سروش غیبی "بربندید محملہا"، کا پیہم پیام سنا رہا تھا،

اسی طریقہ سے چھ ماہ گزر گئے، اور مین کبھی تو عالم مادی کے جذب و کشش سے متاثر ہوتا تھا، اور کبھی آخرت کی پکار سے، سنہ ۴۸۸ھ تھا رجب کا مہینہ تھا، اسوقت معاملہ میری مرضی اور خواہش سے بالاتر ہوگیا، مجھے مجبوری لاحق ہونے لگی، خدا نے میری زبان بند کردی، میری گویائی ایسی سلب ہوگئی، کہ مین تعلیم و تلقین کرنے سے بھی عاجز ہوگیا، ایک دن مینے دباؤ ڈالکر چاہا بھی کہ بعض حضرات کے اطمینان خاطر کیلئے مین کچھ تعلیم کرون، لیکن میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا، اب زبان کی اس بندش اور نطق کے فقدان کے باعث مین سخت مغموم رہنے لگا میری قوت ہاضمہ مین فرق آگیا، نہ کھانے کی خواہش رہی، نہ پانی کی طلب، نہ مین ایک قطرہ آب جذب کرسکتا تھا نہ ایک لقمہ ہضم، میری قوت زائل ہونے لگی، اور اطبا نے بھی شفا سے مایوسی ظاہر کی، انھون نے تشخیص کی کہ کسی دماغی تکلیف نے نظام جسمیہ پر اثر ڈال رکھا ہے، اور اسکا علاج یہی ہے، کہ وہ فکر و تردد دماغ سے دور ہوجائے تب اپنے ضعف و نقاہت کا احساس کرتے ہوئے، اور اپنے ارادہ کی طلب و ادعا، سے دست بردار ہوکر مینے اس شخص کی طرح جس کا وقت ضرورت کوئی حاجت روا نہ ہو، خدا کی طرف رجوع کیا

صدائے غیبی آئی، اور میرے لئے آسان ہوگیا، کہ مین جاہ و حشم کی تمنا، دولت کی فراوانی، اور کینہ و رفقا کے تعلقات سے سبکدوش ہوجاؤن۔

اسکے بعد امام غزالی فرماتے ہین کہ کس طرح مینے بغداد کے دربار خلافت سے رخصت حاصل کی، آپنے ظاہر کیا کہ حج بیت اللہ کا ارادہ ہے، حالانکہ آپکا اصل مقصد یہ تھا، کہ شام کا سفر کرین، اور وہین صوفیہ کی طرح ترک دنیا، اور مراقبہ کے اشغال مین مستغرق رہین، امام غزالی اب ایک بادیہ پیما راہب ہوگئے، آپ ملک شام مین پہونچے، اور وہان دو سال تک کنج عزلت مین بسر کی آپنے صوفیانہ ریاضت کی منزلین طے کین، تزکیہ دماغ اور تصفیہ قلب فرماتے رہے، اور ہمیشہ خیال آلہی مین مستغرق رہے، اسکے بعد آپکے

قلب مین پہنچ مجھ حج بیت اللہ کی خواہش پیدا ہوئی آپ نے مناسک حج ادا کئے، اور دس سال تک آپکی زندگی، دو حصون مین منقسم رہی، خود اپنا تزکیہ نفس، اور دنیا کے دوسرے ارباب کا خیال، تعلقات دنیا کے افکار، زندگی کی ضروریات اور اولاد کی منت و سماجت کبھی انہین اپنی طرف متوجہ کر لیتی، اور کبھی صوفیہ کی "جمعیت" اور "علاقہ الٰہی" کی طلب، کنج عزلت مین بٹھا دیتی۔ (باقی)

عبدالمالک آروی

ایک ادبی و علمی دعوت

جنوری ۱۹۲۸ء کی اشاعت نگار کو مومن کے لئے مخصوص کر کے مین نے اپنے آپکو گویا پابند بنا لیا ہے کہ ہر سال کسی نہ کسی ایسے شاعر کی یاد کو تازہ کیا جائے جس کے مٹانے مین زمانہ نے اپنی پوری قوت صرف کر دی ہے۔

چنانچہ ارادہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۰ء کا نگار، ابو المظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے لئے مخصوص کر دیا جائے اور کم از کم دو سو صفحات کو محیط ہو۔ اس سلسلہ مین جو عنوانات قائم کئے ہین، یہ ہین:-

(۱) ظفر کی سیرت اور اس کے عہد کے تاریخی خصوصیات (۲) عہد ظفر کے سیاسیات (۳) ظفر کی شاعری اور اسکی خصوصیات (۴) عہد ظفر مین دہلی کی شاعری (۵) ظفر کی شاعری پر سیاسیات وقت کا اثر (۶) دربار ظفر اور عہد ظفر کے شعراء (۷) ظفر کے عہد مین دہلی کی علمی و ادبی فضا (۸) ظفر رنگون مین (۹) حامی و آزاد کی رائے ظفر کی شاعری کے متعلق اور اسپر محاکمہ (۱۰) انتخاب کلام ظفر

امید ہی کہ ملک کے ارباب علم و ادب

عنوانات بالا مین سے کسی عنوان پر یا ایک ہی مضمون کے سلسلہ مین ان تمام یا چند عنوانات پر اپنی تحقیقات و معلومات بھیجکر ممنون فرمائینگے۔ انتخاب کلام ظفر کی خدمت ادارۂ نگار نے اپنے ذمہ لی ہے اسلئے اسپر کسی کو وقت صرف کرنیکی ضرورت نہین۔

اسی سلسلہ مین غالباً یہ عرض کر دینا بے محل نہوگا کہ بہترین مضمون کے لئے نگار کی طرف سے ایک حقیر ہدیہ **سو روپیہ کا پیش کیا جانا** قرار پایا ہے۔ جو کامیاب مضمون نگار کی خدمت مین ٹھیک ۲۵ جنوری ۱۹۳۰ء کو روانہ کر دیا جائیگا۔ زیادہ سے زیادہ ۳۰ ستمبر ۱۹۲۹ء تک مضامین کا دفتر نگار مین پہونچ جانا ضروری ہے۔

نیاز فتحپوری (ایڈیٹر نگار) لکھنؤ

چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ

دنیا میں "سانپ" اور "مولوی" دو چیزیں ایسی ہیں، جنکی قسموں کی انتہا نہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور موخرالذکر کا یہ حال ہے کہ:

ہر کرا جامہ مولوی بینی

دردمش صد ہزار مار انگار

مسجد کے ملا سے لیکر محراب و منبر کے واعظ تک، نماز جنازہ پڑھانے والے مولوی سے لے کر اس "مولانا" تک جو بیضاوی و بخاری کا درس دیتا ہے ایک چیز (الا ماشاء اللہ) سب میں مشترک پائی جاتی ہے اور وہ انکے ظاہر و باطن کا تضاد ہے۔ یعنے جس مولوی کا ظاہر جتنا زیادہ خوشنما ہے اتنا ہی زیادہ اسکا بطون مکروہ ہے۔

ایک مولوی کی "ہیئت وضعی"، جس میں اسکا بے تکا عمامہ، الجھی ہوئی زلف (کاہے تا دوش وگاہے تا بناگوش) لانبی پریشان داڑھی، زمین دوز بروت، سیاہ داغدار پیشانی، شیروانی نما کرتہ، نیم ساقی پاجامہ اور غیر دباغت شدہ متعفن چمڑے کا جوتا مع تسبیح و جریب و رومال اور "نا سدانی" کے سب کچھ شامل ہے۔ ایک ایسی واضح، صریح، اختراعِ مسجل (Patent) ہے جس کو دیکھنے کے بعد گویا ہر شخص کا فطری فرض ہوجاتا ہے کہ وہ اس وضع والے کو مولوی سمجھے اور بہ حیثیت مولوی ہونے کے اس وضع کا اختیار کرنے والا تو گویا من جانب اللہ اسپر مامور ہی ہوا ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں قورمہ و مرغ پلاؤ مہیا ہو سکتا ہے وہاں اپنا سلسلۂ ارشاد و ہدایت دراز کرے۔ اس میں بھلا کسی کو اعتراض کی کیا گنجایش ہے۔

مولوی کی اولین قسم جو ارتقاء مولویت کی سب سے پہلی کڑی تھی اور جو مکتبوں کے بوریوں پر نظر آتی تھی اب تقریباً مفقود ہو چکی ہے، مگر ان کے کارنامے مولویت کی تاریخ لکھنے والے کے لئے ہمیشہ اہمیت رکھیں گے۔ کیونکہ "موجودہ مولوی" اسی "گذشتہ مولوی" کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور وہ شخص جو "نفسیات مولویت" (Psychology of molvyism) سے بحث کرنا چاہیگا، اس کیلئے لازم ہوگا کہ وہ اس قسم کی ابتدا ظہور سے آغاز کرے۔ علمی اصولی حیثیت سے آپ اسپر غور کرنیکی اہمیت کا اندازہ یوں کر سکتے ہیں:-

مثلاً ـــــ میرے محلہ میں بہت زمانہ ہوا ایک مولوی کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر محلہ کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ ان کی ایک مولویائن تھیں اور چند در چند بچے جن کو اگر برابر برابر کھڑا کر دیا جاتا تو اچھا خاصہ زینہ بنجاتا۔ رئیس کے یہاں ان کو صرف پانچ روپیہ ماہوار اور کھانا ملتا تھا، لیکن انکی دیگر فتوحات کی صورتیں مختلف تھیں۔ عید، بقرعید، شبرات میں "عیدیاں، بقرعیدیاں اور شبراتیاں" بپاس خاطر عزیز سلمہ لکھکر انعام وصول کرنا تو خیر ایک جایز معمول تھا ہی، لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی مختلف ترکیبوں سے کام لیتے تھے اور اس باب میں وہ

ایک مخترع و موجد کی حیثیت سے بالکل اڈیسن کا مرتبہ رکھتے تھے۔ مثلاً اُن کے موٹے لانبے کُرتے میں آگے پیچھے، نیچے اوپر تقریباً ایک درجن جیبیں تھیں۔ یہ جیبیں مختلف وسعت کی تھیں اور ان کا رنگ بھی مختلف تھا، کوئی سرخ تھی، کوئی زرد، کوئی سفید تھی اور کوئی سبزی مائل، ہر لڑکے کو خفیہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب وہ گھر سے آئے کوئی نہ کوئی چیز لیتا آئے۔ پھر اگر کوئی مرچ لایا تو سرخ جیب میں ڈالدی، کسی نے ہلدی کی گرہ پیش کی تو زرد رنگ کی جیب میں رکھ لی، کوئی آٹا لایا تو سفید جیب کی نذر ہو گیا، اور سبز ترکاریاں سبز جیب میں چلی گئیں۔ ایک جیب چمڑے کی بھی تھی، جس کا راز ایک دن اتفاق سے یوں کھل گیا کہ ایک مسلمان تیلی کا لڑکا کچھ تیل کٹورے میں لایا اور انہوں نے آنکھ بچا کر اسی جیب میں تیل کو انڈیل لیا۔ الغرض شام کو جب وہ گھر جاتے تھے تو مولویائن اور ''ملازلوں'' کے لئے بقال کی اچھی خاصی دوکان بنکر جاتے تھے۔

ایک معمولی شخص کے لئے بظاہر یہ واقعہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، لیکن ایک ماہر نفسیات غور کریگا کہ ایسے معلم کے شاگردوں میں کیا ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے اور وہ آگے چلکر کس قسم کے ''افراد قوی'' بننے کی اہلیت رکھ سکتے ہیں۔

بہرحال اللہ کی یہ مخلوق تو اب مفقود (Extinct) ہو گئی ہے، لیکن اسی کی اولاد و احفاد یا تلامذہ کے سلسلہ میں جو مولوی پائے جاتے ہیں، انکی تین بڑی تقسیمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو عربی مدارس میں لڑکوں کو پڑھاتے ہیں، دوسرے وہ جو وعظ و تبلیغ کے ساتھ لوگوں کو مرید بھی کرتے ہیں، اور تیسرے وہ جو سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد مسلمانوں کے قاید و رہنما بن گئے ہیں۔

اول الذکر قسم بظاہر گوشہ نشین اور بے ضرر قسم معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی خلوت نشینی حقیقتاً ایک مستقل ہنگامہ محفل ہوتی ہے جس میں ایک شمع کی حیثیت رکھتا ہے اور طلبہ ''پتنگوں'' کی، رہی بے ضرری سو اسکا حال اس سے عیاں ہے کہ اگر درسگاہ اس قسم کی ہے جس کے طلبہ مسجدوں میں رہ کر محلہ والوں کی خیرات اور سویم کی روٹیوں پر زندگی بسر کرتے ہیں تو اخلاقی تربیت اور علوم عقلی معدوم اور اگر کوئی قومی مدرسہ ہے جسمیں دارالاقامہ کے اصول پر طلبہ کے رہنے کا انتظام ہے تو وہاں کا نصاب ہی فرسودہ و قدیم ہے جو انسان کو آگے بڑھانے کی جگہ پیچھے ڈھکیل دیتا ہے اور جس کی تکمیل کے بعد سوائے اذان دینے، نماز پڑھا دینے یا ''مسئلۃ البئر محیط'' سمجھا دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتا، اور وہاں کے اساتذہ روشن خیال نہیں ہیں اور غریب طالبعلموں میں کوئی ولولۂ عمل اور نشاطِ روح پیدا ہونے نہیں دیتے

اول الذکر قسم کے مولویوں میں سے جو افراد زیادہ ذہین ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر دوسری قسم میں منتقل ہو جاتے ہیں اور وعظ و تبلیغ شروع کر کے ''مشایخانہ'' حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ طبقہ زیادہ مالدار، زیادہ خوشحال، زیادہ کامیاب و رنگین ہے۔ ایسا مولوی سب سے پہلے بنگال و برما کے جاہل قریوں میں اپنی ''مشق سخن'' شروع کرتا ہے اور جاہل مسلمانوں کو جھوٹی روایتیں، گڑھے ہوئے کاذب افسانے مذہب وہابی مذہب کے متعلق سنا کر اول اول علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کا وعظ کہتا ہے اور جب وہ اپنی حیثیت بلحاظ ایک عالم ہونے کے ''یکے از انبیاء بنی اسرائیل'' کی طرح قایم کر لیتا ہے تو سرِ اعلان مرشد و ہادی بنکر اپنے ارادتمندوں اور مریدوں کی رجسٹر کھولدیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح کم از کم ۷۳۰ مرید اسکو حاصل ہو جائیں تا کہ اگر ایک روپیہ سالانہ بھی وصول کیا جائے (جو نہایت معمولی بات ہے) تو دو روپیہ روز کا اوسط پڑ جائے۔ یہ طبقہ نہایت ''خوش خور'' و ''خوش پوشاک'' ہوتا ہے اگر یہ کسی ایسے قریہ میں پہونچ جاتا ہے جہاں تمام ضروری چیزیں اسکے ''ذوقِ شکم'' کو پورا کرنیوالی ملسکتی ہیں تو پھر اس کے دسترخوان کا پروگرام یہ ہوتا ہے:۔۔۔

صبح کا نسخہ :- نماز کے بعد ہی کشمیری چاء، سیر بھر دودھ اوٹا ہوا، پاؤ بھر مسکہ، ایک چھٹانک پسے ہوئے بادام، آدھ پاؤ قند، دو پراٹھے، تین ابلے ہوئے انڈے، چار کباب اور بس۔

دوپہر کا کھانا :- مرغ کا قورمہ، مرغ پلاؤ، بورانی، پسندے، باقر خانی، مزعفر، بالائی۔

سہ پہر :- سادہ چائے، اور تازہ پھل۔

شب کا کھانا :- وہی جو دوپہر کو تھا مگر شامی کباب اور بھنی ہوئی مچھلی کے اضافہ کے ساتھ۔

اگر مولانا کسی ایسے مقام میں پہونچ گئے ہیں جہاں یہ اشیاء فراہم نہیں ہو سکتیں اور ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ صرف دال ترکاری پر بسر کرنا ہوگی تو پھر وہ کہہ دیتے ہیں کہ آجکل کسی جلالی عمل کا چلّہ کھینچ رکھا ہے اسلئے سوائے دودھ بالائی کے کچھ نہیں کھا سکتا۔

مولانا کی پوشاک بھی ہمیشہ دورہ ہی کے زمانہ میں تیار ہوتی ہے۔ عماموں کی تو خیر کمی نہیں کیونکہ ہر نیا مرید جب کچھ زر نقد اور مٹھائی لاتا ہے تو وہ ایک نیا عمامہ بھی پیش کرتا ہے (جو بعد کو گھر پہونچکر مولویائن کے دوپٹے اور ملازادوں کے کرتوں کے کام آتا ہے) لیکن یوں بھی قمیص اچکن، تہمد اور ازار کے لئے طرح طرح سوتی اور ریشمی کپڑے تحفۃً آتے رہتے ہیں اور جو مولوی زیادہ ہوشیار ہیں وہ صرف اسی غرض سے جولاہوں اور کپڑے کے تجارت کرنے والوں کو مرید بناتے ہیں۔ مولانا کے وعظ و تلقین کا جہاں تک تعلق ہے یکسر خدا کی شان جلالی سے وابستہ ہوتی ہے۔ خدا ایسا قہار ہے، ایسا جبار ہے، اس نے جہنم اتنا وسیع بنایا ہے وہ یوں اژدھوں سے ڈسواتا ہے، اس طرح آگ میں جلاتا ہے۔ مگر ہاں وہ جس کی شفاعت رسول اللہ کر دیں یا کوئی پیر، گویا خدا کا قہرمانی وجود اپنے وقت کا چنگیز یا ہلاکو ہے اور مولینا اس کے وزیر باتدبیر۔ ان کی ملفوظات کا بڑا حصہ خود اپنے ہی کرامات و خوارق عادات سے متعلق ہوتا ہے۔ کہ فلاں مقام پر اس طرح ایک مرتے ہوئے شخص کو اچھا کر دیا، امساک باراں میں یوں پانی برسا دیا، فلاں کے دل کا حال اس طرح بتا دیا، جن کے بادشاہ کو طلب کر کے فلاں کے سر سے آسیب کو یوں دور کرا دیا وغیرہ وغیرہ۔

اگر مولانا کو ذوق موسیقی بھی ہے تو شب کے اول حصہ میں قوالی اور اس کے ساتھ حال قال کی چند مذبوحانہ حرکات بھی دکھائی جاتی ہیں، ورنہ شام ہوتے ہی، مولانا کا جائے قیام مردوں کے لئے "ممنوع الدخول" ہو جاتا ہے اور صرف عورتوں کی ہدایت کے لئے وقف سمجھا جاتا ہے۔ پیر صاحب نرم قالین پر نرم تکیوں کے سہارے دراز ہو جاتے ہیں، عورتیں ڈرتی ہوئی، سہمی ہوئی شرمائی ہوئی سامنے آتی ہیں اور مولانا کا وہ جسم جو مقوی اور قیمتی غذا سے خوب نرم اور پر گوشت بنا ہوا ہے دابنے لگتی ہیں۔ مولانا تھوڑی دیر اس لذت و لطف سے سرشار ہونے کے بعد دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں اور وہاں علٰحدہ علٰحدہ ہر ایک تعلیم و تلقین خصوصی کے لئے طلب فرماتے ہیں، پھر چونکہ وہ مقام بلند ہے جو پیر صاحب کی اصطلاح میں۔ قاب قوسین او ادنیٰ سے کم نہیں، اس لئے یہاں کے راز اول تو بہت کم ظاہر ہوتے ہیں اور جو کبھی ہو گئے تو فوراً کل یوم ھو فی الشان اور اللہ جمیل و یحب الجمال کا وعظ شروع ہو جاتا ہے اور جاہل مرید خوشی کے ساتھ اپنی عورتوں لڑکیوں کو آلۂ تفریح بنانے کے لئے راضی ہو جاتے ہیں۔

تیسری قسم مولوی کی وہ مولانا ہے جو ملک کے اونچے اور تعلیمیافتہ طبقہ میں اپنی بکار گاہ قائم کرتا ہے تاکہ ملک کا سیاسی قاید و رہنما تسلیم کیا جائے جہاں تک اصلاح ملک و قوم کا تعلق ہے میرا تجربہ بالکل صفحہ سادہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن جس حد تک تخریب و فساد متعلق ہے، اس طبقہ کا

وجود اس درجہ خطرناک ہے کہ شاید ہی ہم اُنھیں کہکر اس کی اہمیت کو پوری طرح ظاہر کر سکیں۔

یہ مولانا، کھدر پوش ہوتا ہے، دیسی چیزوں کا عاشق، ولایتی اشیاء سے متنفر، حریت و آزادی کا علمبردار، غلامی و استبداد کا عدو، ترقی کا حامی، تنزل کا دشمن اور

"یتیموں کا والی غریبوں کا ملجا"

کبھی کچھ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس کے کھدر پوش سینہ کے اندر اتنا موٹا اور مکروہ قسم کا نفس ہوتا ہے کہ شاید ہی غریب فرعون کو نصیب ہوا ہو۔ اس کے تمام مقالات حریت، اسکی تمام شعلہ بیانیاں، اسکی جملہ سوراج پرستیاں، صرف حب جاہ سے متعلق ہوتی ہیں اور اسکا مقصود ان تمام نمایشوں سے سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ریل کے اونچے سے اونچے درجہ میں سفر کرے، وداع کے وقت لوگوں کا ہجوم اس کو اسٹیشن تک پہونچانے جائے، جہاں پہونچے وہاں رسم مشایعت کے لئے ایک جماعت موجود ہو، گلے میں ہار ڈالے جائیں، اسکی موٹر کو نوجوانان ہند دھکیل کر لیجائیں، جلوس کے ساتھ جب وہ بازاروں کیطرف سے نکلے تو ایک غرور نما انکسار کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے جھک جھک کر لوگوں کا سلام قبول کرتا جائے، اور جائے قیام پر ہر وقت زایرین کی آمد و شد سے میلہ سا لگا رہے

یہ اپنے آپ کو سیاسیات کا ماہر، نظام عالم کا "استن حنانہ" اور گردش ارضی کا محور سمجھتا ہے، اس کو یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ نہو تو نظم دنیا درہم برہم ہو جائے، مشرق مغرب سے، شمال و جنوب سے ملجائے اور قومیت کا بیڑا غرق۔ اس قسم کا مولینا بہت کم خطرہ میں پڑتا ہے اور اگر کبھی پڑ جاتا ہے تو صرف تجارتی اصول کی بنا پر کہ آیندہ اس کے کاروبار کی رونق اس سے زیادہ بڑھ جائیگی۔ یہ سوائے اپنے کسی کی رائے کو پسند نہیں کرتا، یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں خدا نے صرف اسی کو ذی عقل و ہوش بنایا ہے اور خلیفۃ اللہ فی الارض اسی کی ذات سے عبارت ہے۔ وہ جلسوں میں ہمیشہ دیر کر کے پہونچتا ہے تاکہ جس وقت پہونچے تو سارا مجمع جو اسکا انتظار کر رہا ہے، گردن اٹھا اٹھا کر اسکو دیکھنے لگے وہ چوکڑیوں پر سوار ہو کر جاتا ہے، اونچی جگہ مسند طلا اور زرکار کرسیوں پر اپنا دامن عبا دراز کرتا ہے۔ وہ دوران جلسہ میں سرگوشیاں کرتا ہے، کاغذ کے پرزوں پر پنسل سے کچھ لکھ کر لوگوں کو ہدایات فرماتا ہے، گویا کہ وہ اس ساری جماعت کا ایک قاید اعظم ہے، اس مشین کا یہ بوت یا گورنر اسپرنگ ہے جسپر پرزوں کی . . . . باضابطہ گردش قایم ہے۔ مولانا، مولانا کی آوازوں سے اسکا سیروں خون بڑھتا ہے، دست بوسی سے اس کے جذبات قیادت میں برقی رو دوڑ جاتی ہے اور جس وقت وہ اسٹیج پر جا کر تالیوں کی آواز سنتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے کہ خدا عبارت ہے صرف اسی کی ذات سے، یہ حال ہے اسکی پبلک زندگی کا لیکن اپنے گھر کے اندر وہ کیا ہے؟ اپنے متعلقین کے ساتھ اسکا کیا برتاؤ ہے۔ لوگوں کے حقوق وہ کیونکر ادا کرتا ہے، اس کا حال اسکی غریب بیوی سے پوچھئے جو ایک کنیز سے بدتر حیثیت رکھتی ہے، بچوں، خادموں اور اس کے اعزہ سے دریافت کیجئے کہ یہ اپنے آپ کو "خدا کا بیٹا" کہنے والا، کس طرح کا باپ کس قسم کا آقا اور کس انداز کا انسان ہے۔

اس کا مذہب یکسر خود پرستی، اس کا دین و ایمان سراسر کبر و غرور، اور اس کی ذات از سرتاپا یادگار ہے اُن فراعنہ و نمارده کی جنکا حال تو کتابوں میں ہمکو نظر آجاتا ہے، لیکن صورت اب تک کبھی نہیں دیکھی تھی۔

میں نہیں کہتا کہ اس جماعت میں کوئی مستثنےٰ نہیں ہے، لیکن اگر کوئی ہے تو اسکا عدم وجود برابر ہے اور اس کو یہ مرتبہ حاصل نہیں۔

اسقدر تمہید کے بعد مجکو اصل مدعا کی طرف آنا چاہیئے جو عنوان سے ظاہر ہے۔ میرے تجربات مولویوں کے متعلق اسقدر وسیع ہیں کہ اگر چاہوں تو برسوں تک اس سلسلہ کو قایم رکھ سکتا ہوں، لیکن اس وقت میں اپنا بالکل حال کا تجربہ پیش کرنا چاہتا ہوں، جو ادبی حیثیت سے بھی کم پر لطف نہیں ہے :-

۴- جولائی کو میں ایک ...... جلسہ میں شرکت کی غرض سے الہ آباد جا رہا تھا، پرتاب گڈھ اسٹیشن پر پہونچ کر میں جس درجہ میں داخل ہوا، وہاں پہلے سے ایک ہندو خاتون کونہ میں بیٹھی ہوئی تھی جس سے ایک مرد (جو غالباً اس کا خوش نصیب شوہر ہوگا) باتیں کر رہا تھا۔

یہ عورت جسے ایک نوجوان لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، بہت مقبول صورت، حد درجہ مہذب، اور نہایت خوش ادا چیز تھی اور اپنی نزاکت کے لحاظ سے آسکر وائلڈ کی زبان میں بالکل ایک سفید فاختہ یا کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رنگ کی کندنی چمک، اس کے خد و خال کی کشمیریت، اسکی آنکھوں کی نشیلی کیفیت، اس کے لبوں کی میگونی، اس کے جسم کی لچیلی نزاکت یہ سب باتیں اسکی خوش سلیقگی، متانت و سنجیدگی کے ساتھ ملکر ایک ایسی فضا پیدا کر رہی تھیں کہ ہر شخص کو اس سے متاثر ہونا چاہیئے اور غلط ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ مجھ پر کوئی اثر اس کا نہیں ہوا، لیکن ایسی صورتوں میں میرا فلسفہ صرف یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے آپ پر غور کرتا ہوں اور جب اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ میں انسان ہوں اور انسان ہی تک میری ...... رسائی ہوسکتی ہے تو پھر اس نوع کی آسمانی مخلوق کی طرف توجہ نہیں کرتا اور اگر توجہ ہوتی بھی ہے تو بالکل نمایش کی حیثیت سے۔ میرے لئے موقعہ تھا کہ میں مقابل کی بنچ پر بالکل اس کے سامنے اور ...... اس کے بہت قریب ہوکر بیٹھ جاتا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا صرف احترام نسوانی کے خیال سے کہ ممکن ہے اسے کچھ تکلیف ہو اور وہ آزادی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکے۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک مولانا مع اپنی تمام خصوصیات ظاہری کے داہنے ہاتھ میں مٹھائی کی ہانڈی، اور بائیں ہاتھ میں طہارت کا لوٹا لئے ہوئے (جام بدستے و سبوئے بدست) اندر داخل ہوئے اور یک نگاہ گاڑی کا جایزہ لیکر بلا پس و پیش اپنا محاذ انہوں نے اسی جگہ قایم کر دیا جس کو میں نے قصداً چھوڑ دیا تھا۔

مجھے پہلے ہی ان کی وضع و صورت اور اس ناشایستہ حرکت سے یقین ہوگیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی مولانا ہے، لیکن اتفاق سے اسی درجہ میں ایک وکیل صاحب ان کے شناسا اور مل گئے اور انھوں نے مولانا کے لفظ سے خطاب کرکے اور مہر توثیق ثبت کر دی۔

مولانا کی عمر ۶۰ سے متجاوز ہوگی، لیکن صحت ماشاءاللہ بہت اچھی تھی اور مصنوعی دانتوں کی آب، اور داڑھی کا خضاب جو ہر چند طاؤسی ہوگیا تھا، بتا رہا تھا کہ ہنوز زعم جوانی موجود ہے۔ تمام اعضا صحیح و سالم تھے، البتہ داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور انگوٹھا کچھ ٹیڑھا اور مفلوج سا تھا، جو غالباً عمل جراحی کا نتیجہ تھا کیونکہ ہاتھ پر ایک بڑا نشان اسکا پایا جاتا تھا۔

مولانا کو اسقدر اپنے سے قریب دیکھکر اس خاتون نے آنچل کی اوٹ سے نیچے ہی نیچے بہت غور سے دیکھا اور نہایت ہی مخفی تبسم کے ساتھ اس نے شوہر کو اور شوہر نے اسے دیکھا اور دونوں پھر باتوں میں مصروف ہوگئے۔

مولانا نے سب سے پہلے اپنی نشست کا انداز اس طرح قایم کیا کہ چہرہ، اسی طرف رہے اور اسکے ماتھے کی سرخ بندی جو بیر بہوٹی کی طرح دہک رہی تھی نگاہ سے اوجھل نہ ہو۔ جب اپنے نشانہ و ہدف کی طرف سے مطمئن ہوگئے، تو انہوں نے چاہا کہ کسی طرح اس کے شوہر سے بے تکلفی پیدا کرکے

اپنے آپ پر نگچینیٔ جمال کو حلال کرلیں، لیکن بدقسمتی سے وکیل صاحب جوان کے شناسا تھے الف لیلہ کے کم گو حجام سے کم باتونی نہ تھے اور انہوں نے جو مولانا سے گفتگو شروع کی تو پھر اس کا موقعہ ہی نہ دیا کہ وہ کسی طرف اور متوجہ ہوتے۔ ہر چند مولانا کی چین پیشانی، بے رخی، چہرہ کی عبوست اور کبھی کبھی اخبار لیکر اس کے مطالعہ کی کوشش کرنا صاف کہہ رہا تھا کہ وہ کسی مداخلت کو پسند نہیں کرتے اور انکی توجہ مراقبہ کو صدمہ پہونچ رہا ہے لیکن وکیل صاحب جو اپنی پہنائی اور قد و قامت کے لحاظ سے ابوالہول (Sphinx) کی لحد ہوتے تھے، اس غریب مولانا کے آزار کو نہ سمجھ سکے اور برابر انکی یکسوئی خیال و نگاہ میں حارج رہے۔ لیکن باوصف اس کے مولانا نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے ہدف کو فراموش نہیں کیا اور اپنے کسی لمحہ عزیز کو انہوں نے بیکار جانے نہیں دیا۔ وہ باتیں کرتے تھے مگر نگاہ کا سمت بدلتا تھا، وہ وکیل صاحب کے سوالوں کا جواب دیتے تھے مگر ہر جواب کے دوران میں اس ”سرمایۂ جاں“ کا مطالعہ ضرور کرلیتے تھے۔ وہ کوشش کرکے اپنے ہاتھ کی معیوب کج انگلیوں کو چھپاتے تھے کہ مبادا وہ خاتون اس عیب کو دیکھ کر ان کو چاہنا چھوڑ دے، وہ آواز میں اک خاص قسم کا مصنوعی لوچ اور لحن پیدا کرکے گفتگو کرتے تھے، وہ اپنے قہقہہ میں ایک سیمیں جھنکار پیدا کرنیکی سعی فرماتے تھے (کانہ دد ھم رنان) وہ اپنی خوشدلی، قابلیت، جاہ و ثروت، دولت و امارت کا ثبوت دینے کیلئے کبھی کبھی لطائف بھی کہتے فارسی کے اشعار بھی پڑھتے بڑے بڑے لوگوں کے نام اور ان سے اپنے تعلقات کو بھی ضمناً ظاہر کرتے جاتے تھے اور سب سے زیادہ زور اس پر دے رہے تھے کہ دنیا میں تعصب سے زیادہ بری کوئی چیز نہیں اور بھئی میرا مسلک تو یہ ہے کہ ”با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام“ ”رام رام“ کہہ کر جس وقت مولینا نے اس عورت کو دیکھا تو وہ بھی انہیں دیکھ رہی تھی اور میں بھی ان دونوں کے دیکھنے دیکھ رہا تھا، اور آخر کار جب تینوں نگاہیں مرکز اجتماع سے ہٹیں تو اس طرح کہ تینوں نے علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو دیکھا مگر یہ منظر پیدا کرتے ہوئے کہ مولانا اپنی جگہ مست تھے اور وہ خاتون محجوب۔ الغرض مولانا کے تمام لاعبانہ تیور اس کا پتہ دے رہے تھے کہ وہ انہیں لوگوں میں تھے جو

این کار را بہ شیوۂ کار آگہاں کنند

جب مجھے پوری طرح یقین ہوگیا کہ مولانا کی خوش طبعی اکبانی طور پر بڑھ گئی ہے اور انہیں وثوق کامل ہوگیا کہ سامنے درجہ میں صرف انہیں کی ذات ایسی ہے جسپر وہ خاتون مایل ہو سکتی (ہو سکتی کیا ہو ہی گئی ہے)، تو میں سنبھلا اور میں نے آگے بڑھ کر باادب عرض کیا کہ اگر جناب اجازت دیں تو چند مسایل حضور سے دریافت کرلوں، جو اسی وقت میرے ذہن میں آئے ہیں۔ وہ یہ سنکر دفعتہً چونک پڑے، اور بولے ”ہاں ہاں کہئے، ہم لوگ اسی لئے ہیں“ اور یہ کہکر پھر ایک خاص پندار کے ساتھ اس طرف دیکھ لیا۔ میں نے عرض کیا کہ ”مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ جناب تنہا عالم ہی نہیں ہیں بلکہ ادیب و شاعر بھی ہیں جیسا کہ آپکی شعر خوانی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس بنا پر مجھے یہ دریافت کرنے کی جراٴت کرنا چاہئے کہ کیا ”غنا رخانۂ ہمسایہ“ اور ”حسن ہر گذر ہے“ سے فایدہ اٹھانے کا مسئلہ محض شاعرانہ ادعا ہے یا واقعی کوئی شرعی حقیقت اس میں پنہاں ہے“۔ یہ سنکر ان کے چہرے پر پہلے اک ہلکی سی سرخی عتاب کی اور پھر زردی حجاب کی نمودار ہوئی اور پہلو بدلکر بولے کہ ”آپ کو مجھ سے مذاق کرنیکا کیا حق حاصل ہے؟“ میں نے کہا کہ ”بندہ نواز، میں آپسے مذاق کرسکتا ہوں، میں تو واقعی آپ سے سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں کیونکہ بسا اوقات سفر حضر میں ایسا ہوتا ہے کہ نگاہ مجبوراً اٹھ جاتی ہے اور میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے آخر کار کانپ اٹھتا ہوں کہ کہیں آخرت میں بازپرس نہ ہو۔“

مولانا نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے کہ "یہ صورت تو عذاب سے ڈرنے والوں کی نہیں ہوتی، داڑھی منڈی ہوئی، مونچھ بڑھی ہوئی اور پیشانی سجدے کے نشان سے خالی"

میں۔ "بجا ارشاد ہوا، میں اپنی صورت کا سب سے زیادہ شناسا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ عذاب سے ڈرنے والی صورت کیسی ہوتی ہیں سامنے ہی موجود ہے، صراحت کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں تو آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں، اور آپ کو اس کا جواب بہ حیثیت عالم دین ہونے کے دینا چاہیے، عام اس سے کہ میری داڑھی منڈی ہوئی ہے یا خضاب سے رنگی ہوئی، میرے منہ میں دانت اصلی ہیں یا مصنوعی، میری انگلیاں سیدھی ہیں یا ٹیڑھی، میری عمر باپ ہونے کی ہے یا شوہر بننے کی"

یہ سننے کے بعد مولانا کا غصہ ضبط سے باہر ہوگیا اور آستینیں چڑھا کر بولے کہ "تم مجھ سے مسخرہ پن کرتے ہو۔ یاد رکھو میں بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش بھی ہوں۔"

میں نے عرض کیا کہ "میں یوں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں" اس تنقید کی تاب وہ کیا لا سکتے تھے۔ بے اختیارانہ طور پر اٹھ کھڑے ہوئے اور میں اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھا رہا، کیونکہ فنون سپہ گری کی رو سے اس موقعہ پر بہترین جواب حملے کے بعد ہی ہو سکتا تھا، لیکن وکیل صاحب نے اٹھ کر ان کو پکڑ لیا اور سارا درجہ مخاطب ہو کر ان کو سمجھانے لگا کہ جانے دیجئے آپ بزرگ ہیں اپنی طرف خیال کیجئے اور جنیں جناں" میں نے کھڑکی کی طرف رخ کر لیا اور جب چند منٹ کے بعد سکون ہوگیا تو میں پھر ان کی طرف متوجہ ہوا اور بولا کہ "مولانا اگر غصہ فرد ہوگیا ہو تو عرض کروں کہ میرے سوال کا جواب مرحمت ہو" یہ سنکر سارے درجہ والے تو خیر ہنس ہی پڑے تھے، وہ خاتون بھی مسکرانے لگی اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔

مولانا بولے کہ "خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑیئے میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا" میں نے کہا کہ "بات نہ کیجئے تو لکھ کر بتا دیجئے، کیونکہ اس مسئلہ کا جواب تو حسب المراد سوائے آپ کے اور کوئی دے ہی نہیں سکتا"

وکیل صاحب خوش مزاج انسان تھے، انہوں نے کہا کہ "مولینا کیا حرج ہے آپ کیوں نہیں بتا دیتے" مولانا بولے کہ "آپ نہیں سمجھتے یہ مجھے بیوقوف بناتے ہیں، ورنہ کیا یہ خود نہیں سمجھ سکتے کہ جو کچھ یہ پوچھ رہے ہیں محض شاعرانہ بات ہے اور شرع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں مولانا واللہ ایسا نہیں ہے، مجھے اس وقت تک تو صرف گمان ہی تھا، لیکن آج یقین ہو گیا کہ غنائے خانہ ہمسایہ جائز ہو یا ناجائز، لیکن حسن رہگذر سے لطف اٹھانا قطعاً جائز ہے"

مولانا۔ "یہ کیونکر آپ کو یقین ہو گیا"

میں۔ "ایک بنی اسرائیل کے نبی کے طرز عمل سے"

مولانا۔ "وہ کون نبی ہے"

میں۔ "آپ تو اس طرح دریافت کرتے ہیں گویا آپ علماء امت سے ہی نہیں اور آپ کا کوئی عمل مجھ ایسے عاصی کے لئے حجت ہو ہی نہیں سکتا"

یہ سنکر مولانا غصہ میں اٹھے اور لوٹا لیکر منہ بناتے ہوئے بیت الخلا چلے گئے۔ ایک اسٹیشن درمیان میں باقی تھا کہ وہ باہر آئے اور جب اپنی جگہ بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا کہ "تشبہ کسی قوم کے ساتھ ایک شخص کو اسی قوم میں داخل کر دیتا ہے، اس لئے اگر ہمارے ہاں کی عورتیں بھی

رخ بندی کا استعمال کریں تو وہ ہندو ہو جائیں گی۔ آپ کا کیا خیال ہے"

مولانا۔ "بیشک بندی کا استعمال ہماری عورتوں کو نہ کرنا چاہئے"

میں۔ "لیکن مولانا یہ تو آپ نے دیکھا کہ بڑی پیاری چیز اور خاصکر گورے رنگ پر تو قیامت ہی ہو جاتی ہے"

مولانا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تم ہو کوئی بڑے بدمعاش اور تمہیں وہ لوگ ہو جن کے لئے خدا نے عذاب دوام کی وعید نازل کی ہے"

اتنے میں پریاگ اسٹیشن آگیا جہاں مجھے اترنا تھا، مولانا بدستور بیٹھے رہے اور میں اتر پڑا، لیکن نیچے پلیٹ فارم پر جاکر میں نے ان سے کہا کہ مولانا خدا کے لئے صرف ایک بات کان میں سن لیجئے۔ مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے کہنا مان لیا اور جب انہوں نے کھڑکی کے پاس آکر اپنے کان قریب کئے تو میں نے عرض کیا کہ "مولینا اس میں شک نہیں کہ ماں اچھا ہے، کچھ یاروں کا بھی حصہ ہونا چاہئے"

یہ سنکر انہوں نے میری گوشمالی کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں الگ ہٹ گیا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔

اکاڈیمی کا دفتر پریاگ اسٹیشن سے صرف دو تین فرلانگ کا فصل رکھتا ہے، اور اس دس منٹ کے راستہ میں جس خیال نے میرے دماغ کو گھیر رکھا تھا وہ مولانا کا واقعہ نہ تھا بلکہ غالب کا یہ شعر تھا جسے میں گنگناتا جا رہا تھا:۔

اگر بہ دل نہ خلد انچہ از نظر گزرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

تذکرۂ خندۂ گل

یا

ظریف شاعروں کا تذکرہ

جسمیں ۳۰۰ سو سے زیادہ اردو، فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات، انکے لطائف و ظرائف اور انتخابات کلام درج ہیں۔ یہ کتاب اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے اور ہر صاحب ذوق کی لائبریری میں اس کا رہنا ضروری ہے۔ تنہائی میں اس سے بہتر مونس، غمگینی میں اس سے زیادہ کامیاب ذریعہ تفریح اور اہل تحقیق کے لئے اس سے زیادہ مواد اس موضوع پر اور کہیں نہیں مل سکتا۔ حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات۔

قیمت مع محصول ڈاک للعمر (چار روپیہ) منیجر "نگار" لکھنؤ

ہماری فسانہ نگاری

اور

فسانۂ عجائب کے اجزائے ترکیبی

(بہ سلسلۂ سابق)

یہ مضمون بھی بہت پامال ہے اور طلسمی قصون مین اکثر جگہ پایا جاتا ہے۔ اسی صورت سے بہار دانش مین ملکزادہ کو مہر بانو کی خلخال مچھلی کے پیٹ سے ملی ہے اور اسی کے ذریعہ سے وہ منزل مقصود پر پہونچا ہے، اسطرح مصنف بہار دانش نے ملکزادہ کو ایک ہولناک جنگل مین پہونچا کر دیو سے کشتی کرائی ہے۔ اور اُسے سرحد عدم مین پہونچا کر پری نزاد کو رہائی دلائی ہے۔ وہان بجائے سفید دیو کے ایک وزیر زادہ کو ملکزادہ کا معین بنایا ہے۔

اسکے بعد انجمن آرا۔ اور جانعالم طوطے بنگئے ہین اور اُڑتے پھرے ہین۔ یہ وہی تبدیل قالب کا جادو ہے اور اس قسم کے واقعات مثنوی گلزار نسیم مین بھی موجود ہین

ملکہ مہر نگار ایک بادشاہ یا کسی رئیس کے قبضے مین پھنسی ہے اور اس سے معاہدہ ہوا ہے کہ برس دن تک اگر کوئی ڈھونڈھنے نہ آئے تو مین تیرے ساتھ شادی کرونگی۔ یہ معاہدات ایسی سرگشتہ شاہزادیان اکثر کرلیتی تھین اس قسم کی بہت سی کہانیان مشہور ہین جو قریب قریب ہر شخص نے سنی ہونگی

اسکے بعد اُس طوطے کی بدولت جو اول مین جانعالم کا رفیق تھا مہر نگار اور انجمن آرا اور جانعالم کی ملاقات ہوئی ہے۔ چنانچہ اسی قسم کی امداد طوطے نے بہار دانش مین کی ہے اور آخر کار وہی ذریعۂ ملاقات باہمی بن گیا ہے۔ نل ودمن کی خط وکتابت بھی طوطے ہی کی بدولت ہوئی ہے

اسکے بعد پورے قصہ مین ایک جگہ سردی کی شدت کا بیان ہے اور ختم ہے۔ رہنوردان عشق کو ایسے جنگل ملتے ہی رہتے ہین جہان وہ امت موسیٰ کی طرح سرگردان اور پریشان پھرا کرتے ہین۔ ان جنگلون مین کہین گرمی زیادہ ہوتی ہے کہین سردی۔ یہ کوئی نئی بات نہین ہے

فسانۂ عجائب کے درمیان مین جو حکایات لائی گئی ہین انکا طرز انوار سہیلی اور بہار دانش دونون سے ملتا ہے۔ مگر اسکو بہار دانش ہی کا صحیح تتبع کیا جاسکتا ہے۔ کوئی خاص جدت نہین ہے۔ غرضکہ یہ لحاظ نفس قصہ اول سے آخر تک کوئی نئی بات نہین ہے

عبارت کے لحاظ سے اُس زمانہ کی کتابون مین فسانۂ عجائب کا ایک خاص درجہ ہے۔ اور بغیر رعایت کہا جاسکتا ہے کہ سرور نے جس رنگ سے اس فسانہ کو تمام کیا اس کا جواب نہین۔ پھر بھی دو تین باتین اس مین ایسی ہین جنسے عبارت کی زیب وزینت کو ایک داغ لگ گیا ہے

(۱) مصنف کو نثر مقفےٰ کرنیکی فکر ہر وقت دامنگیر رہتی ہے اور اسکی وجہ سے قوافی مین رطب یابس سبھی بھر دیتا ہے۔ کوئی بات حسب موقع اور حسب حال ہو یا نہو مگر کبھی کبھی قافیہ کی مجبوری کی وجہ سے لانا پڑتی ہے اور اس سے صاف تصنع اور بناوٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ رنگ فسانہ عجائب کی عبارت مین اول سے آخر تک ہے مثال کے لیے چند فقرے چنکر پیش کرنا بیکار محض ہے کیونکہ یہ کوئی ایسی بات نہین ہے کہ اس کے لئے چند صفحات کافی ہون اسکے لئے ضرورت ہے کہ کتاب کو اول سے آخر تک پڑھا جائے ہلکی سی نظر فکر کے سامنے یہ سب کرشمے آجاتے ہین

(۲) بتانے والے بتاتے ہین کہ فسانۂ عجائب کی عبارت اُس زبان مین لکھی گئی ہے جو خاص بیگماتی یا شاہی زبان ہے حالانکہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے۔ سرور نے گو اسکی کوشش کی ہے۔ مگر وہ متوسط فرقہ کی زبان سے آگے او سکو بڑھا نہین سکے۔ اور بعض جگہ تو اسدرجہ گر گئے ہین اراذل و ادانی کی زبان کو بھی مات کر دیا ہے مطلق یہ خیال نہین رکھا کہ یہان کیا کہنا چاہئے اور کیا کہتے ہین۔ وہ دکھاتے ہین کسی شخص کو فرقۂ اعلی مین سے مگر اوسکی گفتگو ایسی بےموقع اور خلاف امید ہوتی ہے کہ کتاب کا درجہ اس سے پست ہو جاتا ہے۔ مثلاً چند فقرے ملاحظہ فرمائیے۔ جانعالم ہزارون تمناؤن لاکھون آرزوؤن کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ وہان سرور اسکی خوبصورتی کے بیان مین رطب اللسان ہین۔ مگر ساتھ ہی ایک ایسے بچہ کے لئے جسے پیدا ہوئے ابھی دو گھنٹے بھی نہین گزرے یہ فقرے بھی لکھ جاتے ہین "کاسہ سر سراسر شور جوانی زور شباب سے معمور۔ آنکھین جھپکانے والی دیدۂ غزال ختن کی شراب عشق کے نشے سے چکنا چور،، اسی طرح ایک جگہ جہان جادوگرنی بیان کرتی ہے کہ لے جانعالم مین مدتون سے تیری شیدا تھی وہان یہ بھی کہتی ہے کہ "آج لات و منات کی مدد سے تو میرے قابو مین آیا،، حالانکہ لات و منات کو جادو سے کوئی تعلق اور واسطہ نہین۔ یا۔ اسی جادوگرنی سے جب شاہزادہ یہ کہتا ہے کہ مین تیرے پاس رہون تو کیونکر رہون مین محض انجمن آرا کے لئے گھر سے نکلا ہون حکومت کی مجھے پروا نہین ہے وہان شہزادہ کے منہ سے یہ فقرہ نکلا ہے۔ "اللہ کی عنایت سے گھر کی حکومت چین کرنے کو کافی تھی،، یہ وہ فقرہ ہے کہ شاہزادہ تو شاہزادہ ایک رئیس بلکہ ایک متوسط درجہ کا آدمی بھی نہین کہہ سکتا۔ ایسے ہی جادوگرنی نے جسوقت شاہزادے کو تعویذ دیا ہے تو اُس سے کہا ہے کہ تو یہان اکیلا رہتا ہے "ڈرتا ہوگا۔ تو سرور شاہزادے کی شجاعت کے تمام گذشتہ افسانے بھول جاتے ہین اور شہزادے کی زبان سے یہ زنانے جملے کہلا دیتے ہین "کوئی ہمین مار ڈالے تو دن بھر مفت مٹی خراب رہے،، ایک تو یہ کہنا کہ کوئی ہمین مار ڈالے دوسرے یہ کہ دن بھر مٹی خراب رہے۔ کچھ ایسے ہین جنکی کوئی گنجائش ایسے محل پر نہین

جادوگرنی نے شہزادے کو ایک نقش سلیمانی دیا کہ اسے بازو پر باندھ لو اُسنے باندھ لیا۔ ایک روز جو اتفاق وقت سے اُسکو کھولکر دیکھا تو اُس کا یہ نقشہ تھا "بست در بست کا نقش۔ ہر خانے مین اسمائے الٰہی مع ترکیب و تاثیر تحریر تھے۔ دیکھتے دیکھتے خانہ مطلب مین نظر پڑی۔ لکھا تھا کوئی شخص کسی ساحر کی قید مین اگر ہو یہ اسم پڑھے نجات پاوے،، ہمارے نزدیک یہ بالکل نئی بات ہے کہ نقش مین یہ باتین درج ہون۔ اس طرح سے تو کوئی عمل کی کتاب ہو سکتی ہے نہ کہ نقش کی یہ ایک غلطی ہے۔ اور سخت غلطی ہے۔

ملکہ مہر نگار شاہزادے سے کہتی ہے۔ کہ میرے باپ نے ہر چند مجھسے شادی کو ارشاد کیا مینے بسبب مفارقت انکار کیا۔ اب فتنۂ آفت آسمانی و بلائے ناگہانی مجھپر ٹوٹ پڑی کہ بیک نگاہ عاشق کیا دیوانی ہو گئی،، جہانتک خیال کیا جاتا ہے آخری فقرے ایک شاہزادی ورد بھی

ناکتخدا کبھی نہین کہہ سکتی۔ اور پھر وہ بھی ایک ایسے اجنبی شخص سے جو صرف ایک رات رہا ہو

ملکہ مہر نگار اپنے باپ کی تعریف کرتی ہے۔ کہ ''ہر چند ظل سبحانی عامل بے بدل ساحر بے مثل ہین۔ علوی سفلی سب کچھ پڑھا لکھا''۔ علوی سفلی کا پڑھنا لکھنا اس بات سے بھی زیادہ عجیب ہے کہ ظل اللہ عامل بھی ہین اور ساحر بھی۔ درویش متشرع مسلم بھی ہین۔ اور جادوگر زندیق اور کافر بھی

جانعالم جب ملکہ مہر نگار سے رخصت ہوتا ہے تو ملکہ وہ فقرے فرماتی ہین جو بزرگ اپنے چھوٹون کے پردیس جانے کے وقت کہتے ہین ''جس طرح بیٹھ دکھاتے ہو اسی صورت اللہ تمھارا منھ دکھائے''

جانعالم جب شہر زرنگار مین پہونچا ہے تو وہان کے بازار کی آب و تاب لکھتے ہوئے مصنف یہ مبالغہ آمیز فقرہ لکھتا ہے ''کوئی شے کسی طرح کا اسباب ایسا نہ تھا کہ اس بازار مین نہ تھا مغرب و مشرق کی اشیائے نادرہ کا ہر جا انبار تھا'' یہ لکھکر اشیائے نادرہ کا بیان اس صورت سے کیا جاتا ہے۔ حلوائی۔ نان بائی۔ کنجڑے۔ قصائی۔ سقون کے کٹورون کی جھنکار میوہ فروشون کی پکار۔ دلالون کی بول چال وغیرہ وغیرہ مگر اشیاء نادرہ کا کوئی ذکر نہین ہے

شہزادہ جب انجمن آرا کے چھوڑانے اور جادوگر سے لڑنے کے لئے چلا ہے۔ اور انجمن آرا کی مان کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ کوئی ایسا حسین شہزادہ انجمن آرا پر عاشق ہو کر آیا تھا اور وہ جادوگر سے لڑنے جاتا ہے۔ تو وہان مصنف لکھتا ہے ''انجمن آرا کی مان در دولت برا برچلی آئی'' سمجھ مین نہین آتا کہ وہ بیگم کسقدر شریف اور عفت مآب تھی اسکے بعد مصنف نے یہان وہ سمان دکھایا ہے کہ جیسے ایک داماد کی متمول سسرال مین تواضع ہوتی ہے جسکا بظاہر کوئی محل نہین ہے۔

جادوگر کے قبضے سے چھوڑانے کے بعد انجمن آرا کی پہلی ملاقات جانعالم سے ہوئی۔ یا تو جانعالم وہ شریف اور ضابطہ عاشق تھا کہ فرشتے اُسکے دامن پر نماز پڑھتے تھے یا انجمن آرا کو دیکھتے ہی بالکل بدحواس ہو گیا وہان مصنف لکھتا ہے کہ ''ہر چند ضبط کیا نہ ہو سکا۔ تھراتا۔ دم چڑھاتا۔ دوڑ دوڑ کر گرد پھرنے لگا لڑکھڑاہٹ سے گرنے لگا'' اسیطرح یہ کہ انجمن آرا ایسی شریف۔ بھولی شرمیلی لڑکی جسکا کیرکٹر مصنف نے ہمیشہ بہت ہی شرمیلا دکھایا ہے۔ پہلی ہی ملاقات مین باوجود اس دیوانگی کے جان عالم پر عاشق ہو گئی۔ اسجگہ مجھے بیساختہ نصیبی کا یہ شعر یاد آتا ہے

زندہ در عشق چسان بود نصیبی مجنون بیش ازین عشق مگر اینہمہ دشوار نبود

(اے خدا کیسے تھے وہ رقیق القلب۔ اور جلد باز عاشق۔ آج تو ایک کا بھی جلوہ نظر نہین آتا) مگر آگے چلکر مصنف کو تنبہ ہو جاتا ہے اور فوراً کہتا ہے کہ انجمن آرا نے یہ حرکتین دیکھکر جانعالم سے شرما کر سر جھکا کر کہا سنبھلو صاحب کچھ پاس و لحاظ بھی کسی کا نہین'' اللہ اکبر کیا عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثال کوئی اس سے زیادہ مل سکتی ہے۔ کیا ایک شاہزادی کی یہ گفتگو بیباکانہ تسلیم کیجائیگی

اسکے بعد بھی انجمن آرا سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُسنے شاہزادہ کا جو بے ہوش تھا۔ سر اپنے زانوے ناز نین پر رکھ لیا۔ اور جب جانعالم کو ہوش آیا تو اسنے زانو ہٹا لیا۔ مگر اس جگہ جانعالم نے جس رذالت اور شہدے پن کا ثبوت دیا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے یعنی ''یہ کہہ کے آنکھین بند کر لین کہ پھر ہمین غش آیا تمنے زانو کیون سرکایا اسپر بی انجمن آرا چڑھ گئین کھسیا گئین۔ اور ایسا جواب دیا کہ

تڑاق سے کہا کیا خوب اتنا اختلاط میری چڑھ ہے۔ مین نے تیری محنت اور مشقت پر نظر کرکے یہ انسانیت کی حرکت کی تھی۔ تم چل نکلے۔ خدا جانے دل مین کیا سمجھے۔ اپنی راہ لیجئے۔ چلتا دھندا کیجئے واہ واہ نیکی بر باد گنہ لازم،، انجمن آرا کے یہ بازاری فقرے۔ چل نکلے۔ چلتا دھندا کیجئے اپنی راہ لیجئے وغیرہ۔ ایسے ہین کہ کوئی شریف نوجوان لڑکی نہین کہہ سکتی۔ اسپر حضرت جانعالم کے یہ سوقیانہ جواب اور پھکڑ مذاق اور بھی سونے مین سہاگے کا عالم دکھاتے ہین "وہ چور کی داڑھی مین تنکا۔ تمھین اپنا عاشق کبھی نہ سمجھون گا۔ نہ معشوقون کے دفتر مین آپ کا چہرہ لکھونگا" خیر اسپر بھی اگر بس کرتے تو خیر۔ مگر سرور مرحوم انجمن آرا سے یہ بیسواؤن کے سے فقرے بھی کہلاتے ہین۔ "وہ چہ خوش بھلا دل تو بہلا لو۔ کچھ ہو یا نہ ہو زبان کا مزا نکالو۔ یہ تو وہی مثل ہوئی "مان نہ مان مین تیرا مہمان"، عشق اور عاشقی کی باتین میری بلا جانے۔ رمز و کنایہ کسی اور سے جاکے کرو۔ اپنا چوچلا تہ کر رکھو۔ اپنی صورت تو غور سے دیکھو تمنے سنا نہین۔ حلوا خوردن را روے باید،، انجمن آرا کی اس تقریر کو پڑھکر یہ معلوم ہوا کہ بھٹیاریان سرائے مین لڑ رہی ہین اسپر میان جانعالم کا یہ ارشاد سبحان اللہ و بحمدہ۔ کیا کہنا۔ گویا صاف انجمن آرا کی عفت پر حملہ ہے "ہم مین بیچارہ خستہ تن۔ غربت زدہ دور از وطن مہنت پن کہان سے لاؤن کیون کر ویسی صورت بناؤن۔ ایک منہ تاکر ایک وتا ہے۔ کفر و اسلام مین بڑا فرق ہوتا ہے۔ تمھین ابھی تک موہن بھوگ کا ذائقہ نہین بھولا ہے دم تقریر زبان پر حلوا ہے"

مگر انجمن آرا بھی ایسی ڈھیٹ تھی کہ کسی طرح خاموش نہین ہوتی کہتی ہے "وہ کہا چلو صاحب وہ مواقربان کیا تھا۔ اپنی چونچ بند کرو کٹی جلی کی ہنسی اپنے گھر جاکر کرو،، یہ وہ باتین ہین جنھین سرور کے قلم نے ایک شاہزادی کے بجائے ایک بیسوا کا کیرکٹر دکھایا ہے اور جانعالم کو بجائے ایک شریف کے اچھا خاصہ لچا غنڈا بدمعاش بنا کر دکھایا۔

جسوقت انجمن آرا کو مانجھے بٹھایا گیا ہے یا منگنی کی گئی ہے وہان تو سرور کے قلم نے وہ انوکھی باتین لکھی ہین کہ کیا کہا جائے۔ اراذل اور اوانی کے یہان بھی وہ باتین نہین ہوتین۔ اوّل تو بیگمات مین ان رسوم کا دستور کہان ہے۔ اور اگر ہے تو اسقدر بیحیائی مان کے ملتجیانہ سوال کا ایسا بے باکانہ جواب انجمن آرا ہی کا کام تھا۔ سرور لکھتے ہین "وہ اُسنے پہلے بیٹی کو گلے سے لگایا۔ پیار کیا۔ پھر کہا سنو پیاری دنیا کے کارخانے مین یہ رسم ہے کہ بادشاہ کے گھر سے فقیر تک بیٹی کسی کی مان باپ پاس ہمیشہ نہین رہتی۔ اور غیرت دار کے گھر مین لڑکی جوان۔ ہر وقت رنج کا نشان خفت کا سامان ہے اور خدا و رسول کا حکم بھی یہی ہے۔ کہ جوان کو ٹھانہ رکھو۔،، بھلا خیال تو کیجیے کہ ایک مان اور مان بھی ملکہ۔ کیونکر یہ باتین اپنی بیٹی سے کہہ سکتی ہے۔ یہ باتین تو شریف غریب لوگون مین بھی نہین ہوتین۔ جن فقرون کے خط کھینچا گیا ہے اونکو بار بار پڑھیئے اور سمجھیئے

آگے چلکر مان اپنی بیٹی کو جتاتی ہے کہ ایک شخص تجھپر عاشق ہے۔ اور تجھسے زیادہ خوبصورت ہے۔ اسپر انجمن آرا رد کر کہتی ہے کہ صورت شکل کا کیا ذکر ہے،، مان بیٹیون مین یہ باتین کسقدر فطرت سے دور معلوم ہوتی ہین اور کسقدر بیحیائی ان مین کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے۔

اسی وقت انجمن آرا اپنی مان سے یہ بھی کہتی ہے "خدا جانے وہ کون ہے کہان سے آیا ہے اپنے منہ سے میان مٹھو شہزادہ بنا یا ہے۔ آپکی لونڈی ہون بہر صورت فرمانبردار ہون اگر کنوئین مین جھونک دو چاہ سے گر پڑون اُف نکرون مگر جو آپ اوسکی شکل پر ریجھ محنت و مشقت کو

سمجھ بوجھ یہ مقدمہ کیا چاہتی ہین تو مین راضی نہین،، اس عبارت کا ایک فقرہ انجمن آرا کی بیباکی اور ناہمواری کا پتہ دیتا ہے۔
اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر آوارہ رہی ہے

اسپر ستم بالاے ستم یہ ہوتا ہے کہ مغلانیان وغیرہ سمجھاتی ہین۔ اونکی بھی فقرے وہی حماقت آمیز دور از عقل ہوتے ہین جو فقرہ ارادل مین رائج ہین ملاحظہ ہون " قربان جاؤن واری ماں باپ کی عدول حکمی خدا اور رسول کی نافرمانی ہوئی ہے تمھین انکار مناسب نہین۔ اور خدانخواستہ یہ کیا تمھارے دشمن ہین جو راہ چلتے کے حوالے کسی کے کہے سنے سے بے دیکھے بھالے کر دینگی،،

رسم زمانہ کے موافق سرور نے شب عروسی کا سمان بھی دکھایا ہے مگر وہ حیاسوز منظر ہے کہ صاحبقران اور جان صاحب کے دیوانون مین نظر نہین آتا۔ مین اسپر کوئی تنقید کرنا نہین چاہتا صرف عبارت نقل کرتا ہون اور خط کھینچتا ہون

" خواہش کو اضطرار، حیا مانع کار، شرم پیر تکرار دونون کے دم چڑھ گئے تھے جنگ زرگری کا ڈورِیان کر رہے تھے۔ شہزادی موقع پر ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ بے بس آجاتی تھی تو چٹکیان لیتی تھی۔ گاہ کہتی تھی اتنا کوئی گھبراتا ہے دیکھو تو کون آتا ہے۔ کبھی خود اٹھ کے دیکھتی بھالتی تھی کوئی دم یون ٹالتی تھی۔ اسی موقع پر سرور نے فردوسی کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے

چنان پردہ آورد و آورد و برد		کہ دایہ زحسرت پس پردہ مرد

رشک وحسرت سے جگر صدف چاک ہوا دشمن کمبخت در پردہ ہلاک ہوا

تقاضاے سن، الھڑپنے کے دن اُسوقت دونون گھبراے اور وہ کیفیت سب بھولی جب دامن سب مین چادر پلنگ پر شفق صبح پھولی۔ صبح ہوئی تو دولہا دولھن اُٹھے۔ اوس موقع پر سرور نے نہایت ہی رکیک الفاظ استعمال کئے ہین اور پھر لطف یہ کہ یہ الفاظ نہ صرف رکاکت پر مبنی ہین بلکہ ادنیٰ وہی بازاریت اور متوسط بلکہ ادانی کی زندگی کا نمونہ پایا جاتا ہے

" نمود سحر ہوئی، عام شب کی خبر ہوئی۔ دم صبح ایک سرخرو، دوسرا ژولیدہ مو۔ حمام مین داخل ہوئی۔ جو جو محرم راز شریک نوردگداز تھین انھون نے رات کی باتون کے پتے رمز و کنائے مین دئے۔ سب نے قہقہہ مارا۔ جب رو برو نیچیری اور تمبول آیا شرما کے سر جھکایا۔

آخری فقرے تو بالکل اُس رنگ مین رنگے ہین جو معمولی لوگون کے گھروں مین ہوتا ہے۔

جان عالم جب انجمن آرا کو لیکر رخصت ہوا تو پہلے مہرنگار کے شہر مین پہونچا تمام حشم وخدم، فوج ولشکر ساتھ تھی ایک جنگل مین قیام کیا۔ تب ملکہ کو خبر ہوئی۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے فوج کی فوج آئی اور ملکہ کو خبر نہوئی سبحان اللہ۔ پھر معلوم کرنے کے لئے عام عورتون کی طرح تماشا دیکھنے کوٹھے پر چڑھ گئی تب خبر ہوئی۔ کیا جان عالم استقبال نہ تھا۔ کہ خبر کر دیتا اور مہرنگار کیسی امیرزادی تھی کہ کوٹھے پر سے عام لوگون کی طرح دیکھنے گئی۔ یہان کی عبارت یہ ہے

"بارہ دری سے نیچے اُتری پھر کہا خدا جانے یہ لشکر کہان سے آکر اترا ہے۔ بلکہ ہنسکر بحیلہ سیر خواصون کے کندھون پہ ہاتھ دھر کوٹھے پر چڑھی جان عالم مہرنگار کے مکان پر معہ انجمن آرا آیا۔ دو نو نوجوان شاہزادیون کی گفتگو ہوئی۔ مگر وہ گفتگو جو بالکل بے موقع ہے اور بازاری عورتون مین بھی شاید ایسی گفتگو ہوتی ہو،،

"ملکہ آبدیدہ ہوکر بولی تمنے مجھے محجوب کیا۔ مین فقیر کی بیٹی تم شہزادے ہرچند شاہ وگدا دونون بندہ خدا ہین الا تمھارے قدم آنکھون پر رکھون تو بجا ہے۔ آپ کے آنے سے مجھے بڑا افتخار حاصل ہوا ہے۔ انجمن آرا بولی ہم نے خوب کیا رنڈی یہ چوچلے کی باتین بیگانہ وار نکرتی تو کیا ہوتا اے صاحب ہمارے تمھارے تو رشتہ ہمسری سر رشتہ برابری ہے اور حساب کی راہ سے پہلے تو سلامتی سے تمھین ہو سرکار کا اُنس ہمین ملا ہے۔ پہلے مزا آپ نے چکھا ہے۔ جوبن لوٹا ہے"

واضح ہو کہ یہ وہ انجمن آرا ہے جسکا کیرکٹر ہمیشہ مصنف نے نہایت ہی شرمیلا دکھایا ہے اور مہر نگار کے مقابلے مین ہر جگہ اوسکو بھولا بھالا ثابت کیا ہے

ملکہ مہر نگار کا باپ جب بعد نکاح ملکہ کو رخصت کرتا ہے تو شاہزادے سے وہ باتین کرتا ہے جو بالکل چھوٹے لوگون مین ہوتی ہین ایک ایسے بادشاہ سے جو فقیر ہو گیا ہو یہ باتین اچھی نہین معلوم ہوتین۔ وہ کہتا ہے

"فقیر زادی کو کنیز عزیز جان کر نظر الطاف وکرم ہردم رکھنا۔ یہ بھی خدمتگذاری مین قصور نکریگی اسے تمکو سونپا تمھین حافظ حقیقی کے سپرد کیا۔ لو خدا حافظ"

جب وزیرزادہ جانعالم کو توائے سراپردۂ خاص مین لیگیا۔ اس جگہ مصنف لکھتا ہے۔ "جتنی جلیسین انیسین مہ جبینین دونون شہزادیون کے ہمراہ تھین اسے دکھا فرمایا جس طرف تیری رغبت ہو دلوا دون وہ نطفۂ حرام اور خیال مین تھا غش کرینگا"

چونکہ وزیرزادہ شاہزادے کا دخیل صحبت تھا تو دونون شہزادیون نے ان عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ سے شاہزادہ کو سمجھایا۔ "ہر دم ایک شخص غیر اور جوان کو شریک صحبت خلا ملا رکھنا کیا مناسب ہے۔ اور آداب سلطنت سے بھی یہ امر بعید ہے شیطان کو انسان دور بجانے۔ غیر تو غیر اپنے کا کیا اعتبار"

جب وزیرزادہ جانعالم کے قالب مین آگیا ہے۔ اور خیمہ مین آنے سے ملکہ کو کچھ شبہہ ہوا ہے تو اُسنے انجمن آرا سے وہ کلمے کہے جو عوام بھی نہین کہتے۔ "خدا خیر کرے آج بہت شگون بد ہوئے تھے صبح سے دہنی آنکھ پھڑکتی تھی راہ مین ہرنی اکیلی رستہ کاٹ میرا منہ تکتی تھی۔ اپنے سایہ سے بھڑکتی تھی خیمے مین اترتے وقت کسی نے چھینکا تھا۔ خواب متوحش نماز کے وقت دیکھا تھا"

وزیرزادہ بصورت شہزادہ جب ملکہ کے خیمہ مین پہونچا تو ملکہ نے پوچھا آج کہان آرام کروگے۔ ملکہ نے کہا یہین سو رہو۔ یہ بھی عجیب عامیانہ جملہ ہے جو ملکہ کی زبان سے نہین نکل سکتا۔

جب شاہزادہ جان عالم کو بصورت بوزنہ بادشاہ کے دربار مین لے چلے ہین تو ملکہ مہر نگار جھروکہ سے جھانک رہی تھی۔ اُسوقت ہزارون آدمیون کے مجمع مین وہ اُسی جھروکے سے فرماتی ہین "ایک دم ٹھہر جائین اسکی تقریر کی مشتاق ہون" سوداگر نے ہاتھی روکا ملکہ نے کہا اے مقرر بے زبان گم کردہ خانمان اگرچہ اب ہم کس لایق ہین۔ مگر تیری داستان ظلم وجور کے شایق ہین" دیکھنا یہ ہے کہ کیا کوئی شاہزادی کوٹھے پر تماشا دیکھنے کے لئے بیٹھ سکتی ہے اور کیا اتنے مجمع مین اسکو یہ کہنے کی جُرات ہو سکتی ہے۔ اور کیا اُسکی زبان سے یہ لفظ اچھے معلوم ہوتے ہین "کہ اب ہم کس لائق ہین"

جہان شاہزادہ جان عالم کا جسم معہ لشکر کے نصف پتھر کا ہو گیا ہے اور تمام لشکر مصیبت مین مبتلا ہے وہان مصنف کے یہ فقرے کسقدر برمحل معلوم ہوتے ہین "وہ رنڈیون کی زاری انجمن آرا کی بیقراری علی الخصوص ملکہ کے بیان سے زمین و آسمان کا نپتا تھا"

رنڈیون کا لفظ، اور ملکہ کا بین (بیان) کرنا علی الخصوص قابل داد ہین۔

جسوقت لشکر اس رنج و محن مین مبتلا ہوا ہے اتفاقاً ایک شاگرد ملکہ کے باپ کا پہونچا ہے اور وہ ملکہ کے خیمہ کے پاس آیا۔ وہان سرور ملکہ کی زبان سے یہ فقرے ادا کراتے ہین "بھائی اسوقت پردہ کہان کا"، یہ فقرے بالکل معمولی لوگون کے ہین

پیر مرد ملکہ مہر نگار کے باپ کا کیرکٹر مصنف نے ہر جگہ یہ دکھایا ہے کہ وہ ایک مرد فقیر مہذب قانع آدمی ہین، مگر وہ جب جادوگرنی سے لڑنے گئے تو یہ سوقیانہ گفتگو کرنے لگے۔ ملاحظہ ہو

"اے ننگ فرقۂ بنی آدم مردود عالم تجھے جوش شہوت و لولۂ مباشرت نے آمادہ قتل ہزارہا بندگان اللہ بے جرم و گناہ کیا ہین مرگ عزیزان دیکھون مرنے سے ڈرون۔ بقول تیرے آج نہ موا کل مر جاؤنگا" ایسے ہی جب وہ جادوگرنی پر فتحیاب ہو چکا تو کہنے لگا۔ کہ "اسکا باپ شہنشاہ جادوان ہے کوئی دم مین ضرور آئے گا بکھیڑا مچائیگا" آخری فقرہ بالکل عوام کے رنگ مین رنگا ہوا ہے

اسیطرح اس مرد فقیر نے جادوگرنی کے باپ سے یہ گفتگو کی "جسکا خون زمین پر گرے گا۔ اسکا مظلمہ مواخذہ تیری بیٹی جو فاحشہ تھی اسکی گردن پر ہوگا ہم سمجھے تھے وہی ننگ خاندان تھی اب معلوم ہوا ایسون کے ویسے ہی ہوتے ہین تجھے سفید داڑھی کی شرم نہ آئی کہ وہ مرے تیر اکلنک کا ٹیکا مٹا" جو جو عامیانہ فقرے ہین وہ خود پکار رہے ہین مینے صرف خط کھینچ دیا ہے

جان عالم سیر دریا کے لئے جا رہا ہے۔ اور وہ ملکہ مہر نگار سے کہتا ہے "چلتی ہو"، ملکہ کہتی ہے "آپکو اور لہرائی نیا ڈھکوسلا سوجھا" ایک شوہر پرست ملکہ کی شاہزادے سے یہ گفتگو۔ یا شاہزادے کی یہ عامیانہ گفتگو کہ چلتی ہو کسقدر نازیبا ہے

ملکہ مہر نگار ایک شاہزادے کے یہان کشتی شکستہ ہو کر پہونچی ہے اُسنے بہت تواضع اور خاطر کی ہے اور مستدعی ہوا ہے کہ ملکہ اُس سے شادی کرے، جب بہت مُصر ہوا تو ملکہ نے یہ فقرے کہے۔ جو بیحد عامیانہ ہین، اور ہر گز ایک ایسی عقلمند جلیل القدر شاہزادی کی زبان سے اچھے نہین معلوم ہوتے "جو میری خوشی چاہے تو برس روز کی مہلت دے اس عرصہ مین اگر کوئی ڈوبا تِرا میرے وارثون کا پتا ملا"

غرضکہ فسانہ عجائب اسی قسم کے۔ ناموزون فقرون۔ اور جملون سے بھری ہوئی ہے مصنف کو ایک جگہ بھی یہ خیال نہین رہتا کہ وہ کہان کا حال لکھ رہا ہے۔ اور کیسے جملے اُسکے قلم سے نکل رہے ہین۔ کن رسوم کا وہ ذکر کرتا ہے۔ اور کیا اُس کو ذکر کرنا چاہئے۔ غیر مہذب جملون کا طوفان قدم قدم پر امنڈ رہا ہے یہانتک کہ وہ جادوگرنی اور شاہزادے کے حال مین یہ جملے بھی لکھ گئے ہین "یہ کہکے گردن مین ہاتھ ڈالدیا وہ قحبہ تو ... بھوکے بیٹھی تھی لپٹ گئی۔ ناچار خاطر افگار اوس تیرہ بخت کا منہ کالا کر کے ہاتھ منہ دھو اُسکے ساتھ سو رہا۔ وہ حرّہ حرافہ بد مست لیٹتے ہی جہنم واصل ہوئی" اسکے بعد ہم تیسرے جزو کی طرف توجہ کرتے ہین۔ جنمین بعض داستانون مین سرور نے نظم کو نثر کا جامہ پہنا دیا ہے اور میر حسن کی محنت کو خاک مین ملا کر خود اُسکے مالک بن بیٹھے ہین۔ چنانچہ جہان بے نظیر کے پیدا ہونے سے پہلے بادشاہ نے نجومیون سے دریافت کیا ہے وہان میر حسن نے یہ سمان دکھایا ہے

یہ سنکر وہ رمال طالع شناس
لگا دھیان اولاد کا اُس کے ساتھ
جماعت نے رمال کی عرض کی
تو ایک ایک نقطہ ہے دو دو خوشی
نجومی بھی کہنے لگے در جواب
عمل اپنا سب کرچکا ہے زحل

لگے کھینچنے زایچے بے قیاس
جو پھینکین تو شکلین گئین بیٹھ بل
کہ ہے گھر مین امید کی کچھ خوشی
زن و زوج کی شکل مین ہے فرح
کہ ہم نے بھی دیکھی ہے اپنی کتاب
ستارے نے طالع کے بدلے ہین طور

دھری تختی آگے لیا قرعہ ہاتھ
کئی شکل سے دل گیا اون کا کھل
بیاض اپنی دیکھی جو اس رمل کی
بیاں کرئے وصل کا تو فرح
نحوست کے دن سب گئے ہین نکل
خوشی کا کوئی دن مین آتا ہے دور

نظر کی جو تسدیس و تثلیث پر
تو دیکھا کہ ہے نیک سب کی نظر

کیا پنڈتون نے جو اپنا بچار
تلا اور برچھک پہ کر کے نظر
نکلتے ہین ابتو خوشی کے بچن
کہ آیا ہے اب پانچوان آفتاب
مقرر ترے چاہئے ہو پسر
کہ ہین اس بھلے مین برے طور بھی
نہ آوے یہ خورشید بالائے بام
رہے برج مین یہ مہ چاردہ
کہا جان کی سب طرح خیر ہے
کوئی اُسکی معشوق ہو استری

تو کچھ انگلیون پر کیا پھر شمار
کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا
نہو گر خوشی تو نہون برہمن
نصیبون نے کی آپ کے یاوری
کہ دیتی ہے یون اپنی پوتھی خبر
یہ لڑکا تو ہوگا وے کیا کہین
بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام
کہا سنکے شہ نے یہ اُنکے تئین
مگر دشت غربت کی کچھ سیر ہے
کچھ ایسا نکلتا ہے پوتھی مین اب

جنم پترا شاہ کا دیکھکر
چندرمان سا بالک ترے ہوئے گا
مہاراج کے ہون گے مقصد شتاب
کہ آئی ہے اب پانچوین مشتری
ولیکن مقدر مین کچھ اور بھی
خطر ہے اسے بارھوین سال مین
نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مہ
کوجی کا خطرہ تو اسکو نہین
کوئی اسپہ عاشق ہو جن و پری
خرابی ہو اسیر کسی کے سبب

سرور نے اسی مین اپنی ضرورت کے موافق تراش خراش اور رد و بدل کر کے جان عالم کے پیدا ہونے کے وقت یون لکھا ہے۔

در نجومی۔ پنڈت۔ جفردان۔ حاضر ہوے بہت سوچ بچار کر کے برہمنون نے عرض کیا۔ مہاراج کا بول بالا، جاہ و حشم، مرتبہ دوبالا اعلیٰ رہے ہماری پوتھی کہتی ہے۔ بھگوان کی دیا سے شہزادے کا چندرمان بلی ہے۔ چھٹا سورج ہے جو گرہ ہے سو بھلی ہے دیگ نیگ کا مالک۔ دھرم مورت یہ بالک رہے"

اسی کے بعد جیسا کہ بدر منیر مین نجومیون نے بینظیر کی آوارگی کا پتہ دیا ہے اسی طرح سرور نے جان عالم کی صحرا نوردی کا مذکور کیا ہے "مگر پندرھوین برس مشتری بارھوین آئیگی سنیچر پاؤن پڑے گا" گسیان کی کرپا سے جان کی کھیر ہے۔ بڑی بڑی ہرنی کی سیر ہے"

اسمین شک نہین کہ سرور نے اس داستان کو بہت بڑھا کر اور اپنے قصہ کیموافق بنا کر لکھا ہے مگر یہ سب خیالات مثنوی میر حسن ہی سے لئے گئے ہین۔ اگرچہ الفاظ مین رد و بدل کر دیا گیا ہے۔ اور نثر کی آزادی نے اُن خیالات مین بھی اضافہ کر دیا ہے مگر اصل ماخذ سے کسی طرح انکار نہین ہو سکتا۔ سرور لکھتے ہین۔

"ایک سمت درخت گنجان چشمہ ہاے آب روان دیکھکر جا بیٹھا"

میر حسن بھی اسی عالم مین جبکہ شاہزادہ بدر منیر کے باغ مین پہونچا ہے لکھتے ہین

تھے اک طرف گنجان باہم درخت　　کہ لپٹے ہون جس طرح مشتاق سخت
لگا وان سے چھپ چھپ کے کرنے نظر　　درختون سے جون ماہ ہو جلوہ گر

اسکے بعد مین دونون نے اپنے اپنے طرز پر اُس منظر کی الفاظ مین تصویر کھینچی ہے مگر جہان بینظیر نے بدر منیر کو۔ اور جان عالم نے ملکہ مہر نگار کو دیکھا ہے اور ایک خاص عالم طاری ہوا ہے اُسکے الفاظ بالکل مل گئے ہین۔ اور یقینی اُسکے موجد میر حسن ہین۔ ملاحظہ ہو

سرور کہتے ہین "یہ تو مدتون کا مسافت دیدہ مسافرت کشیدہ تھا۔ وہ زمین خجستہ اُنہین بہت پسند آئی"

میر حسن۔　　ملی جنس کی اپنے جو اسکو بو　　لگا تکنے حیرت سے ہر ایک سو

یہ صدا جو اہتمام سواری آگے آگے کرتی تھین اونکے کان مین پڑی اور نگاہ جمال جان عالم سے لڑی

میر حسن کہتے ہین　　جو دیکھے تو ہے اک جوان حسین　　درختون کی ہے اوٹ مین مہ جبین
　　یہ چرچا جو پھیلا تو ظاہر ہوا　　ہر اک حال سے اُس کے ماہر ہوا

سرور کہتے ہین۔ سب لڑکھڑا کر ٹھٹک گئین۔ کچھ سکتے کے عالم مین سہم کر جھجک گئین۔ کچھ بولین اِن درختون سے چاند نے کھیت کیا ہے۔ کوئی بولی نہین ری سورج چھپتا ہے۔ کسی نے کہا غور سے دیکھ ماہ ہے۔ ایک جھانک کر بولی باللہ ہے۔ ایک نے غمزے سے کہا چاند نہین تو تارا ہے۔ دوسری جنکی بکے بولی اچھال چھکا تو بڑی خام پارا ہے۔ ایک بولی سرو ہے یا چمن حسن کا شمشاد ہے۔ دوسری نے کہا تیری جان کی قسم پرستان کا پریزاد ہے۔ کوئی بولی غضب کا دلدار ہے کسی نے کہا دیوانیو چپ رہو خدا جانے کیا اسرار ہے۔ ایک نے خوب جھانک تاک کے کہا خدا جانے تم سب کے دیدون مین چربی کہان کی چھا گئی ہے یہ تو بھلا چنگا ہٹا کٹا مرد وا ہے

اَب دیکھئے میر حسن بالکل یہی تصویر دکھاتے ہین اور معلوم ہوتا ہے کہ سوائے چند الفاظ کے سرور بھی کوئی فرق نہ دکھا سکے

یہ سن ایک سے ایک وان سب کی سب　　پھرین برگ گل کی طرح غنچہ لب
جو دیکھین تو شعلہ سا روشن ہے کچھ　　درختون کا روشن سا آنگن ہے کچھ
کسی نے کہا کچھ نہ کچھ ہے بلا　　کسی نے کہا چاند ہے یا ن چھپا
کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن　　کسی نے کہا ہے قیامت کا دن
لگی کہنے ماتھا کوئی اپنا کوٹ　　ستارا پڑا ہے فلک پر سے ٹوٹ

ہوئی صبح سب اُٹھ گیا یہ حجاب — درختون مین نکلا ہے یہ آفتاب
کسی نے کہا دیکھیو اے ہوا — کھڑا ہے کوئی صاف یہ مرد وا
کسی نے کہا یہ تو دلدار ہے — کسی نے کہا کچھ یہ اسرار ہے

اسکے بعد سرور لکھتے ہین

"سواری جو رُکی، ملکہ نے پوچھا خیر ہے" سب نے ملکہ کو بتایا اور ملکہ آگے بڑھی۔ اسی کو میر حسن کہتے ہین

گئی بات یہ شاہزادی کے گوش — یہ سنتے ہی جاتا رہا اسکا ہوش
کہا مین تو دیکھون یہ کہکر اُٹھی — گیا سنناجی تورہ کر اُٹھی
خواصون کے کاندھے پہ رکھ اپنا ہاتھ — عجب اک ادا سے چلین ساتھ ساتھ
کچھ اک خوف سے ہول کھاتی ہوئی — دھڑک اپنے دلکی مٹاتی ہوئی
کئی ہمدمین تھین جو کچھ وہ پڑھین — دعائین وہ پڑھ پڑھ کے آگے بڑھین

سرور کہتے ہین "دیکھا ایک جوان رشک مہ پیر کنعان رعنا سرو قامت سہی بالا بحرِ حسن وخوبی کا دریکتا۔ کاسہ سر سے فر شاہی نمایان بادۂ حسن دلفریب سے معمور ہے۔ دماغ مین کشورستانی ہے۔ بھٹی جوانی ہے" اس تعریف کو سرور نے بھی طول دیا ہے اور میر حسن نے بھی اور ان دونون داستانون مین خیالات کی یکرنگی ہے۔ الفاظ مین فرق ہے مگر بہت زیادہ فرق نہین۔ بلکہ بعض شعر خود فسانہ عجائب مین پورے پورے نقل کردئے ہین جیسے کہ

برس پندرہ یاکہ سولہ کا سن — جوانی کی راتین مرادون کے دن

آگے چلکر جو مہر نگار اور جانعالم کے وصل کا منظر دکھایا ہے وہ بھی قریب قریب ویسا ہی ہے جیسا کہ بینظیر اور بدر منیر کے ملنے کا حال میر حسن نے دکھایا ہے

باغ کی بہار کا عالم۔ اور جان عالم کے جانے کے بعد باغ کی ویرانی تقریباً وہی ہے جو میر حسن کے یہان ہے۔ اور اسی طرح مختلف داستانون مثلاً بارات وغیرہ کا حال میر حسن کا کھینچا ہوا نقشہ ہے۔ الغرض یہ ہے فسانہ عجائب کی اصل حقیقت جس نے اسکو دنیا مین مشہور کردیا ہے۔

"نقاد"

ایک شاعر کا انجام

مصنفہ نیاز فتحپوری:- ایڈیٹر نگار کا سب سے پہلا افسانہ حسن وعشق جسمین تخئیل کی بلندی، زور تحریر، اسلوب بیان، اور ندرتِ انشاء کے ایسے ایسے پاکیزہ نمونے موجود ہین جو ساحری کی حد تک پہنچے ہین، جوش محبت کے جذبات جس مستانہ پن سے اس تصنیف مین ظاہر کئے گئے ہین اسکا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے یہ فسانہ جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہے قیمت مع محصولڈاک ۱۲ ار

مینجر نگار لکھنؤ

مشرقی مآثر

فلکیات وریاضی مین!!

تاریخ عالم کے زرین اوراق اس امر پر شاہد ہین کہ دنیا کی اور قومون کے مقابلہ مین ہمارے اسلاف تجارتی امور مین بہت زیادہ ممتاز تھے، اُنکی تجارت کا سلسلہ تقریباً دنیا کے ہر گوشہ تک پہونچا ہوا تھا میدان تجارت مین روئے زمین پر کوئی انکا حریف مقابل موجود نہ تھا، اس لئے جب اُنکے تجارتی کاروبار کا دائرہ زیادہ وسیع ہو گیا، تو اونکو اول، اول بہ تقاضائے ضرورت تجارتی حساب کے اصول وقواعد وضع کرنے کا احساس پیدا ہوا چنانچہ انھون نے سب سے پہلے اس فن کے مبادی اور اصول مقرر کئے، پھر رفتہ رفتہ مختلف زمانون مین مختلف ترقیان کین، سندات ودستاویزات، تحاویل مالیہ، شرکات، وصولات، حساب فائدہ وغیرہ قسم قسم کے تجارتی حسابات، قیاسات اور اوزان کے نظام کی تعین، ہندسی طریقون سے آراضی کی پیمائش اعداد لکھنے کی ایک مخصوص نوع کا استنباط گنتی کے ستینی نظام کی ایجاد یہ سب ہمارے اسلاف ہی کے ذہن وعقل، غور وفکر کے زندہ جاوید نتیجے ہین، نظام ستینی کے آثار قدیمہ ابتک ہمارے بعض نظامات مین شایع ہین، مثلاً ۶۰ منٹ کا ایک گھنٹہ، ۶۰ سکنڈ کا ایک منٹ، ۳۶۰ درجہ کا ایک دائرہ، ۶۰ دقیقہ کا ایک درجہ، ۶۰ ثانیہ کا ایک دقیقہ، اس کے علاوہ اعداد صحیحہ اور بعض کسور بسیطہ کی وضع بھی انھی کی ذہنی طاقت کا خوشگوار ثمرہ ہے،

یہ تمام حسابات اور یہ تمام طریقے ان خشتو نمین مدوّن پائے گئے ہین جن کا ابھی ابھی مابین النہرین اکتشاف کیا گیا ہے۔ ماہرین حفریات کا بیان ہے کہ ان آثار قدیمہ کی تاریخ ۳۰۰۰ برس ق۔م ہے سنہ ۱۸۹۴ء مین فرانسیسی وفد نے اسی اطراف مین ایک مدرسہ کی بناء کا سراغ لگایا تھا جسکی تاریخ بھی ۳۰۰۰ برس ق م بتائی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدامت کے اس زمانہ مین ہمارے اسلاف تعلیم وتعلّم کے مہذب طریقے سے بھی واقف تھے

ان خشتون مین غور کرنیکے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہین کہ، مسیح علیہ السلام سے تین ہزار برس قبل ہمارے اسلاف ۱۔۶۰ کے مربع اعداد کو اس کے مکعبات، جذر مالی کو اچھی طرح جانتے تھے، اس لئے کہ ان اینٹون مین مربع اعداد مکعبات، اور ضرب تقسیم کی مکمل جداول موجود ہین، نسبت وتناسب، ہندسہ کے سلسلۂ متصلہ، اور قوۃ ثانیہ کی طرف کمیۃ ثنائیہ کی ترقی وغیرہ کے اصول ومبادی سے بھی وہ لوگ بخوبی واقف تھے، ہندسہ مین انکی معلومات ومعارف کا دائرہ البتہ محض بعض ہندسی اشکال جیسے مربع، مستطیل، مثلث، اور دائرہ تک محدود تھا لیکن ان کے معارف ہندسیہ تمامتر سامی تھے، ان کے ہندسی اور میکانیکی معارف کے متعلق سرولیم ولکوکس نے تفصیل سے بحث کی ہے لیکن بخوف طوالت ہم اس تفصیل کو قلم انداز کرتے ہین،

علم الفلک مین ہمارے اسلاف کی معرفت کا سلسلہ اعتدال ربیعی کے زمانہ اور اسکی تعیین تک پہونچتا ہے۔ اس لئے کہ انھون نے اعتدال

ربیعی ہی سے اپنا سال شروع کیا، اور پہلے مہینہ کا نام ثور رکھا، اس سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ ان لوگون نے اسوقت یہ تقویم بنائی تھی جب اعتدال ربیعی کے زمانہ مین آفتاب برج ثور کے اندر تھا (یعنی اس تقویم کی تاریخ تقریباً ...۵ برس قبل مسیح ہے) اور انھون نے دائرہ بروج کو بارہ برجون پر تقسیم کیا۔ حرکات سیارات کی تحقیقات کی، مختصر یہ کہ انھین نے سب سے پہلے علم الفلک کے مبادی اور اصول وضع کئے، اس کے نطاق معرفت کو وسیع کیا، اوقات د تاریخ، سنین و شہور معلوم کرنے کے لئے جنتری ایجاد کی معرفت اوقات کے لئے دھوپ گھڑی کا استنباط کیا سال کے فصلون کی تحدید کی، نجوم کو مجامیع اور کوکبات پر تقسیم کیا، ان کے اوضاع اور ان کے اوقات طلوع و غروب کو معلوم کیا، الغرض فن ملاحت اور دریائی سفر کی سہولت کیلئے انھون نے اس فن کو غیر معمولی کاوشون سے بہت زیادہ منقح اور مہذب بنایا

ہم کو معلوم ہے کہ مصریون نے ۴۲۴۱ ق. م مین ایک تقویم بنائی تھی، جسمین سب سے پہلے انھون نے سال کے بارہ مہینے، اور ہر مہینہ کے ۳۰ دن مقرر کئے تھے، اور پورے سال مین رسمی تہوارون کیلئے پانچ دن کا اور اضافہ کرکے ۳۶۵ دن کا سال بنایا تھا۔ یہ تمام ایجادات ان کے نظام اعداد، ضبط حساب، دقت ارصاد، اور رسوخ معارف کی غیر معمولی ترقی پر دلالت کرتی ہین، ہمارے اسلاف نے ہندسۂ بنا، معارف میکانکی مساحت علمی کے اندر جو کچھ ترقیان کین، وہ محتاج بیان نہین ہین، انھون نے دور دراز مسافتون کو طے کرنے کیلئے مستقیم خطوط بنائے، ارتفاع وانحدار کے فرق کی معرفت کیلئے مستوی سطحون کی دقیق طور پر تعیین کی، قدما کی اس قسم کی سب سے بڑی یادگار ہرم اکبر ہے، موجودہ زمانہ کے ماہرین فن نے اس ہرم کو دیکھا، اور فن کی حیثیت سے دیکھا، تو اسکی جوانب کی تعیین مین زیادہ سے زیادہ ۱½ سنٹیمیٹر اور زوایا کی تحدید مین زیادہ سے زیادہ قوس دائرہ کے ۱۲ ثانیہ یا ½ زاویہ قائمہ کی غلطی نکال سکے،

الغرض مشرق مین جو کچھ ہونے کو تھا وہ ہوا۔ پھر یہ تمام علوم و فنون یونانیون کی طرف منتقل ہوگئے، اور انھون نے ایک راسخ علمی اصول اور منطقی نظریات پر انکی از سر نو ترتیب دی، اور ان مین بہت سے ایسے رجال علام اور فلاسفہ کبار پیدا ہوئے جنکی نظیر قدیم یا جدید دنیا مین ملنی دشوار ہی نہین بلکہ قطعاً ناممکن ہے۔ افلاطون، ارسطوطالیس، ارخمیدس، اور اقلیدس جیسی بے نظیر اور باکمال ہستیان سرزمین یونان سے اٹھین جنھون نے بعض اقسام علوم مین کسی مستزید کیلئے کوئی مجال بحث باقی نہ چھوڑی، منطق و فلسفہ کی مملکت کے تو وہ اکیلے فرمان روا تھے، چنانچہ ان فنون مین وہ امام اول شمار کئے جاتے ہین،

عرب اور اسلام کے مآثر

عرب نے صدر اسلام مین جب میدان ترقی کے اندر قدم رکھا۔ تو فتح و ظفر ان کے ہم رکاب تھے جدھر وہ جاتے مظفر و منصور واپس آتے، چنانچہ تھوڑے ہی دنون مین اطراف و جوانب کے تمام ملوک و سلاطین ان کے زیر نگین ہوگئے اور دنیا کے بیشتر حصہ پر ان کا پرچم لہرانے لگا۔ فتوحات ملکی کا سلسلہ جب ختم ہوا۔ اور انکو کامل فراغت نصیب ہوئی تب وہ علوم و معارف کی طرف مائل ہوئے، اور فلکیات و ریاضی اور علوم طبیعی مین بہت سی یونانی کتابون کا ترجمہ لکھا، ہنود و اعجام کی بہتیری تصنیفات کے اقتباسات شایع کئے عباسی خلفا نے اپنے زمانہ حکومت مین اس علمی حرکت اور فکری نہضت کی ہر ممکن وسائل سے تشجیع کی مختلف مذاہب اور مختلف اجناس کے فاضل علماء کو ترجمہ اور تالیف کی خدمت پر مقرر کیا، حتی کہ تھوڑی ہی مدت مین سنسکرت اور یونانی زبان کے تقریباً تمام علوم کا عربی مین ترجمہ ہو گیا اور عربون نے ہندی رقوم مین جو مناسب اور عمدہ اعداد تھے، انکو مہذب بنا کر اپنے قوم مین داخل کیا۔ یہی وہ واقعات ہین، جنکی وجہ سے

مغربیوں میں عام طور پر یہ خیال پھیل گیا کہ عربوں نے علوم و فنون کو محض ناقلانہ حیثیت سے نقل کیا ہے، خود انکی کمائی کا اسمیں کوئی سرمایہ نہیں لیکن مستشرقین کی تازہ بحثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے بہت سے جدید امور کا بھی استنباط کیا جو اس سے قبل بالکل غیر معلوم اور مجہول تھے، ہم ذیل میں اس موقع پر ہم عربوں کے صرف فلکیات اور ریاضی کے مشہور اور عام مآثر کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں، ناظرین غور سے پڑھیں اور اندازہ لگائیں کہ یورپ کے اس زعم باطل میں راستی و صداقت کا عنصر کہاں تک مفقود ہے!!

علم الحساب میں، نظریات اعداد کے اندر عربوں نے بہت کم اضافہ کیا، موضوعات کی تبویب، اور ہندی رقوم کی تہذیب میں البتہ انہوں نے بہت کچھ کوشش کی، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اعداد میں صفر کا اضافہ پہلے عربوں ہی نے کیا، اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے پہلے پہل صفر کو موجودہ غایت کے لئے استعمال کیا، فرنگیوں نے بھی اس عربی لفظ کو اس معنے میں اپنی زبان کے اندر نقل کیا ہے —————— اس لئے مرجح بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسر عشری کی علامت فاصلہ کو عربوں ہی نے سب سے پہلے وضع کیا تھا،

علم الجبر کے اصول و قوانین بھی عربوں ہی نے وضع کئے، اور قانونی و نظامی صورتوں کے تسمیے علامات و اشارات جبریہ سے کام لیا۔ بعض اعداد کا غیر معروف قوانین و ضوابط سے استنباط کیا، علامہ خوارزمی نے سب سے پہلے موجودہ طرز پر معادلۂ درجۂ ثانیہ کی تحلیل کی، اور اس کے جذر کو مستخرج فرمایا۔ خوارزمی وہ پہلا شخص ہے، جس نے سب سے پہلے اس علم کا نام "علم الجبر والمقابلہ" رکھا، یورپ والوں نے اسی سے اس علم کو نقل کیا ہے۔

عربوں نے سلاسل اعداد یا انکے مجموعات سے بھی بحث کی، جبر و ہندسہ کے طریقوں سے بعض معادلات درجۂ ثانیہ کی تحلیل پر بھی قادر ہوئے۔ اور انہی نے معادلات جبریہ کی تحلیل ایک بالکل جدید اور سہل اسلوب پر قائم کی، انہی نے یہ نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ دو مکعب اعداد کا مجموعہ مکعب عدد نہیں ہو سکتا۔ اس نظریہ کو انگریزی میں (Fermat) کہتے ہیں، اور انہی نے سب سے پہلے ہندسہ کے بعض قضایا اور عملیات کی تحلیل میں اسالیب جبریہ سے کام لیا، حقیقت میں عربوں کی یہ وہ قیمتی بحثیں ہیں جن پر شہرۂ آفاق ڈیکارٹ نے اپنے مباحث عالیہ کی تعمیر کھڑی کی۔

پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ خود یونانیوں نے ہندسہ کا فن اتنا مکمل کر دیا تھا کہ اسمیں مزید حواشی کا اضافہ کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی، اس لئے اس فن میں عرب کے مشاغل کا دائرہ محض وضع تمارین، اور بعض مشکل مسائل کی تحلیل تک محدود رہا،

علم المثلثات اور علم الانساب میں عربوں کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس لئے کہ انہی لوگوں نے سب سے پہلے مثلثات کے اکثر قضایا اور قوانین (مثلاً قانون تناسب جیوب، اور قوانین مثلثات کروبیہ غیر قائمۃ الزاویہ وغیرہ) کا انکشاف کیا۔ اور انہی لوگوں نے سب سے پہلے مثلثات کی اس نوع کی تحلیل کیلئے ایک عام قانون بنایا۔ اور انہی لوگوں نے سب سے پہلے قاطع اور اس کے امثال و نظائر کو معلوم کیا، اور انہی لوگوں نے سب سے پہلے مماس اور قاطع وغیرہ کی نظایر کے لئے جدولیں وضع کیں، اور انہیں لوگوں نے سب سے پہلے سطح کرہ پر اصول رسم کی حقیقت کا پتہ لگایا۔

عربوں کے فلکی مباحث بہت مشہور ہیں، انہوں نے چاند، سورج اور سیارات کی گردشوں کی تحقیقات کی، اور انکے اوقات کو ضبط کیا، بطلیموس کے جداول کی تنقیح کی، چاند کی حرکت میں بعض انواع خلل کا انکشاف کیا۔ اور انہی لوگوں نے خلیفہ مامون کی فرمائش پر سب سے پہلے علمی اور قانونی طریقہ سے خط نصف النہار کے درجہ کا طول معلوم کیا، عربوں کی ذہن و عقل، غور و فکر، دانش و بصیرت کی غیر معمولی اہمیت کا اس سے تمکو اور صحیح اندازہ ہو سکیگا کہ تقریباً آٹھ سو برس پہلے جبکہ یورپ کی علمی دنیا پر جہل و نادانی کی کثیف گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، عربوں نے چند گز میں

آسمانی حالات کا مطالعہ کرنے کیلئے قائم کیں اور ان جداول کی تصحیح کی جو حرکات قمر کے ساتھ مخصوص تھیں، گردش زمین کا حال معلوم کیا، متعدد تجربات کے بعد انہی نے سب سے پہلے یہ فیصلہ کیا کہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے مختصر یہ کہ فلکیات میں عرب یونانیوں سے زیادہ ممتاز ہیں، اس لئے عربوں نے اپنی خداداد لیاقت سے اس علم کو ایک استقرائی علم بنا دیا، انھوں نے یونانیوں کی طرح محض نظریات پر اکتفا نہیں کی بلکہ نظریات کے ساتھ ساتھ عقلیات پر بھی کافی عبور حاصل کیا

بہر حال! فلکیات و ریاضی میں مشرق نے سب سے پہلے اپنی خدمات جلیلہ پیش کیں، زمانہ قدیم میں اسنے سب سے پہلے ان علوم کے اصول و مبادی وضع کئے، اور پھر عصر متوسطہ میں جو ایک مظلم اور تاریک زمانہ گزرا ہے اس نے محض ان اصول و قواعد کے حفظ ہی پر کفایت نہ کی بلکہ اسمیں بہت سے اہم ترین حقایق و معارف کا گران ارز اضافہ بھی کیا

ان تمام تر معروضات کا نتیجہ دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ علوم و فنون کسی خاص جماعت یا فرد کی ملک نہیں ہیں بلکہ وہ، ہر قوم، ہر جماعت اور ہر فرد کی ایک مشترکہ ملکیت ہیں، جو شخص اس کے حصول کے لئے جد و جہد، سعی و کوشش کرتا ہے وہ اس دولت کو پاتا ہے۔ ہمارا موجودہ تمدن معارف علمیہ کا ایک خوشگوار ثمرہ ہے۔ اور چونکہ یہ معارف مطالب عمران اور مقتضیات حیاۃ پر پورے اترتے ہیں، اس لئے اگر ہم غمار عمران میں خوض کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں ضروری ہے کہ ہم علمی بحث و تفکیر کے اسالیب پر اپنے ناشئہ جدیدہ کو ضرور سکھیں، اس لئے کہ علم ہی درحقیقت ثروۃ کی اصل بنیاد ہے، اور امم و شعوب کی ترقی کا اصلی راز، مال اور مال پیدا کرنیوالے رجال ہی میں مضمر ہے،

"بدر اصلاحی"

کلیات و دواوین (اردو)

دیوان میر حسن دہلوی - نہایت درد انگیز کلام ہے...... ۶ر

دیوان مردان صفی - تصوف کا رنگ کوٹ کوٹ بھر دیا گیا ہے۔ ۵ر

کلیات مومن - معہ تصاویر و مثنویات........ عہ

کلیات ظفر - ہر چہار جلد کامل دو جلد......... ۱۲/۲ عار

دیوان ناسخ - استعارات و تشبیہ میں انکا کلام اپنی آپ نظیر ہے... بہر

کلیات میر تقی میر - تعریف فضول ہے کل شعرائے ماضی و حال کے پیشوا مانے جاتے ہیں............ عہر

کلیات سودا - ہجو گوئی کے بادشاہ اور قصیدہ کے استاد..... عہ

کلیات نظیر اکبر آبادی - ہر رنگ میں فرد تھے...... عہ

مسٹر رینالڈز کے انگریزی ناولوں کے ترجمے

فسانہ الہ دین و لیلیٰ: مشہور ناول اسٹار آف منگریلیا کا ترجمہ رنگین داستانوں کے ضمن میں بہشت و دوزخ کی سیر کرائی ہے پڑھکر دل دھڑک جاتا ہے۔ مترجمہ منشی امیر حسین صاحب تحصیلدار کاکوری قیمت................ ۱۲/عہ

فریب حسن - ناول فاسٹ کا اردو ترجمہ جس میں قصہ کے پیرایہ میں بدکرداریوں کے زبوں نتائج دکھائے گئے ہیں.......... ۱۲/عہ

ناول اسرار نیکرومنیسر کا با محاورہ اور سلیس ترجمہ جو باعصمت اور حسین زمانہ لیڈیوں کے دلی جذبات کا خاکہ زمانہ کی حیرت انگیز نیرنگیوں اور انقلاب کی حیرت انگیز تصویر...... عام

(مینیجر نگار)

ایک سیاح کی ڈائری

پہلا ورق

"لکھنؤ و لکھنویات"

سوچ سمجھ کر کام کرنے کا مفہوم ہم لوگوں میں عام طور پر یہی ہے کہ کبھی کوئی کام نہ کیا جائے۔ برخلاف اس کے مجھ پر یہ الزام قایم کیا جاتا ہے کہ پہلے کام شروع کر دیتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ:-

نہ ہو تو کیجے کیا اور ہو تو کیونکر ہو!

اس زندگی میں سب سے پہلی آزادی تو مجھے اسوقت ملی جب میری بیوی نے انتقال کیا۔ صبح کو وہ رخصت ہوئیں، شام کو تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر سیدھا کلکتہ چلا گیا، اس لئے نہیں کہ انکی جدائی کا غم دور ہو جائے بلکہ اس حقیقت کی بنا پر کہ جب آدمی کے بیوی نہ ہو تو سوائے آوارہ پھرنے کے وہ آخر کر ہی کیا سکتا ہے۔ دوسری آزادی مجھے ایک سال کے بعد ملی جب میری دوسری شادی ہوئی ــــ یہ پہلے ہی طے ہو گیا تھا کہ بعد عقد "وہ" ایام گرما بسر کرنے کو مری چلی جائینگی ــــ اور میرے لئے قلب کی ایک خاص بیماری کی وجہ سے تمام پہاڑ "ولن ترانی" ہو کر رہ گئے تھے ــــ اسلئے میں نے شمال کا رخ کیا اور سب سے پہلی روانہ ہونے والی گاڑی پر سوار ہو گیا۔ کامل ۱۹ گھنٹہ کے بعد صبح کو جو دفعۃً آنکھ کھلی تو کانپور کا اسٹیشن نظر آیا۔ میں یہاں اتر پڑا، منزل مقصود سمجھکر نہیں، بلکہ محض اس خیال سے جسے "دفع وخل" کہتے ہیں۔ دن بھر کانپور کی خاک چھاننے کے بعد جب شام کو اسٹیشن پہونچا تو لکھنؤ جانے والی ریل تیار تھی اور مسافروں کے ہجوم سے تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، معلوم ہوا کہ آج محرم کی ۸ ہے اور یہ سب لوگ وہاں روشنی دیکھنے جا رہے ہیں۔ میں شمسی تاریخوں سے بھی بے خبر رہتا ہوں چہ جائیکہ قمری۔ اسوقت یہاں "محرم اور لکھنؤ" یہ دو نام سنکر بے اختیارانہ طور پر ایک درجہ میں داخل ہو گیا اور شام کو ۷ بجے اس سرزمین میں پہونچ گیا جو اپنی روایات کے لحاظ سے بجا طور پر "کربلائے ہند" کہلائی جا سکتی ہے۔

"یا حسین! واحسینا!!"

قبل اس سے کہ میں قیام لکھنؤ کے حالات قلمبند کروں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ میرے لئے یہاں کی زیارت کا یہ اولین شرف تھا اور میں نے جو خیالی تصویر یہاں کی اپنے دماغ میں کھینچ رکھی تھی اس کا تعلق یکسر "حسن و غنا" سے تھا۔ یعنی میں سمجھتا تھا کہ لکھنؤ کا ذرہ ذرہ "معمورۂ جمال و موسیقی" ہے اور رات کی تاریکی میں یہاں بھی وہی نیرنگ حسن و عشق نظر آتا ہے جو کسی وقت عہد عباسیہ میں بغداد کے لئے مخصوص تھا یہاں کی نزاکت جسم و خیال کے واقعات، یہاں کی لچیلی تہذیب و معاشرت کی حکایات، میں نہیں کہہ سکتا کہ کب سے اور کیوں میرے دماغ میں گونج

رہے تھے، لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ اسقدر کمسن سال ہیں کہ اگر انکی ابتدا فسانۂ آزاد کے زمانۂ تصنیف سے قرار دوں جب میں بہت کمسن تھا تو بچہ ہی ہونگا، ممکن ہے آج کوئی نقاد سرشار کے متعلق یہ حکم لگائے کہ اس نے اپنی تصانیف سے جو توہین لکھنؤ کے بلند معیار شرافت و الوالعزمی کی کی ہے وہ غداری کی حد تک پہونچتی ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ عنفوان شباب کی دیکھی ہوئی "حسن آرا" سے حریم ناز میں نہ سہی تو "تختۂ باند" پر ملنے کی خواہش ضرور دل میں پیدا ہوتی ہے

مجھے بالطبع موسیقی سے لگاؤ ہے اور جانِ عالم نے ٹھمری کی ایجاد سے محمد شاہ رنگیلے کے خیال کو جسقدر رنگین بنا دیا اسکا بھی معترف ہوں ہر چند اصول فن کے لحاظ سے لکھنؤ کو کسی نایک کے پیدا کرنیکا شرف حاصل نہیں ہوا، لیکن جو بانکپن یا (لکھنؤ کی زبان میں چوچلا) صرف آواز کے اتار چڑھاؤ اور "بندش مسک" سے انہوں نے پیدا کیا وہ کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ لکھنؤ کا گانا لکھنؤ سے باہر میں نے بارہا سنا، لیکن یہ تمنا ہمیشہ قائم رہی کہ وہیں کی فضا کی اگر کوئی خنک سی چاندنی رات اس کے لئے میسر آجائے تو کیا کہنا۔ اس لئے جس وقت میں لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہونچا تو میرا خیالی لکھنؤ میرے دل و دماغ میں کلورو فارم کی طرح بسا ہوا تھا اور ہر چند یہ معلوم کر کے کہ یہاں آج کل محرم ہے تھوڑی سی کلفت ہوئی، مگر پھر اس خیال سے کہ یہاں کا یہ زمانہ بھی خاص چیز ہے میں نے اپنے اوپر سیاحت کی تمام مسرتیں طاری کر کے قیام کا ارادہ کر ہی لیا

میں جس حصہ ملک کا رہنے والا ہوں، وہاں محرم کا وجود کوئی معنے نہیں رکھتا، نہ وہاں مجالس مرثیہ کا قیام ہوتا ہے، نہ بزم عزا آراستہ کیجاتی ہے بلکہ کہیں کہیں گھروں میں "ذکر الشہادتین" کے قسم کی کتابیں پڑھکر "یادگار شہدائے کربلا" صرف دلمیں قائم کیجاتی ہے، اسلئے میرے لئے لکھنؤ کی شام کا یہ منظر کہ ہر شخص نہایت شوق و مسرت کے عالم میں پوری سج دھج کے ساتھ شاہ نجف چلا جا رہا ہے اور وہاں ہزاروں رنگین برقی قمقموں کی روشنی میں اس طرح پر تکلف دعوتیں اڑ رہی ہیں جیسے واجد علیشاہ کی سالگرہ منائی جا رہی ہو، بالکل ناقابل فہم معمہ تھا۔ شاہ نجف سے لیکر حسین آباد تک تماشائیوں کا ہجوم اور امامباڑہ کا دلہن کیطرح سجا ہوا ہونا لبریز حوض میں فواروں کا جاری ہونا اور انکا روشنی کے انعکاس سے قوس قزح کی سی کیفیت پیدا کرنا ایک ایسا منظر تھا جس کو دیکھکر ایک شخص بیساختہ کہہ سکتا ہے کہ

ایں خانہ بدیں خوبی آتشکدہ بایستے

لکھنؤ کے محرم کے لئے یہ میرا پہلا جذبۂ شکر گذاری تھا کہ میں یہاں کی فراوانی مسرت میں گھر اور نئی بیوی کی جدائی کو بھی تھوڑی دیر کیلئے بھول گیا

۹ محرم کا سارا دن میں نے مجالس عزا میں شریک ہو کر بسر کیا یہ امر افسوسناک ہے کہ سوز خوانی کا رواج یہاں سے تقریباً اٹھ گیا ہے یعنی تنہا وہ چیز جو ایک صاحب ذوق کو ان محافل کی شرکت پر مجبور کر سکتی ہے وہی مفقود ہو گئی ہے۔ موجودہ مجالس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن میں صرف مرثیے تحت اللفظ پڑھے جاتے ہیں اور دوسری وہ جنمیں "حدیث خوانی" ہوتی ہے، اول قسم کی محافل کا مقصود زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ مرثیہ گو اپنی شاعری، اپنی مرثیہ گوئی اور اپنی حرکات رقصیہ کی داد لے اور دوسری قسم کی مجلس صرف فن خطابت کی تکمیل کی نمائش ہوتی ہے، لیکن میرے نزدیک دونوں نامکمل ہیں۔ اول الذکر میں شاعری کا جہانتک تعلق ہے وہ ہر چند لکھنوی ذوق کے لحاظ سے بالکل مکمل چیز ہوتی ہے لیکن صحت روایات اور جذبات حماست کے اعتبار سے سارا مرثیہ "تخیر معصوم الرجیز" کی حیثیت رکھتا ہے اور شہادت حسین جس انداز سے اظہار الم کیا جاتا ہے وہ "اہل بیت" سے تو کسی طرح منسوب نہیں کیا جا سکتا، ممکن ہے کہ جان عالم کے مٹیابرج جاتے ہوئے ان کے پسماندگان نے اس طرح کا شور و شیون کیا ہو۔ رہا پڑھنے کا انداز

سو ممکن ہے کہ وہ کالکادین، ابنادین کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص فن کی چیز ہو، لیکن میں نے تو بجائے حرکات شجاعت و تہور کے اک قسم کی "نسائیت" ہی ان میں پائی۔

مجالس حدیث خوانی میں کوئی "مجتہد یا مولانا" جسے یہاں کی اصطلاح میں "قبلہ و کعبہ" کہتے ہیں، ممبر پہ جا کر سب سے پہلے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھواتے ہیں، پھر کلام مجید کی کوئی آیت پڑھکر اس کے رموز و نکات بیان کئے جاتے ہیں، احادیث کی تلاوت کر کے انکا مفہوم بتایا جاتا ہے اور اخیر میں تمام وعظ کو کھینچ تان کر فضیلت حسین و شہادت حسین سے متعلق کر کے زور زور سے رانوں پر ہاتھ مار کر چیختے ہیں، روتے ہیں اور سننے والے بھی آنکھوں پر رومال رکھ کر روتے وقت اس طرح بدن کو جنبش دیتے ہیں جیسے کوئی انہیں گدگدا رہا ہے

یہاں کے ایک خاص واعظ کا بیان بھی میں نے سنا اور انکی تاویلات بیجا، انکے دلایل رکیکہ، انکی توجیہات سخیفہ، ان کے دسائیس روائی اور تحریفات تاریخی کو سنکر حیران رہگیا کہ اہل علم میں یہ بھی ہوا کرتا ہے

دریافت سے معلوم ہوا کہ تقریباً پورا سال یہاں اسی نوع کی مجالس ماتم و گریہ وزاری میں بسر ہوتا ہے، حتیٰ کہ مصیبت دور کرنے اور خوشی طلب کرنے کا بھی یہی ایک طریق ہے۔ نسائی طبقہ میں جو "شبستان ماتم" قایم کی جاتی ہے وہ بیشک ایک لطیف پہلو بھی رکھتی ہے، کیونکہ اول تو یونہی کسی عورت کا "مخمل ماتم" بیچانا کم قیامت نہیں ہے، چہ جائیکہ ایک خاص سوگوار لحن سے اشعار پڑھنا اور پھر ساری محفل کا نازک ہاتھوں سے نازک سینوں پر "خانہ برانداز" قسم کی ضربیں لگاتے لگاتے تھک کر ایک "آغوش طلب" انداز سے گرجانا ــــــ حقیقت یہ ہے کہ ایک انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسی صورت میں "شہادت" کو زیادہ وزنی قرار دے یا اس "خوں بہا" کو

دس کی صبح کو چوک سے ضریح مبارک (میرے نزدیک اسکا اردو ترجمہ زری کافی ہے) کا جلوس نکلنے والا تھا۔ صحیح وقت معلوم نہ تھا اسلئے فرط اضطراب نے بیٹھنے نہ دیا اور جلدی وہاں پہونچ گیا۔ لکھنؤ کا چوک اپنی تنگی، مرطوب فضا اور غیر صالح ماحول کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی معیوب حصۂ شہر کیوں نہ ہو، لیکن حقیقی لکھنؤ اسی حصۂ آبادی کا نام ہے اور قدیم لکھنوی معاشرت کے نمونے صرف یہیں دیکھے جا سکتے ہیں، باوجود سڑک کی تنگی و تاریکی کے یہاں ایک خاص قسم کی عطریت محسوس ہوتی ہے اور نبض میں اک عجیب قسم کا ہیجان پیدا ہو جاتا ہے

یہاں کے اکثر بالاخانے اس مخصوص طبقہ سے آباد ہیں کہ اگر اس عنصر کو انسانی آبادی سے علیحدہ کر دیا جائے تو دنیا میں سوائے مسجدوں کے اور کچھ نہ رہ جائے۔ معلوم نہیں اڈیٹر نہت اسے "حسن رگھندے" میں شامل کرتا ہے یا نہیں لیکن چونکہ میں وجوب کا قایل ہوں اس لئے اکبر کے اس فلسفہ پر کاربند ہو کر کہ

اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

بلا تشبیہ "ارنی گوئے کوہ طور" کی طرح نگاہ شوق سے ان پردوں میں رخنہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوا جو اسوقت بالاخانے پر پڑے تھے۔ آگے بڑھا اور ایک ایسے مقام پر پہونچ گیا جہاں سے ایک سڑک مغرب کی جانب جاتی ہے۔

میں تھک کر یا ہجوم سے گھبرا کر سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد جو دفعۃً آنکھ اٹھی تو دیکھتا کیا ہوں کہ غالب کی پوری مثنوی "چراغ دیر" مجسم سامنے موجود ہے

سامنے بالاخانے پر ایک تنی ہوئی سفید چادر کی اوٹ سے دو ساحر مگر حزین و سوگوار آنکھوں نے مجھے ایک بار غلط انداز انہ طور پر دیکھا اور میرا آسمان و زمین سب کچھ اپنے ساتھ لے گئیں۔ لکھنؤ کا یہ پہلا اور آخری بدیعہ جمال تھا جس نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو نظیری کے ساتھ اسکے محبوب نے کیا تھا اور جس پر وہ بے اختیار ہو کر کہہ اٹھا تھا کہ :۔

ازکف نمی دہد دل آساں ربودہ را

دیدیم زور بازوے نا آزمودہ را

معلوم ہوا کہ باندازۂ جمال و نزاکت وہ غنا و موسیقی کی بھی مالک ہے اور آنکھوں سے زیادہ افسوں اس کی آواز میں ہے۔ اس خبر نے میرے حواس میں اور زیادہ تعطل کی سی کیفیت پیدا کر دی، اور میں کھڑا ہوا اس عالم اضطرار میں سوچ رہا تھا کہ کوئی اہل ملے تو لکھنوی شاعری کے انداز میں اس سے یہ تو پوچھ لوں کہ میرے دل کا مزار کس کی سایۂ دیوار میں بن رہا ہے، کہ اتفاق سے ایک ضعیف عورت جس کے ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح بھی تھی، میرے پاس سے گذری اور میری "چشم نگراں" کو دیکھ کر بولی کہ "میاں آج کے دن تو اوپر نہ دیکھو"۔ میں نے باادب عرض کیا کہ "بڑی بی اُن سے بھی تو کہو کہ آج کے دن نیچے نہ دیکھیں"۔ اسنے غضب آلود چتون سے مجھے دیکھنا شروع کیا، لیکن زری کے ساتھ جو ہجوم بڑھتا آرہا تھا اس نے مجھے بچا لیا اور پھر خبر نہیں کہ وہ کہاں غائب ہو گئی

زری کا جلوس کیا تھا؟ اس کا بیان اتنا ہی مہمل ہوگا جتنا اس کا اطناب، چند ہاتھی، چند اونٹ، کچھ جھنڈیاں، متعدد بینڈ، دو چار تعزئے اور ایک گھوڑا مع خون آلود ساز و یراق کے۔ یہ تھی زری اور اسکی جملہ کائنات۔ میں ان چیزوں کے فلسفہ سے واقف نہیں جس کو ضرورت ہو وہ سی تاریخ کا ہمدم دیکھے جس میں جناب قمی جرنلسٹ نے تاڑہ سے لیکر نگاڑہ (نقارہ) تک ہر ایک کی بابت حد درجہ بالغ نظری سے کام لے کر تحقیق کے دریا بہا دیئے ہیں

یہاں صبح سے دوپہر تک شیعوں کے تعزئے نکلتے ہیں اور دوپہر کے بعد سے سنیوں کے۔ چونکہ دل و دماغ اک خاص خیال سے متاثر تھا اس لئے زری دیکھنے کے بعد میں نے آج کے تماشہ کو ختم کیا اور کربلا بھی نہ جا سکا، حالانکہ یہاں کا خونین ماتم، یہاں کی واویلا دیکھنے کی چیز ہے۔

اس کے بعد میں نے چند دن یہاں کے اکابر سے ملنے اور یہاں کے مجالس شعر و سخن کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اور قیام کیا۔ میں کس کس سے ملا، ان کو کیسا پایا اور انکی شاعری کے متعلق کیا رائے قائم کی۔ اسکی تفصیل آپ آئندہ ملاحظہ فرمائیں گے

ایک سیّاح

ہمیشہ یاد رکھئے

(۱) خط و کتابت میں نمبر خریداری درج کرنا (۲) جوابی امور کیلئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا (۳) ۲۰ تک پرچہ نہ پہونچے کی اطلاع کرنا (۴) منی آرڈر کے کوپن میں نمبر خریداری درج کرنا۔ (منیجر نگار لکھنؤ)

منطوقات ناطق

یا

جناب ابو العلاء ناطق لکھنوی کے الہامات شعری

بلکہ

ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہیے

"آپ نے اگست کے ملاحظات میں لکھنوی و غیر لکھنوی نزاع کو محو کرنے کے لئے جو مصلحانہ انداز اختیار کیا ہے وہ آپ کی نیت کے لحاظ سے یقیناً بہت مبارک چیز ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح آپ اُس احساس کو کیونکر مٹا سکیں گے جو اس وقت ساری دنیا میں لکھنوی شاعری کے بے کیف و بے مزہ ہونے کے متعلق قائم ہو گیا ہے اور یہی احساس اصل بنیاد تمام جھگڑوں کی ہے

آپ نے جو اشعار بعض شعراء حال لکھنؤ کے درج کیے ہیں، وہ یقیناً بُرے نہیں ہیں لیکن تعجب ہے کہ آپ نے مبصر میں دوسروں کے شایع شدہ اشعار تو انتخاب کر لئے اور خود مدیر مبصر کی غزل کو چھوڑ دیا میں نے ان کی ایک نہایت ہی معرکۃ الآراء غزل پر ہلکی سی تنقید کی ہے جو پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ کی مصلحانہ روش اجازت دے تو شایع فرما کر ممنون کیجئے، اس سے مقصود صرف یہ سوال ہے کہ کیا لکھنوی شعراء کوئی ایسی ہی درخشان مثال "حسنِ شاعری" کی غیر لکھنوی شاعروں میں پیش کر سکتے ہیں؟۔ اگر نہیں تو پھر اُس فرق مراتب کو مٹانے والے آپ کون ہیں جسے خود خدا نے تخلیق ذہن و دماغ کے وقت ازل ہی میں پیدا کر دیا تھا۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اسباب اختلاف میں سے اک نہایت ہی ضعیف سبب کو سامنے رکھ کر پند و نصیحت شروع کر دی حالانکہ حضرات لکھنؤ کا کلیلوگوں سے عنا در کھنا اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم کیوں اُن سے اچھا شعر کہتے ہیں بلکہ زیادہ تر اس لئے ہے کہ ہم کیوں آپ آپ کو "مومن" کہتے ہیں پھر جب ہم ان کی نگاہ میں مومن ہی نہیں تو آپ کا "کل مومن اخوۃ" کا درس دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ بہر حال میں اب تنقید پیش کرتا ہوں"

ہمارے ایک دوست کہا کرتے تھے کہ دنیا میں شاعر ہونا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے زیادہ کوئی گناہ ممکن نہیں لیکن ان کا ذہن کبھی اس طرف منتقل نہ ہوا کہ ایک گناہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص باوجود شاعر نہ ہونے اپنے آپ کو شاعر سمجھے اور بہ جبر اپنے آپکو

شاعر تسلیم کرائے۔

پھر اس جرم کی حیرتناکی اسی جگہ ختم نہین ہو جاتی، بلکہ اس سے آگے اور بڑھتی ہے یعنی یہ کہ ایسا شاعر کبھی کبھی اپنے آپ کو استاد بھی کہتا ہے شاگردونکی ایک جماعت بھی پیدا کر لیتا ہے اپنی تخریب کو اصلاح، اور فساد کو کون کے نام سے موسوم کر کے مشاعرون مین "باندازِ مغنانہ" غزلین پڑھتا ہے، اور رسایل مین "یہ شیوۂ حکیمانہ" اُن کی اشاعت بھی چاہتا ہے ——— شیوہ و انداز اینان رانگر!!

ممکن ہے کہ کسی وقت کوئی اللہ کا بندہ تمام ایسے متشاعرین کے حالات مرتب کرے، اس لئے مین یہ مضمون ابھی سے بطور بنیاد و تقریب اُس مقدمہ و تمہید تحریر کئے دیتا ہون اور اُس سے بزور سفارش کرتا ہون کہ جب کبھی وہ اس مفید تالیف کی طرف توجہ کرے تو جناب ابوالعلاء الناطق لکھنوی کو نہ بھول جائے کیونکہ میرے نزدیک جو مرتبہ میرؔ کو شعرا مین حاصل ہے، وہی جناب ناطق کو غیر شاعر شاعرون کی جماعت مین حاصل ہے بلکہ اگر جناب ناطق اجازت دین تو انھین کے اسم گرامی و تخلص سامی سے اس کو معنون کر دے

بحمد اللہ مجھے جناب ناطق اور ہر ایسے شخص سے جو اپنے آپ کو شاعر کہتا ہے براہ راست ذاتی شناسائی نہین ہے، لیکن چونکہ رسایل و جراید کے مطالعہ کا مجھے مرض ہے اور اس سلسلہ مین رطب و یابس سبھی کچھ نگاہ سے گزر جاتا ہے اس لئے بغیر کسی سعی و کاوش کے مجھے معلوم ہے کہ جناب ناطق لکھنؤ کے ایک رسالہ مبصر کے مدیر اعزازی ہین اور گاہے گاہے اپنے تبرکات شاعری دوسرے رسالون کو بھی تقسیم فرما دیتے ہین۔ چنانچہ حال ہی مین لکھنؤ کا ایک دوسرا رسالہ "خضر راہ" ناطق صاحب کے عطا کردہ "جرعۂ آب حیات" کو لیکر موصول ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جناب ناطق کے "منظوقات" کی داد دینا اس دنیا کے اندر تو کسی سے ممکن نہین، عالم برزخ مین اس کا امکان ہو تو ہو

غزل مین تغزل سے ایسی صاف بیزاری، کیفیت عشق و محبت سے ایسا مکمل گریز حلاوت و شیرینی سے ایسا سخت تنفر اور باوجود بامعنی الفاظ فراہم کرنے کے ہر ہر شعر کو صد گونہ اہمال کی صورت مین پیش کرنا۔ واقعہ یہ ہے کہ

"این سعادت بزور بازو نیست"

لوگ کہتے ہین غزل نام ہے صرف حکایت محبت کا، جذبات عشق کی صحیح ترجمانی کا، سادگی بیان کا بیساختگی کا اور ہر اُس کیفیت کے بیان کا جو مطالعۂ حسن سے پیدا ہوتی ہے حالانکہ اس وقت کا "شاعر اعظم، استاذ الامم، ادامہ اللہ یا الشعر و الطب والحکم" اس امر کا اعلان کر رہا ہے کہ غزل نام ہے صرف حکایت تنفر کا، جذبات کراہت کے ترجمانی کا ژولیدگی بیان کا اور ہر اس کیفیت امتلاء کا جو ایک مکروہ شے کے مطالعہ سے پیدا ہوتی یا ہو سکتی ہے

جناب ناطق کی حسین غزل کو دیکھ کر مین اس نتیجہ پر پہونچا ہون وہ اُن کی نہایت ہی معرکۃ الآرا فکر ہے اور کہا جاتا ہے کہ جس وقت الہ آباد کے مشاعرہ مین اس کو پڑھا گیا تو ساری محفل ایک خاموش اضطراب مین مبتلا تھی ممکن ہے کہ جناب ناطق کے بدخواہ اس کو "داد نہ ملنے" سے تعبیر کرین، لیکن ممکن ہے یہ سب کچھ اس "جلوۂ جانانہ" اور "نطق سحر کارانہ" کا نتیجہ رہا ہو جو بعض اوقات "متلی معدہ" کے بعد عالم خواب مین ایک خاموش کابوسانہ تشنج بھی پیدا کر سکتا ہے۔

اسقدر تمہید کے بعد یقیناً آپ بے چین ہونگے کہ اس غزل کو سنین لیکن مین دفعتہً ساری غزل آپ کے سامنے پیش نہین کرونگا بلکہ ایک ایک شعر سناؤنگا کیونکہ ممکن ہے آپ اس کو دیکھ لینے کے بعد میری تنقید پڑھنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کرین اور اس طرح میری محنت اکارت جائے مطلع ملاحظہ ہو۔

قطرے نہین حباب مین دل ہین نقاب راز مین
چند حقیقت آشنا غرق ہوئے مجاز مین

اس شعر کے سننے کے بعد مین نہین کہہ سکتا کہ آپ مین کیا کیفیت پیدا ہوئی، لیکن مجھ پر جو عالم طاری ہوا وہ ضرور مجھے معلوم ہے، یعنی یہ کہ اتنے خوبصورت الفاظ اس سے زیادہ بے معنی طور پر آج تک کوئی مجتمع نہین کر سکا۔ قطرہ، حباب، نقاب، حقیقت، مجاز علیحدہ علیحدہ کیسے صاف وپاکیزہ الفاظ ہین، لیکن شاعر کے کمال کو دیکھئے کہ ”بیک گردشِ قلم“ ”نادر و نادری“ دونون کا صفایا کر دیا۔ اچھا اب آئیے ”بطن شاعر“ کو بھی دیکھ لین شاید کوئی مفہوم وہان سے دستیاب ہو سکے۔ فرماتے ہین

حباب کو حباب نہ جانو بلکہ وہ مجموعہ ہے قطرون کا

پہلی تشبیہ نقاب راز مین چھپے رہنے والے ”دلہا“ سے دی ہے اور دوسری مجاز مین غرق ہو جانے والے ”حقیقت آشناؤن“ سے ایک شخص اس کے سننے کے بعد کہہ سکتا ہے کہ اس شعر مین تغزل کی کیا بات ہے، کونسی کیفیت، یا سرشاری محبت اس سے ظاہر ہوتی ہے، لیکن یہ اعتراض غلط ہے کیونکہ اس شعر مین حکیم صاحب نے صرف حباب کی حقیقت سے بحث کی ہے جس کا تعلق طبیعیات سے ہے نہ کہ عشقیات سے اور اس مین کلام نہین کہ حباب کی کنہہ وحقیقت دریافت کرنے مین ضرور انھون نے عالمانہ تفتیش سے کام لیا ہے، کیونکہ دنیا اس وقت تک یہی جانتی تھی کہ حباب تو نیم قطرہ سے بھی کم صرف اک ”کیفیت نم“ کا نام ہے مگر حکیم صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ اس آتشی شیشہ مین بہت سے قطرون کا عرق کشید کیا جا رہا ہے حیرت و افسوس ہے کہ اس فاضلانہ اکتشاف پر ۱۹۲۸ء کا نوبل پرائز متعلق بہ طبیعیات حکیم صاحب کو نہین ملا

تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

اب اس شعر کی دوسری معنوی خوبی ملاحظہ ہو

دعویٰ یہ ہے کہ حباب مین قطرے نہین ہین۔ پھر کیا ہے؟ خود ہی اس کا جواب دیتے ہین کہ نقاب راز مین چھپے ہوئے دل ہین یون سمجھ لو کہ مجاز مین غرق ہو جانے والے چند حقیقت آشنا ہین۔ اس جواب کا ثبوت طلب کرنے کی ضرورت نہین کیونکہ جب بدبخت حقیقت آشنا نقاب راز مین چھپنے کے باوجود بھی مجاز مین غرق ہونے والے پائے جاتے ہین تو اصول طبیعیات سے یہ دعویٰ اقلیدس کے بدیہیات مین داخل ہو کر ویسی ہی تلخ حقیقت بنجاتا ہے، جیسے ریاح باسوری کے تکاثف سے امعائے مستقیم کا تشنج یا صداع صدغین۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

ایک بھی ہم سبق نہین مدرسۂ نیاز مین
زخم ہین سب کے مختلف شرح نگاہِ ناز مین

آپ جی مین کہتے ہونگے کہ ایسے مطلع کے بعد کیا کوئی شعر اس پایہ کا نکل سکے گا، لیکن آپ کو خبر نہین کہ حکیم صاحب کا دماغ ایک ایسا عجوبہ زار ہے کہ اگر مدۃ العمر وہ شب و روز سوائے غزلگوئی کے اور کچھ نہ کرین تو بھی ان کے ”یہ جواہر ریزیان“ کم نہ ہون

چنانچہ یہ دوسرا شعر ملاحظہ ہو، کیا مطلع سے کم درجہ رکھتا ہے۔ وہی حکیمانہ تیور، وہی مرشدانہ ٹھاٹ، وہی فلسفیانہ بے کیفی

چندے آفتاب چندے ماہتاب، ایک کو چھپائیے دوسرے کو نکالئے۔ کیا ممکن ہے کہ سامع کی توجہ کسی اور طرف ہٹ جائے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ مطلع مین حکیم صاحب نے طبیعیات کے ایک معمہ کو حل کیا تھا اور اس مین ایک وسیع المطالعہ انسان ہونے کی حیثیت سے انھون نے ایک نئی کتاب کے وجود کی خبر دی ہے جس کا نام "نگاہِ ناز" ہے۔ اس کتاب کے موضوع پر حکیم صاحب نے کوئی بحث نہین کی ہے بلکہ صرف اس کے دقیق و دشوار ہونے کا حال اس طرح بیان کر دیا ہے کہ اس کی شرح و تفسیر سے جو مدرسۂ نیاز مین پڑھائی جاتی ہے ہر طالب علم اک نیا اثر زخم کی صورت مین حاصل کرتا ہے۔ یعنی اگر کسی کا زخم مستطیل ہوتا ہے تو دوسرے کا مربع، کسی کا دایرہ دار ہوتا ہے تو کسی کا مثلثی اور اگر یہ کہا جائے کہ "اختلاف زخم" "اختلاف کیفیت" کے مفہوم مین مستعمل ہوا ہے تو پھر اس کا تصنع یقیناً تنقید سے بے نیاز ہے

تیسرا شعر:-

پردہ کی رسم و راہ ہے اپنے نیاز مند سے ورنہ حجاب کو کہان دخل حریم ناز مین

اس شعر مین بھی ایک جدید انکشاف ہے اور وہ یہ کہ پردہ حریم ناز مین نہین ہوتا بلکہ "حسن لب بام" کے لئے مخصوص ہے۔ اگر حریم کے لغوی معنی پوشیدہ یا پس پردہ کے ہین تو ہوا کرے، ناطق صاحب کی انشا مین حریم نام ہے "اس مینا بازار" کا جس مین داخل ہونے کی شرط اولین پردہ و حجاب کا اٹھا دینا ہے۔ مفہوم اور تغزل کے لحاظ سے جو مرتبہ اس شعر کا ہے، اس کے اظہار کی ضرورت نہین

چوتھا شعر:-

حلقۂ زلف کی گرہ کھل ہی گئی اگر تو کیا قید ہے میری متسلک سلسلۂ دراز مین

یعنی لوگ سمجھتے تھے کہ حکیم صاحب اس کے حلقۂ زلف مین محبوس نہین! ورا سکے گرہ کھلنے کے بعد وہان سے نکل بھاگین گے۔ اس خدشہ کو انھون نے رفع کیا ہے کہ ایسا نہین ہو سکتا کیونکہ ان کی قید سلسلۂ دراز سے متعلق ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ سلسلۂ دراز کس چیز کا ہے، سو اس کی صراحت اس لئے نہین کی گئی کہ شعر صاف ہو جاتا اور اس صنعت سے نکل جاتا جو اس غزل مین ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ متسلک کے بعد لفظ مین کا استعمال بھی قابل غور ہے۔ ممکن ہے فصحائے لکھنؤ یونہی بولتے ہون۔

پانچوان شعر

شکل حقیقت اب کے ہو اور کسی کے دل پہ نقش صورت مستقل نہین آئینۂ مجاز مین

یہ شعر حکیم صاحب کا اس غزل کی جان ہے، اور مخصوص طور پر اس دعویٰ کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ ساری دنیا کے علماء تاویل جمع ہو جائین تو بھی اس کے معنی پیدا نہین کر سکتے۔ اگر آئینۂ مجاز مین کوئی صورت مستقل طور پر مرتسم نہین ہو سکتی تو شکل حقیقت حکیم صاحب کے دل کے بجائے کسی اور کے دل پر کیون نقش ہو۔ وہ کیون اس سے خایف ہین کیا انکا دل صرف آئینہ مجاز ہے جس مین شکل حقیقت مستقلاً قائم نہین ہوتی۔ غالباً یہ کوئی خاص لاہوتی یا ناسوتی معمہ ہے جسکو ہم ہی نہین سمجھ سکے، حکیم صاحب غریب کیا سمجھین گے

چھٹا شعر

مسلک دید حل ہو سر در کائنات سے وہ جو لگی تھی طور پر آکے بجھی حجاز مین

مسلک کا حل ہونا بالکل نئی بات ہے۔ معمہ حل ہوتا ہے، دواؤن مین موتی حل ہوتا ہے، مشک و عنبر حل ہوتا ہے، لیکن، مسلک شاید علم العقاید کی کوئی نئی دریافت ہے کہ اس سے قبل کسی کو اس کا حل ہونا معلوم نہین ہو سکا تھا اگر حل ہونا حکیم صاحب نے واضح ہونے کے معنی مین لکھا ہے تو یہ اور ایک معمہ ہے جسے صرف جناب ناطق ہی کے گرہ کشا ناخن حل کر سکتے ہین

ایک اور شعر ملاحظہ ہو

سجدہ مین سر اگر گیا پھر نہ اٹھیگا تا ابد قید نہ رکھئے وقت کی میرے لئے نماز مین

اس شعر مین محض یہ خصوصیت قابل داد ہے کہ حکیم صاحب ابھی تک اپنے سجدہ یا نماز سے متعلق صرف گفت و شنود مین مصروف ہین اور معاملہ ابھی تک طے نہین ہوا۔ اصل جھگڑا یون شروع ہوا کہ حکیم صاحب نے (شاید ناوقت) کہا کہ مین سجدہ کرنا چاہتا ہون، جواب ملا کہ یہ بیوقت کی شہنائی کیسی۔ جو اوقات مقرر ہین ان مین سب کے ساتھ تم بھی سجدہ کر لیا کرو، اسپر حکیم صاحب نے فرمایا کہ مین اگر سجدہ کرنے پر آ گیا تو حشر تک سجدہ ہی کرتا چلا جاؤنگا اور حشر تک سر نہ اٹھاؤنگا اسلئے میرے لئے وقت کی تعیین نہ کیجئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا، شعر سے ظاہر نہین ہوتا۔ لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ انھین اجازت اس کی نہین ملی، ورنہ ظاہر ہے کہ انھین مصر کے ادارت کی فرصت کہان ملتی اور بجائے سر بسجود رہنے کے وہ ہر وقت "مایل بہ قعود" کیون رہتے۔

اس شعر کی بنیاد صرف لفظ اگر پر قایم کی گئی ہے اور یقیناً یہ شاعرانہ معجزہ ہے کہ صرف ایک لفظ سے ایسے ایسے غوامض انھون نے اس شعر مین پیدا کر دئیے

اب جو نفس مین ہے خلوص نالہ مین کب اثر یہ تھا پردہ کوئی نہین رہا دل کے شکستہ ساز مین

یہ شعر بھی چند در چند عجائب فن اپنے اندر رکھتا ہے، پہلے مصرعہ کی اگر نثر کیجائے تو اصولاً اسکو یون ہونا چاہئے کہ "اب جو خلوص نفس مین ہے وہ نالہ مین کب تھا" اسطرح لفظ اثر بالکل بیکار ہو جاتا ہے اور اگر اس کی نثر یون کیجائے:۔ "نالہ مین کب یہ اثر تھا جو اب نفس مین ہے" تو لفظ خلوص زاید قرار پاتا ہے۔ مگر جناب ناطق نے دونون لفظ رکھ کر گویا یہ بات پیدا کی کہ جس لفظ کو جی چاہے نکال کر معنے پیدا کر لیجئے اور یہ پہلی نمایش فن ہے۔ دوسرے مصرعہ مین متعدد مسایل طے کئے گئے ہین۔ ایک یہ کہ ساز ٹوٹ جانے کے بعد اگر صرف پردے رہجائین تو موسیقی پیدا ہو سکتی ہے، لیکن اس کا اثر نہین ہوتا۔ دوسرے یہ کہ جب شکستہ ساز کے پردے بھی غائب ہو جائین تو موسیقی پھر عود کر آتی ہے اور پوری قوت کے ساتھ

یہان یہ شک وارد ہو سکتا ہے کہ اگر اس شعر مین دل کو واقعی شکستہ ساز سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس مین پردے کس چیز کے ہونگے اور اگر پردہ بمعنی حجاب لیا گیا ہے تو دل کا ساز ہونا کیا؟ لیکن یہ اعتراض وہی شخص کر سکتا ہے جو اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ اہل لکھنؤ جب ابہام کی شاعری پر آ جاتے ہین تو وہ اجتماع ضدین کو بھی حسن شاعری قرار دیتے ہین چہ جائیکہ اہمال

زخم عدو نہ دیکھئے آپ نگاہ ناز سے لوگ کہین گے داغ ہے دامن پاکباز مین

یہ شعر بالکل لکھنوی ساخت کا ہے کہ نگاہ مین اس کی وسعت کے لحاظ سے دامن پیدا کیا گیا اور جب اس مین دامن پیدا ہو گیا تو

معمولی کپڑے کے دامن کی طرح اس کو خون عدو سے داغدار بھی کر دیا۔

علاوہ اس کے پہلے مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا بالکل بیکار ہے۔ اگر "نگاہ ناز سے" کو حذف کر دیا جائے تو معنی میں کوئی سقم پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر یہ کہا جائے کہ نگاہِ ناز کی تخصیص و تعیین ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے دامن نگاہ کی داغداری ثابت نہیں ہو سکتی، تو پھر سوال یہ ہوگا کہ محبوب کی وہ کونسی نگاہ ہے جس کو عاشق عدو کے لئے گوارا کر سکتا ہے اور جس سے دامن پاکیزہ آلودہ نہیں ہو سکتا

ناطق سوختہ جگر دل پہ تو ہات رکھ کر ذرا ... ایسی ہی کچھ چمک سی تھی نالۂ جانگداز میں

ہر چند اس شعر میں مفہوم پیدا کرنے کے لئے حکیم صاحب نے غیر معمولی مسیحا نفسی سے کام لیا، لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے اول تو دل پر ہات رکھنے سے چمک کا احساس ہونا کیا معنی، ہات رکھ کر دھڑکن تو ضرور محسوس کیجا سکتی ہے، لیکن چمک دیکھنا تو آنکھ کا کام ہے نہ کہ ہات کا اور اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اگر دل پر ہات رکھنے سے نالۂ جانگداز کی سی چمک محسوس ہوتی ہے (حالانکہ یہ مسئلہ بجائے خود حل طلب ہے کہ نالۂ جانگداز میں چمک کیوں ہو) تو پھر نتیجہ کیا، یعنی اگر ناطقِ سوختہ جگر کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ دل کی چمک اب اس خطرناک حد تک پہونچ رہی ہے جسے نالۂ جانگداز کہتے ہیں تو سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ زمانہ ماضی کا نالۂ جانگداز کیا سوائے دل کے کسی اور مقام سے نکلا تھا اور اگر یہ نہیں تو پھر دل کی چمک سے خبردار کرنا بیکار ہے

اس غزل میں دو شعر اور ہیں:۔

اس کی جبین پہ اس لئے آ کے شکن مچل گئی ... سجدہ کو ناز کیوں ہوا ناصیۂ نیاز میں

جینے نہ دے اگر جیوں، مرنے نہ دے اگر مروں ... مرگ و مسیح دونوں ہیں پیکرِ چارہ ساز میں

پہلا شعر بے عیب ہونے کی حد تک پھیکا و بے مزہ ہے اس لئے اعتنا نہیں کیا گیا اور دوسرے میں چونکہ لفظ پیکر کی ضرورت استعمال سے زیادہ اور کوئی امر بحث طلب پیدا نہیں ہوتا اس لئے مرگ و مسیح میں سے مرگ ہی کا انتخاب اس کے لئے موزوں سمجھا گیا۔

یہ ہے ایک لکھنوی (استاد) شاعر کی غزلگوئی کا رنگ جس پر اہل لکھنؤ کو ناز ہے اور جس پر اعتماد کر کے وہ دعوائے "انا ولا غیری" کا دم بھرتے ہیں۔

"طوشا نجل"

(نگار) یہ مضمون جس مقصد کے ساتھ لکھا گیا ہے، اسے لکھنے والے نے خود ہی ابتدائی سطروں میں ظاہر کر دیا ہے اور اگر مجھے اس مسئلہ کو اگست کے ملاحظات ہی کے ساتھ ختم کر دینا ہوتا تو شاید میں اس کی اشاعت مناسب نہ سمجھتا، لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس باب میں مخالف و موافق دونوں خیالات معلوم کر کے کسی نتیجہ پر پہونچوں اور اس کا ذریعہ یہی ہو سکتا ہے کہ نگار کے چند صفحات کچھ دنوں کے لئے اس بحث و نزاع کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں

میں اپنی رائے اس تنقید کے متعلق محفوظ رکھنا مناسب سمجھتا ہوں، لیکن میں تنقید نگار کے اس دعویٰ کو بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ غیر لکھنوی شاعروں کے کلام میں کوئی ایسی غزل پیش نہیں کیجا سکتی (اگر ناطق صاحب کی یہ غزل واقعی بقول نقاد لغو و مہمل ہے) اور میں اس چیلنج کو نہایت ہی ناروا جسارت سے تعبیر کرونگا

دوسرا دعویٰ (ضمناً) یہ کیا گیا ہے کہ ساری دنیا لکھنوی شاعری کی طرف سے بدظن ہے۔ مین اسکے ماننے کیلئے بھی طیار نہین، بلکہ مین تو علی الرغم یہ کہتا ہون کہ اب بھی اک بڑی جماعت انھین لوگون کی ہے جو "لکھنؤ اسکول" کی شاعری پر سر دھنتے ہین اور "دہلی اسکول" کو پسند نہین کرتے۔

تیسری بات اور ہے جو یقیناً زیادہ توجہ کی مستحق ہے یعنی وہی "مومن اور غیر مومن" والا قصہ۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا ذہن بھی اس طرف منتقل نہ ہوا تھا کیونکہ اس خصوص مین میرا جو مشرب ہے وہ کسی سے مخفی نہین اور میرے نزدیک نوع انسانی مین اس قسم کی تفریقات پیدا ہو جانا انتہائی بدنصیبی ہے۔

بہرحال مین ابھی تک یہ ماننے کے لئے آمادہ نہین کہ اہل لکھنؤ کی خلش کا یہ سبب ہے اور اگر ہو تو بھی، دوسرون کی تنگ نظری کا جواب تنگ نظری سے دینا کب جائز ہے۔

نیاز

علم الکیمیا کا ایک حیرت انگیز معجزہ

کایاپلٹ ہیر آئیل

کہنے کو صرف یہ تیل ہے لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے اکسیر کو بھی مات کرتا ہے۔ یہ تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود دنیا بانی کیمیاوی اجزا سے جدید اصول پر تیار کیا گیا ہے اور جسکا تجربہ ایڈیٹر نگار اور ملک کے بعض نامی گرامی حضرات اور ڈاکٹر کر چکے ہین یہ گھر مین اسکی ایک شیشی رکھنا گویا بہت سے امراض کو دفع کر دینا ہے۔

(۱) اگر چند بال صاف ہو گئے ہین یا بالخورہ اور گنج ہو گیا ہے۔ یا بال گرنا شروع ہو گئے ہین اگر کمزور ہو گئے ہین یا سفید ہونے لگے ہین تو اس تیل کا استعمال انکی جڑون کو فاسد رطوبتون سے صاف کرکے بال کا گرنا موقوف کر دیگا بال بڑھائیگا اور جہان جہان کے بال گر گئے ہین وہان نئے بال سیاہ پیدا کریگا۔

(۲) جن کو نزلہ درد سر یا شقیقہ دوران سر ضعف دماغ ضعف بصارت بیخوابی اور نسیان وغیرہ کی شکایت رہتی ہے ان کیلئے یہ تیل بڑی نعمت ہے نزلہ کو فوراً روک دیتا ہے اور دماغ و بصارت کو قوی کرکے عجیب قسم کا سکون پیدا کر دیتا ہے اور عینک کے استعمال کو بھی غیر ضروری کر دیتا ہے۔

(۳) شدت تپ کی حالت مین اسکی مالش فوراً ہذیانی حالت کو دور کرکے پسینہ لے آتی ہے اور بخار کو کم کر دیتی ہے۔

(۴) ایسے مہلک امراض سے جیسے کنٹھمالا اور سل و دق اسکا استعمال کرنیوالا محفوظ رہتا ہے اور تمام اثرات نزلہ کو خواہ سر مین ہو یا دانتون یا مسوڑھون مین یکقلم دور کر دیتا ہے۔

(۵) سر اور جسم کے پھوڑیان پھنسیان، گرمی دانے خارش اور ہر طرح کے جلدی امراض اسکے مالش سے کافور ہو جاتے ہین۔ ایک تازہ سرٹیفکیٹ ملاحظہ ہو۔

مکرمی تسلیم۔ آپکا عنایت کردہ تیل بہت مفید ثابت ہوا ابھی ایک شیشی ختم نہین ہوئی ہے اور سر کی خشکی جاتی رہی بال گرنا بند اور نئے بال نکلنے شروع ہو گئے۔ براہ کرم حکم دیدیجئے کہ ایک شیشی اور بھیجی جائے اور آئندہ بغیر میری استدعا کے ہر مہینے کے شروع مین ایک شیشی بذریعہ وی پی روانہ ہوا کرے والسلام۔

نیازمند جعفر علی خان (ڈپٹی کلکٹر) رائے بریلی۔

جوابی امور کے واسطے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے

قیمت معہ محصول .... ([illegible])

مینجر کایاپلٹ ہیر آئیل۔ لکھنؤ

باب الاستفسار

غالب کی شاعری

(از زبیدہ خاتون - رحمت باغ حیدرآباد دکن)

"مین نہایت ادب کے ساتھ جناب کی خدمت مین حسب ذیل استفسار است پیش کرنیکی جرأت کرتی ہون۔ اگر جناب کو زحمت نہو تو اپنے زرین خیالات سے مجھے مستفید فرمائیے۔

(۱) شعر کی خصوصیات کیا ہین؟ اور کیا ان مین فلسفہ داخل ہے غالب کی فلسفیانہ شاعری کے متعلق ڈاکٹر عبدالرحمان صاحب مرحوم بجنوری کی رائے سے آپ کس حد تک اتفاق فرماتے ہین؟

(۲) ہندوستان کے شعرا مین غالب کا کیا درجہ ہے اور کن خصوصیات کی بنا پر؟"

(**نگار**) شعر کی خصوصیات کیا ہین؟ یعنی کس شعر کو صحیح معنی مین شعر کہہ سکتے ہین؟ یہ سوال اسقدر قدیم ہے کہ اگر ہم چاہین تو کہہ سکتے ہین کہ تنقید کے اولین احساس کے ساتھ ہی یہ بھی وجود مین آیا تھا، اور اس لئے آپ جس زمانہ اور ملک کے لٹریچر کو اٹھا کر دیکھین گی تو اس موضوع پر آپ کو کافی سرمایۂ تحقیق نظر آئے گا۔ مجھ سے سوال کر کے آپ کیون اُس فرسودہ و پامال مبحث کو زندہ کرنا چاہتی ہین، جس مین اب کوئی جدت و ندرت باقی نہین رہی۔ پھر یون بھی نگار کے گزشتہ مجلدات مین اس مسئلہ پر ایک سے زاید مرتبہ اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہون اور اس لئے اب انکا اعادہ کوئی لطف کی بات نہین۔ مگر ہان یہ کہنے سے باز نہین رہسکتا کہ جس طرح حسن و جمال کے لئے کوئی خاص مادی معیار اس وقت تک قائم نہین ہو سکا اسی طرح فن یا اصول فن کے لحاظ سے شعر کی خوبی کا اندازہ دشوار ہے۔ البتہ جس حد تک ذوق و وجدان کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حسن و شعر کی خوبی منحصر ہے صرف ناظر و سامع کے تاثر و تکیف پر جو بالکل ذاتی و انفرادی چیز ہے اور اس پر کسی کا اعتراض کرنا بالکل خلاف محل ہے جس طرح ایک حبشی کی محبوبہ یورپ مین قبیح ترین چیز سمجھی جاتی ہے اس طرح حبش مین سیمبران فرانس کو مبروص سمجھکر اُن کی طرف سے منہ پھیر لیا جاتا ہے، اور یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ لکھنؤ اسکول کی شاعری قابل ترجیح ہے یا دہلی اسکول کی" ایک شخص جس کا دل کیفیت عشق و محبت سے خالی ہے اس کے نزدیک میر و درد کی شاعری لایعنی ہذیان سرائی ہے، اور دوسرا جو صرف حکایات محبت ہی سننا چاہتا ہے، وہ اسیر و ناسخ کے دواوین کو مجموعۂ مزخرفات جانتا ہے مین نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہین جو میر کا یہ شعر سنکر:-

اک نگہ سے بیش کچھ نقصان نہ آیا اس کے تئین　　اور مین بیچارہ تو اے مہربان مارا گیا

گھنٹون کے لئے بیکار ہو گئے اور وہ ملکوتی نفوس بھی میری نگاہ سے گزر چکے ہین جن کے نزدیک "مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجران کا"

شاعری کا بہترین معیار ہے۔

بہرحال تنقید شعر کے متعلق کوئی ایسا فیصلہ جس کو سنکر ہر شخص سر تسلیم خم کرے، نہ آجتک ہو سکا ہے نہ آئندہ اس کا امکان ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ اگر کوئی شخص صحت عقل و فکر سے کام لیکر محض فطری اصول اور علمی مسلمات پر بنیاد رکھ کر ایک شعر کی حقیقت کو سمجھنا چاہے تو وہ ایسے حدود معین کر سکتا ہے جو "خالص، وعیار" کے تمیز میں مدد دے سکتے ہیں اور اسی لئے نہ صرف شعر بلکہ ادب انشاء کے تمام اقسام کے لئے ادبین اصول جس کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے یہ قرار دے لیا گیا ہے کہ

انچہ از دل خیزد بر دل ریزد

پھر چونکہ شاعری میں زیادہ تر واردات قلب ہی سے بحث کیجاتی ہے، اس لئے وہان اس کلیہ کی قوت اور زیادہ نمایاں نظر آتی ہے اور "بر دل ریزد" ہی کو دیکھ کر "از دل خیزد" پر حکم لگایا جاتا ہے

ہو سکتا ہے کہ ایک واقعہ میرے لئے اسقدر باعث تاثر نہ ہو جتنا آپ کے لئے، لیکن واقعہ کی نوعیت کو دیکھ کر بہ آسانی یہ فیصلہ ہو سکتا ہے کہ اصولاً اس کا اثر کسقدر اور کیسا ہونا چاہئے اور یہیں سے وہ اصول مترتب ہوتا ہے جسے ایک شعر کی تنقید میں حقیقت مسلمہ کا درجہ حاصل ہے۔

شاعری میں حکمت و فلسفہ کے تمام شعبے داخل ہیں یا نہیں، میرے نزدیک لایعنی سی بحث ہے کیونکہ ممکن ہے فلسفہ شعر میں آکر بلند ہو جائے لیکن شعر فلسفہ کے حدود میں جاکر کوئی خاص امتیازی مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا، شعر حقیقتاً نام ہے اُس شعور حفوحی کا جس کا تعلق صرف انسان کے جذبات دقیقہ سے ہے یا اگر آپ سکو زیادہ بلند کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ جس کا تعلق روحانیت سے ہے اس لئے میرے نزدیک ایک شعر کا تعلق "اخلاقیات" سے تو ہو سکتا ہے لیکن "حکمیات غیر اخلاقی" سے متعلق کرنا خواہ مخواہ کی جسارت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفہ و حکمت بہت وسیع چیز ہے یعنی اس کی وسعت یہانتک ہے کہ "جرم و معصیت" بھی اس میں داخل ہو سکتی ہے، چنانچہ ہمارے ایک عزیز دوست جو "مسو، ہضم" کی حد تک فلسفہ واقع ہوئے ہیں دنیا کے بعض قبیح ترین و شنیع ترین حرکات کو بھی نہ صرف فطری بلکہ الوہیت سے ماورا (Beyond Divinity) قرار دیتے ہیں۔ لیکن شعر کی نزاکت اسقدر بھیانک وسعت کی متحمل نہیں ہو سکتی اور وہ کبھی "داعیات فطرتِ صحیحہ" سے منحرف ہو کر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جس کو فطرت صحیحہ کہا جاتا ہے وہی ایک اعتباری و فرضی چیز ہے تو بیشک میرے پاس اسکا کوئی جواب نہ ہوگا اور میرے لئے اس صورت میں سپر ڈالدینا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔

بہرحال چونکہ شعر کی پوری قوت کا اندازہ صرف اسی احساس و تاثر کے عالم میں ہو سکتا ہے جس کو مادیات یا منجر بہ مادیات سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی لئے آپ دیکھیں گی کہ شرق و غرب ہر جگہ جس صنف سخن کی ترقی ہوئی یا جس کی قدر کی گئی وہ وہی ہے جسے تغزل یا غرامی (Erotic or Amatory Poetry) شاعری کہتے ہیں اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز اس کا وہی غیر اکتسابی اور بالکل فطرت کے مطابق ہونا ہے، چنانچہ آپ دیکھیں گی کہ جس شعر میں عہد وحشت کی سی سادگی پائی جاتی ہے وہی بہت زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ ہر چند اس اصول کی بنا پر تغزل یا غرامی شاعری کے لئے یہ ضرور نہیں کہ وہ "تعلق جنسین" ہی میں محدود ہو، بلکہ وہ مذہب، اخلاق، مناظر فطرت، قوم و ملک ہر ایک سے وابستہ ہو سکتی ہے، لیکن یہ تمام "انشعابات" عہد ترقی اور دورِ تمدن کی چیزیں ہیں، حقیقی اور اصلی شاعری تو وہی ہے

جس کا درس عورت کی نگاہ اولین نے دیا تھا و لسد درما قال

نخستین بادہ کاندر جام کردند ز چشم مست ساقی وام کردند

اس لئے میرا مسلک اس باب مین بہت کچھ قدامت پسند (واقع ہوا ہے) اور مین ایک شعر مین حکمت و فلسفہ کے بجائے، بیان درد و حکایت محبت کی جستجو کرتا ہون اور اس مین کسی قسم کے تصنع کو پسند نہین کرتا

ڈاکٹر بجنوری مرحوم جس زمانہ مین دیوان غالب کا مقدمہ لکھ رہے تھے، مین بھی بھوپال ہی مین تھا اور بارہا میرے اُن کے درمیان "غالب کی شاعری" موضوع بحث قرار پائی۔ اس مین شک نہین کہ وہ بہت پاکیزہ ذوق سخن رکھتے تھے، نہایت ذہین شخص تھے اور پوری قوت نقد اُن مین موجود تھی، لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اُس وقت تک سن وقوف کو نہ پہونچے تھے اور اُن کا ذوق شعر و تنقید پختگی کو نہ پہونچا تھا۔ مین نے ہمیشہ اُن سے یہی کہا کہ آپ نے اس کام کو کم از کم ۵ ا سال قبل از وقت شروع کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو غالب کی مدح سرائی کی وہ صورت جو ایک ذم کا پہلو لئے ہوئے ہے، کبھی اختیار نہ کرتے۔

غالب کے شاعر ہونے مین کس کو گفتگو ہو سکتی ہے، لیکن اس کے محاسن شاعری کا صرف اس لئے قایل ہونا کہ اسنے حکمت و فلسفہ کے تمام نکات حل کر دیئے ہین نہ صرف خلاف حقیقت و واقعہ ہے بلکہ میرے نزدیک غالب کی شاعری کی توہین بھی ہے۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی نگاہ عقیدت نے حکمت و فلسفہ کے تمام رموز بستہ کا حل کلام غالب مین پا لیا ہو لیکن مین تو ڈرتا ہون کہ کہین یہ غالب پر اتہام نہ ہو اور نتیجہ ہو صرف ڈاکٹر بجنوری کی شاعری کا۔ مجھے افسوس ہے کہ انھون نے دیوان غالب مین غالب کا مطالعہ نہین کیا بلکہ خود اپنا مطالعہ کرنا چاہا، اور وہ یقیناً شاعری کے اس منزل مین تھے جس مین

بہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آسان ہے

تو قلم سے نکل سکتا ہے لیکن یہ نہین کہا جا سکتا کہ

مرے دل مین ہے یارب شوق وصل و شکوۂ ہجران خدا وہ دن کرے جب اُس سے مین یہ بھی کہون وہ بھی

چونکہ ڈاکٹر بجنوری خود بہت دقت پسند و مشکل آفرین طبیعت رکھتے تھے اور زمانہ نے اُن کو کوئی درس ایسا نہ دیا تھا جو انسان سے "خیال محال" ترک کرائے "واقعیت مکانی" مین مبتلا کر دیتا ہے، اس لئے انھون نے غالب کو شاعری کے اُن حدود مین ڈھونڈھا جہان وہ صرف اسد تھا اور بجنوری صرف ڈاکٹر۔ اگر اُن کی عمر وفا کرتی اور کسی بیوفا سے واسطہ پڑتا تو اُن کے مقدمہ کا یہ رنگ نہ ہوتا اور پھر انھین معلوم ہوتا کہ غالب کی شاعری کا وہی حصہ بیکار ہے جسے وہ فلسفہ طرازی سے تعبیر کرتے ہین۔

ڈاکٹر بجنوری کا، دیوان غالب کو الہامی کتاب کہنا بالکل درست ہے کیونکہ ہر حقیقی شاعر کا حقیقی شعر الہام ہی ہوا کرتا ہے اور علاوہ غالب کے ہندوستان مین اور بھی شعراء ایسے ہین جو اس حیثیت سے، پیغمبری کا درجہ رکھتے ہین، لیکن بجنوری مرحوم نے الہامات، کی تعیین کرتے ہوئے جس چیز پر زور دیا ہے وہ یہ ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت مین ہے دریا لیکن ہمکو تقلید تنک ظرفی منصور نہین

حالانکہ الہام حقیقتاً یہ ہے:۔

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل مین کسی رنگ سے معذور نہین

اور یہی وہ خصوصیت شعری ہے جس کی بناء پر مومن کو غالب پر ترجیح دیجا سکتی ہے، کیونکہ مومن کی فلسفہ طرازی بھی اس رنگ کو نہین چھوڑتی اور غالب تغزل سے ہٹکر کہین کہین اس حد تک پہونچ جاتے ہین کہ:۔

ترے بیمار پہ ہین فریادی — وہ جو کاغذ مین دوا باندھتے ہین

آپ کے سوال کا دوسرا حصہ کہ "ہندوستان کے شعراء مین غالب کا کیا درجہ ہے اور کن خصوصیات کی بناء پر" بہت زیادہ تفصیل کا محتاج ہے اور باب الاستفسار مین پوری طرح ایسی بحث نہین کیجا سکتی، تاہم مختصراً اسقدر ضرور عرض کرونگا کہ قبول و شہرت کا جہانتک تعلق ہے غالب کی ہستی بالکل منفرد ہے (گو مجھے اس مین کلام ہے کہ محض قبول و شہرت دلیل کسی کی خوبی کی ہو سکتی ہے یا نہین) لیکن نفس شاعری کے لحاظ سے اور وہ بھی اُردو مین، غالب کا مرتبہ نہ اسقدر بلند ہے جتنا بجنوری مرحوم نے سمجھا اور نہ اتنا گرا ہوا جتنا آپ کے حیدر آبادی پروفیسر ڈاکٹر عبد اللطیف نے سمجھایا۔ بلکہ اُس کا درجہ اس افراط تفریط کے درمیان ایک معتدل نقطہ پر قایم ہے۔

غالب کے کلام مین تین جداگانہ رنگ نظر آتے ہین، ایک وہ جسے غیر معتدل فارسی تخیل کہنا چاہئے مثلاً

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

دوسرا رنگ وہ جس مین تخیل تو فارسی ہے لیکن بہت معتدل جیسے:۔

دہر مین نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا — گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا

یا

تغافلہائے تمکین آزما کیا — غم آوارگیہائے صبا کیا

تیسرا رنگ وہ ہے جس مین صرف سادگی نے حسن کلام پیدا کیا ہے۔ مثلاً

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالین گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو — کاشکے تم مرے لئے ہوتے

وغیرہ وغیرہ

پہلے رنگ کا ذکر بالکل بیکار سی بات ہے، کیونکہ خود غالب ہی نے اس کو نظری کر دیا تھا اور اس کو سامنے رکھ کر غالب کی شاعری پر حکم لگانا مناسب نہین۔ رہ گئے باقی دو رنگ سو اس مین کلام نہین کہ یہ دونون اپنی اپنی جگہ نہایت پاکیزہ ہین، لیکن ان کو غالب سے مخصوص سمجھنا درست نہین اُس وقت جتنے کامیاب شعراء تھے، سب کے یہان کم و بیش یہی دونون رنگ پائے جاتے تھے علی الخصوص مومن کہ اگر اس کے کلیات کا استقصا کیا جائے تو بلا مدرک تفاوت کئی دیوان غالب نکل سکتے ہین۔ لیکن بایں ہمہ یہ نہین کہا جا سکتا کہ غالب کی شاعری ایک اتباعی و تقلیدی رنگ رکھتی ہے۔ اس کی معنی آفرینی، خلق مضامین، ندرت بیان، نوائے ترکیب، جدت تخیل، ہر چیز اپنی اپنی جگہ اس کے غیر معمولی ذہانت و طباعی کے ثبوت مین پیش کیجا سکتی ہے اور اگر آپ اس کے اُردو کے کلام کو نظر انداز کر دین (جسے وہ اپنا "مجموعۂ بے رنگ" کہتا ہے) تو پھر فارسی مین اس کی انفرادیت

کو بھی ایک حد تک تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب خود بھی اس کو محسوس کرتا تھا کہ ریختہ اس کے وسعت بیان کا متحمل نہین ہو سکتا اور اس لئے اس نے زیادہ توجہ فارسی شاعری کی طرف کی۔

اس مین کلام نہین کہ غالب کی وقت پسند طبیعت نے سب سے پہلے میرزا عبدالقادر بیدل کا رنگ اپنے ریختہ اور فارسی مین پیدا کرنا چاہا لیکن چونکہ بیدل کا رنگ الفاظ و تراکیب سے بالکل علحدہ محض وجدان و کیف سے پیدا ہونے والی چیز ہے جو غالب مین مفقود تھا اس لئے ان کو آخر کار سپر ڈالدینا پڑی اور اعتراف ناکامی کے بعد عرفی و نظیری کو پیش نظر رکھ کر شاعری شروع کی۔ جہانتک فارسی زبان اور شوخی و حلاوت کا تعلق ہے، یقیناً غالب کو عرفی اور نظیری ہی کے صف مین جگہ دیجائے گی بلکہ جوش و خروش کی حیثیت سے اس کا مرتبہ بلند نظر آئیگا لیکن اثر و تاثر کی دنیا مین غالب ان دونون سے فروتر نظر آتا ہے۔ آپ غالب کا پورا کلیات چھان ڈالئے مگر عرفی کے اس شعر کا جواب آپ کو کہین نہین ملیگا:۔

امروز نگاہِ من و عرفی بہم افتاد — باہم نگرستیم و گرستیم و گزشتیم

غالب نظیری کی تقلید مین اپنی سرشاری کا اظہار کرتے ہوئے سیر نہین ہوتا۔ چنانچہ متعدد جگہ لکھا ہے:۔

(۱) غالب از اوراق ما نقش ظہوری دمید — سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدن وہیم

(۲) غالب از من شیوۂ نطق ظہوری زندہ گشت — از نوا جان در تن ساز بیانش کردہ ام

(۳) جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب — خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم

اور اس مین شک نہین کہ ان دونون کے کلام مین اس درجہ اتحاد و یکرنگی ہے کہ مشکل سے امتیاز ہو سکتا ہے، لیکن پھر بھی نظیری کے اس نوع کے اشعار کا جواب اس سے نہ ہو سکا:۔

درمحبت دل و دین باختن اول قدم ست — ما نظیری ز تو خورسند بایمہا نہ شویم

مثال لب دریا و حال مستسقی ست — دہند شوق و لے رخصت نظر ندہند

تو مپندار کہ این قصہ بخود می گویم — گوش نزدیک لبم آر اکہ آوازے ہست

الغرض تغزل مین معاملات محاکات، رشک و حسد، طعن و تشنیع، شوق وصل و شکوۂ ہجران وغیرہ تمام وہ جذبات جو پندارِ عشق کے ساتھ پیدا ہوتے ہین غالب کے یہان نہایت خوبی و اہتمام سے پائے جاتے ہین، لیکن جہانتک جذبات استسلام (Passive feelings) کا تعلق ہے، غالب کی شاعری کوئی خاص امتیاز نہین رکھتی۔ یہی سبب ہے کہ غالب کے قصاید اُس کی غزلون سے اور مثنویان قصاید سے بہتر ہین۔ کیونکہ قصاید مین رنگ تغزل ضروری نہین اور مثنوی مین وسعت بیان کے لئے کافی میدان موجود ہوتا ہے جسمین غالب ایسا محاکات نویس و معاملہ نگار پورا زورِ طبیعت صرف کر سکتا ہے۔

"نیاز"

سالومی

آسکر وائلڈ کے نہایت مشہور ڈراما کا ترجمہ جسے جناب مجنون گورکھپوری نے اسی قوت بیان اور سلاست کے ساتھ کیا ہے جو آسکر وائلڈ کے خصوصیات انشاء مین داخل ہین اس مین ایک مختصر مگر جامع مقدمہ بھی شامل ہے جسمین اس ڈرامہ کی تاریخ و دیگر خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲ ار

مینیجر "نگار" لکھنؤ

ہوا کا ترانہ

نہ ہے رہبر کوئی میرا نہ ہے رہزن میرا
کہین منزل ہے مری اور نہ مسکن میرا
مست پرواز سدا رہتا ہے توسن میرا
کبھی اُلجھا نہ کسی خار سے دامن میرا
آرہی ہون مین کہان سے یہ مجھے یاد نہین
کوئی دنیا مین مری طرح بھی آزاد نہین

گام پیما ہون مین خاموش بیابانون مین
میرے ہنگامے تڑپتے ہین گلستانون مین
دشت مین، وادی کہسار مین، ویرانون مین
بزم آرا ہون مین دنیا کے شبستانون مین
وہ فضا کون سی ہے مجھ سے جو آباد نہین
کون سالب ہے وہ جس پر مری رو داد نہین

ابر ہین سبزۂ گردون پہ خرامان مجھ سے
قلزم آب مین موجین ہین غزلخوان مجھ سے
صحن گلزار ہے فردوس بہ دامان مجھ سے
رقص پیما ہین شرر ہائے گلستان مجھ سے
عکس آرائے گلگون ہے مرے سینے مین
زندگی جلوہ نما ہے اسی آئینے مین

ہر طرف پھیلی ہے اس باغ مین نکہت میری
نہین دیکھی ہے کسی نے کبھی صورت میری
ایک حالت پہ نہین رہتی ہے فطرت میری
ہر طرف مجھ کو لئے پھرتی ہے وحشت میری
نقش ہوتے نہین جنبش سے نمایان میری
جادہ رفتار سے رہتا ہے گریزان میری

مین اڑا لاتی ہون پھولون کی بہار رنگین
مین الٹ دیتی ہون سے کریہ دیار رنگین
توڑ لیتی ہون مین گلہائے شرار رنگین
مین چرا لاتی ہون نغمون کے نگار رنگین
آہ و فریاد کے پوشیدہ ہین پارے مجھ مین
سو رہے ہین غم و عشرت کے شرارے مجھ مین

کشمکش سے مرے ہوتے ہین ترنم پیدا
میرے جلوون سے ہے کلیون مین تبسم پیدا
پتیون مین مرے دم سے ہے تکلم پیدا
مین نے سبزہ پہ کئے صبح دم انجم پیدا

سن کے میرے نفس مست سے اعجاز بہار
لب ساحل پہ بجا کرتے ہین موجون کے ستار

قصر گل توڑ کے نکہت کو چراتی ہون مین   دشت و کہسار کو پھولون مین بساتی ہون مین
لے کے گہوارہ مین کلیون کو کھلاتی ہون مین   برگ خوابیدہ کو نغمون سے جگاتی ہون مین
صبح دم باغ مین شاخون کو سنوار آتی ہون
گل کے افسردہ چراغون کو اُتار آتی ہون

آہ کرتی ہون مین جاکر کبھی ویرانون مین   کبھی گاتی ہون ترانے مین شبستانون مین
پھول چنتی ہون کبھی آکے گلستانون مین   اور اڑاتی ہون کبھی خاک بیابانون مین
جام شبنم کبھی پھولون کو پلا دیتی ہون
ان کی محفل سے کبھی ان کو اُٹھا دیتی ہون

بال سنبل کے کبھی کھینچ لیا کرتی ہون   دامن گل پہ کبھی رقص کیا کرتی ہون
کبھی دوشیزۂ نرگس سے حیا کرتی ہون   چوم کر لب کبھی پھولون کے چھپا کرتی ہون
فرش سبزہ پہ کبھی ناز سے اٹھلاتی ہون
تھام کر دامن نکہت کبھی اِتراتی ہون

چادرِ گرد اڑا لاتی ہون صحراؤن سے   گوہر آب چرا لاتی ہون دریاؤن سے
شاہدِ مے کو بھگا لاتی ہون میناؤن سے   نکہت گل کو جگا لاتی ہون ایماؤن سے
توڑ لیتی ہون گل شمع شبستانون مین
جام شبنم کو پٹک دیتی ہون ویرانون مین

تنگ آجاتی ہون جب گھوم کے صحرا و چمن   آکے دریا مین بناتی ہون مین آبی مسکن
اُس مین بنتی ہون شعاعون سے انوکھا دامن   یاد آتے ہین مگر جب گلِ صحرائے وطن
دم مین بس توڑ کے اِس خیمۂ آبی کی رسن
برق مضطر کی طرح اڑتی ہون بے رنج و محن

تاب خورشید سے جب کانپنے لگتی ہے فضا   جسم کو پیرہن خاک مین لیتی ہون چھپا
نے کے دامن مین بھر اپنے خس و خاشاک بلا   رقص کرتی ہوئی اٹھتی ہون مین مینار نما
اِک بلندی پہ بناتی ہون نشیمن اپنا
پھر اُتر آتی ہون مین پھاڑ کے دامن اپنا

لب جو آئینہ پھولون کو دکھاتی ہون کبھی
اور گہوارہ مین موجون کے کھلاتی ہون کبھی
وصل و ہجران کے مزے دم مین چکھاتی ہون کبھی
مین ملاتی ہون کبھی اُن کو ہٹاتی ہون کبھی
دشت و کہسار مین نکہت کو پھرایا مین نے
عالمِ خواب مین غنچون کو ہنسایا مین نے

آکے سنتی ہون کبھی نغمۂ مرغانِ بہار
کبھی پھولون کا لگاتی ہون چمن مین انبار
ناچتی ہون کبھی دامن مین لئے اپنے شرار
کھیلتی ہون کبھی چشمون کو بنا کر گلزار
چھیڑ کر موج کو اک زمزمہ سنتی ہون کبھی
آستینِ پیرہنِ آب کی چنتی ہون کبھی

چاند جب کھول کے دروازۂ زرین اپنا
کہتا ہے تارون سے افسانۂ غمگین اپنا
جوشِ مستی مین لئے بربطِ پروین اپنا
آکے مین چھیڑتی ہون نغمۂ رنگین اپنا
رقص کرتے ہین مرے سامنے گلہائے چمن
چومتی ہون مین لبِ نکہتِ فردوس وطن

جامِ مہتاب سے جب ہو کے ستارے مدہوش
سنتے ہین شاہدِ فطرت کی نوائے خاموش
چادرِ ابر سمن بار سے پیرایہ بدوش
آکے ہوتی ہون مین اس بزم مین افسانہ نیوش
کبھی چھپ جاتی ہون لیکر گلِ انجم کی بہار
اور ہنستی ہون بنا کر یہی پھر نقش و نگار

چاند کو توڑ کے موجون پہ بہاتی ہون کبھی
اور ٹوٹے ہوئے ٹکڑون کو ملاتی ہون کبھی
گلِ سوسن کی طرح اُس کو ہنساتی ہون کبھی
چھین دامن مین اُسے اپنے چراتی ہون کبھی
اُس کو آغوش مین لے کر کبھی سو جاتی ہون
ظلمتِ شب کی طرح نور مین کھو جاتی ہون

چادرِ ابر پہ لے کر کبھی مستی مین قلم
مین بناتی ہو کہین شہر کہین بزمِ صنم
کہین مینار، کہین قصر، کہین رقصِ علم
کہین چشمے، کہین کہسار، کہین باغِ ارم
دم مین یہ نقش بنا کر مین مٹا دیتی ہون
آئینہ شاہدِ ہستی کو دکھا دیتی ہون

شور کرتی ہون مین آکر کبھی ویرانون مین
خیمہ بردوش کبھی پھرتی ہون میدانون مین
کبھی پردون کو الٹ دیتی ہون ایوانون مین
کھیلتی ہون کبھی شمعون سے شبستانون مین

حسن گلزار کو کرتی ہون مین مستی مین خراب
آکے سو جون پہ تڑپتی ہون مین ہوکر بےتاب

لے کے گرداب مین کشتی کو مچلتی ہون کبھی
بادبان چیر کے جون برق نکلتی ہون کبھی
مین اُگلتی ہون کبھی اُس کو نگلتی ہون کبھی
منہ مین مچھلی کی طرح لے کے اچھلتی ہون کبھی

پھینک دیتی ہون کبھی دشت کو دریاؤن مین
کبھی دریا کو الٹ دیتی ہون صحراؤن مین

ابر کی فوج کو میدان مین لاتی ہون مین
شور کر کے دہل رعد بجاتی ہون مین
آگے آگے علم برق ہلاتی ہون مین
لشکر مہر کو حملون سے بھگاتی ہون مین

ہنس کے پھر بادشہ نور کو شرماتی ہون
چادرِ قوس قزح اوڑھ کے سو جاتی ہون

میرے آغوش مین سوتے ہین ہزارون طوفان
ہین ہزارون مرے دامن پہ بہارین قصان
قہر مین کرتی ہون سیلاب پہ دنیا کو روان
اور خوشی مین اُسے کر دیتی ہون فردوس نشان

رقص کرتے ہین ہر اک رنگ کے جوہر مجھ مین
مین ہون عالم مین نہان عالم محشر مجھ مین

یاسمن روکتی ہے ناز سے توسن میرا
ہنس کے گل کھینچتے ہین گوشۂ دامن میرا
ہاتھ ہی ہاتھ لئے شاہد سوسن میرا
کہتی ہے ناز سے آ دیکھ نشیمن میرا

کوئی پہناتا ہے پیراہن نکہت مجھ کو
اور سناتا ہے کوئی نغمۂ عشرت مجھ کو

نگرانِ عشوہ گردون سے مین چھڑا کر دامن
موج دریا کی طرح دیکھتی صحرا و چمن
جوشِ وحشت مین گزر جاتی ہون بے رنج و محن
کیا ہو مجھ پر اثر جادوِ نسرین و سمن

میری رفتار مین مضمر ہے نشیمن میرا
میرے دامن کی فضاؤن مین ہے گلشن میرا

تھی مین گلبانگ جہان خیز ازل پر رقصان
حضرتِ نوح کے طوفان مین ہر سو تھی روان
مین ہون دیکھے ہوئے جمشید کی محفل کا سمان
یون ہی گاؤن گی سدا دیکھ کے نیرنگ جہان

ہے ہوا نام میرا کام روانی میرا
سب کو سیراب کئے رہتا ہے پانی میرا

طفیل احمد شمیمی بی۔اے

تربیت اطفال

ذرہ دہر مین ہے نورِ قمر جلوہ فگن　　سینۂ تخم مین ہے عکسِ شجر جلوہ فگن
صاعقہ پاش ہے گو موج روان دریا مین　　دیکھنے والا مگر کوئی نہین دنیا مین
صحنِ گلشن سے اگر شاخ نہوتی روپوش　　ہوتے کچھ غنچۂ خوشرنگ وہان جلوہ فروش
قطرے نیسان کے صدف سے جو نہ باہر گرتے　　ایسے دُر بنتے کہ پھر نظرون سے گوہر گرتے
آہ اطفالِ وطن آج جو آوارہ ہین　　ماہ بے نور ہین، آئینۂ ناکارہ ہین

صیقل علم سے گر انکو جِلا دی جاتی
انکے سینون ہی سے پھر کسبِ ضیا کی جاتی

(محمود - اسرائیلی)

تحریصِ عمل

توہی بلبلِ چمن ہے ہمہ سوز و ساز ہوجا　　توہی شمعِ انجمن ہے ہمہ تن گداز ہوجا
یہ ترا سکونِ پیہم ہے حریفِ زندگانی　　اسے سونپ کر خدا کو تو خرام ناز ہوجا
تری ہر ادا مین مضمر ہے جہان سرفرازی　　ابھی اسکو آزمالے۔ ابھی سرفراز ہوجا
تری بندگی کی خو نے نہ تجھے کہین کا رکھا　　دلِ غزنوی بگڑ کر نگہ ایاز ہوجا
ہے ترے عمل کی دنیا جسے خواب کہہ رہا ہے　　جو شعورِ زندگی ہے تو عمل نواز ہوجا

تری "بزمِ آرزو" کا ہے جنون مدعا کو
تری "شمعِ جستجو" کی ہے تلاش ارتقا کو

امین حزین

غزلیات

اختر شیرانی :—

دل و دماغ کو رو لونگا، آہ کر لونگا
تمھارے عشق مین سب کچھ تباہ کر لونگا!

جو تم سے کر دیا محروم، آسمان نے مجھے
مین اپنی عمر کو صرفِ گناہ کر لون گا!

ثواب کے لئے ہو جو گنہ وہ عینِ ثواب!
خدا کے نام پہ بھی اک گناہ کر لون گا!

حریمِ حضرتِ سلمیٰ کی سمت جاتا ہون
ہوا نہ ضبط تو چپکے سے آہ کر لون گا!

مجھے جو دیر و حرم مین کہین جگہ نہ ملی
ترے خیال ہی کو سجدہ گاہ کر لون گا!

یہ نو بہار، یہ ابر و ہوا، یہ رنگِ شراب!
چلو جو ہو سو ہو، اب تو گناہ کر لون گا

کسی حسین کے معصوم عشق مین اختر
جوانی کیا ہے مین سب کچھ تباہ کر لونگا!

دل شاہجہانپوری :—

بے نیازی ہے اُسکی عجز نواز
وقفِ سجدہ رہے جبینِ نیاز

اپنے نغمون کو چھیڑ اے بلبل
ہر گلِ تر ہے گوش بر آواز

کھنچ رہی ہین دلِ حزین کی رگین
ہم نفس اُٹھ رہا ہے پردۂ راز

شمع گریان ہون بزمِ ہستی مین
ہر نفس عشق مین ہے روح گداز

چھیڑتی ہے عبث ہوائے چمن
اب کہان ہم مین ہمتِ پرواز

زینتِ حسن بے حقیقت ہے
ہو نہ آلودۂ فریبِ مجاز

صورتِ شمع جل خموشی سے
ہے تقاضائے عشق سوز و گداز

شب غم اے دلِ فراق نصیب
ہے مصیبت خیالِ زلفِ دراز

کوچۂ عشق مین جناب دل
ہے عبث شکوۂ نشیب و فراز

افسر صدیقی امروہوی :—

راز ہستی کس سے پوچھین کس کو اتنا ہوش ہے
آئینہ خانے مین اک اک آئینہ خاموش ہے

حشر کیون برپا کرتا ہے اپنی فتنہ سامانی پہ ناز
میرے پہلو مین بھی اک ہنگامہ خاموش ہے

شمع کیون بیتاب ہے جلتا ہے پروانہ اگر
عشق تو دیوانہ ٹھہرا حسن کیون پر جوش ہے

ہٹتے دیکھون دل نے ہوئے روشن بر نقاب
دیکھئے جلوہ تمھارا کس کو اتنا ہوش ہے

کان مین آتی نہین اب لن ترانی کی صدا
ایک مدت ہو گئی دنیائے دل خاموش ہے

صبح خندان کی طرح افسر مرا دل ہے نہال
شامِ فرقت مین نہ جانے کون ہم آغوش ہے

نظیر لودھیانوی :—

تجھے دلبری کا مذاق ہے تو بجائے سرو سمن مین آ
بہزار جلوۂ دمِ سحر تو نکل کے گھر سے چمن مین آ

تجھے ربط تیر و کمان سے ہے کیا تجھے کام تیغ و سنان سے کیا
تو نہالِ حسن و جمال ہے تو بہار بن کے چمن مین آ

ذرہ کرم کبھی لے صبا یہ پیام میرا اُسے سنا
کہ جہان مین عالمِ نو ئے شبِ ماہ دہرِ کہن مین آ

نہ ہو یہ ریاضِ فرنگ مین نوائے جلوۂ گنگ مین
جو تلاشِ لیلیٰ آرزو ہے تجھے تو نجد کے بن مین آ

تو ہر ایک طرح کا ظلم سہ تو رضائے دوست مین مست رہ
تو صراطِ عشق مین گام اُٹھا تو دیارِ دار و رسن مین آ

جو اضطراب فزا نہین تو کبھی زندگی کا مزا نہین
جو نہین ہے شغلِ رباب و مے تو حریمِ اہلِ سخن مین آ

یہ کہا ہے اخترِ صبح نے کہ نہ بے خبر ہو مآل سے
یہ نشاطِ عمر ہے یک نفس نہ فریبِ چرخِ کہن مین آ

جو چڑھے تھے رنگ اُتر گئے کئی ماہ و سال گذر گئے
ہے پرانے دیس کا ذوق کیون تو نظیر اپنے وطن مین آ

معلومات

کانچ اور فولاد کا شہر اسوقت یوروپ کے مسائل تمدن مین سے ایک بڑا مسئلہ مکانون کی تعمیر کا ہے - آبادی کی کثرت سے جگہ مین تو اضافہ ہوتا نہین اور ہر آدمی کے لئے ہر نوع ایک معین جگہ زمین پر سانس لینے اور رہنے کے لئے ضروری ہے، چنانچہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ وہان کے موجودہ مکانات آبادی کے لحاظ سے بہت تنگ اور اصول صحت کے اعتبار سے ناقابل سکونت ہین نہ خاک سے پوری طرح حفاظت ہوتی ہے نہ ہوا اور روشنی کافی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ گنجان آبادی مین سڑک کے دونون جانب، بلند عمارتون کا سلسلہ، نہ ہوا کو آزادی کے ساتھ آنے دیتا ہے نہ روشنی کو، اور ہر چند وہان کمرون کے اندر ہوا اور مصنوعی روشنی پہونچانے کا انتظام بہت پرپیچ طریقون سے کیا جاتا ہے لیکن خاطر خواہ اس مین کامیابی نہین ہوتی -

لندن کے ایک مشہور ماہر تعمیرات سنڈے اکسپریس مین اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہین کہ یہ مشکل صرف اس طرح حل ہو سکتی ہے کہ تعمیر نہایت سادہ ہو اور تجربہ علمی طور پر تعمیری کا ایک جزو قرار دیا جائے اور بجائے اینٹ پتھر کے صرف فولاد اور کانچ کی عمارتین بنائی جائین - چنانچہ یوروپ و امریکہ کے ماہرین فن نے عمارتون کے بالکل نئے نقشے طیار کرنا شروع کر دیئے ہین اور بڑی حد تک تمام دقتون کو دور کر کے مستقبل کی تعمیرات پر علمی حیثیت سے کوششون کا آغاز ہو گیا ہے

تجویز یہ ہے کہ بجائے بنیاد کھودنے کے جس مین رطوبت، گندگی اور وقت سبھی کچھ پیدا ہوتی ہے، عمارتین صرف ستونون پر قایم کی جائین تاکہ سڑک بھی وسیع رہے، لوگون کی آمد و رفت مین بھی سہولت پیدا ہو اور دکانون کو بھی کافی جگہ ملجائے - جدید عمارتین فولاد، کانچ اور کنکریٹ کی ہونگی جن کے نیچے باغ مصنوعی جھیلین، پیرنے کے حوض، تفریح گاہین وغیرہ سب بن سکین گی اور اس طرح یہ تمام اسباب صحت و تفریح شہر کے اندر ہی ہر جگہ مہیا ہو سکین گے -

لوگون کا خیال ہوگا کہ کانچ ایسی نازک چیز کے مکانات بہت کمزور ہونگے لیکن یہ صحیح نہین کیونکہ اگر کانچ بہت دبیز استعمال کیا جائے تو اس سے زیادہ مضبوط کوئی چیز نہین اور اس کی دیوارین، چھتین، دروازے، اور ستون بغیر کسی خطرہ کے بنائے جا سکتے ہین، اسی کے ساتھ سب سے بڑا فایدہ یہ ہے کہ شیشہ پر نقاشی، رنگسازی وغیرہ بھی بہت آسانی سے ہو سکتی ہے اور اسے جس طرح چاہین ڈھال سکتے ہین اور حسین سے حسین چیز اس کی طیار کر سکتے ہین، پھر چونکہ وہ صاف رہنے والی چیز ہے، تم کو قبول نہین کرتی، اس پر خاک نہین جمتی اس لئے صحت کے لئے بھی بہت مفید ہے اور ارزانی اسکی ظاہر ہے -

شیشہ کی عمارتون مین مصنوعی روشنی کا سوال بھی بالکل اٹھ جائیگا کیونکہ یہ عمارتین ایسی بنائی جائین گی کہ از خود روشن ہو جائین اور اس طرح گویا کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے مکانات روشنی کے بنے ہوئے ہونگے

اہرام مصری کا راز اہرام مصری کے متعلق ایک نہایت عجیب و غریب نظریہ حال ہی مین یہ قایم کیا گیا ہے کہ مصر قدیم کے کاہن اس سے دھوپ گھڑی کا کام لیتے تھے اور موسم کی پیمایش کرتے تھے، مسٹر کاٹشور تھ نے جو اس قیاس کا موجد ہے، حکومت مصر کو لکھا ہے کہ سب سے بڑے مینار کی چوٹی کا منہدم حصہ بنانے کی اجازت دیجائے تاکہ اس کا تجربہ ہو سکے -

اس کا خیال ہے کہ مینار کا شمالی حصہ بجائے ڈایل یا سایہ دیکھنے کی جگہ کے استعمال ہوتا تھا اور اس کا تجربہ کرنے کے لئے مینار کی چوٹی کی تعمیر ضروری ہوگی۔

اس وقت تک جو عام طور پر یہ خیال قائم کیا جاتا ہے کہ اہرام مصری صرف فراعنہ کی لاشون کو محفوظ رکھنے کے لئے بنائے گئے تھے مسٹر کاسٹورتھ کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قدیم اہل مصر بڑے عملی لوگ تھے اور اہرام مصر صرف اس غرض سے بنائے گئے تھے کہ مصر کے کاہن اس کی مدد سے موسمون کی تعیین کر سکین، چنانچہ اہل مصر اس مدد سے اپنے ایک خاص غلہ کی تین تین فصلین کاشت کر لیتے تھے۔ تیسری مرتبہ کاشت کرنے کے لئے اگر دو چار دن کی بھی دیر ہو جاتی تو فصل خراب ہو جاتی تھی لیکن اہرام مصری کی مدد سے ایک دن کیا بلکہ ایک گھنٹہ کی بھی دیر نہ ہوتی تھی اور وقت کاشت کی بالکل صحیح تعیین ہو جاتی تھی۔

اہرام مصر گویا کاہنین مصر کی پوشیدہ جنتری تھی جس کی مدد سے وہ مصر کے کاشتکارون کو احکام صادر کرتے رہتے تھے اور اس کے راز کو وہ کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔ چونکہ مصر کی ساری آبادی کاشتکاری پیشہ تھی اور خود ان کو وقت و موسم کے تعیین کا طریقہ معلوم نہ تھا، اس لئے وہ کاہنون کو نہایت ہی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کا بڑا اثر سارے ملک پر قایم تھا۔ وہان کے کاہن ہر ماہ کے دسوین، بیسوین اور تیسوین دن ہر عشرہ کا پروگرام بتا دیا کرتے تھے کہ آیندہ دس دن مین کیا کرنا چاہئے اور موسم کی کیا حالت ہوگی مثلاً "خزان شروع ہوگئی ہے۔ دریائے نیل پوری طغیانی پر ہوگا نہرون کے دہانے کھول دو، لونگ چقندر اور شلغم کی کاشت شروع کردو، بھیڑون کو مینڈھون سے علحدہ کردو، زیتون اور روئی چن لو، پھلون کو جمع کر لو۔"

اور یہ تمام پیشین گوئیان وہ اہرام مصری کی مدد سے کیا کرتے تھے اگر مسٹر کاسٹورتھ کا یہ قیاس صحیح نکلا اور حکومت مصر نے اس کو مزید تفتیش کی اجازت دیدی تو یقیناً یہ انکشاف نہایت ہی دلچسپ انکشاف ہوگا۔

زمین اور شہاب ثاقب ڈاکٹر چارلس پی اولیور نے جو جامعہ پنسلوینیا کے رصد خانہ کے مہتمم ہین حال ہی مین فلکیات کی ایک مجلس مین تقریر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسوقت روزانہ کروڑ شہاب ثاقب زمین تک پہونچنے والے وہ ہین، جو ہمکو نظر آتے ہین ورنہ جو دوربین سے دیکھے جاتے ہین ان کی تعداد کا علم کسی کو پھر حیرت ہے کہ ان سے زمین کو کیون نقصان نہین پہونچتا اس کا سبب یہ ہے کہ جب وہ آسمان سے ۳۰ سے لیکر ۴۰ میل فی سکنڈ کے حساب سے چلتے ہین، تو فضا کی گرمی ان کو جلا کر خاک کر دیتی ہے، اور جب وہ زمین پر پہونچتے ہین تو راکھ کا ڈھیر ہوتے ہین، دوسرے انکی ضخامت بھی کم ہوتی ہے۔

امریکہ کی عورت کا اسراف دنیا کی تمام عورتین اپنے اسباب آرائش مین فضول خرچی کے لئے بدنام ہین، لیکن اس حیثیت سے نیویارک کی عورتین سب سے آگے ہین، چنانچہ امریکہ کے اخبارات کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۲۶ء مین عورتون اور لڑکیون نے صرف کپڑون پر (جواب اس قدر کم ہوگئے ہین کہ انکی سرحد تقریباً عریانی سے جا کر مل گئی ہے) جو رقم صرف کی ہے وہ ۱۹۲۵ء کی رقم سے ۱۳۷۰۰۰۰۰۰ ڈالر یعنی تقریباً ۴۵ کروڑ روپیہ زیادہ ہے اور غریب مرد کو اسی اعتبار سے اپنے کپڑون مین کمی کرنا پڑی اور اس کمی کی مقدار ۱۹۰۰۰۰۰۰ ڈالر ہے۔

پرتاب ۱۲ر
روہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی عہ
ملکہ زنوبیہ ۳ر
قرۃ العین ۳ر
مخدرات عمہ/۸
جویائے حق للعہ
لعبت چین عہ
فاتح مفتوح عمہ/۴
ایک خرمی عمہ/۸
الفانسو ۱۲ر
ایام عرب ۶
قیس ولبنی عمہ/۴
یوسف ونجمہ عمہ/۸
زوال بغداد عمہ/۸
مینا بازار عہ
مقدس نازنین عمہ/۸
رومۃ الکبری عمہ/۸
فلپانا عمہ/۸
شوقین ملکہ عہ
منصور موہنا ۸ر
حسن انجلینا ۸ر
ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
فردوس بریں ۸ر
حسن کا ڈاکو عمہ/۸
دربار حرام پور ۱۰ر
غیب دان دلہن عہ
بدر النساء کی مصیبت عمہ/۴

میوۂ تلخ ۸ر
نیکی کا پھل عمہ

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق عمہ/۸
قاسم وزہرہ عہ
نیرنگ جمال ۴ر

میر ولی اللہ بی اے

بندگی ۶
کاس الکرام ۱ر
لسان الغیب جلد اول ۱ر
〃 دوم ۶
〃 سوم ۶/۸
〃 چہارم ۶/۸
تمغان فصاحت ۶/۸
بادو کوناب عہ

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری عمہ/۴
بہرام کی گرفتاری عہ

مولانا نیاز فتحپوری

گہوارۂ تمدن ۶
گیتان جلی ۶
نگارستان ۶
صحابیات ۶/۸
تاریخ الدولتین عمہ/۸

سید سجاد حیدر بی اے

زہرا ۱۳ر
جلال الدین خوارزم شاہ عمہ/۱۲
خیالستان عمہ/۸
ثالث بالخیر ۸ر

حکایات واحتسابات عمہ/۴

دلچسپ تاریخی وجاسوسی ناول

سراب فیشن ۸ر
بالشوک شہزادی ۸ر
شہید وفا ۸ر
ممتاز بیگم ۸ر
شعلۂ رنگین ۸ر
محاصرۂ پیرس عہ
شیخ چلی عہ
بہادر ترک ۸ر
بہرام کی واپسی ۴ر
انقلاب فرانس عمہ/۸
حسن بنارس ۸ر
فطرتی جاسوس عمہ/۸
ترکی حرم سرا ۸ر
جنگ طرابلس ۸ر
بہرام چور عمہ/۸
زرپرست عمہ/۴
کنجی کا راز عمہ/۸
عبدالرحمٰن ناصر ۶
عروس مصر ۶
سیلاب خون عمہ/۸
کرشمہ عمہ/۸
وفادار دلہن عمہ/۸
طواف زمین عہ

سیاحت زمین عمہ/۴
سیاحت عہ
نازنین مراکش ۸ر
سمندر کی سیر ۶/۸
اسرار بالشوزم عمہ/۴
روح لیلی ۱ر
امین بک عمہ/۸
حجاج بن یوسف عمہ/۴
یوسف پاشا عمہ/۸
انقلاب عثمانی عمہ/۸
نیلی چھتری عمہ/۸
بہرام کی آزادی ۱۲ر
بہرام کی گرفتاری عہ
بہرام کی سرگزشت عہ
پر اسرار قتل ۶

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب ۱ر
بزم خیال عہ
مشاطۂ سخن عہ
انشاء النسوان ۶ر
مکاتیب محسن الملک عمہ/۸
لیلی مجنون ڈراما ۸ر

مراثی

مراثی دبیر ۶/۸
مراثی انیس للعہ/۸
مراثی ضمیر عہ

نگار بک ایجنسی

نظیر آباد لکھنؤ

مراثی مونس ۱ر/۱۲
مراثی دلگیر ۶/۱۲

تذکرۃ الشعرا

تذکرۂ حسینی ۱۱ر
گلشن ۱۰ر
سراپائے سخن عہ
سوانح نظیر اکبر آبادی عمہ

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز عمہ/۲
کلیات عراقی ۱۲ر
دیوان حافظ عمہ/۶
دیوان نعمت خان عالی عہ
کلیات انوری ۶/۴
دیوان بے دل ۱۰ر
کلیات سعدی عمہ/۸
دیوان عرفی ۱۲ر
کلیات جامی عمہ/۶
کلیات غالب عمہ/۵
کلیات صائب عمہ/۱۲
کلیات حزین ۶/۱۲
دیوان عنصری ۱۴ر
دیوان ظہیر فاریابی ۶ر
دیوان غنی کشمیری ۶ر
دیوان ناصر علی ۵ر
دیوان ہلالی ۶ر
کلیات جلال اسیر عمہ/۴

دواوین اردو

دیوان حسن دہلوی ۶ر
کلیات ظفر ۶/۱۲

کلیات مومن عہ
دیوان ناسخ عمہ/۴
کلیات میر عمہ/۸
کلیات سودا عمہ/۸
کلیات انشا عمہ/۸
کلیات نظیر اکبر آبادی عہ
گلزار داغ عمہ/۴
دیوان رند ۹ر
دیوان ذوق ۲ر
کلیات اسمعیل ۶
مراۃ الغیب عہ
صنم خانۂ عشق ۶
فریاد داغ ۴ر
دیوان قاتل ۸ر
دیوان شیدی ۴ر

عجائب وغرائب

عجائب المخلوقات تصویر رنگین عمہ
〃 باتصویر سادہ للعہ
مجمع الفنون ۱ر/۸
طلسم فرنگ ۶
کارخانۂ عالم عہ

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین ولیلی عمہ/۱۲
فریب حسن ۶
سوزن عشق عمہ/۴
روز الیمبرٹ للعہ/۸
ناول اسرار ۶/۸
شام جوانی ۱ر/۴
طلسمی فانوس عمہ/۱۲

تصانیف مولانا نیاز فتحپوری

صحابیات

جس میں عہد سعادت کے ۵۸ خواتین کے مستند حالات درج ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا کی خاص زبان و انشا میں ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت فی جلد عہ

نگارستان

زیر طبع ہے

شاعر کا انجام

نیاز فتحپوری کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا فسانہ جو زور انشا اور حسن بیان کے لحاظ سے عجیب و غریب چیز ہے

قیمت مع محصول ۱۲ ار

شہاب کی سرگزشت

اردو میں پہلا فسانہ ہے جس میں نفسیاتی تحلیل کے لحاظ سے سیرت نگاری کی گئی ہے۔ یہ امر مسلم ہوچکا ہے کہ اردو میں اس سے بہتر تخییل اور بلند انشا کا فسانہ کوئی شائع نہیں ہوا۔

قیمت فی جلد عہ

جذبات بھاشا

ہندی شاعری میں جو لوچ اور کیفیت ہے اس کا علم انھیں کو ہوسکتا ہے۔ جنھوں نے اس زبان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کو دیکھئے اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجئے

قیمت فی جلد ۱۲ ار

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان مصری مشہور مورخ اسلام کی تاریخ تمدن اسلامی کے ایک حصہ کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسی تاریخ پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔

قیمت فی جلد عہ

علم فراست الید

یعنی ہات کی لکیروں کو دیکھکر ایک شخص کی سیرت اور اس کے ماضی و مستقبل کے حالات معلوم کرنے کا علم۔ اس فن پر ایک سلسلہ مضامین نگار میں شایع ہوا تھا۔ اب اسے خوبصورت جیبی سائز میں مرتب کیا جارہا ہے اور اخیر دسمبر ۱۹۲۸ء تک شایع ہوجائیگا۔ اس کتاب میں اس فن کے تمام مشکلات اسقدر آسان زبان میں حل کئے گئے ہیں کہ ہر شخص مطالعہ کرنے کے بعد نہایت معمولی مشق سے ہات دیکھکر صحیح احکام صادر کرسکتا ہے

قیمت فی جلد عہ

ظریف شاعروں کا تذکرہ
یا
تذکرۂ خندۂ گل

اردو و فارسی کے جتنے ظریف شاعر گزر چکے ہیں یا اب موجود ہیں ان سب کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف اور نمونۂ کلام کے یکجا کردئیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اپنی موضوع اور دلچسپی کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب ہے حجم ۵۰۰ صفحات

قیمت مع محصول للعہ

فلسفۂ مذہب

جو سلسلہ وار نگار میں شایع ہوچکا ہے زیر طبع ہے

(مینجر "رسالہ" نگار" نظیر آباد لکھنؤ)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

قواعد رسالہ "نگار"

۱۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے۔

۲۔ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا

۳۔ خط کتابت کیوقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جسپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کردیئے جاتے ہیں

۴۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۵۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہییں۔

۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ رو
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ رو

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مولانا نذیر احمد		مولانا شبلی						رتن ناتھ سرشار			
نبات النعش	۹/	سیرۃ النبی جلد اول	عہ/	علم الکلام	۶/	مضامین عالمگیر	۸/			پیاری دنیا	
مراۃ العروس	۱۰/	" دوم	۱۲/	الکلام	۶/	آغاز اسلام	۸/	سیر کہسار	۱۲/	کایا پلٹ	
توبۃ النصوح	۱۲/	" سوم	عہ/	رسائل شبلی	۱۲/	کلیات فارسی	۶/	خدائی فوجدار	۶/	میٹھی چھری	
موعظ حسنہ	۱۲/	الفاروق	۶/	مقالات شبلی	عہ/	کلام شبلی اردو	۸/	جام سرشار	۶/	طرحدار لونڈی	
رویائے صادقہ	۱۲/	سیرۃ النعمان	۱۲/	شعر العجم جلد اول	سے/	امیر مینائی		الف لیلہ بطرز ناول	عہ/	طلسمی فانوس	
ایامی	۱۲/	الغزالی	۱۲/	" دوم	۶/	صنم خانۂ عشق	۶/	کامنی	۱۲/	جوالا پرشاد برق	
فسانۂ مبتلا	۱۲/	المامون	۱۲/	" سوم	۶/	مراۃ الغیب	۱۲/	سوانح عمرو عیار	۶/	مرنالنی	۱۲/
ابن الوقت	۱۲/	سوانح مولانا روم	۶/	" چہارم	سے/	محامد خاتم النبیین	۸/	منشی سجاد حسین مرحوم		مار آستین	۱۲/
مصائب غدر	۱۲/	سفرنامہ مصر و شام	۶/	" پنجم	۶/	ضیائے سخن	عہ/	احمق الذی	۸/	بنگالی دلہن	۱۲/
				موازنہ انیس و دبیر	سے/	مکاتیب امیر مینائی	۶/	حاجی بغلول	۸/	معشوقۂ فرنگ	۱۲/

دفتر نگار - نظیر آباد لکھنؤ

یکم دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء

مکرمی - تسلیم - جناب کا چندہ اس ماہ کے رسالہ کے ساتھ ختم ہوگیا نوے نگار بالکل جدید پروگرام کے ساتھ اور بے انتہا سامان دلچسپی لے نکل رہا ہے اور غالباً یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ شعبۂ انتظام ہو جانے کی وجہ سے حضرت نیاز نے اب اپنا سارا وقت صرف رسالہ ب و تحسین کے لئے وقف کر دیا ہے۔

امید ہے کہ آپ بدستور نگاہ کرم نگار پر مبذول رکھیں گے اور ماہ دہ کے رسالہ کا وی پی قبول فرمائیں گے۔

ماہ آیندہ کا رسالہ ۱۶۰ صفحات پر نہایت ہی دلچسپ مضامین لئے ہوئے حاضر ہوگا۔

اگر آپ نے منی آرڈر کے ذریعہ سے چندہ مرحمت فرمایا تو آپکو ۲ر کی بچت ہوگی

خاکسار - منیجر نگار

لگرامی ۷۰
گورکھپوری ۷۵
۸۱
۸۹
۹۱
۹۲
۹۴
۹۵

بسم اللہ

(صفحہ ۸۰ کا اعلان ملاحظہ فرمایئے) (صفحہ ۸۰ کا اعلان ملاحظہ فرمایئے)

نگار

فہرست مضامین ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء

ملاحظات		۲
مومن و کلام مومن	کیفی چریاکوٹی	۹
گناہ کی گٹھری	(ڈاکٹر) اعظم کریوی	۱۷
مسلمانان ہند کے پستی کے اسباب	سید مقبول احمد بی ۔ اے	۲۲
خلیق اورنگ آبادی	سید تمکین کاظمی	۲۸
مصحفی کا مرتبہ شاعری	افسر امروہی	۳۳
سیاح کی ڈائری		۵۰
ازدواج مکرر		۵۷
ارہر کا کھیت	رشید احمد صدیقی ایم ۔ اے	۶۵
جلوۂ کرشن	ہوش بلگرامی	۷۰
زندگی	مجنوں گورکھپوری	۷۵
باب الاستفسار		۸۱
منظومات:-		
محمود شیرانی		۸۹
اختر شیرانی		۹۱
شمیمی بی ۔ اے		۹۲
فراق گورکھپوری		۹۴
سید علی اختر، اختر		۹۵

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار (۶)	دسمبر ۱۹۲۹ء	جلد (۱۶)

ملاحظات

کون کہتا ہے انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ کیا اس لئے کہ وہ اپنی مقابل جنس سے محبت کرتا ہے، مگر یہ فطرت کی مجبوری ہے یا اپنی خواہش کی تکمیل کا اقتضار۔ کیا اس لئے کہ وہ اپنی اولاد پر شفقت و رافت صرف کرتا ہے، لیکن وحشی سے وحشی درندہ بھی اس جذبہ سے خالی نہیں کیا اس لئے کہ وہ اپنے ابنائے جنس کے ساتھ نرمی و تلطف سے کام لیتا ہے مگر شاید صرف اس لئے کہ وہ اپنے ساتھ کسی سلوک کی توقع رکھتا ہے۔ تم فطرت انسانی کا مطالعہ خواہ کسی پہلو سے کرو، اس کی خود غرضی، اس کی ناحق کوشی، اور اس کی حرص و ہوا پرستی اس کی زندگی کے ہر ہر لمحہ اور اسکے اعضا ر کی ہر ہر جنبش سے وابستہ پاؤ گے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کی عبادت بھی کرتا ہے تو صرف اس طمع سے کہ وہاں اس کو حوریں ملیں گی، کوثر و تسنیم ملینگے اور ہر وہ چیز ملیگی جو اس دنیا میں اُسکو میسّر نہیں آسکتی۔

عالم طفلی سے لیکر عہد انحطاط تک کوئی دور زندگی کا ایسا نہیں ہے، جس میں انسان کی اس فطری خصوصیت کی جھلک نمایاں طور پر نہ پائی جائے اور اس قدیم حیوانیت کے علامات اسمیں نظر نہ آئیں جس کا ثبوت ماہرین علم تشریح بعض اثری اعضا سے دیتے ہیں اور ڈاروِن، قانون ارتقار سے۔

یقیناً انسان نام نہ اس کے اعضار کا ہے، اور نہ اُن خصوصیات کا جو اس کے محض ایک جاندار چیز ہونے کے ثبوت میں پیش کیجا سکتی ہیں

بلکہ انسان کا بہترین تشخص اساسی وہ ہے جو کائنات کی سب سے زیادہ روشن و مکمل، الہامی کتاب نے بتایا ہے۔

"انی جاعل فی الارض خلیفۃ"۔ وعلم آدم الاسماء کلہا اس لئے آیئے آج کی صحبت میں، اجمالاً استخلاف فی الارض اور حقیقت علم پر ایک نگاہ ڈال لیں، کیونکہ میرے نزدیک تمام اخلاق کی اساس اور فلسفۂ مذہب کی بنیاد اسی پر قایم ہے۔

خلافت سے مقصود ربانی کیا ہے، اور اس خلافت کی غایت کیا ہے؟ بظاہر یہ بحث بہت طویل الذیل گفتگو کا مقتضی معلوم ہوتا ہے، لیکن خدا نے جس طرح تمام فلسفۂ حیات کو نہایت آسان و مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے، اسی طرح خلافت انسانی کے مسئلہ کو بھی بہت واضح و صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔

(یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کئے ان کو زمین میں اپنا قایم مقام بنائے گا جیسا کہ اس سے قبل کے لوگوں کو عطا فرمایا گیا) نہ صرف اس آیت میں بلکہ اکثر مقام پر جہاں استخلاف کا ذکر کلام مجید میں آیا ہے اسی کے ساتھ ارض کا بھی ذکر کیا گیا ہے:۔

(۱) قال عسیٰ ربکم ان یھلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعلمون۔

(۲) ولو نشاء لجعلنا منکم ملٰئکۃ فی الارض یخلفون

(۳) ثم جعلناکم خلٰئف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ استخلاف، یہ خلافت اسی زمین سے متعلق ہے، اسی دنیاوی حیات سے تعلق رکھتی ہے اور اسی عالم کے کاروبار سے متعلق ہے جس کو دوسرے مقامات پر وراثت ارضی سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

(۱) ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون۔

(۲) ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین۔

(۳) وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء۔ فنعم اجر العاملین۔

پھر کسی جگہ وراثت ارض کے ساتھ عبادی الصالحون کا ذکر ہے، کسی جگہ متقین کا بیان ہے اور کہیں عاملین کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی خلافت خداوندی، نیابت الٰہی یا وراثت ارضی کے حصول کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ انسان اچھے کام کرے، ترقی کے لئے جد و جہد کرے، دنیا میں امن و سکون کو رواج دے اور اپنے استقلال و استقامت سے شیطانی قوتوں، طاغوتی لشکروں اور اخلاقی بغاوتوں کا مقابلہ کرے۔

پھر اسی کے ساتھ سورۂ احقاف کی اس آیت کو ملاحظہ فرمایئے:۔

فھل یھلک الا القوم الفاسقون (کیا سوائے فاسق قوم کے کوئی اور قوم ہلاک ہو سکتی ہے) اور غور کیجئے کہ ان تمام آیات کے مفہوم کو مربوط کرنے سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

پہلے ارشاد ہوا کہ "میں زمین میں اپنا قایم مقام، اپنا نائب پیدا کرنا چاہتا ہوں، جس کا نام انسان ہے"۔ پھر بتایا گیا کہ خلافت سے مراد یہ ہے کہ "وہ زمین کا وارث ہو، وہاں حکومت کرے، امن و سکون پھیلائے، ترقی کی راہیں نکال کے خدا کی پیدا کی ہوئی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھائے،

رات دن محنت و عمل میں لگا رہے اور حیات و دوام حاصل کرے۔ اس کے بعد فیصلہ کن الفاظ میں بتا دیا گیا کہ جب تک انسان ان باتوں پر کاربند رہیگا وہ برابر ترقی کرتا رہیگا، کیونکہ خدا کا دستور یہی ہے کہ وہ صرف ان قوموں کو ہلاک کرتا ہے جو فاسق ہیں، باغی ہیں، اور خدا کی ودیعت کی ہوئی قوتوں سے کام نہ لیکر کفران نعمت کا ارتکاب کرتی ہیں۔

یقیناً ترقی سے مراد صرف مادی ترقی نہیں ہے، محض صنعت و حرفت، دولت و تجارت، جاہ و ثروت کی ترقی مقصود نہیں ہے، لیکن اسی کے ساتھ کلام مجید سے یہ بھی ثابت نہیں کہ وراثت ارضی سے مراد نکبت و ذلت اور عسرت و افلاس ہے۔ اس لئے وہ قومیں جو اس وقت دنیاوی حیثیت سے ترقی یافتہ نظر آتی ہیں باوجود انتہائی انحطاط اخلاق کے بھی، ایک لحاظ سے اپنے آپ کو یرثہا عبادی الصالحون کے تحت میں لا سکتی ہیں، لیکن وہ جن کے پاس نہ دولت ظاہری ہے نہ دولت اخلاق اور ہلاک ہو رہی ہیں آپ نے آپ کو فہل یہلک الا القوم الفاسقون سے کیونکر علیحدہ کر سکتے ہیں۔

کیا کوئی بڑے سے بڑا مولوی، یعنے خدا کا کوئی بڑے سے بڑا خلیفہ اس کا جواب دے سکتا ہے۔

علم کی تعریف خدا نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:— ولا تقف ما لیس لک بہ علم۔ ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔

یعنی ہر اس چیز کو نہ مان لیا کرو جس کا تمہیں علم نہ ہو اور علم کی حقیقت اس طرح سمجھ لو کہ تمہارے کان، تمہاری آنکھ اور تمہارا قلب ان میں سے ہر ایک جواب دہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ تم کرتے ہو وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر اطمینان نفس و قلب کے ساتھ کرتے ہو یا محض دوسروں کے کہنے سننے سے۔

یہ ہے تفسیر و تشریح علم آدم الاسماء کلھا کی۔ علم اسماء سے مراد حقایق اشیاء کا علم ہے اور علم بھی وہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا، پھر اب انسان کے مسئلہ خلافت فی الارض اور حقیقت علم دونوں کو ملا کر غور کرو کہ اسلام کی صحیح تعلیم کیا ہے اور اسی کو معیار قرار دے کر فیصلہ کرو کہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے ہم کو کیا کرنا چاہئے کہ کھوئی ہوئی وراثت ارض حاصل ہو سکے۔

میں نے ہمیشہ اس امر کی تبلیغ کی ہے کہ اسلام سے زیادہ وسیع النظر، قریب الفہم، آزاد خیال اور وسیع آغوش رکھنے والا مذہب کوئی نہیں ہو سکتا، اس نے کوئی چیز ایسی پیش نہیں کی جو مذہب کے دایرہ کو تنگ و محدود کر دینے والی ہے، بلکہ اس نے دوسرے مسلک والوں کے ساتھ اس رواداری کا اظہار کیا ہے جس کی نظیر دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ اس نے دوسرے مذہب کے انبیاء و اکابر کی عزت کرنے کا درس دیا ہے، اس نے دیگر اقوام کی کتب مقدسہ کا احترام کیا ہے۔ اس نے لکل اجل کتاب کا سبق دیا ہے، اس نے لکل قوم ہاد کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے، وہ علی الاعلان معترف ہے اس امر کا کہ وان من امۃ الا خلا فیہا نذیر اور اس نے صاف صاف یہ بھی بتا دیا ہے کہ لکل امۃ رسول پھر جب حقیقت یہ ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام جو اس فراخدلی کے ساتھ تمام دنیا کو دعوت دے رہا ہے اور جو اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا کہ تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً۔

کیوں نہیں سارے عالم پر چھا جاتا اور کیوں نہیں دنیا اس مرکز پر آ جاتی جسے اسلام نے صرف انسانیت اور اخوت عامہ سے تعبیر کیا ہے۔

اگر اس راز کی حقیقت معلوم کرنا ہے تو اسلام کی تعلیمات کو نہ دیکھو کہ وہ تو ہمیشہ سے بے لاگ ہیں، کلام مجید پر غور نہ کرو کہ اس میں بھی کوئی تبدیلی

پیدا نہیں ہوئی، بلکہ صرف اس جماعت کی تاریخ کا مطالعہ کرو جو اپنے آپ کو عالم دین، ہادی طریقت، اور مرشد و رہبر کہتی ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنے اغراض نفسانی کے لئے تعلیمات مذہب کو مسخ کرکے پیش کیا اور آج بھی عالم انسانی اس طاغوتی قوت کا مجروح نظر آتا ہے۔ وہ تمکو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ کلام مجید پر غور کرو، حالانکہ خدا نے علم و یقین کے باب میں تمہارے قلب کو بھی ذمہ دار بنا دیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ منشاء ایزدی کو صرف اسی نے سمجھا ہے حالانکہ علم آدم اسماء کلہا میں تمام افراد نوع انسانی شامل ہیں۔ وہ تعلیم دیتا ہے کہ مسلمان بننے کے لئے صورت بدلو، لباس بدلو، خاص وضع اختیار کرو، مخصوص طریق حیات کے پابند ہو، درانحالیکہ خدا نے یہ شرط کہیں عاید نہیں کی۔ خدا مسلمانوں کو انتم الاعلون کے لقب سے یاد کرتا ہے، لیکن ان کا تقاضہ یہ ہے کہ محکوم رہو، غلام بنو، دوسروں کے دستگر بنے رہو، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مذہب کا تعلق صرف درستی اخلاق سے ہے، لیکن یہ گروہ کہتا ہے کہ مذہب نام ہے قومیت کا، سیاست کا، اور ہر اس چیز کا جس سے حقیقتاً مذہب کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

پھر آج جبکہ اس جماعت نے ہمارے تمام نظام مذہبی کو درہم برہم کر رکھا ہے، سب سے پہلے سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کب تک آنکھ بند کرکے انکے مواعظ و ہدایات کو وحی آسمانی سمجھتے رہیں گے اور کس حد تک وہ بانی اسلام اور اسکی توہین کو گوارا کریں گے۔ وقت آگیا ہے کہ لوگ ہوشیار ہو جائیں اور ان کے اقتدار کے ارگراں سے اپنی گردنوں کو آزاد کرلیں کیونکہ جب تک یہ "حجاب کثیف" درمیان باقی ہے، امت مسلمہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتی۔

گذشتہ ماہ کی ڈائری پر لکھنؤ کے ایک شیعی اخبار سرفراز نے ۲۱ نومبر ۲۹ء کی اشاعت میں پورے تین کالم کا مقالہ افتتاحیہ آخرکار سپرد قلم کر ہی دیا

چشم من روشن کہ رویش بامداداں دیدہ ام

ڈائری میں صرف لکھنوی شاعری کے حقیقی عناصر سے بحث کرکے بتایا گیا تھا کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے اس کو ایک مخصوص رنگ میں رنگ دیا تھا اور اسی سلسلہ میں تاریخ اودھ کے اس المناک حصہ کا بھی ذکر آگیا تھا، جس کا حوالہ بسلسلۂ تنقید ضروری تھا، لیکن ہمارے محترم معاصر نے اسے جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا وہ کم از کم میرے لئے ضرور حیرتناک ہے۔

اگر وہ اس کے جواب میں لکھنوی شاعری کے عناصر ترکیبی سے بحث کرکے اختلاف کرتے یا تاریخی حیثیت سے تردید فرماتے تو یقیناً وہ علم و زبان کی ایک اہم خدمت ہوتی، لیکن انھوں نے شروع سے لیکر آخر تک سارے مضمون کو فرقہ دارانہ جذبہ کا نتیجہ بتایا ہے، اور اس قدر بے اختیاری و بے صبری کے ساتھ کہ اگر میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ

چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پہ؟

میں دنیا کے ہر الزام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتا ہوں، لیکن عصبیت، نفاق انگیزی یا دل آزاری کا الزام میرے اوپر قایم کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے میں اڈیٹر سرفراز کو سنی کہدوں کہ وہ یہ سنکر سوائے ہنسنے کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

جو حضرات نگار کا مطالعہ کر رہے ہیں وہ آگاہ ہیں کہ مذہب کے باب میں میرا نظریہ اس قدر وسیع ہے کہ وہاں کافر و مسلم کے سوال کی بھی گنجائش نہیں ہے

چہ جائیکہ شیعہ سنّی اور اس لئے اگر میری کسی ادبی یا تاریخی تنقید میں کوئی شخص عصبیت کی بو پاتا ہی تو میں بلا تامل کہدوں گا کہ یہ اس کے مشام کی گمراہی ہے، حس کا نقص ہے۔

اسی نگار میں خود میں نے اپنے قلم سے مذہب اہل سنّت کے بہت سے مروجہ عقاید و مسایل پر نہایت سخت تنقیدیں کی ہیں اور کرتا رہتا ہوں، جہانتک مراسم مذہب کا تعلق ہے یا رواجی دنیا سے اسے واسطہ ہے، میں اس وقت تشیّع و تسنّن کیا ہر مذہب کو مجموعۂ خرافات پاتا ہوں اور یقیناً میں اس کے اظہار میں تامل نہیں کرتا، اور کوئی صاحب اور اک انسان انکار نہیں کرسکتا کہ اسوقت دنیا مذہب کے صحیح اصول سے کس قدر ہٹی ہوئی ہے، مثلاً میں خود سرفراز کے قابل اڈیٹر سے دریافت کرتا ہوں کہ نوابان اودھ کے دربار میں مذہب کے نام سے جو جو بدعتیں روا رکھی جاتی تھیں کیا واقعی مذہب تشیّع انہیں جایز سمجھتا ہے۔ وہ تو وہ مجھے معلوم ہے کہ سنجیدہ علمائے شیعہ عزاداری کی اس صورت کو بھی جو فی الحال عام طور پر رائج ہے کبھی پسند نہیں کرتے۔ سلطنت اودھ میں جو کچھ ہوا وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے یقیناً "گندگی و عفونت" ہی کہلائے گا، اور اگر بجائے شیعہ سلطنت کے کوئی سنّی حکومت ہوتی تو میں اسوقت بھی اسے انہیں الفاظ سے یاد کرتا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ منصور کے باب میں اورنگزیب پر میں نے ایسی سخت تنقید کی ہے کہ شاید ہی آپ کو کسی دوسری جگہ ملے۔ یا جہانتک انصاف کا تعلق ہے میں نے معاویہ و حسین کے کردار کا فرق دکھانے میں جس صفائی سے کام لیا ہے وہ غالباً آپ کے لئے بھی حیرتناک ہو۔ میں اس معاملہ میں اپنے آپ کو اسقدر بے لاگ پاتا ہوں کہ اگر آج میں شیعہ عقاید کا متبع ہو جاؤں تو بھی میری تنقید کا لب و لہجہ یہی ہوگا، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ سخت۔ میں جماعتی تفریق یا مذہبی امتیاز کو سامنے رکھ کر کبھی کچھ نہیں لکھتا بلکہ اصول اخلاق و انسانیت کو سامنے رکھ کر تنقید کرتا ہوں، خواہ وہ مسئلہ حضرات شیعہ کا ہو یا اہل سنت کا۔

اب رہا لکھنوی شاعری، یا سلطنت اودھ کی بنیاد کا سوال، سو میں بہت ممنون ہونگا اگر اڈیٹر سرفراز کوئی تفصیلی جواب اس کا پیش کریں گے، کیونکہ ممکن ہے خود انہیں کی طرف سے بہت سے ثبوت ایسے فراہم ہو جائیں، جنکو میں نے قصداً نظر انداز کر دیا تھا، اسی سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ "دربار خلافت کی ان رنگ رلیوں کا بھی ایک ہلکا سا فوٹو دکھانے کے لئے مجبور ہوں جو تقدس کے پردہ میں جایز رکھی گئی تھیں"۔ اہلاً و سہلاً ضرور ایسا کیجئے بلکہ اگر آپ دربار رسالت میں کوئی نقص محسوس کرتے ہیں تو اس کا بھی اظہار کیجئے۔ آپ کی اس تنقید پر سب سے پہلا مبارکباد دینے والا شخص اڈیٹر نگار ہوگا اگر واقعی وہ کوئی تاریخی خدمت ہوئی۔

ہمارے عزیز دوست اور ملک کے نہایت کہن سال صحافی جناب جالب نے، میرے اس مضمون سے اختلاف کرتے ہوئے جو گذشتہ ماہ نگار میں سلسلۂ استفسار "ہندو و مسلم اتحاد" پر لکھا گیا تھا، ایک مقالۂ افتتاحیہ تحریر فرمایا ہے جو ہمدم ۲۰ اور ۲۱ نومبر کے ہمت میں شایع ہوا ہے۔

جناب جالب کے اس ناقدانہ مضمون پر چند در چند پہلوؤں سے بحث کی جاسکتی ہے اور بعض نہایت اہم اصولی مسائل معرض گفتگو میں آسکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ملاحظات میں بالتفصیل اس بحث کو نہیں چھیڑ سکتا اور نہ غالباً اس امر کی ضرورت ہے کہ اب جبکہ ہندوستان کے سیاسیات "نظریہ" کی دنیا سے ہٹ کر "عملی" پہلو اختیار کر رہے ہیں خواہ مخواہ ان مباحث میں بیکار وقت ضایع کیا جائے، لیکن میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ نہ جناب جالب صاحب میرے مدعا کو سمجھے اور نہ میں ان کی تنقید کو، جالب صاحب

فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں وطنی جذبہ کام کر رہا ہے اور میں یہی چیز مسلمانوں میں نہیں پاتا۔ ان کے یہاں اگر کوئی صحیح یا نادرست جذبہ ہے تو وہ صرف مذہبی جذبہ ہے، اور وہ اسی کے ماتحت اپنی قومیت و وطنیت کو قایم کرنا چاہتے ہیں، جو میرے نزدیک بدترین سیاسی گمراہی ہے۔ جب تک کسی قوم کے سیاسیات اس کے مذہب سے علٰحدہ نہ ہوں گے نہ اس میں وطنیت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ وہ حکومت میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اسی خیال کی بنا پر میں نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل مجھے بہت تاریک نظر آتا ہے لیکن اگر جالب صاحب کے نزدیک حقیقت یہ نہیں ہے (جسے وہ کبھی ثابت نہیں کر سکتے) تو میں کیا ساری دنیا ان کی ہمنوا ہو سکتی ہے۔

دوسری سب سے بڑی غلطی جالب صاحب نے یہ کی ہے کہ وہ ہندوستان کو ہر عسکری قوت کے سامنے جھکنے پر مجبور پاتے ہیں اور ثبوت میں انگریزوں کو پیش کرتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے مٹھی بھر جماعت سے ہندوستان کو فتح کیا اور اب تک اس پر حکومت کر رہے ہیں۔ جناب جالب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان انگریزوں نے کبھی فتح نہیں کیا بلکہ خود ہندوستانیوں نے انگریزوں کے لئے کیا۔ یعنی جس وقت تک ہندوستانیوں میں جذبۂ وطنیت پیدا نہیں ہوا تھا وہ دوسرے کے لئے آلۂ کار بنکر خود اپنا نقصان کرنے میں جری تھے۔ لیکن اب جبکہ یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے جالب صاحب اس امید موہوم پر کوئی ایسی تعمیر قایم نہیں کر سکتے جسے وہ مسلمانوں کا قبلۂ مقصود یا کعبۂ امن و امان قرار دیں۔ کیونکہ اگر مسلمانوں نے ہندوؤں سے علٰحدہ ہو کر محض انگریزوں کی تتبیع میں "جس کی تیغ اس کی دیگ" پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ سوائے ناکامی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اب زمانہ وہ نہیں ہے جو کلایو کو ملا تھا، بلکہ وہ ہے جب ایک نہرو رپورٹ کے مطالبہ کی تردید بھی حکومت کے بس کی بات نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ جالب صاحب نے حکومت کی تقسیم یونانی و اسلامی تو سمجھ لی لیکن اس طرف خیال منتقل نہ ہوا کہ آج ہندوستان میں جس حکومت کا مطالبہ ہے وہ نہ یونانی ہوگی نہ اسلامی بلکہ خالص ہندوستانی اور وہ جو اپنے آپ کو ہندوستانی نہ سمجھے گا اس کی برکات سے یقیناً محروم رہیگا۔

آپ اپنے لئے جداگانہ انتخاب چاہتے ہیں، آپ اپنے لئے علٰحدہ قانون طلب کرتے ہیں، آپ چاہتے ہیں کہ آپکی اقلیت اکثر کی حیثیت قبول کرلے، لیکن اہلیت و قابلیت کا یہ عالم ہے کہ اگر یہ سب کچھ دیدیا جائے تو بھی ایک مست کی پگڑی کی طرح اس کا سنبھالنا دشوار ہے۔ پہلے مسلمانوں سے اس ذہنیت کو دور کر دیجئے جو باجہ اور رام لیلا پر آمادۂ جنگ ہو جاتی ہے اور علم الدین کو (جو یقیناً قتل کا مجرم تھا اور جس کو بالکل بجا طور پر پھانسی دی گئی) شہید قوم سمجھ کر اس کی قبر کو زیارت گاہ بنا لیتی ہے، اس کے بعد آپ مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق کوئی امید افزا پیشین گوئی فرمائیے گا، اور پھر یوں بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر آپ کو مسلمانوں کا مستقبل موجودہ حالات کے ماتحت بھی بہت درخشاں نظر آتا ہے، تو پھر آپ نہرو رپورٹ سے کس اندیشہ کی بناء پر اختلاف فرما رہے ہیں۔ کیا بقول آپ کے مسلمانوں کی اقلیت دو لاکھ مسلح افراد بھی نہیں نکال سکتی ہے کہ ہندوؤں کو مفتوح کر کے حکومت برطانیہ کی سنّت کو پھر از سر نو زندہ کرے۔

برتمنا ہائے عرفی خندہ می آید مرا۔

یہ رسالہ سولھویں جلد کا آخری پرچہ ہے اور جنوری سنہ ۳۰ء کے رسالہ سے سترھویں جلد شروع ہوگی، سنہ ۲۹ء کے پروگرام کا جزو غالب تنقیدی مضامین تھے اور تنقید سے جو ہیجان پیدا ہو سکتا ہے، وہ ملک میں پیدا ہوا اور بالکل بجا۔ لیکن الحمد للہ نگار و صاحب نگار دونوں کا

ضمیر مطمئن ہے کہ اس نے ذاتیات یا عصبیت کو کہیں دخل نہیں پانے دیا اور اگر کسی نے اس کے خلاف رائے قایم کی تو اس کی ذمہ دار خود اس کی قوت فیصلہ ہے۔

سنہ ۳۰ء کا پروگرام کیا ہوگا؟ اس کے متعلق قبل سے کوئی بیان دینا مناسب نہیں۔ مستقبل خود بتائے گا کہ ہمارا لائحہ عمل کیا تھا اور ہم کس حد تک اس میں کامیاب ہوئے۔ و افوض امری الی اللہ۔

اس رسالہ کے ساتھ اکثر حضرات کا چندہ ختم ہوتا ہے۔ اس لئے مینجر کی طرف سے جو اعلان صفحہ ۸۰ پر شایع ہوا ہے اس کو ایک بار ضرور دیکھ لیجئے۔ میں ان حضرات کو جو ہمیشہ شروع سال سے جدید خریدار پیدا کرکے مجھ پر کرم فرمانے کے عادی ہیں، ان کو بھی خصوصیت سے توجہ دلاتا ہوں۔

ایک مطبوعہ کارڈ اس رسالہ کے اندر آپ حضرات کو ملیگا، براہ کرم اس کی خانہ پری کرکے اخیر دسمبر سنہ ۲۹ء تک دفتر نگار میں بھیجدیجئے۔ یہ التجا منیجر کی نہیں ہے بلکہ **میری درخواست** ہے جس کو اگر آپ مطالبہ بھی سمجھیں تو نادرست نہیں ہوسکتا۔ اگر نگار کی خدمت کو کسی قابل سمجھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں حصہ نہ لیں **جبکہ آپ کو اپنے حلقہ احباب میں صرف دو خریدار جدید فراہم کردینا چنداں دشوار نہیں ہے۔**

گذشتہ ماہ کے رسالہ میں ایک فسانہ جناب طالب باغپتی کا جھوٹ کے عنوان سے شایع ہوا ہے، یہ فسانہ لیونڈ اینڈریو کے فسانہ کا ترجمہ ہے۔ کاتب کی غلطی سے اس کا اظہار اختتام مضمون پر نہ ہوسکا۔

ماہ جنوری سنہ ۳۰ء کا رسالہ ظفر اور اس کی شاعری کے لئے مخصوص ہے، اس وقت تک جتنے مضامین موصول ہوئے ہیں انمیں اس کی شاعری سے بحث نہیں کی گئی، لیکن اس عہد کے بعض تاریخی و معاشری حالات سے متعلق دو مضمون (ایک جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اور دوسرا سید وزیر حسین صاحب دہلوی کا) ایسے پاکیزہ موصول ہوئے ہیں کہ اگر ظفر نمبر میں سوائے ان دو مقالوں کے اور کوئی تیسرا مضمون نہوتا تو بھی کافی سے زیادہ سامان دلچسپی فراہم ہوجاتا۔ لیکن آپ دیکھینگے کہ ۱۶۰ صفحات میں علاوہ ان دو مضامین کے اور بھی جو کچھ درج ہوگا وہ آپ اپنی نظیر ہوگا۔

ہمارے پاس انڈین میڈیکل اسٹور نظیر آباد لکھنؤ سے ایک شیشی سرمہ کی آئی تھی جس کو ہم نے خود بھی استعمال کیا اور اپنے بعض احباب کو بھی دیا۔ تجربہ سے یہ سرمہ بہت مفید ثابت ہوا ہے اور آنکھوں کے بہت سے امراض کیلئے کارآمد چیز ہے۔ اگر کوئی عیب ہے تو یہ کہ سفید ہے ممکن ہے جدید خیال کے حضرات اس کو بھی خوبی میں شمار کریں۔

نیاز

مومن وکلام مومن

(بہ سلسلہ سابق)

خصوصیات شعر ابو الہلال عسکری امام بلاغت اپنی مشہور کتاب "صناعتین" میں لکھتے ہیں کہ "کلام نثر ہو یا نظم اس میں سہولت - سلاست - بہتر الفاظ، عمدہ معانی اچھی ترکیب - موزون نشست الفاظ ہونا ضروری ہے"

شعر کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ "شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جو معانی کثیرہ پر حاوی ہوں، جن کو سنکر سننے والا خود بخود لطف حاصل کرے، سہل ہو، قلیل النظیر ہو

امام یحییٰ بن علی یمنی نے اس مسئلہ پر طویل بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ناظم اور ناثر کو علوم ضروریہ پیش نظر رکھ کر کلام کو مرتب کرنا چاہئے یعنی کہاں مبتدا کو ہونا چاہئے کہاں خبر کو، کہاں مقدم ہونا ضروری ہے کہاں موخر، اسی طرح جملہ فعلیہ میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ فاعل کہاں ہونا چاہئے اور مفعول کی کون جگہ ہے، کس قسم کا فعل لانا مناسب ہے ضمائر میں بھی مناسبت اور عدم مناسبت کا پیش نظر رکھنا لازم ہے، منشائے بیان یہ ہے کہ اگر اشعار قواعد مقررہ (نحویہ وصرفیہ) کے مطابق ہیں تو اس قابل ہیں کہ سندیں پیش کئے جائیں، ان کی صحت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

جہاں یہ امر مسلم ہے وہیں یہ بھی مان لینا پڑے گا کہ اس قسم کے اشعار آمد کے درد اور بیساختگی کے نشتر بن نہیں سکتے - یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص ان قیود کے ساتھ آمد کا رنگ پیدا کرے - اگر ایسا کوئی شاعر نظر آئے تو اس کے اشعار زور تخیل کا نتیجہ نہوں گے بلکہ کرامت کی دلیل۔

حکیم مومن، اسی قسم کے شاعر ہیں کہ پابندیوں کے اندر وہ اس طرح آزاد ہیں کہ نظر کو دھوکا ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ اعتراض کرنے والے اعتراض کرتے ہیں لیکن ان کو اس کی صحت اور عدم صحت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

علامہ قلقشندی صبح الاعشی کی جلد دوم میں صفحہ ۲۸۰ پر خصوصیات شعر کے متعلق نہایت محقق اور دلچسپ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

شعر کی خوبی کے سات مدارج ہیں:-

۱- کسی شعر کا ہر مصرعہ بجائے خود مستقل ہو، مثلاً امرئ القیس کا شعر ہے:-

افاطم مهلاً بعض هذا التدلل
وان كنت قد ازمعت هجري فاجمل

اس شعر کا ہر مصرعہ اپنی جگہ پر مستقل ہے۔ شعر کا یہ درجہ اعلیٰ ہے۔

۲- دونوں مصرعے مستقل بھی ہوں اور ایک دوسرے سے مربوط بھی ہوں، مثلاً امرئ القیس کا یہ شعر۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل
بسقط اللوی بین الدخول فحومل

اس شعر کا پہلا مصرعہ بجائے خود مستقل ہے، لیکن جب دوسرا مصرعہ ملا دیا گیا تو اسکا درجہ بڑھ گیا۔

۳- شاعر اپنے کسی شعر کے دونوں مصرعوں کو جس جگہ چاہے رکھدے لیکن معنی میں فرق نہ آئے۔ اس کا نام تصریع موجہ ہے مثلاً ابن حجاج کا یہ شعر:-

من شروط الصبوح فی المرجان
خفۃ الشرب مع خلو المکان

۴- پہلا مصرعہ غیر مستقل ہو لیکن جب دوسرا مصرعہ ملایا جائے تو شعر پورا ہو جائے، اسکا نام تصریع ناقص ہے۔ متنبی کا شعر ہے:-

مغانی الشعب طیباً فی المغانی
بمنزلۃ الربیع من الزمان

۵- شعر میں کوئی لفظ وسط اور قافیہ میں بطریق حقیقت واقع ہو جیسے:-

وکل ذی غیبۃ یؤب
وغائب الموت لا یؤب

اس میں لفظ یوب تصریع مکرر ہے۔
کبھی بطریق مجاز ہوتی ہے، مثلاً:-

فتیً کان شرباً للعفاۃ ومرتعاً
فاصبح للھندیۃ البیض مرتعاً

اس شعر میں لفظ "مرتعا" مجاز ہے۔

۶- پہلا مصرعہ اسوقت تک معلق رہے جب تک دوسرے مصرعہ کا پہلا لفظ اسکی صفت بناکر نہ ملایا جائے۔ مثلاً:-

الا ایہا اللیل الطویل الا انجلی
بصبح وما الاصباح فیک بامثل

پہلا مصرعہ لفظ "بصبح" کا محتاج ہے، اسکو تصریع معلق کہتے ہیں۔

۷- مختلف القافیہ مصرعوں کے نام کو تصریع مشطور کہتے ہیں، مثلاً:-

اقلنی قد ندمت علی الذنوب
وبالاقرار عذت من الجحود

اس شعر میں ذنوب کا قافیہ جحود لایا گیا ہے جو معیوب ہے۔

مومن اور خصوصیات شعر اسی کسوٹی پر "مومن" کے اشعار دیکھنا چاہیئے، مومن کے تمام دیوان میں زیادہ تر اول و دوم مدارج کے اشعار ہیں، سوم و چہارم کے کم، پنجم و ششم کے اس سے کم۔ ہفتم کا نشان نہیں۔

(مثال اول و دوم)

(۱)

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

پہلا مصرعہ بجائے خود مستقل ہے لیکن دوسرا ملا دیا گیا تو ارتباط بڑھ گیا۔

(۲)

اظہار شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث
میں نے کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث

اس شعر کا پہلا مصرعہ اس قدر مستقل ہے کہ دوسرا نہ بھی ملایا جائے تب بھی مضمون میں کوئی نقص نہیں رہتا۔

(۳)

تصریع ناقص کی مثال:۔

خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس در پر
نشان پائے نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

(۴)

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

اس شعر میں تصریع موجہ ہے یعنی پہلا مصرعہ دوسرے کی جگہ اور دوسرا پہلے کی جگہ رکھدیا جائے تو مقصود میں فرق نہو۔ مرتبہ پنجم محتاط اور قادر الکلام شعراء کے نزدیک عیب سمجھا جاتا ہے، اس لئے "مومن" نے اس سے حتی الوسع احتراز کیا ہے۔

الفاظ اور شعرا ناظم اور ناثر کی قدرت اور فضیلت نظم اور نثر میں الفاظ اور معانی کی موزونیت سے معلوم ہوتی ہے۔ ابن رشیق قیروانی العمدہ صفحہ ۸۰ جلد اول میں لکھتے ہیں کہ:۔

"لفظ جسم اور معنی روح ہے ان دونوں میں باہم ارتباط ایسا ہوتا ہے جیسا جسم اور روح میں، جس طرح جسم کی قوت سے روح قوی اور ضعف سے ضعیف ہوتی ہے، یہی حال الفاظ کا ہے، معنے اگر درست ہوتے ہیں اور لفظ میں نقص ہوتا ہے تو شعر میں نقص پیدا ہوجاتا ہے، اگر معنے میں خرابی ہے تو لفظ بیکار معلوم ہوتا ہے"

اسی کتاب میں آگے چلکر معانی اور الفاظ کے موازنے میں "الفاظ" کی خرابی و صحت زیادہ زور دیا ہے:۔

"اکثر ائمہ لغت خوبی الفاظ کو معانی پر ترجیح دیتے ہیں، بعض علماء کا قول ہے کہ الفاظ، معانی سے زیادہ ضروری اور قیمتی ہوتے ہیں ابو ہلال عسکری، اس فن کے جیّد امام کا قول ہے کہ "معانی کی تمام خوبیاں الفاظ پر موقوف ہیں، یہی وجہ ہے کہ شعرا اور خطباء اپنے کلام میں اثر پیدا کرنے کے لئے مناسب الفاظ کی ترتیب دیتے ہیں"۔ (صفحہ ۴۴ کتاب صناعتین)

علامہ قلقشندی کی رائے ہے کہ:۔

"شیریں الفاظ کی طرف طبیعت خود بخود مائل ہوتی ہے نہ کہ معانی کی طرف"

کلام فصیح کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"فصاحت کا انحصار الفاظ پر ہے، یعنے لفظ فصیح وہ ہے جس کے فوراً سمجھنے میں کسی قسم کے اہتمام کی ضرورت نہ ہو۔

پھر لکھتے ہیں کہ:۔

الفاظ میں خاص قسم کی کشش ہوتی ہے جس کی طرف قوت سامعہ کا خود بخود میلان ہوتا ہے، اگر الفاظ میں سختی ہوتی ہے تو اس سے نفرت پیدا ہوتی ہے اول الذکر کی مثال آواز بلبل اور دوسرے کی مثال گدھے کی آواز ہے"

اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے اس قسم کی نفرت یا رغبت کا انحصار الفاظ پر نہیں بلکہ آواز پر ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آواز الفاظ کی تابع ہوتی ہے، یعنے کوئی آواز لفظ یا الفاظ سے خالی نہیں ہوتی۔

ہماری رائے میں الفاظ صرف سامعہ نواز ہی نہیں ہوتے بلکہ ان سے قوت باصرہ، دل و دماغ سب کو کیفیت و لذت حاصل ہوتی ہے۔

(مثال الفاظ فصیح)

مومن نے اپنے اشعار میں اس کا کہاں تک اہتمام کیا ہے، ذیل کے شعروں سے معلوم ہوسکتا ہے:۔

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

اس شعر میں الفاظ دیدۂ حیراں۔ تماشا۔ دیکھا کیا کی فصاحت قابل ذکر ہے، اس شعر میں ان سے زیادہ موزوں الفاظ کا اجماع مشکل ہے۔ یا اس مضمون یا ان معانی کو دوسرے الفاظ میں ڈھالنے سے یہ خوبی ساقط ہوجاتی ہے۔

(۲)

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

اس شعر کے الفاظ خط کشیدہ کو معیار مذکورہ پر جانچ کر دیکھئے۔

(۳)

تلخ کامی پر مجھے، تجکو لب شیریں پہ ناز
آمرے جادو سے اعجاز مسیحائی ملا

اس شعر میں الفاظ تلخ کامی۔ لب شیریں۔ جادو۔ اعجاز مسیحائی کے کرشمے دیکھئے۔

(۴)

ملجاتے ہی اغیار نکل آتے ہیں باہر
زنجیر درِ یار ہے یار سلسلہ اپنا

اس شعر میں لفظ سلسلہ نے شعر کو شعر بنا دیا ہے۔

معانی اور شعر صبح الاعشیٰ میں ہے کہ "معانی" کا وجود الفاظ کے لئے ایسا ہے جیسا کہ جسم کے لئے لباس ہوتا ہے جس طرح جسم کپڑے کا تابع ہوتا ہے اسی طرح الفاظ معانی کے تابع ہوتے ہیں۔ صاحب بلاغت کو الفاظ سے زیادہ معانی کے اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔

معانی کی چند صورتیں ہوتی ہیں:۔

۱۔ مستقیم حسن —— یہ صورت وہ ہوتی ہے کہ اپنی صحت پر خود دلالت کرتی ہے۔ اسکی مثال عربی میں رایت زیداً ہے اور اردو میں "میںنے زید کو دیکھا" ہے، اس قسم کے اہتمام کا نام "سحر حلال" ہے

۲۔ مستقیم قبیح ہے، اس کی مثال عربی میں "زیداً رایت" "زید کو دیکھا میں نے" اس کا دوسرا نام تعقید ہے ابن اثیر نے مثل السائر میں اس کا نام مغالطۂ معنویہ رکھا ہے۔

۳۔ مستقیم کاذب —— اس کی مثال "حملت الجبل" "میں نے پہاڑ اٹھا لیا" حقیقتاً غلط ہے لیکن اپنے موقعہ پر مبالغہ موزوں ہے۔

۴۔ مستقیم محال —— ان باتوں کا ذکر جو عقلاً اور عادۃً محال ہوں۔ اس کا دوسرا نام غلو ہے۔ یہ بھی اپنے موقعہ پر مستحسن اور موزوں ہے۔ بشرطیکہ شاعر کا دماغ صحیح ہو اور اس میں کافی تمیز ہو، ورنہ معیوب ہے مثلاً اردو کا یہ شعر:۔

ایک دن رونے جو بیٹھا میں برائے امتحاں
سو سمندر سات نالے کتنے دریا بہہ گئے

۵۔ مستقیم غلط۔ اس کی مثال عربی میں یہ ہے کہ کوئی کہے "ضربنی زید" مجھ کو زید نے مارا، لیکن مقصد ہو "ضربت زیداً" میں نے زید کو مارا، یہ بھی اپنے موقع پر درست ہوتا ہے بشرطیکہ شاعر اس موقعہ کو سمجھے۔

"مومن" نے ان اقسام کو جس طرح پیش نظر رکھا ہے انکی مثالیں دیکھ لیجئے:۔

مثال اول:۔ ؎

اس کوچہ کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آہ پر پنکھا سا جھل گیا

اس شعر میں "سلاست" کی خوبی جہاں تک ہے ارباب نظر پر مخفی نہیں۔

مثال دوم:۔ ؎

ایسی لذت خلش دل میں کہاں ہوتی ہے
رہ گیا سینہ میں اسکا کوئی پیکاں ہوگا

اس شعر میں تعقید ضرور ہے لیکن "معیوب" نہیں، اہل فن سمجھ سکتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار بہت کم بلکہ الشاذ کالمعدوم ہیں لیکن ان کا "عیب" "مومن" نے اپنی حکمت سے نکال دیا ہے۔

مثال سوم:۔ ؎

مرگئے اس کے لب جاں بخش پر
ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا

اس شعر کا کذب "صدق استعارہ و تشبیہ" کے انداز رکھتا ہے، شاعر کا یہ کمال قابل ذکر ہے۔

مثال چہارم:۔ ؎

یہ مشت پر سوختہ پھونکیں گے قفس کو
تو ساتھ کسی کے مجھے صیاد نہ کر بند

"مومن" کے اس مثال میں امکان کی بیساختگی دیکھئے۔

مثال پنجم:۔ ؎

نام وصال لینے سے ہوتا ہے مضطرب
کیونکر کہوں اسے مرے مرنے کا غم نہیں

لفظ "وصال" سے کذب میں صدق کا جلوہ موجود ہے، مومن نے اس قسم کا کمال اپنے دیوان میں اکثر جگہ دکھایا ہے۔

ترتیب اور شعر

اہتمام الفاظ و معانی سے زیادہ "ترتیب" کا خیال شعر کو بہتر اور شاعر کے کمال کو ظاہر کرتا ہے۔ جو شاعر جس قدر صاحب کمال ہوتا ہے، اسی قدر اس کے اشعار کی ترتیب بہتر ہوتی ہے۔

فصیح اور بلیغ الفاظ استعمال بھی کئے جائیں لیکن انکی ترتیب درست نہو تو ان کی فصاحت اور بلاغت بیکار ہوتی ہے۔ مفرد الفاظ عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن الفاظ ترتیب اور ترکیب سے دلکش اور دلگداز بن جاتے ہیں۔

ائمہ معانی و بیان کی رائے ہے کہ قرآن حکیم اپنی ترتیب الفاظ کی وجہ سے معجزہ ہے۔

آیات:۔ وقیل یا ارض ابلعی ماءک ویا سماء اقلعی وغیض الماء وقضی الامر واستوت علی الجودی الخ سنکر ایک عرب نے اس کی فصاحت و بلاغت پر سجدہ کیا تھا، حالانکہ الفاظ ارض۔ سماء۔ امر۔ ماء وہی ہیں جو روزانہ بولے جاتے ہیں۔ لیکن ترتیب میں آکر معجزہ بن گئے۔

ترتیب میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ ضعفِ تالیف نہو، مثلاً "ضرب غلامہ زیداً" (مارا اس کے غلام نے زید کو) اسمیں ضعفِ تالیف ہے۔

۲۔ تعقید نہ ہو۔ (اسکی مثال بیان ہو چکی ہے)

۳۔ تنافر کلمات نہ ہو مثلاً (ولیس قرب قبر حرب قبر) اسکی دوسری مثال آچکی ہے۔

شمس الدین محمد بن قیس رازی نے ان خصوصیات پر ایک فیصلہ کن محقق مضمون لکھا ہے، اسکا خلاصہ دیکھئے اور اس معیار پر "مومن" کو جانچئے۔

"کوئی شخص اس وقت تک شاعر کہے جانے کا مستحق نہیں جب تک ادوات شعر سے واقف نہو کلمات صحیح، الفاظ شیریں، عبارات بلیغ، معانی لطیف سے اپنے شعر کو آراستہ کرنا نہ جانتا ہو، وزن مناسب، ردیف اور قافیہ کی خوبی اور موزونیت سے آگاہ نہ ہو"

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:۔

شاعر کو اس جوہری کے مانند ہونا چاہیئے، جو جذب نظر خریداران کے لئے اپنے جواہرات کو مناسب اور موزوں مواقع پر رکھتا ہے، شاعر کو بھی شعر میں مناسب الفاظ کو موزوں جگہ رکھکر اپنے صحت مذاق کا ثبوت دینا چاہیئے۔

اس موضوع پر نہایت شرح و بسط کیساتھ جمیع اصناف پر اس کتاب میں لطیف بحث ہے، اس جگہ صرف اسی پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا گیا۔

"مومن" دنیائے شاعری میں میر کے بعد پہلے شخص ہیں جو الفاظ کو شعر میں نگینے کی طرح جڑتے ہیں اور اس فن میں موزونیت اور مناسبت کا ایسا کمال دکھاتے ہیں جو نظروں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

اگر اس خصوصیت کا اضافہ کر لیجئے کہ تمام اصناف معانی و بیان سے اپنے پورے دیوان کو سجایا ہے تو ان کی اس قدرت میں ان کا شریک کوئی شاعر نہیں۔

پہلے بتایا گیا ہے کہ "شاعر" اپنے فضل وکمال، طبیعت، وقت، فضا، گردوپیش، رنگ زمانہ سے متاثر ہوتا ہے، اور وقت و زمانہ شاعر کو متاثر کرکے اپنی زبان بنالیتا ہے۔ اس لئے شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ اس کی زبان نہیں ہوتی بلکہ زمانے کی۔ ہومر اپنے وقت کے یونانیوں کی زبان تھا اور ڈمینٹ اور ملٹن کا بھی یہی حال تھا

حکیم "مومن" بھی اپنے وقت اور زمانے کے واقعات اور فضا سے متاثر ہوئے ہیں، لیکن اپنی خودداری کے حدود سے آگے نہیں بڑھے، اور شعراء کی طرح زمانے نے ان سے بھی موافقت نہیں کی ہے لیکن وہ اس سے پریشان اور مضطرب ہوکر متانت سے کبھی آگے نہیں بڑھے، ضروریات نے ان کو بھی مجبور کیا ہے، لیکن کبھی اپنے اشعار کے موتیوں کو بازار میں لے کر نہیں گئے۔

باقی ——— باقی

"کیفی چریاکوٹی"

نوٹس

ہندوستانی اکاڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد کے مطبوعات

ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی واقتصادی حالات ———

از علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ایم۔ سی۔ جی۔ ای ———

مجلد	ہعہ؍
غیر مجلد	عہ؍

زیر طبع

(۱) مغلوں سے پہلے عرب و ہند کے تعلقات (از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی)

(۲) مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر (از مولانا محمد امین صاحب عباسی)

(۳) ازمنہ وسطے کا ہندوستانی تمدن (از رائے بہادر مہامہوپادھیا گوری شنکر ہیراچند صاحب اوجھا)

(۴) ہندی شاعری (از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

جنرل سکریٹری ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد

گناہ کی گٹھری

(فسانہ)

اسکا پورا نام بسنت رام تھا، لیکن گاؤں کے سب لوگ اس کو بسنتا کہتے تھے۔ چچا۔ چچی کے سوا اس دنیا میں بسنتا کا کوئی عزیز اور نہ تھا۔ پھر بھی گاؤں والوں نے اس کو اپنا بنا لیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بسنتا گاؤں والوں کا تو کام کر دیتا تھا لیکن اپنے گھر کی وہ کوئی پرواہ بھی نہ کرتا تھا۔ گاؤں بھر کے بیگار کرنے میں بسنتا کا خوب جی لگتا تھا وہ کھیتی باڑی کے کام میں خوب ہوشیار تھا لیکن اس سے اس کے چچا کو کوئی مدد نہ ملتی تھی، بسنتا کو گھر کے کام میں لگانے کے لئے اس کے چچا کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ ادھر ادھر کی بیگار کر کے جب بسنتا اپنے گھر میں گھستا اور ہنس ہنس کر اپنی چچی سے کھانا مانگتا تو وہ بہت خفا ہوتی۔

بسنتا کے سرپرست صرف بسنتا ہی پر نہیں خفا ہوتے بلکہ وہ اپنے پڑوسیوں کو بھی دو چار الٹی سیدھی سنانے سے باز نہ آتے تھے، خصوصاً جگوا کو تو وہ اٹھتے بیٹھتے گالیاں دیتے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جگوا ہی نے بسنتا کو کچھ "دوا دارو" کھلا کر اپنے بس میں کر لیا ہے۔

بوڑھا جگنّا تھ (جگوا)، ذات کا مالی تھا اس کے پاس دو چار بیگھے موروثی کاشتکاری تھی، اسی میں اس کی بخوبی بسر اوقات ہو جاتی تھی گھر میں وہ اور اس کی نواسی "سکھیا" کے سوا اور کوئی نہ رہتا تھا، اس کا ایک ناتی "جھنوا" جوان ہوتے ہوئے بھی اپنے بوڑھے نانا کی کوئی مدد نہ کرتا تھا، بلکہ وہ اِدھر اُدھر آوارہ مزاج لڑکوں کے ساتھ مارا مارا پھرا کرتا، جب کبھی اس کو خرچ کی ضرورت ہوتی تو وہ دو چار دن کے لئے گھر آ کر اپنے نانا کو تنگ کیا کرتا۔

(۲)

برکھا رُت اور دوپہر کا وقت تھا، رم جھم رم جھم پانی برس رہا تھا، بوڑھا جگوا اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھا ہوا دھان کوٹ رہا تھا اور اس کے قریب ہی سکھیا کوٹے ہوئے دھان کو پھٹک رہی تھی۔ سکھیا کی عمر زیادہ سے زیادہ بارہ برس کی رہی ہوگی پھر بھی وہ گھر کے کام کاج میں بڑی ہوشیار تھی۔ پانی برستے ہی میں بسنتا نے جگوا کو آ کر پرنام کیا اور سکھیا سے کہا۔ "سکھیا! "کلی" کہاں ہے، ذرا اٹھا تو لا میں نانا کو تنبا کو پلا دوں"۔

بسنت، جگو کو نانا کہتا تھا، دونوں حقہ پینے کے بڑے شوقین تھے۔ بسنتا چلم پر چلم بھرے جاتا اور اس کے بدلے میں بوڑھا جگو اپنی جوانی کے واقعات اور غدر کے قصے سنایا کرتا، اس وجہ سے ان دونوں میں بڑی دوستی تھی۔

سکھیا نے "کلی" لا کر بسنتا کو دیدی، چلم میں تنبا کو جما اور آگ رکھ کر بسنتا نے "کلی" جگو کی طرف بڑھا کر کہا۔ "نانا تم

ذرا دم لگالو میں دھان کوٹے دیتا ہوں "
سکھیا نے بسنتا کی طرف غور سے دیکھا اور کہا۔ "بھیّا کیا آج تم نے روٹی نہیں کھائی ؟"
سکھیا کے اس سوال سے بسنتا سٹ پٹا گیا اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا لیکن اس کے پژمردہ چہرہ سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ سکھیا کا خیال درست ہے۔ جگّو نے حقہ کا ایک کش لیکر کہا۔ "ارے ! ! اتنک نہیں کھایا۔ سکھیا تو کیسے جان گئی میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں اب مجھے کچھ نہیں سوجھتا"۔ بوڑھے کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگے
سکھیا اسی وقت بسنتا کے لئے کھانا لائی۔ بسنتا نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ "سکھیا تو نے ہی یہ کھانا پکایا ہے "
سکھیا نے لجا کر جواب دیا۔ "ہاں"
"واہ واہ ! ! تو تو بڑا مزیدار کھانا پکاتی ہے"
"معلوم ہو گیا تم ہنسی میں ایسا کہہ رہے ہو۔ ترکاری خراب ہوگی"
"تیری قسم ترکاری تو بہت اچھی ہے۔ میری "چاچی" بھی اس سے اچھا نہیں پکا سکتی"
"کیا "چاچی" بہت اچھا کھانا پکاتی ہے ؟"
"لیکن تجھ سے اچھا نہیں"
"چاچی" کا ذکر ہوتے ہی سکھیا نے پوچھا۔ "بھیّا یہ تو بتاؤ آج تم نے گھر میں کھانا کیوں نہیں کھایا، کیا چاچی کچھ خفا تھیں ؟"
بسنتا نے اداس ہوکر جواب دیا۔ "چاچا" نے کھیت پر جانے کو کہا تھا، میں نہیں گیا اسی سے "چاچی" بہت خفا ہو گئیں"
"تم نے "چاچی" اور "چاچا" کا کہنا کیوں نہیں مانا ؟"
"میں کھیت پر جانے کے لئے تیار تھا لیکن اسی وقت مودا کے گھر سے ایک آدمی مجھے بلانے آیا اور میں کھیت پر نہ جا سکا"
"چاچا" کا کام چھوڑ کر تم مودا، کے یہاں کیوں گئے "
"مودا کے یہاں میرا جانا بہت ضروری تھا کیونکہ اس کے یہاں کے سب لوگ بخار میں پڑے ہیں، کوئی پانی دینے والا بھی نہیں "چاچا" کا کام کرنے والے بہت ہیں، میرے نہ جانے سے ان کا کچھ حرج نہیں ہو سکتا "
سکھیا اور بسنتا کی یہ باتیں جگّو اچھی طرح دھیان سے سن رہا تھا، اس نے دل میں کچھ سوچکر ایک ٹھنڈی سانس لی وہ بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا اور جب بسنتا کھانا کھا کر اس کے پاس پہونچا تو اس نے کہا۔ "بیٹا ایک بات کہوں مانو گے "
"تمہاری بات نہ مانوں گا تو پھر کس کی مانوں گا "
بُڈھے نے کلی بسنتا کی طرف بڑھا کر کہا۔ "اچھا سن۔" بوڑھے کو کھانسی آگئی، اس نے کھنکھار کر پھر کہا۔ "بسنتا تو اپنا دل نہ چھوٹا کر میرے ہی گھر میں رہا کر۔ میں یہی سکھیا سے تیرا بیاہ کردوں گا اور میرے پاس جو دو چار بیگھے زمین ہے وہ بھی تیرے نام لکھ دوں گا مٹھی بھر اناج کے لئے چچا کی گالیاں کیوں سنتا ہے "

بسنتا نے دانتوں سے اپنی زبان دبا کر کہا :- "نانا یہ تم کیسی بات کہہ رہے ہو، تمہارا جو کچھ ہے وہ سب "چنوا" کا ہے کھیت مکان سب پر اسی کا حق ہے، میں اس کا حق چھین کر نرک میں نہ جاؤں گا۔ رام! رام!! یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا بیاہ کا معاملہ تو میں اس سے دور بھاگتا ہوں، میں بیاہ کروں گا ہی نہیں"

بڈھے نے مایوس ہو کر کہا۔ "یہ کیوں؟"

بسنتا نے دھان کوٹتے ہوئے جواب دیا:- "نانا تم بوڑھے ہو کر بھی اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے، بات یہ ہے کہ بیاہ ہوتے ہی میں تم کو پرایا سمجھنے لگوں گا۔ یہی میرے چچا پہلے مجھ کو بہت پیار کرتے تھے، لیکن جب سے ان کا بیاہ ہوا، اور "چاچی" آئیں تب سے ـــــ اور کیا کہوں ـــــ کچھ ڈر نہ ہو تو مجھے کچا ہی کھا جائیں۔

(۳)

اسی دن شام کو "چنوا" اپنے نانا کے یہاں آیا، وہ گانجہ پیئے ہوئے تھا، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، کرپارام بنیا پتہ لگا کر "چنوا" سے اپنے روپیوں کا تقاضا کرنے آیا، پانچ برس ہوئے "چنوا" نے اس سے کچھ روپئے ادھار لئے تھے، لیکن اب تک دینے کا نام نہ لیتا تھا۔ کرپارام آج ذرا تیز ہو کر آیا تھا، اُدھر "چنوا" بھی گانجہ کے نشہ میں خوب گرم ہو رہا تھا، کرپارام نے سختی کی تو چنوا نے بگڑ کر کہا:-

"ابے! بجو کی سی آنکھیں کیوں نکالتا ہے، تیرے ایسے بنیوں کو میں سمجھتا ہی کیا ہوں، یہاں سے اپنا منہ کالا کر، میں روپئے نہیں دوں گا، جا نالش کر دے"

کرپارام نے چنوا کو یونہی روپئے دیدیئے تھے، کچھ "لکھا پڑھی" نہ کی تھی نالش کرنے سے اس کو کچھ فائدہ حاصل ہونے کی امید نہ تھی۔ اس نے کہا:- "سارا غنڈاپن نکال دوں گا، دے گا کیسے نہیں، کیا مفت کے روپئے تھے۔ تو کیا میں تو تیرے باپ سے لیلوں گا۔"

نشہ میں چور "چنوا" نے اس زور کی لات کرپارام کے جگر پر ماری کہ وہ دھم سے زمین پر بے سُدھ ہو کر گر پڑا، اس کے گرتے ہی چنوا کا نشہ ہرن ہو گیا، دوڑ کر پانی لایا اور کرپارام کے منہ پر چھڑکنے لگا، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا، اس کے قریب ہی سُکھیا کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی۔ اور بوڑھا جگوا بخار میں کراہ رہا تھا۔ بہت کوشش کرنے پر بھی جب کرپارام کو ہوش نہ آیا تو چنوا کا ڈر کے مارے برا حال ہو گیا، اس نے بہت آہستہ سے سکھیا سے کہا:- "ہائے اب کیا ہو گا؟ یہ تو مر گیا" خوش قسمتی سے چنوا کا مکان بستی کے ایک سرے پر تھا! اس کے قریب اور کوئی مکان نہ تھا، ورنہ چنوا اور کرپارام کی گالی گلوج پر بہت سے لوگ جمع ہو جاتے۔ بہن اور بھائی جب دونوں ناامید ہو کر دعائیں مانگ رہے تھے تو انہیں کچھ آہٹ معلوم ہوئی، آواز پہچانی ہوئی معلوم ہوئی، کسی نے کہا:- "اری سُکھیا کیا اب تک گھر میں دیا نہیں جلا، نانا کو بخار چڑھ آیا کیا؟" سُکھیا نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر کہا۔ "بھیا شور نہ مچاؤ آہستہ آہستہ بولو بہر بڑی مصیبت آگئی۔ بسنتا نے گھبرا کے کہا:- "کیسی مصیبت؟ یہ کون لمبا لمبا پڑا ہے"

سُکھیا نے بسنتا کے منہ پر ہاتھ رکھکر کہا:- "چپ! چپ!!" یہ کہکر سکھیا نے چپکے چپکے سب حال کہدیا۔ چنوا نے بسنتا کے دونوں پاؤں پکڑ لئے اور کہا:- "بسنتا اب تو ہی بچا"

سکھیا نے بھی سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "بھیا جس طرح سے بھی ہو میرے بھائی کی جان بچالو"

بسنتا نے کچھ دیر سوچ کر کہا:۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں، میں سب ٹھیک کرلوں گا، اچھا یہ تو بتاؤ کہ گھر میں کوئی بوری یا تھیلا ہے؟"

سکھیا نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا:۔ "ہاں ہے"

"اچھا تو جلدی لے آ"

بسنتا اور چنوا نے مل کر کرپارام کی لاش کو بوری میں بند کیا اور یہ طے پایا کہ جب سب لوگ سو جائیں اور گاؤں میں سناٹا ہو جائے تو بسنتا اس بوری کو ندی میں ڈال آئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آدھی رات کے وقت بسنتا کرپارام کی لاش کو اپنی پیٹھ پر لاد کر ندی کی طرف چل پڑا، اس کے جاتے ہی چنوا خود کو اپنے دل میں پاپی سمجھنے لگا۔

بسنتا کہہ گیا تھا کہ وہ لاش کو ندی میں ڈالکر رات ہی کو "چنوا" کے گھر آجائے گا، مگر دن نکل آیا اور وہ واپس نہ ہوا۔ "چنوا" کو بسنتا سے زیادہ اپنی فکر تھی کہ اگر کہیں بسنتا گرفتار ہوا تو "چنوا" کی خیر نہیں۔ دس بجے دن کے جب اس کو پتہ چلا کہ پولیس نے بسنتا کو کرپارام کے قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کرلیا تو "چنوا" کا منہ فق ہو گیا، وہ سوچنے لگا:۔ "ایک دن مرنا تو ہے ہی پھر اپنی جان کے لئے بسنتا کو کیوں پھنساؤں ـــ تھانہ میں چلکر سچی بات کہہ دوں ـــ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟" یہ سوچکر چنوا کانپ اٹھا۔ بوڑھے جگو کو تو یقین نہ آتا تھا کہ بسنتا نے کرپارام کا خون کیا ہوگا، سکھیا کی عجیب حالت تھی۔ اس کا دل بیٹھا جاتا تھا، بھائی کی محبت میں وہ اپنے نانا سے بھی سچی بات نہ کہہ سکی۔ ادھر جب اسے ناکردہ گناہ بسنتا کا دھیان آتا تو وہ کلیجہ تھام کر رہ جاتی۔ "چنوا" اب گھر سے بہت کم باہر نکلتا تھا، وہ دن بھر ایک گوشہ میں چپ چاپ پڑا کچھ سوچا کرتا تھا۔ جس دن بسنتا کا مقدمہ عدالت میں پیش ہونے والا تھا، اس دن "چنوا" کی حالت غیر ہوگئی۔ سکھیا نے اس کا حال پریشان دیکھ کر کہا "آج تمہارا منہ کیوں اترا ہوا ہے خیریت تو ہے؟"

چنوا نے بہن کی طرف مجرمانہ نظر سے دیکھ کر کہا۔ "مجھے کیا ہو گیا ہے؟ ـــ تو کیا سمجھ سکتی ہے سکھیا!"

(۴)

جس دن بسنتا کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو "چنوا" بھی وہاں موجود تھا، اس کو دیکھ کر بسنتا کا دل دھڑکنے لگا، ابھی مقدمہ کی کارروائی شروع نہ ہوئی تھی کہ چنوا ایکبارگی مجسٹریٹ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:۔ "حضور! بسنتا بڑا بیڈھب آدمی ہے یہ میرے گناہ کی گٹھری چرالایا ہے، اصلی مجرم میں ہوں، کرپارام مجھ سے اپنے روپیوں کا تقاضا کرنے آیا تھا اس نے مجھے گالی گلوج کی میں مچان پے بیٹھا تھا مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کے پیٹ پر ایک لات جمادی اور وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا، میں نے اس کے منہ پر پانی چھڑکا کہ اسے ہوش آجائے لیکن اسکو تو مجھے سزا دلانا تھا جان بوجھکر مر گیا، اس کے بعد یہ چور بسنتا میرے گھر آیا اور اس نے کہا کہ میں لاش کو ندی میں پھینک آؤں گا، میں راضی ہو گیا، اور میں نے لاش کو بوری میں بند کر کے اس کی پیٹھ پر باندھ دی۔ حضور اب تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا یہ بسنتا بڑا بیڈھب آدمی ہے مجھ کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ کیوں بسنتا ٹھیک ہے نا!" یہ کہکر چنوا نے بسنتا کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

مقدمہ پھر نئے سرے سے شروع ہوا "چنوا" سیشن سپرد کیا گیا اور بسنتا کو اخفائے جرم کی پاداش میں ۱۲ سال قید سخت کی سزا ملی سیشن میں مقدمہ خراب ہو گیا اور چنوا سزائے موت سے بچ گیا۔

---

۱۲ سال کی سزا کاٹ کر جب بسنتا رہا ہوا تو وہ سیدھا اپنے جگوا نانا کے پاس پہونچا، چنوا کے متعلق اس نے اس سے کچھ نہ دریافت کیا، کیونکہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ چنوا کو ضرور پھانسی ہو گئی ہوگی۔

بسنتا نے منھ لٹکا کر غمگین لہجہ میں جگوا سے کہا "وہ نانا! اس کی تقدیر!!"

بوڑھے نے جواب دیا "ہاں اس نے جوانمردوں کا سا کام کیا ہے، مگر تو تو بتا کہ تو نے مفت میں کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈالی تجھے اتنی تکلیف اٹھانے کی بالکل ضرورت نہ تھی"

بسنتا نے روتے ہوئے کہا: "نہ میری ماں ہے نہ باپ۔ مرجاؤں تو کوئی رونے والا بھی نہیں ہے، اگر مجھے پھانسی ہو جاتی تو بہت اچھا ہوتا ——"

بوڑھے نے بسنتا کو جھڑک کر کہا:۔ "جب تیرا ایسا خیال ہے تو آج سے مجھے "نانا" مت کہنا۔ کیا ہم لوگ تیرے کوئی نہیں کیوں رے بسنتا؟"

سکھیا چلم بھر رہی تھی، اس نے ہنس کی طرح گردن موڑی اور بسنتا پر تیز نگاہ سے حملہ کر کے بولی "اب چپ چاپ کیوں کھڑے ہو جواب کیوں نہیں دیتے کیا ہم تمہارے کوئی نہیں ہیں؟"

بسنتا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں وہ نانا کے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔ بوڑھے نے بسنتا کو اپنے کلیجہ سے لگا لیا، ایک ہفتہ کے اندر ہی اچھی ساعت میں بوڑھے جگوا نے سکھیا کے ساتھ بسنتا کا بیاہ کر دیا، بسنتا پھر شادی کرنے سے انکار نہ کر سکا۔

(ماخوذ از بنگالی)

اعظم کریوی

تصویر زیب النساء بیگم

جو دربار عالمگیری کی ایک بے مثل مصورہ کی قلمکاری ہے، اور بعد تنقید و تحقیق بسیار اس کی صحت کی توثیق ہو چکی ہے، یہ تصویر تین خوشنما رنگ سے تیار کی گئی ہے اور ۱۹۲۸ء کے نگار میں شایع ہو چکی ہے قیمت مع محصول .... (۸/)

تصویر رقاصہ

بنگال کے مشہور نقاش و مصور مزمدار کی ایک بہترین تصویر جو حضرت نیاز کے مشہور مضمون رقاصہ کے گجراتی ترجمہ کیساتھ کلکتہ کے مشہور گجراتی رسالہ نو جیتن میں شایع ہوئی تھی۔ قیمت ..... (۴/)

"مینیجر نگار لکھنؤ"

مسلمانانِ ہند کے پستی کے اسباب

اور

مذہب و قوم کی غلط تعبیر

حکومتِ ہند کی ایجوکیشنل کمشنر کی رپورٹ سنہ ۱۹۲۲ء تا سنہ ۱۹۲۷ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانانِ ہند میں تعلیم کی پستی کے خاص اسباب مندرجہ ذیل ہیں:۔

"دیگر اقوام کے لڑکوں کی نسبت مسلمان مذہبی قیود کے باعث تعلیم میں اکثر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ انکو نہ صرف ، برس کے عرصہ تک محض قرآن شریف کی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے بلکہ اس کے بعد چند سال انکو اپنے صوبجات کی مروجہ زبانیں سیکھنے میں صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس طرح ان کو چھوٹی عمر میں تین زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں، مذہبی زبان یعنی عربی یا فارسی اور بعض اوقات دونوں۔ اردو زبان اور اس کے بعد ضلع کی مروجہ زبان جو کچھ بھی ہو۔ اور اگر وہ آگے تعلیم جاری رکھتے ہیں تو انکو زبان انگریزی بھی پڑھنی ہوتی ہے۔ گویا چار بلکہ پانچ زبانوں کیطرف پوری توجہ کرنی پڑتی ہے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں کو کافی سہولتیں حاصل ہیں۔ اول تو انکو اپنی آبائی زبان یعنے سنسکرت سیکھنی نہیں پڑتی۔ دوم ضلع کی زبان وہ آغوش مادری میں سیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہوش سنبھالنے پر انکو صرف دو زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں، ایک ورنیکولر دوسری انگریزی۔ ان زبانوں کو بھی یہ ہندو لڑکے اس وجہ سے نہیں سیکھتے کہ یہ ان کی زندگی میں کارآمد ثابت ہو، بلکہ وہ دماغ اور حافظہ کی تربیت کیلئے سیکھتے ہیں غالباً ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابیں سنسکرت ہی میں ہیں، لیکن ان کے لئے سنسکرت پڑھنا لازمی امر نہیں ہے۔ انکے مذہبی کتب کا زیادہ حصہ ورنیکولر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ہندو زیادہ تر انہی ترجموں سے ضروری واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ پھر کیوں نہ مسلمان طلبہ کو بھی مذہبی تعلیم عام فہم زبان ہی میں دی جائے۔ اب مسلمانانِ ہند کو اپنی تعلیمی کانفرنسوں میں اس سوال پر ضرور غور کرنا چاہیئے۔ لیکن جس قدر توجہ اس اہم سوال کی جانب کرنی چاہیئے اس قدر ابتک نہیں کی گئی۔ لیکن باوجود ان تمام رکاوٹوں اور پابندیوں کے مسلم طلبہ کی تعداد میں سنہ ۱۹۱۷ء و سنہ ۱۹۲۲ء کے درمیان پیشتر کی بہ نسبت ۴۸۲۰۰۰ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اور سنہ ۱۹۲۲ء و سنہ ۱۹۲۷ء کے درمیان ان کی تعداد میں ۵۰۸۰۰۰ کی زیادتی ہوئی۔ اگرچہ مسلمان لڑکوں کو قرآن شریف کی تعلیم دینا از حد مفید ہے۔ لیکن بلا مطلب و معانی سمجھائے ہوئے رٹانے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ انکو مذہبی باتیں عام فہم زبان میں سمجھا دی جائیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کل اضافہ شدہ طلبہ کی تعداد میں ۳۰ فیصدی تعداد مسلمان لڑکوں کی ہے۔ صوبجات متحدہ میں پرائمری و سکنڈری اسکولوں میں تعلیم پانے والے مسلمان طلبہ کی تعداد میں صرف ۵۳۰۰۰ کا اضافہ ہوا ہے"......

قابل غور امر یہ ہے کہ یہ مذہبی قیود "از ماست کہ بر ماست" تو نہیں۔ غالباً اس بات سے کسی ذی فہم کو انکار نہ ہوگا کہ اگر عموماً

ہندوستان وخصوصاً بنگال میں ہندو مسلمانوں کا تناسب سوائے جیل خانوں، قحبہ خانوں، غریب خانوں کے کہیں بھی آبادی کے لحاظ سے نہیں یا ہندوستان میں کسی علمی وسیاسی وتمدنی زندگی میں ہمارا کما ینبغی حصہ نہیں تو اس کی اصل وجہ ہماری تعلیمی پستی ہے۔ اور در حقیقت تعلیم کا فقدان ہی قومی زوال کی انتہا ہے۔ جس کا مظاہرہ افغانستان کے واقعات میں ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ پس تعلیمی پستی کا سبب بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہم دنیا میں یا تو ایک ایسے نرالے مذہب کے پابند ہیں جو ہمکو ترقی کے میدان میں جانے نہیں دیتا یا خود ہم نے اس مذہب کو نرالے طریقہ سے اختیار کیا ہے۔ اور وہی ہماری پستی کا سبب ہے۔

جنہوں نے فلسفۂ مذہب کا مطالعہ نگار میں کیا ہے۔ ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ میرا مقصد اس کتاب کے لکھنے سے نہ یہ تھا کہ اصحابِ تقویٰ سے مبارزطلبی کی جائے۔ اور نہ یہ کہ اربابِ نظر وفلسفہ سے داد حاصل کی جائے۔ میرا مقصد سوائے اس کے اور کوئی نہ تھا کہ میں اپنے ہم مذہب لوگوں کو ایکبار پھر اپنی موجودہ حالت پر جایزہ لینے کے لئے آمادہ کر سکوں۔ اور اس کے بعد ان سے اجازت اس بات کی لوں کہ اپنے مذہبی مطامحِ نظر میں زمانہ کے موافق ترمیم کریں۔ چونکہ دل مجروح و بے قرار تھا، اور میں نے اسلامی بدبختی کے شیطان کو پکڑ لیا تھا اس لئے گرما گرم الفاظ قلم سے نکلتے چلے گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک شخص اندھیری رات میں اپنے مکان کو جلتا ہوا دیکھ لے یا کسی نقب زن کو پکڑ لے تو اس وقت وہ اصطلاحی الفاظ کا دھیان نہیں کرتا اور حالتِ اضطراب میں نہ جانے کیا کیا زبان سے نکل جاتا ہے۔ تو مذہب وتمدن کا وہ شیطان کون ہے جو مسلمانوں کا رہزن ہے۔ کیا اس کی ضرورت ہے کہ قارئین کرام کو اپنی کتاب کے "مذہب اور قومیت" والے حصہ پر توجہ دلاؤں۔ یا میں پھر اس مضمون میں اس کا لب لباب پیش کروں، یا اب عملی کارروائی پر متوجہ ہوں۔ بہر حال ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پہلے اس بات کو طے کرلیں کہ مسلمان کوئی قوم ہے یا ایک مذہب۔ اگر کوئی قوم ہے تو پھر ہندوستان وچین وجزائر بحرِ ہند وافریقہ وروس میں ہماری درماندگی کا علاج بقراط کے بھی سمجھ میں نہ آئے گا۔ یہودی قوم ایک مختصر سی قوم ہے۔ مگر وہ بھی جب تک اپنی ہمسایہ قوموں سے گھل ملکر ایک نہ ہو گئی، ترقی کے زینے پر قدم نہ رکھ سکی۔ ہماری قوم تو ما شاء اللہ ایک خمس ربع مسکون کی آبادی کے لگ بھگ ہے۔ اور وہ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں، انکو علیحدہ قومی حیثیت دے کر ترقی پر لگانا صرف انہیں ممالک میں ممکن ہوسکتا ہے، جہاں ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہوں، مگر جن ممالک میں ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہیں وہ قوم کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے، باقی ۹/۱۰ حصہ دوسروں کے اختیار میں ہے۔ جہاں ہماری بے دست وپائی عیاں ہے۔ اور جہاں ہمارے پاس کوئی ایسے ذرائع نہیں جن سے ہم اپنی قوم کو مدارجِ ترقی پر پہونچا سکیں۔ پھر آئیے سب سے پہلے قومیت کو سمجھ لیں۔

قوم کی تعریف یہ ہے کہ انسان کی ایک جماعت۔ ایک زبان۔ ایک معاشرت۔ ایک قانون وشریعت۔ ایک روایت کی متبع ہو۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ وہ ایک مذہب بھی رکھے۔ قومیں عموماً اپنے ملکوں سے نسبت رکھتی ہیں۔ مگر بعض قومیں جن کا کوئی ملک نہیں ہوتا وہ بجائے ملک کے مذہب سے اپنی نسبت کرتی ہیں۔ جیسے یہود وپارسی۔ سکھ۔ جین۔ ہنود وغیرہ۔ اور جب مذہب کو قوم سے نسبت دیجاتی ہے تو اس کے معنے ظاہر ہیں کہ اپنے مذہب کے اندر وہ تمام خصوصیتیں پیدا کر لیتی ہے۔ جو قوم کے شرائط میں داخل ہے مثلاً ایک ہی لباس معاشرت۔ تمدن۔ زبان۔ روایت اور رفتہ رفتہ مذہب ان ساری باتوں پر حاوی ہو جاتا ہے، اگر ایسی قوم کسی ملک کی مالک ہو بھی تو مذہب

کے اندر سیاست بھی داخل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اس قوم کا کوئی ملک نہیں تو سیاست کا جزو معطل ہو جاتا ہے۔ قومی مذاہب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اسپر عمومیت کا اطلاق قائم نہیں رہتا۔ اور چونکہ قوم صرف ایک ہی قانون سے گھٹتی بڑھتی ہے۔ یعنی توالد و تناسل سے اس لئے مذہبی جماعت کا بڑھنا بھی موقوف ہو جاتا ہے الا توالد و تناسل کے اصول سے یا ایک غیر معمولی قوت جاذبہ سے یعنی وہ دوسری ہمسایہ قوموں کی روایت و زبان کو مٹانے پر قادر ہو اور اس کو اپنے میں جذب کرلے۔ اب مذہب اسلام کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے۔ سب سے پہلے مسلمانان عالم کا ایک مختصر خاکہ بیان دے دینا چاہئے کہ وہ کس طرح دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور کتنی مختلف قوموں سے اس کی جماعت بنی ہے۔

۱۔ قوم عرب یا مستعرب۔ ۵۹ ملین

یمنی ۲ ملین — حجازی ۱ ملین — شامی ۴ ملین — عراقی ۵ ملین — نجدی ۳ ملین — عمانی ۲ ملین۔ مصری ۱۵ ملین — بربری ۲۰ ملین — حضرمی ۲ ملین — عرب ماورائے ممالک عربیہ (افریقہ و امریکہ و جزائر) ۵ ملین

۲۔ قوم ترک۔ ۴۷ ملین

عثمانی ۱۴ ملین — ترکمان ۲ ملین — ازبک ۶ ملین — تاجیک ۳ ملین — کرغیز ۵ ملین — باشکر ۴ ملین تاتار روس و قریم و قفقاس ۱۰ ملین۔ ۸۔ ترکان چین و یارقند ۲ ملین۔ ۹۔ ترک ماورائے ممالک (بلقان مصر و شام وغیرہ) ۱ ملین

۳۔ قوم عجم۔ ۴۲ ملین

ایرانی ۱۲ ملین — افغان ۷ ملین۔ کیرد ۴ ملین — بلوچ ۱ ملین — عجم ماورائے ممالک مثل قفقاس ہندوستان افریقہ وغیرہ ۱۸ ملین۔

۴۔ قوم ہند۔ ۷۹ ملین

پنجابی ۱۲ ملین — سندھی ۳ ملین — کشمیری ۳ ملین — بنگالی ۲۵ ملین — ہندوستانی ۱۷ ملین — دکھنی ۱۷ ملین اورائے ہند (افریقہ و جزائر) ۱ ملین۔

۵۔ قوم چین۔ ۵۰ ملین

تنگان ۳۰ ملین — پانتھے دھونی ھوفی ۱۸ ملین — ماورائے چین (ملایا۔ امریکہ) ۲ ملین

۶۔ قوم سلاو۔ ۱۰ ملین

۱۔ روس و پولینڈ ۴ ملین — بلقان ۶ ملین۔

۷۔ قوم یونان ۱½ ملین

البانوی ۱ ملین — اہل کریٹ و یونان و سمرنا ½ ملین۔

۸۔ قوم ملایا ۲۴ ملین — سماترا ۳ ملین — جاوا ۲۸ ملین — ملکس و سیلبر ۴ ملین — ملاکا ۱ ملین — فلیپائن

دیاپوا، ۱ ملین - بورنیو - ۴ ملین، ماورائے ملایا (جنوبی افریقہ - میڈگاسکر وغیرہ) ½ ملین -

۹- اقوامِ یورپ و امریکہ و آسٹریا، ۱ ملین -

۱۰- اقوامِ افریقہ، ۵۰ ملین :-

حبشی ۳ ملین — سوڈانی ۴۵ ملین — سواحلی ۲ ملین

تو اسلام اس وقت ۱۰ اقوامِ عظیم میں شایع ہے۔ کیا یہ سب ایک ہی قوم ہیں۔ اگر نہیں ہیں اور یقیناً نہیں ہیں تو ہم ہندوستانیوں میں کون طرۂ امتیاز ہے کہ وہ یہاں آکر ایک مسلمان کی قوم بن جائے۔ حتے کہ بڑے سے بڑا جوشیلا مسلمان ہائے قوم وائے قوم کرتا ہے، تو اس سے اس کی مراد صرف اپنے ہم مذہب والوں سے ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مذہب اسلام کو ہندوستان میں قوم بنانے کی بدعت کہاں سے نکلی۔ اور اس کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ قوم بننے کی رفتار کیسی ہے، آیا یہ قوم تیار ہو چکی ہے یا ابھی تیاری پر ہے۔ اور قوم بن کر وہ کہاں تک قومی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئی۔ پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ اس قومیت نے کتنے موانع مذہب و معاشرت کے متعلق ہم میں پیدا کر دیے ہیں۔ اور پھر اس غلط عقیدہ کے ازالہ کی صورت کیا ہے۔

اسلام کو قومیت کا رنگ دینے کے جراثیم قرآن سے باہر فقہ اور حدیث میں ملتے ہیں۔ اور چونکہ مسلمانوں میں قرآن ایک ہوا بنکر رہ گیا ہے۔ جس کا چھونا تک مشکل ہے۔ نہ کہ اسکا پڑھنا اور سمجھنا، اس لئے ہمارے مذہب کا سارا دارومدار فقہ و حدیث پر ہے اور یہیں سے ہماری ساری خرابیوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ عرب کا قومی عروج ایک عرصہ تک اشاعت اسلام کا مرادف سمجھا جاتا رہا۔ عربوں کے مفتوحہ ممالک کے باہر اسلام کی اشاعت کا کبھی خیال پیدا نہیں ہوا۔ اور مفتوحہ ممالک میں غیر عربی قوم میں اسلام محض معاشرتی سیاسی جاذبیت کا نتیجہ رہا۔ فقہائے اسلام کے نزدیک دنیا دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک دار الاسلام اور دوسری دار الحرب۔ اور جب فقہا کا یہ قول ہے کہ دار الحرب میں اشاعت اسلام کی سعی یہاں تک جائز نہیں تو ہمکو خواہ نخواہ اس بات کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ مذہب اسلام واقعی ایک عربی پولٹیکل مذہب تھا۔ اور اسپر عمومیت کا اطلاق کبھی نہیں ہوا۔ اور اس لئے اس کی اشاعت اسلامی سلطنت سے باہر نہیں کی گئی اور نہ ہونا چاہیئے۔

دار الاسلام کے اندر قومی خصوصیت کے سارے اجزا طبعی طور سے مذہب کے اندر ہی رہے، اور جس کو ہم معاشرت، شریعت، سیاست سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کو مذہب سے علیحدہ جگہ دیتے ہیں وہ محض مذہب کی شاخیں ہیں مگر یہ حالت دیر تک قایم نہ رہی اس لئے کہ یہ صورتیں قرآن کی عمومیت اور تبلیغ کے منشاء کے خلاف تھیں۔ اور اس کو سوائے خدائی مصلحت کے اور کیا کہا جائے کہ عربوں سے سلطنت چھین لیگئی یہ ایک ایسا تازیانہ غیبی تھا کہ اب مسلمان اگر ہوش سنبھالتے تو قرآن کے مبلغ بنکر دنیا کی قوموں میں نکل جاتے اور پیغام الٰہی کو دنیا کے کونے کونے میں پہونچا دیتے۔ مغلوں کا زمانہ شروع ہوتا تھا کہ گویا عربوں کو یہ پرانا عہد یاد پڑ گیا اور یا کم سے کم ان کے موالی تبلیغ اسلام کیطرف متوجہ ہوئے۔ اور اس زمانے سے لیکر ابتک اور خصوصاً چودھویں ص[illegible]ی میں تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی جماعت خود فاتح تاتاریوں میں جزائر اوقیانوس - افریقہ - روس و چین کے اندر پیدا ہو گئیں۔ [illegible] اتفاق یا سوء اتفاق سے غیر عربی جماعتیں جو اسلام لائیں وہ حکمراں سے لیکر رعایا تک سب کی سب ایمان لائیں۔ ایسا نہوا کہ کسی ملک میں تھوڑے سے اصلی باشندے مسلمان ہو گئے ہوں۔ اور باقی غیر مسلم

اور جہاں ایسی حالت پیدا ہوئی، جیسے ساحل چین و ملیبار میں وہاں وہ غیر ملکی اور علیحدہ قومی حیثیت رکھتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی ضرورت ابھی تک محسوس نہ ہوئی کہ مذہب کو معاشرت و معالات سیاست سے جدا کیا جائے۔ یعنی مختصر یہ کہ فقہ و اجتہاد کا عروج باقی رہا، اور مذہب و قوم میں کوئی مابہ الامتیاز بات پیدا نہ ہوئی۔ انیسویں صدی شروع ہوتے ہی مسلمانوں کی سلطنت پر زوال آنا شروع ہوا۔ ہندوستان اور ملایا اور افریقہ میں اہل فرنگ نے قبضہ کیا۔ تاتاریوں کی سلطنت پر روس کا قبضہ ہوگیا۔ ایک طرف اگر یہ ہوا تو دوسری طرف چین کے اصلی آبادی میں اسلام نے معتد بہ اضافہ کرلیا۔ یہ غالباً ایسی خدائی مصلحت کے ماتحت شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت غیر مذہب والوں کی حکومت میں آگئی۔ اس حالت کو ڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں ہوا اور یقیناً یہ بہت تھوڑا زمانہ ہے کہ مسلمان غور کرسکیں کہ ایسی حالت میں انکو کیا کرنا چاہئے۔ وہ ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھوئے بیٹھے ہوئے ہیں اور چونکہ ابھی تک ان پر ایسی حکومت کا خمار باقی ہے جو مذہب اور سیاست کو یکساں سمجھ رہا تھا وہ اپنی قوم اپنے مذہب ہی کو سمجھ رہے ہیں۔ مگر اب رفتہ رفتہ شاید یہ محسوس کر رہے ہیں کہ سیاست پر ان کا قابو نہیں رہا۔ اس کا حصہ مذہب سے نکالنا ہی پڑے گا۔ معاشرت کے بعض قوانین کو جس میں غیر ملکی حکومت دخل دینا نہیں چاہتی، مذہبی چیز سمجھ لیا گیا۔ یعنی وراثت، شادی طلاق کے معاملات میں جسکو پرسنل لا یعنی شخصی قانون کے نام سے قایم رکھا گیا ہے۔ لیکن درحقیقت جب اسلام نام ہے صرف عمومی مذہب کا تو یہ شخصی قانون "مہمل" سی بات ہے۔ اور وہی مثل ہے کہ "سارا ہاتھی نکل گیا اور دُم پھنس گئی ہے"۔ یعنی اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر آج ایک جرمن۔ یا فرانسیسی یا انگریز یا ایک ہندو اسلام قبول کرے تو وہ اپنی قومی قوانین کے بعض حصے کے لئے نوٹس دے کہ ان کا عمل اسپر موقوف کیا جائے۔ صرف اس لئے کہ اس نے لا الٰہ الا اللہ کا کلمہ پڑھ لیا ہے۔ نہیں۔ درحقیقت قرآن کو قومی و شخصی قانون سے کوئی تعرض نہیں وہ صرف ذریعہ　　　اصلاح اخلاق کے جو ذرائع ہیں۔ اگر ان کے لئے ملکی سیاست جگہ نہیں رکھتی۔ تو قرآن نے مختصراً اسکو بھی سمجھا دیا ہے یا اس کی ایسی اصلاح کردی ہے جس سے اخلاق پہ برا اثر نہ پڑے۔ اس نکتہ کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ قرآن کے اوامر و مناہی موقع کے لحاظ سے فرض و واجب و مستحسن وغیرہ ہیں۔ اور قرآن کے ہر حکم کو فرض عین خیال نہ کرلیا جائے۔ مگر قرآن کا دراصل منشا اشاعت توحید اور اصلاح اخلاق ہے اور باقی سب فروع اور ذرایع ہیں جس میں طریقہ عبادت بھی شامل ہے۔

اگر آج ہندوستان کے مسلمان اس بات کو قطعی بھول جائیں کہ وہ ایک جدا قوم ہیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ان کی قوم کے مختلف اجزا جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اپنی قومی معاشرت و زبان و تمدن کی طرف واپس جاکر اپنے اسلامی خمیر کو جو قرآن سے ان کو ملا ہے۔ ساری قوم میں سرایت کردیں گے۔ لیکن ان سے جدا رہ کر ان کو ایک ایسی تنظیم کی ضرورت ہوگی جو سلطنت کی تعبیر محال ہے۔ اور ہندوستان میں قرآن مختلف زبانوں میں پڑھا اور سمجھا جائے گا۔ کوئی خدا کی عبادت اُس طرح کرے گا جیسے رسول اکرم کے وقت مسلمان کرتے تھے۔ کوئی اس طرح جو ہر طرح رقت انگیز اور قابل قبول خدا ہے۔ اپنی زبان ہوگی اپنی رسم اور ~~لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ~~ لقوم شرح۔

لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ۔ کے ماتحت قومی رنگ جدا ہے بہ ان کے اتفاق کے لئے قرآن و کعبہ باقی رہیگا اس وقت ہم یہ نہ کہیں گے کہ قوم مسلمان ترقی نہیں کرتی۔ بلکہ یہ کہیں گے کہ قوم ہند بر سرا دج ہے۔ اور ماشاءاللہ وہ مسلمان ہے۔ مگر اس کے خلاف

کیسی کیسی احمقانہ حرکتیں ہم سے ظہور میں آ رہی ہیں۔ صرف اس لئے کہ شمالی ہندوستان میں مغلوں نے سلطنت کی۔ ہماری بڑی کوشش یہ ہے کہ ہندوستانی زبان کو فارسی رسم الخط میں لکھیں۔ اس میں فارسی الفاظ ٹھونسیں اور پھر غضب یہ کریں کہ قرآن و مذہب کو اس سے باہر نہ جانے دیں۔ اور اسی زبان کو اس کا زینہ بنائیں۔ بنگالی مسلمانوں کو مجبور کریں کہ وہ اردو سیکھیں۔ اردو اس کا نام رکھیں اور اس کو قومی روایت سے عاری کر دیں اور اس میں عربی اور عجمی روایات کو بھرتی کریں۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر تم اپنے گرد ایک ایسا حصار کھینچ رہے ہو، جو ہندو کو نہ تم سے ملنے دے گا نہ تمہارے مذہب کی طرف آنے دے گا۔ سب سے طرفہ بات یہ ہے کہ فارسی جو یقیناً غیر اسلامی زبان ہے، اس کو تو اسلامی زبان سمجھی جائے لیکن بھاشا و سنسکرت کو غیر ملکی اور غیر مذہبی حتیٰ کہ اس میں قرآن کا ترجمہ بھی روا نہ ہو۔

پس مسلمانانِ ہند کی پستی کا علاج ہے تو صرف یہ کہ وہ اس غیر فطری حصار کو جو قوم اسلامی کے نام سے وضع کیا گیا ہے، توڑ کر پھینک دیں اور جہاں جہاں سے اس کے اجزا لے کر جمع کئے ہیں وہ واپس کر دیں۔ کسی شخص کو محض اس تصور پر کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، عرب بنانے کی سزا نہ دیں، بلکہ اس کو صرف ایک قرآن اسی کی زبان میں دیں اور پھر دیکھیں کہ قرآن کس قدر جلد پھیلتا ہے۔ مسیح نے جو آسمانی بادشاہت کی تشبیہ ضمیر سے دی ہے، وہ درحقیقت اسلام و قرآن کی بہترین تشبیہ ہے۔ اور اگر ہم اس نکتہ کو از خود نہیں سمجھتے ہیں تو خدا ہم کو سمجھا کر رہیگا۔

سید مقبول احمد (بی اے)

کایا پلٹ ہیر آئیل

کہنے کو صرف یہ تیل ہے لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے اکسیر کو بھی مات کرتا ہے۔ یہ تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود نباتاتی و کیمیاوی اجزا سے جدید اصول پر تیار کیا گیا ہے، جس کی تصدیق بڑے بڑے سائنس دانوں نے کی ہے۔ اس کے فوائد کی تفصیل مختصر اشتہار میں ناممکن ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ گھر میں اسکی ایک شیشی رکھنا گویا بہت سے امراض کو دفع کر دیتا ہے۔

اگر۔ سر یا چندیا کے بال گر گئے ہوں یا گر رہے ہیں۔ یا بالخورہ اور گنج ہو گیا ہے۔

اگر نزلہ، درد سر یا شقیقہ، دوران سر، ضعف دماغ و بصر، بے خوابی یا نسیان کی شکایت ہے۔

اگر سر اور جسم کی پھوڑیاں، پھنسیاں، گرمی دانے، خارش یا دیگر امراض جلدی کا دفع کرنا مقصود ہے۔

اگر کنٹھ مالا، سل اور دق وغیرہ سے محفوظ رہنا ہے ———— تو

ان سب کا واحد علاج **کایا پلٹ ہیر آئیل** ہے

جو نہ صرف خوشبو بلکہ اپنی مقدار و وزن کے لحاظ سے بھی بازار کے تمام خوشبودار تیلوں سے اچھا اور ارزاں ہے۔

ڈاکٹر تیج بہادر سپرو لکھنؤ سے اپنی تحریر میں تصدیق فرماتے ہیں کہ اس تیل کے فوائد اشتہار کے مطابق پائے گئے ہیں اور مرزا جعفر علی خاں صاحب بی اے ڈپٹی کلکٹر رائے بریلی نے دوامی آرڈر ہر ماہ ایک شیشی کا دیا ہے۔ اور بھی متعدد سرٹیفکٹ موجود ہیں۔ قیمت مع محصول…… ۱ روپے

(نوٹ) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضروری ہے۔　　"منیجر کایا پلٹ ہیر آئیل لکھنؤ"

"خلیق اورنگ آبادی"

کتب خانۂ آصفیہ کی ورق گردانی کے دوران میں گلزار معاصرین (نمبر ۱۰۴ دواوین فارسی) کے آخر میں ریختہ کے دس صفحات بھی نظر آئے، جن پر خلیق کے اردو شعر لکھے ہوئے ہیں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد:—

"ریختہ جات وغیرہ من تصنیف رائے روپ نرائن خلیق تخلص اورنگ آبادی" لکھا ہوا ہے

اس میں نہ کہیں سنہ درج ہے اور نہ کاتب کا نام افسوس ہے کہ خلیق کا حال بھی نہیں ملتا صرف "مجلۂ عثمانیہ" جلد ۱ نمبر ۴ صفحہ ۱۱۷ پر شیخ چاند صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ نے "اورنگ آباد اور اردو شاعری" پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے مضمون کے "پانچویں دور ۱۲۶۰ھ تا ۱۳۰۰ھ" میں خلیق کا نام بھی گنا دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:—

"اس دور میں اورنگ آباد کی تباہی کے پورے سامان ہو چکے تھے، مشاعروں کی محفلیں گرم تھیں، لیکن کوئی لائق ذکر شاعر نہیں اٹھا البتہ بعض نام مل جاتے ہیں جنہوں نے بزرگوں کی تقلید میں شاعری کی، ان میں خلیق کا نام لینا ضروری ہے، ان کی بعض غزلیں دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا، بہت صاف اشعار ہیں اور کوئی خاص بات نہیں"

موصوف نے خلیق کی غزل کے تین شعر بھی نقل کیے ہیں نہ جانے ان کے پاس خلیق کو (۱۲۶۰ھ تا ۱۳۰۰ھ) کا شاعر ماننے کے کیا اسباب ہیں، چونکہ ہمارے سامنے اس وقت کچھ اور مواد نہیں ہے اس لئے ہم سر دست یہی فرض کرتے ہیں کہ خلیق کی شاعری کی ابتدا ۱۲۶۰ھ یا اس کے درمیان میں ۱۳۰۰ھ تک ہوئی ہے۔

نام سے پتہ چلتا ہے کہ خلیق کایستہ یا کھتری تھے اور جیسا کہ اس زمانہ کے ہندوؤں کے عقائد تھے حضرت علی علیہ السلام کے مداح تھے، ہر غزل میں "محبت مولا" کا ثبوت دیتی ہے، وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے عقاید مشترک تھے مسلمان جنکی مدح کرتے تھے ہندو بھی ان کے ثنا خواں تھے اور ایک زمانہ یہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے پیشواؤں کو برا بھلا کہتے ہیں تو ہندو مسلمانوں کی قابل تعظیم ہستیوں کی ہجو کرتے ہیں۔ خلیق کے اس مختصر دیوان کی پہلی غزل ملاحظہ ہو، حمد، نعت، منقبت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مذہبی مسلمان کی غزل ہے:—

مجال کیا ہے زباں کو کہے جو حمد خدا — سبھی طرح سیتی ہو لال کیا کرے وہ ثنا
اسی طرح سیتی ناقص ہے نعت حضرت میں — ازل سول احمد احد ایک ہیں نہیں ہیں جدا
خلاف اسکے جو بوجھے سو بے شبہ کافر — اگر جھوٹ ہے دلیں تو مان میری صدا
چہار چیز سے پیدا کیا ہے انساں کو — مثال اسکے تو ہیں چار یار رہنما
خلیق یار علی کا غلام ہو دل سے — ہیں دستگیر تیرے بے شبہ وہ روز جزا

اس غزل کو دیکھ کر کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ خلیق پر اسلام کا رنگ اس قدر چھا گیا تھا کہ انہوں نے اس کی تقلید شروع کر دی تھی، خلیق ہندو تھے اور انکو اس امر کا اعتراف بھی تھا کہ وہ ہندو ہیں۔ ذیل کی غزل کا چوتھا شعر دیکھئے:-

یا الٰہی مجھے اپنا نہ طلب گار کیا
کاہے کو عشق مجازی میں گرفتار کیا

ہے مجھے یقیں میری شرم سے تجھ کو [1]
مری بخشش کے لئے اپنے کو غفار کیا

بے طلب مجھ کو دیا جو کہ مجھے تھا درکار
دستگیری کو مری احمد مختار کیا

گرچہ ہندو ہوں گنہگار سراپا یارب
پن گنہگاروں میں مجکو بھی تو سردار کیا

جس کو سرشار کیا اس کو نوازا بے شک
جس کو سرشار کیا اس کو پھر ہشیار کیا

مجھ کو لازم ہے یہی سجدہ کروں ہر دم
ورنہ میں آن کے دنیا میں نہ کچھ کار کیا

ہیں ترے طالع بڑے تجھ کو میں کہتا ہوں خلیق
سرفرازی کی نظر حیدر کرار کیا

[1] یہ مصرع اسطرح لکھا ہوا ہے

اس منقبت کو دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی "نصیری" ہے جو فنا فی علی ہو چکا ہے

جھکا رہا ہے بر حق خلیق سر کو نیوا
ہمارے دین میں چاروں طرف ہے سجدہ روا

مگر وہ قبلۂ مومن کے مولد عالی
زبان خلق میں مشہور ہے گا بیت اللہ

بس آگے وصف کروں کیا کہ یہ مکان و مکیں
جو شرک لائے سو ہے کافر جناب اللہ

علی ہے شیر خدا اور رسول کا داماد
یہ وہ رسول ہے جو نہیں خدا سے کچھ بھی جدا

احد کے لفظ میں جو میم ہو گیا ساکن
وہی ہے میم جو مشکل‌کشا پسند کیا

دلیل میرے سخن پر حدیث قدسی ہے
خدا نے خاد علی کا حوالہ آپ دیا

گئے تھے قصد جو معراج کا رسول کریم
خراماں ہو کے ہوا سامنے وہ شیر خدا

پیام حق کا کئے عرض جبرئیل امیں
کہ دیو خاتم کے تئیں ہاتھ سے اے راہ نما

ہوئے جو محرم اسرار حق بحق محق
ہزار بار ادب سے کہوں میں صلی اللہ

جو دیکھی دست مبارک میں اپنی انگشتر
طعام فضل کو کھا کے کئے خدا کی ثنا

تمام آ کے ملائک ادب سے کئے تسلیم
درود پڑھ کے کہے سب نبی رسول اللہ

ادب سے نام لے حضرت نبی علی کا خلیق
کہ تجھ کو ذات انہوں کی شفیع ہے روز جزا

مبارکباد خدا را نبی علی داماد
یہ وہ علی ہے کہ ہے نام جسکا اسد اللہ

ایسی ہی ایک اور نعت آمیز منقبت کہی ہے :-

کون کہو کہے مصطفےٰ تئیں ذات اللہ سے جدا　　　واسطے بخشش کے میری صورت انساں کیا
بعید پایا ہوں خدا کیو اسطے سو ناضرور　　　خود علم ہو تجہ پہ مشکلشا ظاہر کیا
یہ معمہ گر تو سمجھے ہو یقیں عاقل پسند　　　تھا احد اول سے آخر میم ہو احمد ہوا
عین میں تیرے علی والے نے بخشی روشنی　　　کامیابی دو جہاں کی عین میں ہے مدعا

کمترین کمتراں ہے روپ نام ان خلیق
یا علی مشکلشا یا ابو الحسن ناعیلیا

اس کے علاوہ اور بھی متفرق شعر نعت و منقبت میں کہے ہیں، خصوصاً مقطع اسی رنگ کا کہتے گئے ہیں:-

میم احمدؐ میں جو کہ ظاہر ہے　　　وہی ہے میم میرے مطلب کا
مظہر حق علیؑ مظہر ہیں　　　فدوی مظہر العجائب کا
حق تعالیٰ سے یہی عرض کرے رنگا خلیق　　　دستگیری کو میری حیدر کرار مرا
ہو دل سے فدا علی ولی کا تو خلیق　　　اس رمز کو خوب تو نے جانا جانا
خلیق اب یاد ہے مولیٰ علیؑ کی　　　میرے دل کو علی بھایا سو بھایا
خلیق اب فضل ہے مولیٰ علی کا بے شبہ تجھ پر　　　وگرنہ کاہے کو جگ میں نمایاں دلربا کرتا
عاجز خلیق عرض کرے یا علی ولی　　　جز ذات پاک والا میرے کون ہما——

یہی نہیں کہ وہ "نصیری شیعی" تھے بلکہ ایک "قبر پرست سنی" بھی تھے چنانچہ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی مدح بھی کی ہے:-

قادر قدرت نما وہ شاہ گیلانی ہوا　　　قادر مطلق نے برحق قطب ربانی کیا
دستگیر دو جہاں میراں محی الدین شاہ　　　نام حق نے حق تمہیں محبوب سبحانی کیا
شکر حق جو اس زباں سے میں کہوں پیران پیر　　　یازدہ سجدہ ادا کر غوث صمدانی کہا
گرچہ ہوں میں سر سے لے پاؤں تلک غرق گناہ　　　دستگیری کو میری وہ شاہ جیلانی ملا
اے خلیق لازم ہے تجکو و مبدم سجدہ کرے　　　خوف کیا ہے غوث اعظم ہے تری حار وا (جنت)

کسی کو "مرشد کامل" بھی بنالیا تھا چنانچہ کہتے ہیں:-

بقول مت حکم مرشد کامل　　　رب ارنی ہے دیکھنا اپنا

عید میں بھی قربانی کرتے تھے اور جیتے جی نذر لیجانا نہیں چاہتے، مقصد یہ ہے کہ زندہ رہکر نذر کیا لیجائیں قربان ہی کیوں نہوں!

یہ عید جو آج آئی ہے قربانی کی　　　کیا جی کے نذر تیری لے آنا جانا

بعض اشعار نہایت ہی عمدہ اور صاف کہے ہیں اور "مرشد کامل" کے تذکرے میں جو شعر نقل ہوا ہے اسکے ساتھ دو شعر اور لکھکر قطعہ بند کیا ہے:-

بھول مت حکمِ مرشدِ کامل — رب ادنیٰ ہے دیکھنا اپنا
ماورا اس کے لن ترانی ہو — مثلِ کوہِ طور آپ میں کھپنا
نہ کہ مانندِ مہر ہر ذرہ گرد — جس جگہ جانا اس جگہہ دھپنا

دیکھئے یہ غزل مسلسل کہی ہے اور کس قدر اچھی کہی ہے، خاص کر مطلع آج کل کے لئے کوئی نئی بات نہیں مگر اس زمانہ کے تخیل کے لحاظ سے ایک عمدہ چیز ہے۔

نہوتا کوئی تیرا عاشق تو اے معشوق کیا کرتا — تو اپنی خوبصورت کو لئے خالی پھرا کرتا
ہمارے عشق نے مغرور تجکو کر دیا ظالم — وگرنہ سانس ٹھنڈی رات دن ہردم بھرا کرتا
اگر اس باغِ الفت کا نہ ہوتا باغباں میں تو — چمن کے حسن کو تو کس طرح سیتی ہرا کرتا
نگاہِ عشق نے میرے ، — نہیں تو حسن کو اپنے جلا کر کیا طلا کرتا

ذیل کے اشعار کتنے اچھے ہیں اور خاص کر مطلع کا یہ مصرع "یہ دل ہے جس طرف آیا سو آیا" کس غضب کا ہے!

مزہ جو عشق کا پایا سو پایا — یہ دل ہے جس طرف آیا سو آیا
ارے زاہد عبث بکوا کرے ہے — ہمارے دل کو جو بھایا سو بھایا
شہادت کا مزہ اس کو ہے معلوم — جو زخمِ عشق کو کھایا سو کھایا
خدا کے واسطے منظور کریو — یہ سر دل کی نذر لایا سو لایا

دکن کے اساتذہ نے اس زمین میں خوب طبع آزمائی کی ہے، خلیق نے بھی اچھی غزل کہی ہے، ملاحظہ ہو،

عجب گھڑی تھی کہ جو دل گیا سو پھر نہ پھرا — پتنگ کے طور پہ جو جل گیا سو پھر نہ پھرا
ارے یہ زخم کو دل کے دکھاؤں میں کسکو — کہ قتل کر کے جو قاتل گیا سو پھر نہ پھرا
کیا تھا وعدہ کہ میں شام کو پھر آؤں گا — مثال مہر کے جو ڈھل گیا سو پھر نہ پھرا
تری نگاہ کے کیا تیر ہیں اے کافر! — یہاں سے آج جو گھایل گیا سو پھر نہ پھرا
ارے خلیق عجب ہے فنا کا ملکِ خموش — زمانہ سیتی جو کابل گیا سو پھر نہ پھرا

اسی بحر میں قافیہ بدل کر ایک اور غزل کہی ہے۔

جہاں کے خواب میں جو دم گیا سو پھر نہ پھرا — مثال آہو کے جو رم گیا سو پھر نہ پھرا
عجب بلا ہے قیامت یہ عشق کی منزل — کہ اس کی راہ میں جو گم گیا سو پھر نہ پھرا
یہ زخم دل کا تو ناسور ہو گیا ہے آہ! — جگر کا میرے جو مرہم گیا سو پھر نہ پھرا
ہوئی ہے شام مجھے اسکی انتظاری میں — ابھی آج جو برہم گیا سو پھر نہ پھرا

دنیا اور زندگی کو لوگوں نے خواب سے تشبیہ دی ہے اور اسی طرح خلیق نے بھی مگر کس قدر سادگی ہے۔

یہ جہاں تو مثال ہے سپنا ۔۔۔ آپ میں آپ سوچنا جینا

رباعی اور غزل کا دکن میں بہت کم فرق تھا خلیق کے زمانہ میں رباعی کی طرح غزل بھی اسی بحر میں کہی جاتی تھی، دیکھئے بعض شعر کتنے اچھے ہیں

دل دل سے ملا کے آج جانا جانا ۔۔۔ مٹنے ہم کو بلا کے آج جانا جانا!

چھوٹے ہو جہاں میں اور رہیم سے سچے ۔۔۔ قسمان کھانا اور پھر نہ آنا جانا!

دلدار اگرچہ جگ میں لاکھوں ہیں گے ۔۔۔ دل میرا ہوا ترا دیوانا جانا!

محبت کی چاٹ بری ہوتی ہے کس مزے سے کہتے ہیں:-

جس کو لاگا ہے چسکا تجھ لب کا ۔۔۔ بھولتا ہے وہ ذائقہ سب کا

ذیل کے متفرق شعر دیکھئے کتنے صاف ہیں:-

جان من! جان تجھ کو کہتا ہوں! ۔۔۔ دیکھ تو آشنا ہوں میں کب کا!

عشق سے آن پڑا ہیگا خدا کار میرا ۔۔۔ ذات تیری کے سوا کوئی نہیں غمخوار میرا

رشتہ ہی دانۂ تسبیح کو زنار کے ساتھ ۔۔۔ اس سبب رشتۂ الفت ہے ہار میرا

لازم ہے تجھ کو ورد کرے نام پنجتن ۔۔۔ دافع تیری بلا کے ہیں وہ شاہ کربلا

سب کو قضا قضا ہے رضا کو نہیں قضا ۔۔۔ جسمیں رضا قضا کی ہو وہ ہے قضا رضا

سب سے بہتر ہے اے خلیق مرے ۔۔۔ شمع سا گھل کے آپ میں کھپنا

گو خلیق کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں اور نہ ان کے کلام سے حالات ہی معلوم ہو سکے مگر ایک سو سال پہلے کی شاعری کا نمونہ ضرور ہے اور اسی لئے ہم نے خلیق کو روشناس کرانے کی کوشش کی، ممکن ہے کہ کبھی مکمل دیوان مل جائے اور کسی جگہ حالات بھی نظر آئیں۔ ایسے سینکڑوں گمنام شعرائے دکن کا کلام ہمارے پاس محفوظ ہے جن کے حالات وغیرہ نہیں ملتے، انشاء اللہ یکے بعد دیگرے ان سب کا کلام پیش کیا جائے گا۔

سید تمکین کاظمی

کتاب علم فراست الید

اگر آپ نے ابتک نہیں ملاحظہ کی تو اب طلب فرمائیے۔ قیمت علاوہ محصول عہ (منیجر نگار لکھنؤ)

مُصحفی کا مرتبۂ شاعری

آزاد کی تنقید ـ میر و مصحفی کا تقابل

(۱)

اسلوب شاعری اور انداز بیان کے لحاظ سے قدیم اردو شاعری کو تین صورتون مین تقسیم کیا جاسکتا ہے

۱۔ سادہ و بے تکلف زبان مین نرم نرم محبت کی باتین وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی میر تقی ـ درد ـ سوز ـ یقین ـ بیان ـ ہدایت اور بیدار نے کی کسی سے بن نہ آئی ان شعرا کی غزلین پڑھو اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کہ کہان تک صحیح کہتے ہین

۲۔ جوش و خروش کلام کی گرمی، دلاویزی سنگلاخ زمینون اور مشکل ردیف قافیون مین شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو میرزا رفیع سودا ـ قائم اور بقا کا کلام دیکھو

۳۔ اگر روزمرہ و محاورہ مین بیان کی بے تکلفی اور سادگی دیکھنا چاہو تو میر تقی اور میر سوز کی غزلین پڑھو جن پر ہزار بناوٹین قربان ہین

زمانۂ مابعد مین جسقدر شعرا مشہور ہوئے ان مین سے ہر ایک نے انھین اساتذہ متقدمین مین سے کسی نہ کسی کے اسلوب بیان کو شمع راہ بنایا۔ مثلاً جعفر علی حسرت نے سوز و گداز کی آمیزش کرکے میر سوز کے سادہ و سلیس انداز بیان کو رونق دی۔ میر حسن نے تمام و کمال میر تقی کی تقلید کی۔ جرأت نے معاملات عاشقانہ کے اضافہ کے ساتھ اپنے استاد کے رنگ کو قایم رکھا۔ انشا نے ترکیب الفاظ اور انداز کلام مین اور شاہ نصیر نے مشکل ردیف اور قوافی کو اختیار کرنے مین مرزا سودا کو اپنا امام بنایا۔ مرزا غالب اور حکیم مومن خان مومن نے فارسی کی لطیف اور نادر ترکیبون کے ساتھ میر تقی کے رنگ کو زمین سے آسمان پر پہونچایا۔ اور سب سے اخیر مین مرزا داغ نے سلاست و روانی، برجستگی اور بیساختگی کے موتیون سے میر سوز کے سادہ انداز بیان کو ایسا سجایا کہ سارے ہندوستان مین دھوم ہو گئی۔ لیکن شیخ مصحفی کی ہمہ گیر و ہمہ رنگ طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہ کرکے مشاہیر شعرائے متقدمین و متاخرین مین سے تقریباً ہر ایک کے انداز سخن کا پسندیدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ ان کی غزلون مین کہین میر کا درد ہے۔ تو کہین سودا کا دبدبہ، کسی مقام پر فغان کی رنگینی ہے تو کسی جگہ سوز کی سادگی۔ کہین واقعات مین جرأت کی سلاست و حقیقت نویسی سے کام لیا گیا ہے تو کہین ترکیب الفاظ اور انداز بیان مین انشا کا طنطنہ و جبروت صرف ہوا ہے۔ کہین پر غزلون کو واقعات مسلسل پر ختم کرنے مین مرزا جعفر علی حسرت کا رنگِ کلام پیش نظر ہوتا ہے۔ تو کہین مشکل ردیف قافیہ مین

شاہ نصیر کا کمال سامنے آجاتا ہے اور جن غزلون اور بیتون مین ان اساتذہ کی خوبیون کو ان کی کہنہ مشقی اور اُستادی یکجا کردیتی ہے ان کا شمار لاریب اردو شاعری کے بہترین نمونون مین کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ مین تو یہانتک کہنے لئے طیار ہون کہ دورِ آخر کے اساتذہ غالب و مومن بلکہ داغ کی ساحرانہ خصوصیات کلام کا بھی بیشتر حصہ ان کے کلام مین موجود ہے۔ اور جس طرح خواجہ حافظ شیرازی اپنی ہمہ گیری اور اپنی ہمہ رنگی کے باعث شعرائے فارسی مین بلبلِ شیراز کے با معنی خطاب سے مخاطب ہین اسی طرح شیخ مرحوم کو اُردو شعرا کے گروہ مین عندلیب ہزار داستان کا درجہ حاصل ہے

اس دعوے کو پایۂ ثبوت تک پہونچانیکے لئے یہ ضروری نہین کہ شیخ مرحوم کے کلام کو تمام شعرائے مذکورہ کے کلام کے بالمقابل رکھا جائے۔ کیونکہ انشا۔ شاہ نصیر اور ذوق کی شاعری مین مرزا سودا کی شاعری کا عکس ہے۔ اور میر حسن، جرأت، و حسرت کا کلام میر تقی اور میر سوز کے رنگ کلام کا منت پذیر۔ پس جس شخص کی شاعری مین میر و میرزا دونون اُستادون کے کلام کی خصوصیات موجود ہونگی۔ لامحالہ ان تمام شعرا سے مماثل ہوگا۔ البتہ مومن و غالب اور داغ سے تقابل کرنے کے لئے علیحدہ علیحدہ ابواب کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان حضرات نے اپنی جدت پسند طبائع سے کام لیکر کچھ ایسی بات پیدا کرلی ہے کہ شعرائے متقدمین کے مقلد ہوتے ہوئے بھی ان کی شاہ راہ جدا اور ان کا پیرایہ بیان بالکل علیحدہ نظر آتا ہے۔ اور اسی پیرایۂ بیان کا طفیل ہے کہ مرزا غالب و مرزا داغ ایک طرز خاص کے موجد و مخترع تصور کئے جاتے ہین سب سے پہلے میر تقی اور شیخ مصحفی کے کلام کا موازنہ کیا جاتا ہے

میر تقی کا انداز — میر صاحب کے کلام کی خصوصیتین آزاد نے ان لفظون مین بیان کی ہین

"غزل کے لئے عاشق و معشوق کے خیالات عشقیہ، ذکر وصل، شکایت فراق، درد انگیز اور المناک حالت گفتگو ایسی بے تکلف، صاف اور نرم نرم گویا وہی دو تون بیٹھے ہوئے باتین کر رہے ہین اس کے ادائے مطلب کے لئے الفاظ بھی اور ہین اور انکی بحرین بھی خاص ہین میر صاحب کی طبیعت قدرتی درد خیز اور دل حسرت انگیز تھا۔ کہ غزل کی جان ہے اسلئے اُن کی غزلین ہی ہین اور خاص خاص بحور و قوافی مین ہین" (آبِ حیات صفحہ ۱۶۴)

میر کی طرح شیخ مصحفی کے کلام مین بھی ایک خاص قسم کی خوشگواری و روانی پائی جاتی ہے اور اسکے چند اسباب ہین۔ اول تو انھون نے شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحرین اختیار کی ہین جن مین خواہ مخواہ بات کو صفائی سادگی اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ سادہ و مفرد خیالات کے لئے اس قسم کی بحرین خاص مناسبت رکھتی ہین۔ اس لئے جن مضامین کے اظہار کے لئے انھین انتخاب کیا گیا ہے۔ سوادِ الفاظ سے چودھوین رات کے چاند کی طرح ہر جگہ نمایان و درخشان ہین۔ یہی وجہ ہے کہ جن غزلون یا بیتون مین پُر درد مضامین ہین اُن کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام دیتا ہے۔ اور جہان پُرجوش خیالات ہین دو چار شعر پڑھنے کے بعد جوش و خروش پیدا نہ ہونا ناممکن ہے۔ اس سلسلے مین بعض ایسی بحرین بھی ہین۔ جن کی تخلیق مین فطرتاً ترنم اور موسیقیت کا

عنصر بہت زیادہ ہے اس لئے جب ان مین شعر کہا جاتا ہے تو لامحالہ طبیعت کو ایک قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ پھر ان مین شعر کے اجزا بلکہ مصرعون کے ارکان بھی ایسے فراہم کئے ہین۔ جو تال اور سم کا کام دیتے ہین۔ اور جہان جہان یہ حصے ختم ہوتے ہین صاف معلوم ہوتا ہے کہ گانے کی تان ٹوٹ رہی ہے۔ سب سے زیادہ یہ بات ہے کہ الفاظ زیادہ تر اس قسم کے جمع کئے ہین جن کی آوازین ایک دوسرے سے موافقت و توازن رکھنے کے باعث خوش آیند معلوم ہوتی ہین۔ دوسرے یہ کہ ردیف کی تلاش مین بڑی کوشش وکاوش سے کام لیا ہے۔ ردیف جیسا کہ بعض اہل فن کا خیال ہے۔ حسن و زیبائش کے علاوہ اردو شاعری مین خیالات کی وسعت رنگینی اور تنوع کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کیونکہ ردیف بدلتے کے ساتھ ہی قافیے کی حیثیت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور ردیف کو بدل بدل کر ایک ہی قافیہ کو سیکڑون طرح سے موزون کیا جا سکتا ہے علاوہ برین ردیف بذات خود شعر کا ایک زیور ہے۔ اور ترنم و موسیقیت پر اسکا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسی تلاش کا یہ اثر ہے کہ معانی ردیف کے تنوع نے شیخ مصحفی کے کلام مین رنگینی و وسعت کی وہ دنیا پیدا کر دی ہے جسکے ایک ایک کونے مین سیکڑون گلہائے رنگارنگ اپنی بوقلمونی کی بہار دکھا رہے ہین۔ اور یہ بات متقدمین و متاخرین مین سے شاید کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ مشاعرون کی طرحی غزلیات اور دوست احباب کے فرمائشی کلام کو چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ دوسرون کی پاسداری اور اپنی میلانِ خاطر و رنگ طبیعت کی مخالفت دو ایسے داغ ہین جو حسنِ کلام اور خوبی بیان کے چہرے کو ذرا بدنما بنا دیتے ہین۔ (حسب روایت صاحب آب حیات یہ بات میر صاحب مین بھی موجود تھی) باقی جسقدر غزلین ہین سب کی سب اچھوتی اور خوشگوار ردیفون مین لکھی گئی ہین۔ جن کو مضامین تغزل کی مناسبت نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے تیسرے یہ کہ قوافی کے استعمال مین خصوصیت کے ساتھ اس خیال کو مدنظر رکھا ہے کہ حروف قافیہ مین کیفیت آمیز توازن قائم رہے۔ اور ایسے قوافی سے پرہیز کیا ہے۔ جن کے حروف مین سخت بیگانگی یا آواز مین حد سے زیادہ کراہت و ثقالت پائی جاتی ہے۔ انہین مرزا سودا خصوصاً سید انشا کی طرح یہ خبط کبھی نہین پیدا ہوا کہ دماغ مین سمائے ہوئے ہر ایک مضمون کو خواہ مخواہ لفظون مین ادا کر دین چاہے اس مین شعر کی لطافت قافیے کی خوبی بیان کی روانی حتی کہ شعر کے مقصود اصلی کا خون کیون نہ ہو جائے بلکہ وہ قافیہ کی شگفتگی الفاظ کی موسیقیت اور سب سے زیادہ مضمون کی سلاست کو تلاش مضمون پر ترجیح دیتے تھے۔ اور یہی ناقابل عفو بلکہ قابل سزا قصور ہے جسکی پاداش مین بعض کوتاہ اندیش و کم سواد حاسدین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ ان کے یہان صرف باتین ہی باتین ہین تازگیٔ خیال و بلندیٔ فکر نظر نہین آتی۔ گویا ان لوگون کے نزدیک وہی باتین شیخ مصحفی مرحوم کے محاسن کلام مین داخل ہین جنھین غزل کی جان کہنا چاہئے غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات و معاملاتِ عشق عجز و نیاز اسکے ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ جذبات و معاملات جس زبان مین ادا کئے جائین وہی زبان ہو جسمین عاشق اپنے معشوق سے راز و نیاز کی باتین کرتا ہے۔ یعنی سادہ ہو بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو اسکے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحرین ہون۔ جملون کی ترکیب مین نام کو الجھاؤ نہ ہو قریب الفہم خیالات ہون۔

اور یہ تمام باتین ایک ایک کرکے ہمارے فطرت نگار شاعر کے عاشقانہ کلام مین رونما ہین۔ سنئے

رہنے دو میرے سینے مین پیکاں کو نہ چھیڑو — از بہرِ خدا ناوکِ جاناں کو نہ چھیڑو
یہ وہ نہین ناسور کہ ہو بند کسی سے — بہنے دو میرے دیدۂ گریان کو نہ چھیڑو
ٹک رحم کرو چاکِ گریبان پہ ہمارے — یارو کوئی اُس شوخ کے دامان کو نہ چھیڑو
اے ناصحو کچھ فکر کرو چاکِ جگر کی — بیکار مرے چاکِ گریبان کو نہ چھیڑو
دکھتا ہے یہ دل اور بھی فریاد کرے ہے — مت ہاتھ لگاؤ دلِ نالان کو نہ چھیڑو
رہنے دو پڑا مصحفی خاک بسر کو — اس غمزدۂ بے سروسامان کو نہ چھیڑو

تمام غزل مین سوز و گداز کے خیالات اس طرح ادا کئے ہین جس طرح آگ سے دھوان اُٹھتا ہے، ایک اور غزل ہے:۔

مین وہ نہین ہون کہ اُس بت سے دل مرا پھر جائے — پھرون مین اُس سے تو مجھسے مرا خدا پھر جائے
اگر مین رونے پہ آؤن برنگِ ابرِ بہار — ابھی زمانے کی اے دوست تو ہوا پھر جائے
شبِ فراق مین بچنا بشر کا مشکل ہے — یہ بات اور ہے آئی ہوئی قضا پھر جائے
خدا کرے نہ ملے اُسکو آشنا کوئی — اگر کسی سے کوئی ہوکے آشنا پھر جائے
جو دے سکے نہ رہِ عشق مین ہمارا ساتھ — ہمارے ساتھ نہ آئے وہ آشنا پھر جائے
عجب نہین کہ تری خو کے ڈر سے اے ظالم — زبان پہ آکے مرے حرفِ مدعا پھر جائے
پکارتا ہے تجھے مصحفی جواب تو دے — کھڑا رہے یہ ترے آستان پہ یا پھر جائے

یہ رنگ تغزل جرات کے یہان اور سید انشا کے یہان نہ ہونے کے برابر پایا جاتا ہے۔

باندھ آیا تھا کمر وہ دشمنِ جان کھینچکر — کتنا پچھتائے ہین ہم کل اُسکا دامان کھینچکر
آج اس وحشی نے لی پھر راہِ صحرا ہم جسے — کل بہ مشکل لے گئے تھے تا بہ زندان کھینچکر
ساتھ پیکان کے نکل آیا جو دل لپٹا ہوا — کیتے پچھتائے مرے سینے سے پیکان کھینچکر
کچھ نہین معلوم ہوتا ہمکو جرم مصحفی — لیچلے ہین یار کیون اسکا گریبان کھینچکر

زمین ایسی کہ طبیعت اُلجھن اور ذہن کشاکش مین پڑ جائے لیکن قافیون کی تلاش اور ردیف کے ساتھ اُن کی پیوستگی نے اسی کو شگفتہ بنا دیا ان دونون باتون کے ساتھ مضامین کی عمدگی زمین سے آسمان پرے اُڑی

ساقی شراب لایا مطرب رباب لایا — مجھپر تو اک قیامت عہدِ شباب لایا
دل درد و غم کی اُسکے آخر نہ تاب لایا — یہ ہر گھڑی کا رونا اور اک عذاب لایا
کیا دور ہے جو پردہ رُخ سے ترے اُٹھا دے — دنیا مین مہر و مہ کو جو بے نقاب لایا
کہتا نہ تھا مین اے دل جانا نہ اس گلی مین — آخر تو مجھپر آفت خانہ خراب لایا

نامے کے مرے ٹکڑے لا ڈالے میرے آگے — نامہ کا میرے قاصد یہ کیا جواب لایا

آئینہ کیا کہ اُسنے پتھر پہ جب نظر کی — چہرہ پر اپنے وہ بھی اک آب و تاب لایا

اے مصحفی تو اب منہ کیا دیکھتا ہے مے بھی — ہاتھوں سے اپنے ساقی جام شراب لایا

اول سے آخر تک بندش چست، الفاظ صحیح، ترکیب مناسب اور مضامین متین و سنجیدہ ہین خصوصاً پانچوان شعر اپنی جگہ پر ایک چیز ہے۔ جیسے نواب مصطفےٰ خان شیفتہ جیسا عالی دماغ خیال نقاد بھی بغیر انتخاب کئے نہ رہ سکا۔ ہر مصرع کے ارکان اس خوبصورتی سے جمع کئے گئے ہین کہ شاعری اور موسیقیت یکجا معلوم ہوتی ہین

میر صاحب کی دوسری خصوصیت کا تذکرہ ان لفظون مین کیا گیا ہے

''میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتین کرتے ہین دل کے خیالات کو جو سب کی طبیعتون کے موافق ہین محاورہ کا رنگ دیکر باتون باتون مین ادا کر دیتے ہین اور زبان مین خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتین ایک مضمون بن جاتی ہین اسی واسطے ان مین بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے۔ بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہین۔ یہی سبب ہے کہ دونون اثر بھی زیادہ کرتی ہین۔ وہ گویا اُردو کے شیخ سعدی ہین (آب حیات صفحہ ۱۶۴)

''میر تقی کہین کہین میر سوز کے قریب آجاتے ہین پھر بھی بہت فرق ہے وہ بھی (میر تقی) محاورہ خوب باندھتے تھے۔ مگر فارسی کو بہت نبھاتے تھے۔ اور مضامین بلند لاتے تھے (آب حیات صفحہ ۲۱۳)

شیخ مصحفی مرحوم کی زبان مین بھی صفائی و سلاست حد سے زیادہ ہے اگرچہ اسوقت کی ترکیبین فارسی سے مستعار تھین۔ اور کچھ الفاظ متروک ہو جانے کے باعث اب کانون کو غیر مانوس معلوم ہونگے۔ نیز بعض اسماء کی تذکیر و تانیث بھی جھگڑے کی بات ہے، تاہم مجموعی حیثیت سے شیخ مرحوم کی زبان نہایت صاف و شستہ ہے۔ اور یہ صفتین دونون باکمالون کے یہان اس مناسبت کے ساتھ موجود ہین کہ آج بھی کسی کی زبان کو میر و مصحفی کی زبان سے تشبیہ دیکر اُس کی خوبی کا اعتراف زباندانی کی سند دینے کے برابر ہے۔ مشابہت زبان کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ لوگ مصحفی مرحوم کے کلام کو بعض اوقات میر تقی کا کلام سمجھنے لگتے ہین

شیخ صاحب کا کلام دور از کار استعارات، بعید از قیاس مبالغہ اور غیر فطری بیان سے قطعی خالی ہے۔ انھون نے قلبی واردات و کیفیات کو نہایت سادہ، صاف اور شستہ زبان مین ادا کیا ہے جنمین اسلوب بیان کی دلکشی نے وہ بات پیدا کر دی ہے کہ بعض بعض غزلون کا ایک ایک شعر سوز و گداز کی تصویر نظر آتا ہے۔ ان مین الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی ترتیب و ترکیب خاص کیفیت رکھتی ہے۔ اور ان سب باتون نے یکجا ہو کر شیخ مصحفی مرحوم کی زبان کو بھی اسی طرح سہل ممتنع بنا دیا ہے جس طرح میر کی زبان کو، مثلاً:-

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا — کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا
تجھے کس نے روک رکھا تیرے جی مین کیا یہ آئی — کہ گیا تو بھول ظالم ادھر التفات کرنا
یہ دعا ہے مصحفی کی جو اجل بھی اسکی آئے — شبِ وصل کو تو یا رب نہ شب وفات کرنا

جو ہم سے وعدۂ دیدار یار ٹھہرے گا — تو کچھ نہ کچھ یہ دل بیقرار ٹھہرے گا
چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم — کہین تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا
یہی ہے دل کا دھڑکنا مرے اگر تہ خاک — تو کیا مزار پہ سنگِ مزار ٹھہرے گا
جو سیر کرنی ہے کرلے کہ جب خزان آئی — نہ گل رہیگا چمن مین نہ خار ٹھہرے گا
یہی ہے لوٹ تو دست جنون کے ہاتھون سے — نہ ایک میرے گریبان کا تار ٹھہرے گا
شتاب آئیو ٹھہرا رکھین گے ہم اسکو — جو دم لبون پہ شب انتظار ٹھہرے گا
اسے نہ دفن کرو ہمدمو یہ سمجھو تو — لحد مین مصحفی بے قرار ٹھہرے گا؟

معانی ردیف کے اختلاف سے محاورات کی وسعت پر خاص طور سے روشنی پڑتی ہے ہر شعر مین "ٹھہریگا" اپنے مفہوم کیلئے خاص ہے چھٹے شعر کو دیکھئے انتظار معشوق مین عاشق کا دم لبون پر آجانا ایک بے اختیاری کیفیت ہے۔ لیکن "ٹھہرا رکھین گے ہم اسکو" خاص صبر وتحمل کی صورت ہے۔ "شتاب آئیو" کہنے کا موقع اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے تیسرے شعر مین۔ "مزار ٹھہریگا" کی مشکل ترکیب کو کس خوبی سے ایک لفظ سنگ نے اپنی جگہ بٹھا دیا ہے مقطع کے محاسن ظاہر ہین۔

ہے طرفہ ماجرا مرے قاتل کے سامنے — بسمل پڑا تڑپتا ہے بسمل کے سامنے
حسرت پر اُس مسافرِ بیکس کی روئیے — جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
افسوس کی جگہ ہے کہ دریائے عشق مین — کیا کیا غریب ڈوبے ہین ساحل کے سامنے
جا رہیئے اس جگہ کہ جہان اچھی صورتین — بے پردہ ہو کے آتی ہین سائل کے سامنے
اے مصحفی طلسمِ جہان سے نہ دل لگا — قدر اسکی کچھ نہین کسی عامل کے سامنے

تمام شعرون سے قطع نظر دوسرے شعر مین مسافر بیکس کی حسرت کا خاکہ ایسا کھینچا ہے کہ شہرت و قبولیت کے سبب سے زبان زد خاص و عام ہو گیا ہے

اسی سلسلے مین وہ کہین فارسی کی اچھوتی اور مزیدار ترکیبین بھی استعمال کر جاتے ہین اور اس صفت نے اُنھین میر سوز کے رنگ سے کسی قدر ممتاز اور میر تقی کے رنگ سے مماثل کر دیا ہے

ہجران مین بسکہ مجھ پہ عذاب الیم تھا — ہر شعلہ آہ کا مری نار جحیم تھا

کرتے تھے گل مزار سے میرے شگفتگی
یعنی کبھی ادھر بھی گذارِ نسیم تھا
افشائے عشق بعد خدا جانے کیا بنے
جب تک حجاب تھا یہی امید و بیم تھا
کس زلف مشکفام کی بو تھی کہ باغ مین
ہر ایک غنچہ نافۂ عنبر شمیم تھا
جلتی تھی تیغ وان سر دشمن پہ مصحفی
اور میرا مارے اشک کے یان دل دونیم تھا

تیری رفتار سے اک بے خبری نکلے ہے
مست و مدہوش کوئی جیسے پری نکلے ہے
اک فریبندہ ہے تیری روشِ طرزِ خرام
اسکے عہد سے کوئی کبکِ دری نکلے ہے
گل کو نسبت ہے اسی واسطے با اہل جنون
وضع مین اسکے جو اک جامہ دری نکلے ہے
اپنے رونے کو کوئی سمجھے تو آئینہ مثال
دیدۂ خشک سے آنسو کی تری نکلے ہے
کھول دیتا ہے تو جب جاکے چمن مین زلفین
پابہ زنجیر نسیم سحری نکلے ہے
مصحفی کس کے کھلے بال تو دیکھ آیا ہے
کہ تری وضع سے شوریدہ سری نکلے ہے

نکلے ہے تو میر و مصحفی کی زبان تھی لیکن فریبندہ - طرز خرام - اہل جنون - دیدۂ خشک اور پابہ زنجیر کی فارسی ترکیبین جس خوبصورتی سے استعمال ہوئین وہ اس بات کا ثبوت ہین کہ شیخ مصحفی مرحوم اس رنگ مین بھی میر صاحب کے ہم پلہ ہین - بلکہ جن لوگون کو خدا نے فہم کامل دی ہے وہ تو یہانتک کہہ گئے ہین کہ اگرچہ شیخ مصحفی کی زبان میر و مرزا سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے لیکن اس درجہ سبک اور شیرین واقع ہوئی ہے کہ اکثر اسکی حلاوت اس زمانے مین بھی ناظرین کے دلون مین اُسکے متروک الاستعمال ہونے کا گمان نہ پیدا ہونے دیگی» (حسرت موہانی)
مثلاً

جب واقفِ راہ و روشِ ناز ہوئے تم
سچ ہے کہ عجب خانہ برانداز ہوئے تم
مین تم سے نہ بولون گا کبھی اے لب بستہ
اُس بن پہ تبسم بھی اگر باز ہوئے تم
پہنی جو قبا جامۂ گل دوز کی تم نے
طاؤس صفت اور بھی طناز ہوئے تم
پہونچین گے تجھین تازہ نہالان چمن کیا
اب نام خدا سروِ سرافراز ہوئے تم
اے مصحفی مرغانِ چمن رہ گئے خاموش
گلشن مین اگر زمزمہ پرداز ہوئے تم

تمام الفاظ قوافی فارسی ہین لیکن اجنبیت اور غرابت کا کہین پتہ نہین گویا میر صاحب کی طرح شیخ مصحفی نے بھی غزل کی ایک جداگانہ زبان قائم کرلی تھی - جیساکہ ایک جگہ خود فرماتے ہین

یون تو کہنے کو بھی شعر و سخن کہتے ہین
مصحفی ریختہ گوئی کی زبان اور ہی ہے

رات پردے سے ذرا منہ جو کسو کا نکلا — شعلہ سمجھا تھا اُسے مین پہ بھبو کا نکلا
مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم — تیرے دل مین تو بہت کام رفو کا نکلا

ترسا نہ مجھکو کھینچ کے تلوار مار ڈال — گر مار ڈالنا ہے تو اک بار مار ڈال
صیاد تجھکو کس نے کہا تھا کہ فصل گل — مجھکو قفس مین کرکے گرفتار مار ڈال

"تجھ سے کہا تھا" کی جگہ "تجھکو کہا تھا" قدیم زبان ہے

اس نازنین کی باتین کیا پیاری پیاریان ہین — پلکین ہین جس کی چھریان آنکھین کٹاریان ہین
دل کی طپش کا اپنے عالم ہی کچھ جدا ہے — سیماب و برق مین کب یہ بیقراریان ہین
نومید ہین بظاہر گو وصل سے ہم اُس کے — دل مین تو سو طرح کی امیدواریان ہین
کیا پوچھتے ہو ہمدم احوال مصحفی کا — راتین اندھیریان اور اختر شماریان ہین

میر صاحب کی تیسری خصوصیت کی تفصیل یہ ہے

ہمارے عاشق مزاج شعرا کی رنگینیان اور خیالات کی بلند پروازیان ان کے مبالغون کے جوش وخروش سے کچھ معلوم ہین۔ مگر اسے قسمت کا لکھا سمجھو کہ ان مین سے بھی میر صاحب کو شگفتگی یا بہار عیش ونشاط یا کامیابی وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے اسکا دکھڑا سناتے چلے گئے۔ جو آج تک دلون مین اثر اور سینون مین درد پیدا کرتے ہین کیونکہ ایسے مضامین اور شعرا کے خیالی تھے اور ان کے حالی تھے۔ عاشقانہ خیال بھی ناکامی زارنالے، حسرت ومایوسی ہجر کے لباس مین خرچ ہوئے ان کا کلام صاف کہہ دیتا ہے۔ کہ جس دل سے نکلکر آیا ہون۔ وہ غم ودرد کا پتلا نہین حسرت واندوہ کا جنازہ تھا ہمیشہ وہی خیالات بسے رہتے تھے۔ بس جو دل پر گذرتے تھے وہی زبان سے کہہ دیتے تھے۔ کہ سننے والون کے لئے نشتر کا کام کرجاتے تھے۔

(آب حیات)

شیخ مصحفی مرحوم کا اصلی میدان بھی حسرت وناکامی کا اظہار اور حرمان ومایوسی کا بیان ہے کلام کو دیکھئے بدقسمتی کا شکوہ آسمان کی گردش کا رونا، احباب واعزہ کی مفارقت، کوشش وسعی مین ناکامی اور اپنی بیکسی وبے بسی غرض اس قبیل کا کوئی مضمون نہین جسے انھون نے نظرانداز کردیا ہو۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ غم والم کا ایک سیاہ بادل ان پر چھایا ہوا ہے جس سے خوشی وخرمی کے سورج کی ایک کرن بھی چھنکر ادھر نہین پڑتی۔ یا ایک حرمان نصیب قیدی ہے جو اپنی مصیبت خیز زندگی گزارنے مین مصروف ہے یہانتک کہ زارنالی کے مضامین کی بہتات اور مایوسانہ مضامین کی اکثریت نے ان کے کلام کو مرثیہ اور انھین

غزل گو کے درجہ سے نکال کر مرثیہ گو بنا دیا ہے۔ جیسا کہ خود بھی ایک جگہ فرماتے ہین۔

مجھکو شاعر نہ کہو مصحفی ہون مرثیہ خوان
سوز پڑھ پڑھ کے مجنون کو رُلا جاتا ہون

ان تمام باتون نے جمع ہو کر جذب و تاثیر کی وہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ شعر ادھر زبان سے نکلتا ہے اور اُدھر دل کی گہرائی مین پیوست ہو جاتا ہے۔ گویا شیخ اور اُن کا کلام ملکر ایک ہو گئے ہین۔ اور کلام کو دیکھنے والا کبھی نہین کہہ سکتا کہ اُن کی عمر دکھ درد اور رنج و تکلیف کی سخت ترین منازل سے نہین گزری

اس مین وہ موقع سب سے زیادہ موثر، دلشکن اور طبیعت مین ہیجان پیدا کرنے والا ہوتا ہے کہ جہان خوشی و خرمی تو در کنار درد و غم بھی اس بہتات کے ساتھ نصیب نہین ہوتے کہ طبیعت سیر ہو سکے۔ اور طالب غم دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً

درد و غم کو بھی ہے مقدر شرط
یہ بھی قسمت سوا نہین ملتا

واقعہ یہ ہے کہ یہی مضامین غزل گوئی کی جان ہین۔ اور جس شخص مین یہ مضامین جسقدر کثرت کے ساتھ پائے جائین اسیقدر کامیاب غزل گو خیال کیا جاتا ہے۔ یہی صفت ہے کہ جس نے میر تقی کو سرتاج شعرائے اُردو بنایا اور جسکی بنا پر خود شیخ مصحفی مرحوم صرف اپنے دور کے نہین بلکہ ہر دور کے شعرا مین ممتاز درجہ رکھتے ہین۔ اب ہم چند غزلین پیش کرتے ہین۔

نظرون مین تیری پیارے گو بیوقار تھے ہم
اسپر بھی جان و دل سے خدمت گذار تھے ہم

دامان و جیب اپنا گریہ سے سب چمن تھا
تو سیر کو نہ آیا ابر بہار تھے ہم

آتے تھے پاس تیرے جو دوڑ دوڑ ہمدم
کمبخت دل کے ہاتھون بے اختیار تھے ہم

صید زبون سے اپنے کیون تو نے منہ کو موڑا
اس پر بھی کام کے تھے لاغر ہزار تھے ہم

اے مصحفی تصور اُس کا جو بندھ گیا تھا
با صد ہزار حسرت شب ہم کنار تھے ہم

دیکھ اُسکو اک آہ تو ہم نے کر لی
حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی

کیا جانے کوئی کہ گھر مین بیٹھے
اس شوخ سے راہ ہم نے کر لی

جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر
ہاتھون کی پناہ ہم نے کر لی

نخوت سے جو کوئی پیش آیا
کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

دی ضبط مین جب کہ مصحفی جان
شرم اُس کی گواہ ہم نے کر لی

مری حالت سے جا کر یون کرے اُسکو خبر کوئی
کہ روتا ہے کھڑا تیرے لئے بیرون در کوئی

گیا مین اُسکی محفل مین تو وہ دربان سے یون بولا
یہ مجلس ہے کہ میلا، جو چلا آتا ہے ہر کوئی

خدایا صبر دے دل کو کہان تک راہ مین اُسکی
دھرے زانو پہ سر بیٹھا رہے دو دو پہر کوئی

صبا گر جائے تو خلوت مین اس سے اتنا کہدینا
ترے کوچہ سے غافل کر گیا شب کو سفر کوئی

مرا مرنا ہی بہتر ہے صنم تا تو بھی یہ جانے
کہ دو دن کی جدائی مین گیا جی سے گذر کوئی

ہوا تو مصحفی بے جان مگر اے وائے تنہائی
سر بالین نہ آیا اُسکی شب بھر نوحہ گر کوئی

شب ہجران تھی مین تھا اور تنہائی کا عالم تھا
غرض اس شب عجب اک بے سروپائی کا عالم تھا

شمع پر پروانہ شب جس وقت جل کر رہ گیا
دیکھ کر مین اُسکو اپنے ہاتھ مل کر رہ گیا

بن دیکھے جس کے پل مین آنکھین بھر آئیان ہون
کیا قہر ہے کہ اُس سے برسون جدائیان ہون

اے شب ہجر کہین تیری سحر ہے کہ نہین
نالۂ نیم شبی تجھ مین اثر ہے کہ نہین

گھر کا دروازہ جو ہم صبح کو وا کرتے ہین
شام تک تیری ہی بس راہ تکا کرتے ہین

ہے غریبی مین خبر کس کو وطن والون کی
کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والون کی

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے مین جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

لوگ کہتے ہین محبت مین اثر ہوتا ہے
کون سے شہر مین ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

کس نے رکھتے تھے قفس اُن پہ گرفتارون کے
کانٹے کیون سُرخ ہین سب باغ کی دیوارونکے

نہ کہین صبح ہی ہوتی ہے نہ خواب آتا ہے
رات کیا آتی ہے اک سر پہ عذاب آتا ہے

کب اس طرف وہ بت کج کلاہ آتا ہے گدا کے گھر بھی کہین بادشاہ آتا ہے

میر صاحب کی چوتھی خصوصیت کے بارے مین آزاد کہتے ہین کہ

"ان کی غزلین ہر بحر مین کہین شربت اور کہین شیر و شکر ہین مگر چھوٹی چھوٹی بحرون مین فقط آب حیات بہاتے ہین۔ جو لفظ منہ سے نکلتا ہے تاثیر مین ڈوبا ہوا نکلتا ہے۔ مگر یہ بھی بعض بزرگون سے معلوم ہوا کہ مشاعرے یا فرمایش کی غزلین ایسی نہ ہوتی تھین۔ جیسی کہ طبع زاد طرح مین ہوتی تھین۔ (آب حیات صفحہ ۲۱۲)

شیخ مصحفی مرحوم کی بھی جو غزلین بحر خفیف مین ہین ان کے رنگ شاعری کو اور زیادہ واضح کرتی ہین۔ اُن کا ایک ایک لفظ آئینہ ہے اور یہ تمام آئینے اس حسین ترکیب و ترتیب سے رکھے گئے ہین۔ کہ ذرا سی ٹھیس لگ جانے سے ٹوٹ جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ اگر میر تقی مرحوم کی غزلون کو صرف آب حیات کی نہرین کہا جا سکتا ہے تو شیخ مصحفی مرحوم کی چھوٹی چھوٹی غزلین اپنی تازگی اور صفائی مین سلسبیل و کوثر سے جا ملتی ہین

صاحب آب حیات نے اپنی تصنیف مین شیخ مرحوم کی ان بیش بہا اور قیمتی غزلون کے متعلق ایک حرف بھی نہین لکھا تو ہمین اسکا افسوس نہین کیونکہ جیسا کہ ابتک ثابت کیا جا چکا ہے۔ آب حیات مین جسقدر تعریف یا تعریض کی ہے وہ کسی واقفیت فن کا نتیجہ نہین ہے۔ بلکہ یون ہی ایک کی محبت اور دوسرے کی عداوت کے جوش و خروش مین جو الفاظ زبان قلم پر آ گئے ہین بے تکلف ادا کر گئے ہین

ان کی خاموشی سکوت سخن شناس نہین ہے البتہ ان کی تعریف تحسین ناشناس ضرور ہے۔ اسلئے ہم خوش ہین کہ شیخ مصحفی کے چند پارہائے جگر ایک ناشناس کی تحسین کے تیرون سے محفوظ رہ گئے ورنہ ان کی قیمت کم ہو جاتی

آب حیات مین جو مسلک تمام جذبات گو شعرا کے لئے جائز رکھا گیا ہے اس سے یہ اُمید نہین پڑتی۔ کہ آزاد ان خوبیون کو عمداً نظر انداز کر گئے اگر ان کی نظر پہنچ جاتی تو اپنی مسلمہ فطرت کی بنا پر بگاڑ سنوار کر کہتے اور جا بجا جلی کٹی سنانے مین کوتاہی نہ کرتے اور نہین معلوم کن الفاظ مین باکمال مگر غریب الوطن مصحفی پر پھبتیان اُڑائی جاتین۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا تیر نشانہ پر نہ بیٹھا۔ اور نگاہ غلط انداز سے ایک ایسی غلطی ہو گئی۔ جو حلقۂ احباب مین عرصے تک سرگوشیون کا سبب بنی رہیگی۔ چند غزلین اور ملاحظہ ہون:-

مین خستہ تمام ہو چکا اب جا در دکہ کام ہو چکا اب

زلفون مین پھر اُس نے منہ چھپایا بس وعدۂ شام ہو چکا اب

سیر شب ماہ یار تک تھی لطف لب بام ہو چکا اب

دربار ہو یا نہ ہو غرض کیا اپنا تو سلام ہو چکا اب

رکھا یہ خاک مصحفی کو آرام تمام ہو چکا اب

یون چلتے ہین لوگ راہ ظالم یہ چال ہے کون آہ ظالم
غیرون کو تو روز دیکھتا ہے مجھ پر بھی کوئی نگاہ ظالم
کس کس کو ملے گی حشر مین داد اک خلق ہے داد خواہ ظالم
کہدے کوئی جا کے مصحفی سے ہوتی ہے بری یہ چاہ ظالم

کیا کرین جا کے گلستان مین ہم آگ رکھ آئے آشیان مین ہم
مر کے نکلے قفس سے خوب ہوا تنگ آئے تھے اس مکان مین ہم
شاخ گل کے گلے سے مل مل کر روتے ہین موسم خزان مین ہم
مصحفی عشق کر کے آخر کار خوب رسوا ہوئے جہان مین ہم

ایک ایک شعر بے مثل ہے

اپنے مژگان رخنہ گر کو دیکھ آن کر پھر مرے جگر کو دیکھ
میرے آگے نہ دیکھ آئینہ میری حسرت بھری نظر کو دیکھ
دیکھنا کیا ہے عقد پروین کا اپنے آویزۂ گہر کو دیکھ
تھی شب وصل کھل گئی جب آنکھ رنگ فق ہو گیا سحر کو دیکھ
مصحفی یہ ستم نکر نادان خط نہ دے اپنے نامہ بر کو دیکھ

بیٹھ کر وہ جہان سے اُٹھتا ہے ایک فتنہ دہان سے اُٹھتا ہے
نالہ کرتی ہے جس گھڑی بلبل شعلہ اک آشیان سے اُٹھتا ہے
جم کے جو سنگ کی طرح بیٹھا کب ترے آستان سے اُٹھتا ہے
مصحفی ضبط آہ کر ورنہ پردہ رازِ نہان سے اُٹھتا ہے

غم دل کا بیان چھوڑ گئے ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے
چلتے چلتے بھی یہ جفا کیشان ہاتھ مجھ پر ندان چھوڑ گئے

صفحۂ روزگار پر لکھ کر عشق کی داستان چھوڑ گئے
راہ مین مجھ کو میرے ہمراہی جان کر ناتوان چھوڑ گئے
لے گئے سب بدن زمین مین ہم مصحفیؔ اک زبان چھوڑ گئے

الغرض زبان کی سلاست بیان کی دلآویزی اور خیالات کی واقعیت مین میر صاحب اور شیخ صاحب مین صرف یہی امتیاز ہے کہ میر صاحب متقدم ہونے کے سبب سے افضل سمجھے جاتے ہین اور شیخ صاحب مقلدین کے گروہ مین آکر آگے بڑھنے سے رہ گئے ہین - اسی بنا پر مولانا حسرت موہانی نے فیصلہ کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی مصحفیؔ کا کلام میرؔ سے دوسرے درجے پر ہے

آزاد صاحب کی منطق یہان بھی دنیا سے نرالی ہے کہتے ہین

"اسی کوچے مین اکثر شعر میرؔ صاحب کے بھی جھلک دکھاتے ہین مگر جو اُن کے جوہر ہین وہ اُن ہی کے ساتھ ہین یہ اس ڈھنگ مین کہتے ہین - تو پھسنڈے ہو جاتے ہین

(آب حیات صفحہ ۳۱۲)

ہم پوچھتے ہین کہ آخر میر صاحب کے جوہر کیا ہین زبان کے متعلق تو یہ ہے کہ خود آزاد نے اسی آب حیات مین اُن کو میر و سوداؔ کا ایک آخری ہمزبان قرار دیا ہے - نیز ہم نے صفحات بالا مین مماثلت میرؔ و مصحفیؔ کی بنیاد جن اصول پر رکھی ہے وہ ان ہی کے بیان کردہ ہین اسکے بعد محاسن زبان کا قضیہ تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا - اب رہے مضامین - پس اگر یہ فقرہ مضامین سے تعلق رکھتا ہے - تو اسقدر تشریح کے بعد بھی جس مین الفاظ و معنی اور زبان و بیان دونون کا لحاظ مساوی طور پر قایم رہا ہے ہم دس پانچ مثالیں مہیا کرنے مین بخل نہین برت سکتے ہین تو دروغ گو را تا بخانہ رسانید - پر عمل کرنا ہے - اور محض یہ دکھانا ہے کہ میر تقی کے انداز مین کوشش کرتے ہوئے شیخ مصحفیؔ پھسینڈے ہو کر رہ گئے ہین یا آزاد نے محض تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی مین اور اضافہ کر لیا ہے

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر[1] نکلا (میرؔ)
مصحفیؔ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہو گا کوئی زخم تیرے دل مین تو بہت کام رفو کا نکلا (مصحفیؔ)

شیخ مصحفیؔ مرحوم کے دونون مصرعے جسقدر برجستگی کے ساتھ زبان مین ڈوب کر نکلے ہین اسکا لطف بے تعصب اہل زبان اُٹھا سکتے ہین

اس بیکسی سے کون جہان مین موا کہ مین جز داغ سینہ آج چراغ لحد نہین (میرؔ)
داغ حسرت لے گئے دنیا سے بعد مرگ ہم کون لاتا ہے غریبون کے سر مدفن چراغ (مصحفیؔ)

میر صاحب کے شعر سے اول تو داغ کی توجیہ نہین ہوتی - دوسرے بادی النظر مین یہ معلوم ہوتا ہے کہ چراغ لحد اُس چراغ کا نام ہے جو لحد کے اندر جلے کیونکہ سینے کا داغ جو اُسکی نیابت کا حق ادا کر رہا ہے لحد سے باہر نہین ہو سکتا لیکن مصحفیؔ مرحوم نے چراغ کو چراغِ مدفن اور داغ کو داغِ حسرت کہہ کر مضمون کو دونون لغزشون سے بچا دیا شیخ مرحوم کے شعر مین ایک مخفی پہلو اور لطیف کنایہ

---

[1] میرے نزدیک ان دون شعرون کا تقابل اصولاً درست نہین - (اڈیٹر)

بھی ہے کہ جب زندگی مین کسی نے توجہ نہ کی اور ہمین داغ حسرت لیجانا پڑا تو مدفن پر چراغ جلانیکی توفیق کسے ہو سکتی ہے۔ گور غریبان کی رعایت سے مرنے والون کو غریب کہنا لطف سے خالی نہین کاش آزاد انصاف سے کام لیتے اور شیخ مصحفی مرحوم کے حسن کلام کو جو مرنیوالے کی تربت کا چراغ ہو کر تحفظ نام و نشان کا سبب واحد تھا۔ اس طرح ناحق شناسی کے دامن کے سپرد کرنے سے پرہیز کرتے

امید وار وعدۂ دیدار مر چلے   آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا   (میر)

مدت ہوئی کہ بیٹھے ہین ہم انتظار مین   کیا جانے آتے آتے قیامت کہان رہی   (مصحفی)

میر صاحب کے دوسرے مصرعہ مین "یارو" ایک زائد لفظ[1] معلوم ہوتا ہے۔ نیز امیدوار وعدۂ دیدار کا مر جانا یا مرنے کے قریب پہونچ جانا جذبۂ محبت و مودت کے بالکل منافی ہے اسکے خلاف شیخ مصحفی کا پورا شعر روانی اور برجستگی کے قالب مین ڈھل کر نکلا ہے اور میر کے شعر سے زیادہ کیفیات کا حامل ہے

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا   آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا   (میر)

امید کرم پر تری آتے ہین یہانتک   جس روز نہ دیکھینگے کرم بیٹھ رہینگے   (مصحفی)

میر صاحب کے شعر مین بے ادائی ایک ایسا لفظ ہے جسکے معنی شعر کے لئے کچھ زیادہ مفید نہین کیونکہ ادا بمعنی کرم[2] جمہور کے خلاف ہے۔ نیز پیار[3] کرنا شان معشوق کے خلاف ہونیکی وجہ سے نامناسبت کا پہلو رکھتا ہے۔ البتہ شیخ مصحفی مرحوم کا شعر ہر لحاظ سے بلند تر ہے۔

وہ دشت خوفناک رہا ہے مرا وطن   سنکر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا   (میر)

جس بیابان خطرناک مین ہے اپنا گذر   مصحفی قافلے اُس راہ سے کم نکلے ہین   (مصحفی)

میر صاحب کا دوسرا مصرعہ خضر سفر حذر مین متفق الحرکات کے الفاظ کے اجتماع سے ثقیل ہو گیا ہے۔ اور پہلے مصرعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشت خوفناک کسی وقت وطن کی حیثیت رکھتا تھا۔ بحالت موجودہ اس سے کوئی تعلق نہین۔ لیکن شیخ مصحفی مرحوم کے شعر پر ایسا کوئی اعتراض وارد نہین ہوتا۔ بلکہ ایک اور لطیف پہلو یہ نکلتا ہے کہ مین جس خطرناک بیابان مین سرگرم سعی ہون اس راستے سے یکہ و تنہا آدمی تو کیا قافلون کو بھی قدم رکھنے کی ہمت نہین پڑتی

آزاد صاحب نظر ہوتے تو اندھیرے اُجالے کا جو فرق شیخ مصحفی اور خواجہ آتش کے کلام مین نظر آیا میر صاحب و شیخ صاحب کے کلام مین زیادہ آسانی کے ساتھ نظر آسکتا تھا

جون صبح اب کہان ہے طول سخن سے فرصت   قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا   (میر)

شمع سحری ہین نہین کچھ عمر کو وقفہ   یان کام ہے اپنا تو تمام ایک نفس مین   (مصحفی)

میر صاحب کا شعر طول و مختصر کی صنعتِ تضاد کے سوا کوئی خاص خوبی نہین رکھتا۔ بلکہ الشان فانی کو صرف سحر کے ساتھ

---

[1] ہرگز زاید نہین (اڈیٹر) [2] میر نے ادا بمعنے کرم کب استعمال کیا ہے۔ بے ادائی بہ معنے بے رخی آیا ہے۔ (اڈیٹر)

[3] پیار کرنا اس معنی مین نہین ہے جو صاحب مضمون نے سمجھا ہے (اڈیٹر)۔

تشبیہ دیئے جانے کی وجہ سے ایک حد تک قابل اعتراض بھی معلوم ہوتا ہے۔ یہ مضمون بھی شیخ مصحفی مرحوم کے حصے کا ہو گیا شمع سحری کہکر ایک نفس مین کام تمام کرنا کس قدر لطف آمیز ندرت ہے

سعی طوفِ حرم نہ کی ہم نے   آستان پر ترے مقام کیا   (میر)

کیا غرض تھی طرف دیر و حرم کیون جاتے   اسکے کوچہ مین ہمین عمر بسر کرنا تھا   (مصحفی)

شاعرانہ طور پر طلب حق کے دو راستے مانے جاتے ہین ایک دیر دوسرا حرم لیکن عاشقان صادق ان جھگڑون مین پڑنا پسند نہین کرتے بلکہ براہ راست اپنے مطلوب کے آستانِ ناز پر زندگی بسر کرنے کو عین طاعت و عبادت خیال کرتے ہین یہی مضمون ہے جو دونون کے یہان بیان ہوا ہے لیکن شیخ مصحفی کا طرز بیان زیادہ مدلل۔ زیادہ واضح اور زیادہ محیط ہے "کیا غرض تھی" اس جملے مین دیر و حرم سے بے تعلقی ظاہر کرنے کا جو زور ہے وہ "سعیِ طوفِ حرم نہ کی" سے پیدا نہین ہو سکتا۔ اور "اس کوچہ مین ہمین عمر بسر کرنا تھا" اس مصرع نے عاشق کے جس طور زندگی کی قید کر دی۔ وہ میر صاحب کے دوسرے مصرعہ کے مقابلے مین کہین بڑھ چڑھکر ہے نیز صرف حرم پر اکتفا نہ کرکے دیر و حرم دونون کو نظر انداز کر دینے کا مسئلہ بھی خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کے قابل ہے۔ غرض ہر جہت سے شیخ مصحفی کا شعر بلند ہے۔ مگر افسوس یہ بلندی آزاد کی نگاہ مین پستی کی ہم معنی ہے

طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ نصیب   سر پہ مرے کرور برس تک ہما پھرا   (میر)

دیا ہے مجھ کو یہ برگشتہ طالعی نے اثر   کہ آکے سر پہ میرے سایۂ ہما پھر جائے   (مصحفی)

میر صاحب کے شعر مین "طالع جو خوب تھے" ثقیل انداز بیان ہے۔ "کرور برس تک" مبالغہ ہے اور مبالغہ بھی کریہہ جس سے طوالت وقت کے سوا کچھ منظور نہین "ہما پھرا" ایسے برے پہلو سے نظم کیا گیا ہے کہ اصلی معنی بھی خاک مین مل گئے۔ برخلاف اس کے شیخ مصحفی کا شعر ہر لحاظ سے بلند ہے۔

کیا رکھا کرتے ہو آئینہ سے صحبت ہر دم   ٹک کبھو بیٹھو کس طالب دیدار کے پاس   (میر)

میرے آگے نہ دیکھ آئینہ   مری حسرت بھری نظر کو دیکھ   (مصحفی)

میر صاحب کا شعر زبان کے لحاظ سے کچھ زیادہ صاف اور ترکیب کے لحاظ سے کچھ زیادہ برجستہ نہین پھر اسمین وہ بیتابی اور بیقراری بھی نہین پائی جاتی جو شیخ مصحفی مرحوم کے شعر کا اصلی جوہر ہے۔ معشوق نہین معلوم کس خیال سے عاشق کے سامنے آئینہ بینی مین مصروف ہو جاتا ہے۔ عاشق اس بات کو گوارا نہین کر سکتا کہ اسکی موجودگی مین کوئی دوسری ہستی دیدارِ یار سے فیض یاب ہو۔ اور نہایت بیتابی کے ساتھ محوِ آرائش معشوق سے کہتا ہے کہ او ظالم تو میرے سامنے آئینہ کیون دیکھتا ہے اس وقت تو میری حسرت بھری نظر کو دیکھ۔ تیرا مطلب اسی سے پورا ہو سکتا ہے۔ حسرت بھری نظر کو دیکھنے کے دو مقصود ہین۔ ایک تو یہ کہ حسن کی قدر کرنا اہل نظر کا کام ہے۔ دوسرے یہ کہ صاحب حسن اپنے حسن کے اوصاف آئینہ دیکھکر معلوم نہین کر سکتا اس کے لئے پھر کسی حسرت بھری نظر کی ضرورت ہے۔

ربط صاحب خانہ سے مطلق بہم پہونچا نہ میر مدتون سے ہم حرم مین تھے پہ نامحرم گئے (میر)
ابتک حرم وصل سے محرم نہ ہوئے ہم کعبہ مین حجاب در و دیوار غضب ہے (مصحفی)

دونون کے یہان تصوّف کا ایک مسئلہ نظم ہوا ہے - میر صاحب کہتے ہین کہ ہم ایک مدت سے حرم مین تھے لیکن صاحب خانہ سے مطلق ربط پیدا نہ ہوسکا - آخر کار نامحرم ہی جانا پڑا اول تو یہان ربط پیدا نہ ہونیکی کوئی وجہ ظاہر نہین کی گئی - دوسرے حصول مقصد سے پہلے منزل کو کوشش وسعی سے قدم اُٹھالینا حقیقی جذبۂ محبت کے منافی ہے اس کے خلاف شیخ مصحفی کے الفاظ و معنی بجائے خود مستقل ہین صاحب خانہ کے بجائے حرم سے محرم نہ ہونا کسی دوسری دنیا مین پہونچادینے والا جملہ ہے - دوسرا مصرعہ جس تیور سے ادا ہوا ہے - اُس نے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہین رکھی - اور صاف ثابت کر دیا کہ مجردات تک رسائی حاصل کرنے کیلئے مادیات کا سہارا لینا خوفناک غلطی ہے - حجاب در و دیوار ایک ترکیب ہے منجملہ ان خوشگوار ترکیبون کے جو شیخ مصحفی کے کلام مین اکثر پائی جاتی ہین

یہ چند مثالین اس بات کا ثبوت دینے کے لئے کافی ہین - کہ میر صاحب اور شیخ صاحب کے میدان شاعری اور حدپرداز تخیل مین ذرہ بھر تفاوت نہین حالانکہ آزاد حب الوطنی کے جوش یا خدمت بزرگانِ خاص کے شوق مین غریب الوطن اور بیکس مصحفی کو میر تقی کے مقابلہ ہی نہین بلکہ بعض چھوٹے درجے کے شعرا کے سامنے بھی ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے حیرت ہے

شاید آزاد کا یہ خیال ہو کہ میر صاحب کے کلام کی بندشین چست اور ترکیبین درست ہین اور شیخ مصحفی مرحوم کا کلام ان اوصاف سے خالی ہے تو ہم چند ہم قافیہ اشعار درج کرکے حسن و قبح کا فیصلہ اہل نظر پر چھوڑتے ہین

درہمی حال کی ہے سارے مرے دیوان مین سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا (میر)
ہوش اڑ جائینگے او زلفِ پریشان تیرے لب پر آیا جو مرے ذکر پریشانی کا (مصحفی)

وہ بھی جانے کہ لہو رو کے لکھا ہے مکتوب ہم نے سرنامہ کیا کاغذ افشانی کا (میر)
ہم اسیرون کو قفس مین نہ ملا لطفِ فراغ شوق جی ہی مین رہا بال و پرافشانی کا (مصحفی)

شرمندہ ترے رُخ سے ہے رخسار پری کا چلتا نہین کچھ آگے ترے کبک دری کا (میر)
مردون کو جلاتی ہے ترے پاؤن کی ٹھوکر اس چال پہ مرتا ہے بجا کبکِ دری کا (مصحفی)

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت اسباب لُٹا راہ مین یان ہر سفری کا (میر)

کیا لطف مقام اُن کو جو مشتاق عدم ہین دل کوچ مین رہتا ہے ہمیشہ سفری کا (مصحفی)

کیا کہئے آہ جی کو قیامت ہے انتظار آتا نہ کاش وعدۂ دیدار درمیان (میر)
ہم روئے عیش دیکھ چکے روز حشر بھی یون ہی رہا جو وعدۂ دیدار درمیان (مصحفی)

دفتر نہین کہانی نہین مثنوی نہین کیا شرح سوز عشق کرون مین زبان نہین (میر)
اسکا یہی سبب ہے جو گرم فغان نہین اپنا تو اس چمن مین کوئی ہمزبان نہین (مصحفی)

عبارت خوب لکھی شاعری انشا طرازی کی وے مطلب ہی کم دیکھین تو کیجے مدعا حاصل (میر)
کسی نے کر لیا معلوم رازِ دل تو کیا حاصل مزا جب ہے کہ ہو چکیے ہی چُپکے مدعا حاصل (مصحفی)

زمین پر مین جو پھینکا خط کو کر بند بہت تڑپا کیا جون مرغِ پر بند (میر)
مرے سینے مین دل بیتا بیون سے پھڑکتا ہے مثالِ مرغ پر بند (مصحفی)

افسر امروہوی

تذکرۂ خندۂ گل

ظریف شاعرون کا تذکرہ

جس مین ۳۰۰ سو سے زاید اردو، فارسی کے ظریف شاعرون کے حالات، انکے لطایف وظرایف اور انتخابات کلام درج ہین ۔ یہ کتاب اردو مین اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے اور ہر صاحب ذوق کی لائبریری مین اسکا رہنا ضروری ہے۔ تنہائی مین اس سے بہتر مونس، حالت غم مین اس سے زیادہ کامیاب ذریعۂ تفریح اور اہل تحقیق کے لئے اس سے زیادہ مواد اس موضوع پر اور کہین نہین مل سکتا

حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات (قیمت مع محصولڈاک للعہ) — منیجر "نگار" لکھنؤ

سیّاح کی ڈائری

(موجودہ اکابر لکھنؤ)

اس سے قبل میں جب کسی کا شعر سنتا تھا، تو اپنے تاثر یا شعر کے اثر کے لحاظ سے شاعر کی ایک ذہنی تصویر قایم کر لیتا تھا اور جب تک اُسکو دیکھ نہ لیتا، اسی خیالی صورت کے ساتھ ساتھ اس کے کلام کا مطالعہ کرتا تھا، لیکن جب بعد کے تجربات نے ثابت کیا کہ ہندوستان کا شاعر اپنے "عالم شعر" سے بالکل علحدہ چیز ہوتا ہے اور اس کے اقوال سے کبھی اس کے حال و اعمال پر صحیح حکم نہیں لگایا جا سکتا، تو میں نے اس اصول پر کاربند ہونا ترک کر دیا اور دوسرا اصول بالکل اس کے خلاف یہ قایم کیا کہ "سب سے اچھا شاعر سب سے بُرا انسان ہے" ہر چند اس اصول کی بھی صحت پر مجھے وثوق تام نہیں ہے، لیکن یہ اتنا غلط بھی نہیں ہے، کیونکہ اگر سب سے اچھا شاعر سب سے بُرا انسان نہیں ہوتا تو کچھ ایسا زیادہ دلکش و پسندیدہ چیز بھی نہیں ہوتا کہ اس اصول کو کلیۃً غلط قرار دے دیا جائے۔

اول اول جب میں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا تو ان کے خیال کی رفعت اور جذبات کی اثیریت کو سامنے رکھ کر جو صورت میں نے اُن کی قایم کی، یہ تھی:-

"ایک نحیف الجثہ انسان (دماغی ترقی اور صحت جسمانی دونوں کا اجتماع کبھی میرے ذہن میں نہیں آتا) بڑی چمکیلی آنکھیں، داڑھی اگر ہوئی تو بالکل "مسترسل الشعر" قسم کی ورنہ چار ابرو کا صفایا۔ ہنستے کم ہوں گے لیکن باریک جلد کے نیچے ایک خاص قسم کا نورانی خندہ ہر وقت جھلکتا ہو گا، معاشر نہایت سادہ مگر پاکیزہ ہوگی، بہ لحاظ اخلاق کے یکسر عجز و فروتنی ہوں گے، بات بات پر آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہوں گی اور بہ حیثیت مجموعی ان میں ایک ایسی کشش ہو گی کہ انسان خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتا ہو گا، لباس بالکل مشرقی وضع کا ہو گا اور نمائش سے بالکل دور"

لیکن جب میں ان سے ملا تو مجھے کس قدر تکلیف ہوئی کہ وہاں ایک بات بھی میرے مزعومات کے مطابق نہ تھی۔ میں کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ شلوار پہنتے ہوں گے جو مرد کے لئے حد درجہ غیر شاعرانہ ملبوس ہے اور اونچا کوٹ جو پنجابی یونیفارم کا جزو غیر منفک ہے، استعمال کرتے ہوں گے، جسے کم از کم فلسفیانہ ذہنیت کا انسان کبھی پسند نہیں کر سکتا، ہر چند یہ ضروری نہیں کہ معمولی گفتگو بھی ایک شاعر کی شاعرانہ دلکشی رکھتی ہو، لیکن اس کا تو وہم بھی کبھی نہ گذرا تھا کہ وہ قیام کو کیام اور قہقہہ کو کہکہہ بولتے ہوں گے۔

وہ مجھ سے گفتگو کر رہے تھے اور میں حیران تھا کہ خدایا یہ اقبال دفعۃً اکبال کیسے بن گیا۔ آنکھیں چھوٹی اور بہت چھوٹی، جسم بیلوانی کے لگ بھگ فربہ و تربیت یافتہ، حقہ (محکّہ) کے غیر لطیف و کثیف استعمال کی کثرت سے کمرے کی ساری فضا بدبو سے لبریز، چہرہ کی ساخت نقشہ کی قطع و برید یکسر غیر دلچسپ اور عوایدمیں کوئی دلکشی نہیں ——

اس کے بعد بھی جب میں کسی شاعر یا بڑے انسان سے ملا تو سوائے ایک ٹیگور کے کہ وہ تو بیشک وہی نظر آیا جیسا میں نے سمجھا تھا، ورنہ سب کے

ہمیشہ اپنی ذہنی تصویر سے اس کو بالکل مختلف پایا، اور آخر کار میں نے قصد کر کے اپنی ذہنی مصوری کے اصول کو بدلدیا۔ اور آئندہ کے لئے یہ عہد کیا کہ جب کبھی کسی کا شعر سنوں گا، تو کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کروں گا کہ اس کا کہنے والا کون ہے، اور اگر یہ جاننے کے بعد میں، کوئی تصویر قایم کرونگا بھی تو بالکل اپنے تاثرات کے خلاف۔

لکھنؤ آنے سے قبل میں یہاں کے مشہور شعرا کا کلام دیکھ چکا تھا اور ان کی شکل و صورت، عادات و اخلاق کے متعلق بھی ایک حکم لگا چکا تھا، اس لئے میں بے چین تھا کہ کسی طرح ان سے ملوں، ان کی زبان سے ان کلام سنوں اور پھر اس کے مطابق اپنے "ذہنی مرقع" کی صحت کروں۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں ایک خیالی فہرست مرتب کر چکا تھا کہ مجھے کیا کیا دیکھنا ہے اور کس کس سے ملنا ہے، چنانچہ میں اپنے ذہن کی رفتار کے لحاظ سے جس کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتا، بغیر رعایت حروف تہجی کے حسب ذیل اسمار کی فہرست تیار کر چکا تھا

چھتر منزل۔ صفی۔ بٹیروں کی پالی۔ عزیز۔ محشر۔ آرزو۔ قیصر باغ۔ جالب۔ رحم علی ہاشمی۔ ممتاز حسین۔ عروج۔ آصف الدولہ کا امام باڑہ ناطق۔ احسن۔ بیلی گارد۔ ثاقب۔ نولکشور پریس۔ آسی۔ افسر۔ خان بہادر عین الدین سی ٹی مجسٹریٹ۔ فرنگی محل کا پل۔ گومتی ان کے کنوئیں کی برفی اور تحسین کی مسجد۔ جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا، اس فہرست میں بعد کو بہت کچھ حذف و اضافہ ہوا، لیکن میرے خیال کی جولانگاہ اول اول یہی تھی جو فہرست بالا سے ظاہر ہوتی ہے۔

صبح اول وقت میں اس ارادہ کی تکمیل کے لئے نکلنے ہی والا تھا کہ وہی پارک والے "لقیط"[1]، قسم کے دوست آگئے اور انہوں نے حدیقۃ الحیوانات کا ذکر کر کے جسے یہاں بنارسی باغ کہتے ہیں میری فہرست میں ایک نام کا اضافہ اور کر دیا۔ صبح کا وقت تھا، موسم بھی خوشگوار تھا، اس لئے انکی رہبری میں حضرت گنج کی مغربی معاشرت کی آبادی سے گزرتا ہوا اس وسیع مقام پر پہونچ گیا، جو بیک وقت مرغزار بھی ہے اور صحرا بھی، باغ بھی ہے اور خشک میدان بھی۔ وحوش وطیور کو ان کی طبعی حالت پر دیکھنے کا مجھے بہت شوق ہے اور ہرچند انسانی گرفت میں آنے کے بعد ان کی حقیقی وحشت و رمیدگی باقی نہیں رہتی، لیکن یہاں بڑی حد تک آزادی کے اسباب فراہم کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ شیروں کے لئے بھی تنگ کٹہرے کے ایک وسیع حصہ کو آہنی سلاخوں کے حصار سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ جہاں ان کے لئے نیستان، کوہستان اور پانی کے حوض بنا دئے گئے ہیں۔ یہاں کا سب سے زیادہ رومانی حصہ وہ قطعۂ زمین ہے جہاں یوکلپٹس کے سرو آسا کلہ افگن بلندی کی حد تک پہونچنے والے درختوں کا مختصر سا جنگل تھوڑی دیر کے لئے انسان کو تہذیب و تمدن کے تمام دل و دماغ تھکا دینے والے جذبات سے علحدہ کر کے ایک ایسی معصوم دنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں بغیر کسی معشوق کی موجودگی کے عشق کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

جب دھوپ تیز ہونے لگی اور واپس آنے کا خیال کیا تو میرے رہبر مجھے سنگ مرمر کی اس خوبصورت و خنک بارہ دری میں لے گئے، جہاں کسی وقت یہاں کے فرمانروا بیٹھتے ہوں گے لیکن اب صرف باغ کے مالی رونق افروز رہتے ہیں۔ یہیں ان کے دو دوست اور ملگئے جو اتفاق سے دونوں میرے یہاں درج رجسٹر تھے۔ ان کو میں اس وقت تک صرف آسی اور افسر کے نام سے جانتا تھا، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ انکا اصلی نام مجھ کو بتایا جائے، لیکن آرزو سے تقدیر نہیں پھرتی اور آخر کار ان دونوں کے نام (عبد الباری، اور حامد اللہ) جو غیر معمولی طور پر غیر شاعرانہ

[1] لقیط عربی میں اس بچہ کو کہتے ہیں جو کہیں اتفاق سے پڑا ہوا ملجائے۔

واقع ہوئے ہیں مجھے بتا ہی دیئے گئے۔ یہ گویا پہلا شگونِ بد تھا جو جانوروں کے مطالعہ سے فارغ ہونے کے بعد ان دو ثقیل اور سامعہ شکن نام رکھنے والے شاعروں کی صورت میں ظاہر ہوا ——— جناب آسی دوھرے بدن کے آدمی ہیں لیکن ادائیں ان کی سب اکہری ہیں (اکہری کا لفظ میں نے سادہ اور غیر مصنوعی کے معنے میں استعمال کیا ہے) خندہ رو[۱]، تبسم لب، قہقہہ پیشانی (گھوڑے کا ستارہ پیشانی ہونا اور بات ہے) انسان ہیں، آنکھوں میں شرارت آمیز حیا، چتون میں ہلکی سی متانت آغشتہ شوخی، رفتار میں خفیف سی لچک آ سا بکی، اور گفتار میں ہلکی سی شکریں حلاوت، سبھی کچھ ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی دیکھنے والے پر جو اثر پیدا ہوتا ہے اُسے ہم صرف "حلز دیت"[۲] سے تعبیر کر سکتے ہیں، جو ممکن ہے ان کی انتہائی سادگی و نیکی کا انعکاس ہو۔ قیافہ فی الجملہ ذہین ہے لیکن نگاہیں دوررس نہیں معلوم ہوتیں۔ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور سولہ سترہ سال سے لکھنؤ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں۔ باوجودیکہ تقریباً ربع صدی سے لکھنوی شعرا کے ہجوم میں اور لکھنوی شاعری کی محافل میں زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن ان کی شاعری کسی طرح یہاں کی آب و ہوا سے متاثر نہیں ہوئی اور ان کی غزلیں ان جذبات بلند کی حامل ہوتی ہیں جو یقیناً ان کو کاروبارِ زندگی و مشاغلِ حیات کو دیکھتے ہوئے حیرت میں ڈال دینے والی ہیں۔ لکھنؤ کے عام رواج کے مطابق یہ بھی غزل گا کر فرماتے ہیں، ہر چند اپنے پندار میں وہ بہت زبردست موسیقی پیدا کرتے ہیں اور آواز میں بھی وہ نزاکت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو "دشنام یار" کو بھی "طبع حزیں" پر گراں نہ گذرنے دے، لیکن قدرتی محرومی کا کیا علاج کہ نہ مردانہ لب و لہجہ باقی رہتا ہے نہ نسائی غنا پیدا ہوتا ہے اور اس لئے جس حد تک پڑھنے کا تعلق ہے غزل بالکل مخنث ہو کر رہ جاتی ہے۔ عام شعراء کی طرح انہیں اپنا کلام سنانے کی ہوس نہیں ہے، اس لئے میرے اصرار پر چند مختلف اشعار انہوں نے سنائے جن میں سے بعض مجھے اب بھی یاد ہیں۔

افسر میرٹھی ایک پستہ قد انسان ہیں اور غالباً فطرت کے مقصود کو شرمندہ کرنے والے نہیں ہیں۔ ایک قیافہ شناس کے لئے ان کے چہرہ کی ساخت اور اس کے خطوط میں کافی سامان مطالعہ مل سکتا ہے۔ میں صرف اس قدر سمجھ سکا کہ سرسری ملاقات میں ان کو سمجھ کر مطمئن ہو جانا خطرہ سے خالی نہیں۔ ان کی شگفتہ روئی اگر وہ واقعی عواید رسمیہ کی بنا پر ہو تو صحرا کے سراب سے زیادہ نہیں، لیکن ان کا وہ خندۂ بے اختیار بھی نہیں چھپتا، جب ان کا دل صداقت کے ساتھ اس پر مجبور کرے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کی آنکھیں فریدی قسم کی ہیں، یعنے ایک چھوٹی اور دوسری بڑی، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ رقبہ کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں، البتہ ایک کی ساخت مدور ہے اور دوسری کی مستطیل، اور اس طرح گویا اہرمن و یزدان دونوں ہر وقت ان کھڑکیوں سے جھانکتے رہتے ہیں۔ چونکہ میں ان کی بائیں جانب یعنے ان کے یزدانی حصۂ دماغ کی طرف تھا اس لئے مجھے ان کی اہرمنی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ آدمی بہت سلجھے ہوئے ہیں، اور کافی غور کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچنے کے عادی ہیں۔ ان کی شاعری بڑی حد تک "شب پرستانہ" قسم کی ہے مگر "شب رو" نہیں، آسمان، ستارے، کہکشاں، چاند، ان کے ذرائع پیام رسانی ہیں، اور مقصود شاعری "درسِ حیات"۔ ٹیڑھی میڑھی بحروں میں، ٹوٹے ٹوٹے شعر لکھنا ان کا خاص ذوق ہے، جس سے

---

[۱] اصل میں یہ لفظ خنداں رو ہے لیکن اکثر خندہ رو لکھتے ہیں اور اسی کو سامنے رکھ کر باقی دو لفظ اختراع کئے گئے ہیں۔

[۲] میں نے قصداً عربی کا نہایت ثقیل لفظ استعمال کیا ہے اگر کوئی شخص اس کا مفہوم جاننا چاہتا ہے تو لغت سے مدد لے

بعض جگہ "انجیلی" (Sublime) کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تغزل میں ان کی جذبات نگاری کے بعض شعر میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

واپسی کے وقت نولکشور پریس میں مرزا محمد عسکری بی۔ اے اور پریم چند کی زیارت ہوئی۔ مرزا صاحب یہاں کے شعبۂ اردو کے مہتمم ہیں اور باوصف ضعف و پیرانہ سالی کے پوری جوانانہ سرگرمی کے ساتھ تحریر و مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کا آخری علمی کارنامہ "تاریخ ادب اردو" ہے جو تقریباً ۸۰۰ صفحات کو محیط ہے۔ لکھنؤ میں مسلم اکاڈیمی کا وجود آپ ہی کی ذات سے قایم ہے، کیونکہ آپ ہر ماہ اپنے مکان پر ممبروں کو پر تکلف دعوت دیں اور نہ کوئی شرکت کے لئے مجبور ہو۔ ارادہ ہے کہ محض لطف دعوت کے لئے میں بھی عارضی ممبر بن جاؤں، کیونکہ یوں بظاہر ان سے امید نہیں کہ "مسافر نوازی" سے کام لیں، اکاڈیمی میں اس وقت تک بعض اچھے اچھے مضامین پڑھے جا چکے ہیں اور یہ سب نتیجہ ہے مرزا صاحب ہی کے شغف علمی کا۔ مرزا صاحب سرخ و سپید رنگ، باریک کترے ہوئے نقشہ کے انسان ہیں اور اس حد تک "صنادید عجم" کے آثار آپ میں نمایاں ہیں کہ بے اختیار جی چاہا کہ ایام خزاں میں ان کے "افسانہائے بہار" سنوں، لیکن ہم لوگوں میں جرأت اخلاق کا اس قدر فقدان ہے کہ ایام شباب کی معصیت کو شیوں کا بھی ذکر کرتے ہوئے شرماتے ہیں، حالانکہ جوانی نام ہے اسی "بے راہ روی" کا جو ہر قدم پر نشان لغزش چھوڑ جائے، اور اُس "شب روی" کا جو ہر رات کو ایک کہانی بنا جائے۔

پریم چند گورے رنگ کے شریف ہندو ہیں اور ایسی نورانی شکل رکھتے ہیں کہ اگر ان کی مونچھیں خالص ہندو قسم کی نہ ہوتیں تو میں انہیں مشورہ دیتا کہ وہ دارثی بن جائیں اور دین و دنیا دونوں سے "مرفوع القلم" زندگی بسر کریں، ہندی شعبہ کا انتظام ان کے سپرد ہے اور رسالہ "مادھری" کی ترقی انہیں کے مساعی کی ممنون ہے۔ پریم چند کی فسانہ نگاری ملک میں کافی شہرت و قبول حاصل کر چکی ہے، لیکن جب سے انہوں نے ہندی زبان میں لکھنا شروع کیا ہے، ان کی ذہنیت میں کافی تغیر ہو گیا ہے چنانچہ "چوگان ہستی" (ہندی ناول کا ترجمہ) دیکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جس قطویل بے جا کو اردو برداشت نہ کر سکتی تھی وہ ہندی میں کس آسانی سے مقبول ہو گئی اور وہ عصبیت جو انکی اردو فسانہ نگاری میں کبھی ایک افسردہ چنگاری سے زیادہ نمودار نہیں ہوتی تھی وہ ہندی میں کس طرح "شعلۂ ملتہب" بن گئی ہر چند پریم چند فارسی عربی سے بقدر ضرورت بھی آگاہ نہیں ہیں اس لئے اردو زبان پر ان کو وہ قدرت حاصل نہیں ہو سکتی جو سادہ فسانہ نگاری کو چھوڑ کر، کسی عمیق غور و فکر یا علمی و تحقیقی تحریر کے لئے درکار ہوتی ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انکا سادہ اسلوب ادا کافی دلکش ہے جس میں پلاٹ کا مقامی رنگ اور زیادہ دلچسپی پیدا کر دیتا ہے، تاہم مجھے حیرت اس امر پر ہے کہ وہ شخص جو اردو اس قدر صاف لکھنے کا عادی ہو ہندی میں پہونچکر اس قدر ثقیل ہو جاتا ہے کہ اور نہ صرف یہ بلکہ نصاب کی جو اردو کتابیں نولکشور پریس سے شایع ہوتی ہیں ان میں بھی سنسکرت کا عنصر غالب کر دیتا ہے۔ اردو کو عربی فارسی کی مشکل الفاظ سے پاک کرنے کا یہ مدعا تو نہ ہونا چاہئے کہ سنسکرت کے ثقیل الفاظ ان کے بجائے استعمال کئے جانے لگیں۔ ارادہ ہے کہ نولکشور پریس سے جو اردو کی نصابی کتابیں شایع ہوتی ہیں ان پر آیندہ تفصیل سے بحث کروں اور بتاؤں کہ وہ کس قدر اغلاط سے لبریز ہیں اور فرقہ وارانہ جذبات نے انہیں کس حد تک مسخ کر دیا ہے

یہاں اسوقت تین روزانہ اخبار جاری ہیں، ان میں سب سے قدیم ہمدم ہے جو پہلے جناب جالب دہلوی کی اڈیٹری میں نکلتا تھا اور اب چودھری رحم علی ہاشمی اس کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ جالب صاحب کا ہمدم سے علیحدہ ہونا شعبۂ انتظام کے اختلاف کی بنا پر ہوا ورنہ جالب صاحب کی پالیسی کبھی کوئی نہ تھی اور ہمیشہ اپنے آقا کی مرضی کے مطابق وہ اخبار چلانے کے عادی رہے ہیں۔ ہمدم سے علیحدہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنا ذاتی اخبار ہمت کے نام سے نکالا ہے لیکن چونکہ اس کی پالیسی وہی ہے جو نہرو رپورٹ کے مخالفین کی ہے اس لئے پبلک میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زیادہ مقبول ہونے کی توقع نہیں کی جاتی۔ جہانتک فن صحافت کا تعلق ہے جالب صاحب اپنی وسیع معلومات کی بنا پر اس وقت ایک بے مثل و بے نظیر صحافی ہیں، لیکن چونکہ ان کا طرز تحریر جوش و شوخی سے معرا ہے اس لئے ایک تنگ و محدود حلقہ کے علاوہ ان کا اخبار اور کہیں مقبول نہیں ہو سکتا۔ جالب صاحب کی ایک خصوصیت اور بھی عجیب و غریب ہے کہ باوجود عدم ادعائے شاعری کے وہ صرف اپنے تخلص ہی سے مشہور ہیں اور اس حد تک کہ اگر دفعتاً ان سے سوال کیا جائے تو شاید بغیر سوچے ہوئے وہ خود بھی اپنا نام نہیں بتا سکتے۔

ہمدم کے دوسرے اڈیٹر چودھری رحم علی ہاشمی ایک جوان العمر انسان ہیں، لیکن جوانی کی حرارت سے بالکل خالی۔ ان کی سنجدگی، نیکی، دھیما پن اس کمولت کا پتہ دیتا ہے جو لکھنؤ میں بچوں کی شرارت دور کرنے کے بعد افیون کے استعمال سے پیدا کی جاتی ہے۔ ہاشمی صاحب کے زمانہ میں ہمدم نے ترقی کی ہے جس کا سب سے بڑا سبب پالیسی کا تغیر ہے۔ ترتیب، حجم، دلچسپی اور طباعت کے لحاظ سے بھی قدیم روش میں کچھ تغیر ہوا ہے لیکن ایسا نہیں کہ دیکھتے ہی کوئی شخص

"گھبرا کے یہ کہدے کہ لو وہ آئے"

ذوق جدید و رواج حال کے مطابق دو کالم اس میں مزاح کے بھی ہوتے ہیں جو "دو باتوں" کے عنوان سے پہلے صفحہ میں درج ہوتے ہیں۔ "دو دو باتیں" لکھنے والے اک نوجوان شاعر ہیں، جو اس کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہیں۔ یہ شعر بھی اچھا کہتے ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں، آنکھیں بھی سرمگیں ہیں اور جسم بھی چھریرا۔ ۲۶×۲ تقطیع کا رکھتے ہیں، صورت سنجیدہ ہے لیکن طبیعت شوخ، دہانہ کی ساخت سے ظاہر ہے کہ کسی راز کے چھپانے کے اہل نہیں اور اس لئے دل کا معاملہ ان کے ساتھ کرنا خطرہ سے خالی نہیں، معلوم نہیں ان سے محبت کرنے والے کیونکر زندہ ہیں۔

تیسرا روزانہ اخبار حقیقت ہے، اس کے اڈیٹر اس قسم کے لوگوں میں ہیں جو غلطی سے ایک صدی قبل پیدا نہ ہو سکے تھے اور اب قدرت اپنی فروگزاشت کی تلافی اس طرح کر رہی ہے کہ ان کو زمانہ حال میں پیدا کر کے اڈیٹر بنا دیا۔ سعی و انہماک، صدق و خلوص کے ساتھ کسب معاش کرنا اور کسی کی محکومی اختیار نہ کرنا، یہ ہے نصب العین اس اخبار کا۔

ماہانہ رسائل میں صرف الناظر کے اڈیٹر جناب ظفر الملک سے ملنے کا اتفاق ہوا، یہ بیک وقت لیڈر بھی ہیں اور اڈیٹر بھی، مولانا بھی ہیں اور شہر کے قاضی بھی لیکن دبلاپن بالکل فطری ودیعت ہے، کسی اندیشہ و غم سے اس کا تعلق نہیں۔ بظاہر بہت متواضع و منکسر معلوم ہوتے ہیں "پس پشت" اور "باطن" کا حال خدا جانے۔ نگاہ نقد و نظر اس قدر بلند ہے کہ دنیا میں مشکل ہی سے کوئی چیز انہیں پسند آتی ہے۔ لیکن خود اپنی ذات کو اصول تبصرہ سے مستثنیٰ جانتے ہیں۔ سچ بھی انہیں کے اہتمام سے نکلتا ہے اور عبدالماجد صاحب دریا آبادی اس کے اڈیٹر ہیں۔ ان سے ملنے کا موقع نہیں ملا، مگر سنا ہے کہ ان کا دماغ کسی خاص کیفیت سے متاثر ہے اور ملنا بے سود۔ یہیں سے جناب مولوی صبغۃ اللہ صاحب اڈیٹر خادم الحرمین سے

ملاقات ہوئی۔ آپ خیر سے شاعر بھی ہیں اور شہید تخلص فرماتے ہیں۔ خصایل کے لحاظ سے صبغۃ اللہ کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے، جبکہ ومن احسن من اللہ صبغۃ کی نص قطعی موجود ہے، اللہ ان کو ہندوستان میں بیٹھکر حرمین کی خدمت کی ہمت عطا کرے اور مسلمانوں کو غور کرنے کی توفیق لطف فرمائے۔

لکھنؤ کے شعراء حال میں سے صرف چند کا نام خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے:۔ عزیز، صفی، محشر، ثاقب۔ جناب عزیز سے ملنے میں بہت دقت ہوئی کیونکہ آجکل محمود آباد میں قیام رہتا ہے۔ اتفاق سے چند گھنٹے کے لئے لکھنؤ آئے تھے کہ مجھے خبر مل گئی اور وہیں مکان پر جاکر قدمبوس ہوا۔ میں نے انہیں بھی ایک نحیف الجثہ انسان سمجھ رکھا تھا لیکن یہ بھی "ماشاء اللہ" نکلے۔ چہرہ کے گوشت نے خدو خال چشم و بینی کا بدنمائی کی حد تک احاطہ کر رکھا ہے اور نقشہ کی ذہانت معدوم ہوگئی ہے۔ چہرہ کی خشونت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندرونی خلش ہر وقت ایذا دیتی رہتی ہے اور وہ اپنی زندگی سے کچھ خوش نہیں ہیں۔ گفتگو میں نہ کوئی دلکشی ہے نہ کوئی عمق و ذہانت، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا دماغ شاعرانہ ہے، شعر اچھا کہتے ہیں اور تمام اصناف سخن پر پوری قدرت رکھتے ہیں، مضمون کی جستجو، الفاظ کی تلاش، تراکیب کی چستی، خیال کی حلاوت اور جذبات کی اثر انگیزی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں، شاگردوں کی بڑی جماعت رکھتے ہیں۔ جن میں سے رواں اور اثر کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جو خود اپنی اپنی جگہ استادانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

صفی، معمر شخص ہیں اور غیر "شاعرانہ" حد تک زار و نحیف۔ عجیب بات ہے کہ میں نے ان کی شاعری سے اُن کے "عظیم الجثہ" ہونے پر حکم لگایا تھا، لیکن "یہ" بالکل "وہ" نکلے۔ نہ طبیعت میں شگفتگی، نہ چہرہ پر رونق، نہ اداؤں میں دلبستگی، نہ گفتگو میں جاذبیت، الغرض دنیاوی انسان ہونے کے لحاظ سے وہ صفر کا درجہ رکھتے ہیں، اور ایک ایسی غیر جمالیاتی فضا ان کے چاروں طرف محسوس ہوتی ہے کہ اگر قدرت نے شعر گوئی کا ملکہ نہ دیا ہوتا تو شاید ہی کوئی شخص .... مگر سنا ہے کہ آدمی نیک ہیں اور اخلاق و اطوار بھی غیر پسندیدہ نہیں رکھتے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کو مرتبہ استادی حاصل ہے اور لکھنؤ کے جدید دور کے شعراء میں وہ خاصی قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے، ان کے کلام کی سادگی، شگفتگی، یقیناً قابل ستائش ہے، لیکن انہوں نے قومی شاعر بننے کی کوشش میں اس خصوصیت کو ایک حد تک مجروح کر دیا ہے اور ممکن ہے کہ ان کے قومیات شعری کسی طبقہ میں کچھ چیز سمجھے جاتے ہوں، لیکن میں ان کو اس جوش سے بالکل معرّا پاتا ہوں جو قومی نظموں کو غزلوں سے متمایز کر دیتا ہے۔ ان کی بڑی معرکۃ الآرا قومی نظم "وقت آنے دو وقت آنے" واہی ہے، لیکن اسمیں ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں جس کے اندر شعلہ تو کیا کوئی چنگاری ہی راکھ میں دبی ہوئی مل جائے۔ مثنوی کہنے کا بیشک انہیں خاص سلیقہ حاصل ہے اور اسی میں ترقی کرنا انکی کامیابی ہے اگر وہ سمجھیں۔

اب محشر کا وہ ہنگامہ نہیں ہے جو پہلے کسی وقت تھا، لیکن خیر بعض بعض شعر اب بھی کہہ جاتے ہیں اور سنا ہے کہ آدمی بُرے نہیں۔ مجھ سے صرف ایکبار چوک میں سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہاں کے کوئی عطر فروش ہوں گے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ جناب محشر آپ ہی ہیں، خود ان کی زبان سے ان کے کلام سننے کا فخر مجھے حاصل نہیں ہوا، اور نہ اس کے لئے میں زیادہ بیتاب تھا۔

جناب ثاقب آج کل مہاراجہ صاحب محمود آباد کے بعض صاحبزادگان کے اتالیق ہیں۔ اور اپنی خدمات کی انہماک کیوجہ سے شعر و شاعری

کی جانب زیادہ توجہ نہیں کر سکتے۔ آدمی بہت نیک، خوش اخلاق، متواضع و منکسر مزاج معلوم ہوتے ہیں، اور چہرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام شعرا کی طرح ان کا باطن بمقابل ذکر نہیں ہے۔ ان کے شعروں کی خصوصیت یہی ہے کہ ابتذال کہیں نہیں ہوتا اور خیال بھی عام سطح سے بلند ہو کر اچھوتی چیز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عروج جو یہاں دولھا صاحب کے نام سے مشہور ہیں، خاندان انیس کے باقیات الصالحات میں سے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ خوب کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ ہر چند ضعیفی سے کمر جھک گئی ہے اور تمام وہ علامات شیب جو انسان کو آدمی سے خدا جانے کیا بنا دیتے ہیں انمیں پوری طرح نمایاں ہیں، لیکن جب وہ ممبر پر پہونچتے ہیں تو دفعۃً ایسا تغیر ان میں پیدا ہوتا ہے جیسے کوئی اچانک نشہ سے چونک پڑے اور خطابت کے تمام حرکات پوری قوت کیساتھ رونما ہونے لگتے ہیں۔

جناب احسن لکھنوی جو اپنی ڈرامہ نگاری کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہیں، غزلگوئی کے لحاظ سے کوئی مرتبہ رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن بہ حیثیت انسان ہونے کے وہ ضرور خاص چیز ہیں۔ طبیعت بہت غیور پائی ہے، اور سب سے الگ بے لاگ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ باوجود عمر رسیدہ ہونے کے اب بھی ان کی جوانی کا بانکپن ان کے اعضاء سے ظاہر ہے اور مخصوص حلقۂ احباب میں اب بھی ان کی شگفتگی و زندہ دلی دیکھنے کی چیز ہوتی ہے، موسیقی سے خاص لگاؤ ہے اور ہارمونیم اچھا بجاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی جس لطف سے بسر کی ہے، وہ شاید یہاں کے کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو، اور اب بھی جس نفاست و پاکیزگی اور جس سلیقہ کے ساتھ وہ رہتے ہیں اس کا نشان بھی دوسرے شاعروں میں نہیں پایا جاتا۔

یہاں کے شیعی طبقہ کے صحافیوں میں صرف ایک سید ممتاز حسین صاحب عثمانی اڈیٹر اودھ پنچ قابل ذکر ہیں۔ ہر چند موجودہ اودھ پنچ کا موازنہ سجاد حسین کے اودھ پنچ سے کرنا مضحکہ خیز سی بات ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنؤ میں سوائے ممتاز حسین صاحب کے اودھ پنچ کی روایات قدیمہ کی یاد کو تازہ رکھنے والا کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا۔ آدمی پڑھے لکھے ہیں، وسیع المطالعہ ہیں، اور ہر چند انکی وضع و صورت اور گفتگو سے کبھی کسی کو یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ بیجانہ رنگ کے انسان ہوں گے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ ایسے ہی ہیں اور بعض اوقات ان کا قلم ایسے نقوش چھوڑ جاتا ہے کہ بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔ میں اس سلسلہ میں ان واقعات کو بیان کرنا پسند نہیں کرتا جو انکی عصبیت کے ثبوت میں مجھ سے بیان کئے گئے، کیونکہ اگر وہ صحیح ہوں تو بھی جہاں تک پنچ اور پنچین (کوئی صاحب اسے کچھ اور نہ پڑھ لیں) کا تعلق ہے ان کی تعریف ہی کی جائے گی۔

میں ان سے ملنے کے بعد جائے قیام پر واپس آیا ہی تھا کہ میرے ایک دوست کا تار آیا جسمیں انہوں نے مجھے ایک ضروری مسئلہ طے کرنے کیلئے دہلی فوراً طلب کیا تھا، اس لئے میں بغیر تکمیل پروگرام کے لکھنؤ چھوڑ رہا ہوں۔ اگر زندگی رہی تو پھر کسی وقت حاضر ہونگا، لیکن محرم کا زمانہ بچا کے تاہم دہلی پہونچکر مجھے یہاں کے اس مشاعرہ کا حال ضرور لکھنا ہے جس میں شرکت کا فخر مجھے حاصل ہوا تھا اور اسی سلسلہ میں لکھنوی شاعری کی موجودہ ذہنیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرونگا، خواہ اس کے بعد مجھے "ناد علیاً" کا حصار ہی کیوں نہ اپنے گرد کھینچنا پڑے

ازدواج مکرر

(بسلسلۂ سابق)

(۵)

ہر وہ شخص جو ذکی کی جگہ اپنے آپ کو فرض کرے، بہ آسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ صفیہ کی اس انتہائی صفائی اخلاق سے اس کو کس قدر صدمہ پہونچا ہوگا اور صفیہ کے اعلان کے بعد دنیا نے ذکی کو کیا سمجھا ہوگا۔ ذکی کو صدمہ اس امر کا نہ تھا کہ اس کی بیوی کی وہ ہستی جو اس نے انتہائی سعی اور انہماک کے بعد خود اپنے ادیب دماغ سے پیدا کی تھی، صفیہ کی تحریر سے فنا ہو گئی، بلکہ اس کو برہمی اس امر کی تھی کہ دنیا نے اس جذبہ کو بالکل عریاں دیکھ لیا۔ انسان غلطی کرنے کے بعد دنیا کو فریب میں مبتلا رکھنا پسند کرتا ہے، لیکن یہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ دنیا پر اس کی غلطی ظاہر ہو جائے۔ اگر ذکی غور کرتا تو اس کو صفیہ کا ممنون ہونا چاہئے تھا کہ اس کی کارگاہ فریب جس کا نتیجہ یقیناً اچھا نہ ہوتا جلد درہم برہم ہو گئی لیکن اس نے صفیہ کی اس پاکبازی اور علوئے اخلاق کو حد درجہ غیر وفا شعاری بلکہ غداری سے تعبیر کیا اور انتہائی غم و غصہ کے عالم میں اس سے علیحدہ ہو گیا۔

وہ جس وقت کلکتہ پہونچا تو اس کا مقصود صرف یہ تھا کہ چند دن رہنے کے بعد یہاں سے کسی اور جگہ چلا جائے گا، لیکن بدبختی کہیئے یا خوش بختی کہ اس نے قیام کیا وہاں کے ایک ایرانی خاندان میں اور ان لوگوں کی خاطر مدارات نے ایسا گھر کا سا سکون پیدا کر دیا کہ وہ اپنے اضطراب میں کچھ کمی محسوس کرنے لگا اور جس وقت شمسہ (جو حقیقتاً اس خاندان کی مہر نیمروز تھی) انتہائی بے تکلفی کے ساتھ صبح کو اپنی نرم و شیریں آواز میں ''آفندم، آفندم ذکی'' یا ''آقایم'' یا ''آغا ذکی'' کہکر اس کے کمرہ کے دروازہ پر دستک دیتی تو اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے برفباری کے زمانہ میں کوئی گرم شعاع سینہ سے گذر کر دل تک پہونچ رہی ہے اور وہ زندگی کی کسی نئی لذت سے آشنا ہو رہا ہے۔

شمسہ اپنی تعلیم کے لحاظ معمولی چیز تھی، لیکن چونکہ ہندوستان کے ہر شخص کو فارسی بولنے والی عورت خواہ وہ کتنی ہی جاہل کیوں نہو زردشت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے، اس لئے جب کبھی ایرانی تہذیب کے مطابق وہ ''جانم فدایت'' یا ''قربانت شوم'' کے فقرے استعمال کرتی تو ذکی ہمہ تن عالم شعر و موسیقی میں غرق ہو جاتا اور ایسا محسوس کرتا کہ وہ اس سے بہت کمتر درجہ کا انسان ہے۔ اس دوران میں بارہا ذکی نے روانگی کا خیال ظاہر کیا، لیکن جس وقت وہ اس کے جواب میں شمسہ کے میگوں لبوں سے ''اقبالت مستدام، سرکار این چہ می فرمائید'' سن لیتا تو اس کے اعصاب میں استرخائی کیفیت پیدا ہو جاتی اور وہ پھر اسے ''فدویانہ'' نگاہوں سے دیکھ کر اس طرح خاموش ہو جاتا، گویا قوت گویائی اس سے چھین لی گئی ہے۔

ذکی فارسی اچھی جانتا تھا، بے تکلفی سے بول سکتا تھا اور ذوق شعری کے لحاظ سے وہ یقیناً بہت بلند چیز تھا، لیکن شمسہ کو دیکھتے ہی اس کی طلاقت لسانی اور اس کی ادبیت سب کافور ہو جاتی تھی اور وہ حقیقی معنے میں بالکل عجمی (گونگا) بنکر رہ جاتا تھا۔ ہر چند کسی قسم کا لگاؤ اُسے شمسہ سے نہیں پیدا ہوا تھا، لیکن اس کی معیت میں وہ اپنے آپ کو بالکل نئی دنیا میں پاتا تھا اور تھوڑی دیر کے لئے اپنی گذشتہ معصوم زندگی کو

یاد کرکے کبیدہ خاطر ہو جاتا۔ شمسہ کا اصلی وطن تو طہران تھا لیکن اس کا باپ بہ سلسلۂ تجارت کلکتہ آیا تھا اور پھر اس کو ایران واپس جانے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے یہیں ایک ایرانی خاندان میں شادی کی جس سے شمسہ پیدا ہوئی۔ تجارت میں جب وہ کامیاب نہ ہوا تو اس نے ریلوے کے دفتر میں ملازمت کر لی، اور اپنے مکان کا ایک حصہ لوگوں کے قیام کے لئے مخصوص کر دیا۔ وہ قیام و طعام وغیرہ کے جملہ مصارف دس روپیہ روز کے حساب سے لیتا تھا اور چونکہ شمسہ کی ماں ضعیف ہو گئی تھی اس لئے گھر کا سارا انتظام مہمانوں کی نگہداشت، خاطر مدارات، سب شمسہ ہی کے سپرد تھی جسے وہ ایک یہودی خادمہ کی مدد سے پوری ذہانت کے ساتھ انجام دیتی تھی۔ یہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ شمسہ تعلیم کے لحاظ غیر معمولی چیز نہ تھی لیکن اپنی ذہانت کے اعتبار سے یقیناً وہ [illegible] تھی۔ فارسی تو خیر اس کی مادری زبان ہی تھی۔ لیکن اردو میں بھی اسے ایک ادیبانہ ذوق حاصل تھا اور فارسی کی طرح اردو کے بھی اسے اچھے اچھے شعر یاد تھے، جنہیں وہ برجستگی کے ساتھ استعمال کرتی تھی اور یہی ایک چیز ایسی تھی جس نے اس کی تہذیب و شائستگی، اس کی خوش ادائی، اس کی شیریں گفتگو اور سب سے زیادہ "بادۂ سرجوش" کی طرح اس کے بھرپور شباب کے ساتھ مل کر ذکی کے لئے کافی اسبابِ تباہی پیدا کر دیئے تھے اور اگر اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ اس قدر محتاط و سنجیدہ نہ ہوتا اور کبھی کبھی صفیہ کا خیال اس کے کرب و ملال میں اضافہ نہ کر دیا کرتا تو غالباً وہ شمسہ کی دعوتِ شگفتگی کو اس سے بہت پہلے قبول کر لیتا۔ لیکن اس کی چوٹ سخت تھی اور تازہ اس لئے ابھی تک اس کی متشائم کیفیت دور نہیں ہوئی تھی اور اگر کہیں وہ شگفتگی کی طرف مائل ہوتا بھی تو دفعتہً اس کو ماضی کا خیال آجاتا اور مضمحل ہو کر رہ جاتا۔

اول اول جب ذکی نے یہاں آکر قیام کیا تو شمسہ کی طرف سے سوائے معمولی اور رسمی مدارات کے کوئی خاص توجہ صرف نہیں کی گئی، لیکن جب اس کو معلوم ہو گیا کہ دولت کے لحاظ سے وہ ایک رئیس کی حیثیت رکھتا ہے تو پھر شمسہ کی تمام تابناکیوں کا مرکز سوائے ذکی کے اور کوئی نہ رہا۔ اس نے اپنی خلوت و جلوت، اپنی صبح و شام اپنی زیبائش و آرائش، ذکی کی تالیف کے لئے وقف کر دی اور غلط بیانی ہوگی اگر کہا جائے کہ ذکی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ لیکن پورے استحکام کے ساتھ اپنے مرکز سے ہٹتا جا رہا تھا اور جس وقت رات کو وہ خیر باد یا شب بخیر کہہ کر رخصت ہونا چاہتی تو بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ ہاتھ پکڑ کر اس کو بٹھا لے اور کچھ دیر اور اس کی باتیں سنتا رہے۔ لیکن اس کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ مسکراتی ہوئی، اپنے لچیلے بدن میں ناگن کے سے بل ڈالتی ہوئی، آخری مرتبہ دروازہ کھول کر انتہائی شوخی کے ساتھ اسے جھانکتی اور غائب ہو جاتی۔

یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ اگر ذکی کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کبھی کا دفترِ تدبیر و مصلحت کو "غرقِ مے ناب" کر چکا ہوتا، لیکن گذشتہ ایک ربع صدی کی راسخ صلاحیت جو ذکی کو وراثت و تربیت کے ذریعہ سے حاصل ہوئی تھی یوں دفعتہً نہیں ٹوٹ سکتی تھی۔ رات رات بھر اسکو یہی سوچتے گزر جاتی تھی کہ آخر یہ بے معنی زندگی کب تک بسر ہو سکے گی، اور اس رہبانیت کا نتیجہ کیا ہے، لیکن آخر میں کامیابی اس کے اخلاق ہی کو ہوتی تھی، یہاں تک کہ جب شمسہ صبح کو اس کے لئے چائے کا سامان لاتی تو کبھی کبھی اس کے تیور بالکل اجنبی سے محسوس کرنے لگتی لیکن اس نے بھی ایک عزم کر لیا تھا اور وہ پھر اس کو اسی نقطہ پر کھینچ کر لے آتی جہاں روزانہ اسے چھوڑ کر جاتی تھی

ایک دن، موسم بہت خوشگوار تھا، سامنے دریچہ سے نارنج کی خوشبو کمرہ کو معطر کئے ہوئے تھی اور شاما کا جوڑا صحنِ باغ کے گلاب پر آ آ کر اپنی مست و شیریں آوازوں سے ذکی کے دل میں ہر مرتبہ ایک نیا ولولہ پیدا کر جاتا تھا۔ وہ دیر سے فلسفۂ حیات پر غور کر رہا تھا اور اس نتیجہ پر پہنچ رہا تھا کہ کہیں

حیات و نشاط ایک ہی چیز کے دو نام تو نہیں ہیں، مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ "درِ توبہ ابھی بند نہیں ہوا" اگر ایک طرف دعوت و تبلیغ کا نہایت غایر فلسفہ اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے، تو دوسری طرف اس میں نوید معصیت بھی شامل ہے اور ایک انسان اپنے ذوق و میلان کے لحاظ سے حسب ضرورت جس پہلو کو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اس وقت ذکی کی رفتار خیال دوسرے پہلو کی طرف مائل تھی اور صرف "تجربہ و جستجو" کے بہانہ سے وہ ایک بار اپنے آپ کو ماحول کے سپرد کر دینا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت شمسہ آگئی اور ایسے غیر معمولی بانکپن کے ساتھ کہ غریب ذکی کی وہی حالت ہوگئی جیسے کوئی شخص ساحل سے پھسل رہا ہو اور پشت سے کوئی دھکا دیدے۔ آج شمسہ کی اٹھارویں سالگرہ تھی اور اہتمام کے لحاظ سے بھی واقعی اٹھارویں تھی، سر سے لیکر پاؤں تک رنگ و ریشم، عطر و خوشبو میں لپٹی ہوئی تھی، معلوم ہوتا تھا وہ کوئی تیتری ہے جو رات بھر پھولوں میں بسا کر صبح کو چھوڑ دی گئی ہے۔ وہ مذہباً گبر تھی اور آتش پرست لیکن آج تو وہ اپنے مذہب کی خدا یکسر شعلۂ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی اٹھلاتی ہوئی اندر آئی اور بے اختیار ذکی کے منھ سے نکل گیا:-

چہ آتشے ست کہ بر جان ما نہادی باز

اس نے بڑھ کر ذکی کے دامن کو بوسہ دیا اور بولی:-

"مگر نشنیدہ —

اگر بہ سوزدت اے دل ز درد نالہ مکن

دم از محبت او میزن و بدرد بساز"

ساحل چھوٹ گیا تھا، ذکی کے قدم اکھڑ چکے تھے، سیلاب نے اسے گھیر لیا تھا، اور وہ ایک ایسے عالم میں جسے مدہوشی سے زیادہ بیہوشی کہنا زیادہ موزوں ہے شمسہ کے قدموں کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس نے شمسہ کا دامن تھام لیا اور انتہائی شیفتگی و ربودگی کے عالم میں کہہ اٹھا:-

"بہر کمند کہ خواہی بگیر و بازم بند"

شمسہ نے شوخی سے فوراً دوسرا مصرعہ پڑھ دیا کہ:-

"بشرط آنکہ ز کارم نظر نہ گیری باز"

اس سوال جواب سے ذکی اس وقت اپنے آپ کو جہانگیر اور شمسہ کو نورجہاں سمجھ رہا تھا، اور شام ہونے سے قبل حقیقی معنی میں وہ جہانگیر ہو گیا تھا اور شمسہ نورجہاں

(۶)

گذشتہ واقعہ کو ایک ماہ سے زیادہ زمانہ گذر گیا ہے اور ذکی نے ایک علحدہ کوٹھی شمسہ کے قیام کے لئے لے لی ہے۔ باپ کی جمع کی ہوئی دولت بیدردی کے ساتھ صرف ہو رہی ہے اور سوسائٹی میں شمسہ خانم کا وجود جذب مرکزی پیدا کرتا جا رہا ہے، رولس کار سواری کے لئے، زر کار پردوں اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ مکان رہنے کے لئے، متعدد خادموں کی جماعت خدمت کے لئے۔ اسکاٹ لینڈ کی بہترین شراب لطف زندگی کیلئے اور بنک کی چیک بک ہر اس آرزو کی تکمیل کے لئے جس کا خیال بھی کبھی شمسہ کے دل میں نہ آسکتا تھا، اس کے پاس موجود تھی اور ذکی جس کو اپنی زندگی

میں اول مرتبہ یہ معلوم ہوا تھا کہ دولت اپنے اندر کیسے کیسے اسباب لذت و تفریح پنہاں رکھتی ہے، پانی کی طرح شمسہ کے قدموں پر بہا رہا تھا، اور سمجھتا تھا کہ شاید ابھی تک وہ اس نیم نگاہ کی بھی قیمت نہیں ادا کر سکا جو شمسہ اس پر کبھی کبھی صرف کر دیتی ہے۔ وہ خود بھی تمام اصول اخلاق و احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر آزادی کے ساتھ ہر اس عشرت میں شریک تھا جس کی طرف کبھی اسکا ذہن بھی منتقل نہ ہوا تھا۔ اور جس وقت وہ نشۂ شراب میں شمسہ کے التفات پر نگاہ کرتا تو اس کے اندر جذبۂ ایثار اور زیادہ قوی ہو جاتا اور بے اختیار ہو کر پوچھ بیٹھتا کہ "میں کیونکر تمہارے اس احسان سے عہدہ برآ ہو سکتا ہوں"۔ شمسہ نہایت ہوشیاری سے اس کے ان جذبات کا مطالعہ کر رہی تھی اور آخر کار ایک دن جب کہ وہ پوری طرح اثرِ حسن و شراب سے متاثر ہو رہا تھا اس نے پوری لگاوٹ کے ساتھ اپنا وہ آخری حربہ استعمال کیا جس سے آسمان و زمین میں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ عورت جب تک عالم عشق و محبت میں ہے، خواہ وہ ہنسے یا روئے، یکساں طور پر دل ڈبو دینے والی ہے، لیکن اگر وہ صرف محبت کی تمثیل کر رہی ہے تو غنیمت سمجھو جب تک وہ ہنستے کھیلتے تمہاری زندگی کو پر لطف بنا رہی ہے، ورنہ عورت کا وہ آنسو جو مکر و فریب کا نتیجہ ہوتے ہیں، ایک زبردست سیلاب اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی شخص ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ اس وقت تک ذکی کی زندگی شمسہ کے ساتھ یکسر باغ و بہار کی طرح بسر ہوئی تھی، اور وہ بالکل بھول گیا تھا کہ دنیا میں رنج و ملال کس کو کہتے ہیں، طرب و نشاط کا وہ دلفریب منظر جو تھوڑی دیر کے لئے انسان کو خدا بنا دیتا ہے، ذکی کے دل و دماغ پر اس طرح چھا گیا تھا کہ اس کا ردِّ عمل حد درجہ خطرناک ثابت ہوتا۔

رات کا وقت تھا، دریچوں سے ہلکی ہلکی خنک و معطر ہوا وِسکی کی ایک پوری بوتل سے چکر کھانے والے دماغ کو اور آسمان پر اڑائے لئے جا رہی تھی، ذکی پر ایسی مستی و سرخوشی کا عالم طاری تھا کہ اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا اور شمسہ زیبایش و آرایش کے اس بانکپن کے ساتھ جو کبھی اس میں پیدا نہ ہوا تھا، اپنی تمام نسائی لطافتیں و عنایتیں اس پر صرف کر رہی تھی کامیاب محبت کی باتیں مزے مزے سے ہو رہی تھیں کہ دفعۃً شمسہ ذکی کی آغوش سے علیحدہ ہو کر کچھ سوچنے لگی اور پھر صوفا کے ایک جانب گردن ڈال کر رونے لگی۔ ذکی جس کی جدید حیات نشاط میں یہ بالکل پہلا تلخ منظر تھا، گھبرا گیا، پہلے تو چند منٹ تک شمسہ نے کوئی جواب ہی نہیں دیا لیکن جب اِدھر سے اصرار و اضطراب کی حد ہو گئی تو آنسو پونچھتے ہوئے یا یوں کہئے کہ رومال میں "عطر فتنہ" جذب کرتے ہوئے اٹھی اور بولی:۔ "حیران ہوں کہ آپ کی ان غیر معمولی عنایتوں کو شکریہ کیوں کر ادا ہو سکتا ہے۔ آپ نے جو عزت مجھے دی، وہ میرے خواب و خیال سے زیادہ ہے اور میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ مجھے اب آپ کو زیادہ تکلیف دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، جب تک میں اپنے آپ کو بھی خدمتگذاری کی اہل نہ ثابت کر دوں"۔

ذکی خواہ کتنا ہی آلودۂ عصیاں ہو لیکن چونکہ اس کی فطرت صالح تھی اس لئے شمسہ کے اخلاق کا اس نے یہ زبردست ثبوت دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا، اور بولا:۔

"شمسہ یہ کیا کہہ رہی ہو۔ اگر تمہیں خدمت کرنے پر آ جاؤ گی تو پھر دنیا میں مخدوم بنکر کون رہیگا، اور پھر یوں بھی جو تمہارے فرایض ہیں ان کو اس قدر تکمیل کے ساتھ انجام دے رہی ہو کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں"۔

شمسہ:۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ چند دن میں بہت بیکار روپیہ میرے اوپر ضایع ہوا اور میں چاہتی ہوں کہ اس کی تلافی کی جائے۔ پہلی صورت تو

یہ ہے کہ غیر ضروری مصارف کم کر دیئے جائیں اور جو اس وقت تک صرف ہو چکا ہے اسکو کسی نئے طریقہ سے حاصل کیا جائے"

ذکی:۔ "اس کی کیا صورت ہے"

شمسہ:۔ "آپ کو معلوم ہے کہ تجارت میرا خاندانی و آبائی پیشہ ہے اور اسی میں ترقی کرنا میرا نصب العین رہا ہے، مجھے اس میں کافی تجربہ حاصل ہے اور کلکتہ کے بازار کا جس قدر غایر مطالعہ میں نے کیا ہے کوئی نہیں کر سکتا۔ کل ہی جو خبر مجھے معلوم ہوئی ہے، وہ اسقدر کامیابی کی ہے کہ اگر دو لاکھ روپئے میرے پاس ہوتے تو چند دن میں آپ کو یہاں کا "ملک التجار" بنا دیتی —— اور ——"

ذکی:۔ "دو لاکھ روپیہ نقد تو موجود نہیں ہے، لیکن اس کی فراہمی زیادہ دشوار بھی نہیں۔ اگر تم ایک ہفتہ کی مہلت دو، تو میں جائداد مکفول کر کے لا سکتا ہوں"

شمسہ:۔ یہ سنکر کچھ خاموش ہوئی اور بولی کہ "نہیں یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا، اچھا اس خیال کو جانے دیجئے۔ میری ہزاروں آرزوئیں پوری ہو چکی ہیں، ایک پوری نہ ہوئی تو کیا۔"

یہ کہکر اس نے افسردگی کے ساتھ ٹھنڈی سانس لی اور ایک طرف گردن ڈالکر خاموش ہو گئی۔

ذکی جس نے اس وقت تک شمسہ کو ملول و حزین دیکھنے کی تکلیف برداشت نہیں کی تھی، بیتاب ہو گیا اور اس خیال سے نہیں کہ وہ ملک التجار ہو جائے گا، بلکہ صرف اس بنا پر کہ اس طرح شمسہ کی تمنا پوری ہو گی، وہاں سے اٹھا اور جلدی جلدی اسباب سفر درست کر کے اسٹیشن پہونچا اور دوسرے دن ایک ہندو مہاجن سے گفتگو کر کے چوتھے دن دو لاکھ کی رقم شمسہ کے نام سے بنک میں جمع کر دی اور بنک کی کتاب مع چک بک کے اس کے آغوش میں جا کر ڈالدی۔

(۵)

اس واقعہ کو پندرہ دن گزر چکے ہیں اور ذکی نے شمسہ کے طرز عمل میں بظاہر اس سے زیادہ کوئی تغیر محسوس نہیں کیا کہ وہ بہ نسبت پہلے کے گھر سے زیادہ غیر حاضر رہنے لگی ہے۔ ایک آدھ بار اس کا ذکر آیا بھی تو اس نے تجارتی تدابیر کا بہانہ کر کے ٹالدیا اور یہ بھی خاموش ہو رہا لیکن اس کے ساتھ یہ امر ضرور ذکی کے لئے باعث تکلیف ہوتا جا رہا تھا کہ اس کے احباب کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور بہ نسبت پہلے کے تحائف و ہدایا کی تعداد میں بھی خاصہ اضافہ نظر آتا ہے ذکی فطرتاً رشک کرنے والی طبیعت نہ رکھتا تھا یا یوں کہئے کہ جب تک شمسہ نے اپنی تمام دلداریاں صرف اسی کے لئے مخصوص رکھیں، اس نے پرواہ نہیں کی کہ کون آتا ہے اور کون جاتا ہے لیکن جب اس کی توجہ بٹی تو اس کو بھی اس کا احساس شروع ہوا، اور نہایت ہی مخفی قسم کے برہمی کے آثار اس کے چہرہ سے ظاہر ہونے لگے۔

پہلے شمسہ کو دونوں وقت ذکی کے ساتھ کھانا کھانا لازم تھا، لیکن اب رات کا کھانا وہ مستقلاً باہر کھانے لگی تھی اور اگر کبھی ذکی نے اس کی شکایت کی تو ہنسکر ٹالدیا، یا اپنے افسوں کا اثر قایم رکھنے کے لئے چلتے چلتے ایک آدھ غمزہ صرف کر دیا۔

کامل ایک ماہ تک ذکی شمسہ کی حالت کا مطالعہ کرتا رہا اور اس کی اجنبیت کو جس میں روز بروز کچھ نہ کچھ اضافہ ہو رہا تھا بغور دیکھتا رہا۔ ایک شام جبکہ وہ باہر جانے کے لئے بہترین ملبوس اور اپنے تمام قیمتی زیور نکال رہی تھی، ذکی آہستہ آہستہ اس کے کمرہ میں گیا اور بولا "شمسہ

مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، تھوڑی سی شکایت کرنا ہے، تم کپڑے پہنتی رہو، میں آڑ سے کہتا رہوں گا اور تم جواب دیتی رہنا" شمسہ نے جو کسی زیور کے نہ ملنے سے جھنجھلا رہی تھی، غضب آلود نگاہوں سے ذکی کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

ذکی نے پھر اس کو مخاطب کیا لیکن اس استفسار کے ساتھ کہ "آج کہاں کی تیاری ہے؟"

شمسہ "عقد پروین کلب میں جلسہ ہے اور مجھے بہترین تقریر پر انعام دینا ہے۔ معاف کیجئے اس وقت بہت مصروف ہوں۔ کل میں آپ کی تمام شکایتیں دور کر دوں گی"

شمسہ کے لب و لہجہ میں کچھ ایسی برودت تھی کہ ذکی کو سخت صدمہ پہونچا اور اس نے ارادہ کیا کہ آج اس کی تحقیق ضروری ہے کہ یہ عقد پروین کلب جارہی ہے یا کہیں اور۔ یہ سوچکر وہ واپس آیا اور پہلے سے کپڑے پہن کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ موٹر پہ سوار ہو کر بنگلہ سے باہر آئی، اور ذکی بھی ایک ٹیکسی پر بیٹھ کر اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ لیکن ذکی کے غم و غصہ و حیرت و استعجاب کی انتہا نہ رہی جب اس نے شمسہ کو بجائے عقد پروین کلب کے گرانڈ ہوٹل میں جاتے دیکھا اور وہاں سے وہ ایک نوجوان شخص کو لیکر جسے وہ بالکل نہیں پہچانتا تھا، ایڈن گارڈن کی طرف چلدی۔

ذکی لاکھ متین و سنجیدہ سہی، لیکن پھر بھی اس کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگا اور کامل دو گھنٹے جبتک وہ اپنے محبوب کو لیکر باغ کے کنجوں سے باہر نہیں آئی یہ ہزاروں تجویز بنا بنا کر بگاڑتا رہا، حتے کہ یہ ایک عزم راسخ کر کے اس طرف بڑھا جہاں شمسہ کا موٹر کھڑا ہوا تھا اور ٹھیک اس وقت جبکہ یہ دونوں دروازہ کھولکر اندر بیٹھنے والے تھے یہ بھی پہونچ گیا۔ شمسہ اس کو دیکھ کر سہم گئی اور اس کا محبوب تھر تھر کانپنے لگا۔ ذکی نے جیب سے بجلی کا لیمپ نکالکر ان دونوں کے چہرہ پر روشنی ڈالی اور پھر اسے گل کر کے نہایت ادب سے سر جھکا کر شمسہ سے پوچھا کہ کیا عقد پروین کلب میں آپ نے اسی نوجوان کو بہترین تقریر پر انعام دیا ہے جس سے زیادہ قیمتی چیز آپ اور کچھ نہ دے سکتی تھیں۔ افسوس ہے کہ میرے پاس آئینہ نہیں ورنہ میں آپ کو دکھاتا کہ میں آپ کو کیا دیکھ رہا ہوں۔ (نوجوان سے مخاطب ہو کر) کیا آپ خود اپنی تعریف کر سکتے ہیں (شمسہ سے) کچھ آپ ہی فرمائیے ——

شمسہ اپنا اضطراب دور کر چکی تھی اور یہ معلوم کر کے کہ اب پردہ اٹھ گیا، اور تاویل سے تلافی ممکن نہیں، اس نے اپنے بطون کو دفعۃً بے نقاب کر دیا اور بپھر کر بولی کہ "آپ کو میری آزادی میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ آپ آج اس بات کو دیکھ رہے ہیں جسکو اس سے قبل دیکھنا چاہئے تھا میرے رستہ میں حایل ہونے کی ضرورت نہیں اور اس وقت سے میرے اور آپ کے درمیان کوئی تعلق نہیں۔ یہ کہکر اس نے ذکی کو اسی جگہ حیران و مبہوت چھوڑ دیا اور اپنے محبوب کا ہاتھ پکڑ کے موٹر میں بیٹھی اور چلدی

(۸)

پندرہ روز سے جو بحرانی تپ کا دورہ ذکی پر پڑا تو کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتا۔ اگر کسی وقت کچھ ہوش بھی آجاتا ہے تو اس سے زیادہ نہیں کہ وہ صفیہ کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب اس کا واہمہ اسے شمسہ کی صورت میں اسے پیش کرتا ہے تو پھر آنکھیں بند کر کے ایک کراہ کیساتھ منھ پھیر لیتا ہے۔

جس وقت ذکی کا تار ملنے پر عزیز (صفیہ کا بھائی) کلکتہ گیا ہے تو اس کی حالت اس قدر خراب نہ تھی اور کسی نہ کسی طرح وہ اس کو اپنے گھر تک

آیا تھا، لیکن یہاں آنے کے بعد دوسرے ہفتہ سے جو شدت مرض کی ہوئی تو بڑھتی ہی رہی۔

عزیز ایک دفتر میں ساٹھ روپیہ ماہوار ملازم تھا اور اپنی بیوہ ماں اور بہن (صفیہ) کی کفالت کا ذمہ دار تھا، اسی خیال سے اس نے شادی بھی نہیں کی تھی کہ وہ اس سے زیادہ بار کا متحمل نہ ہوسکتا تھا، ذکی کی مالی حالت اسقدر سقیم ہو چکی تھی کہ اگر عزیز اسے کلکتہ جا کر نہ لے آتا تو وہ خود کرایہ تک ادا نہ کرسکتا۔

علاج کے مصارف بہت زیادہ تھے مگر عزیز قرض دام سے اور صفیہ اپنے زیور بیچکر (جو دو چار اس کے پاس تھے) ان کو برداشت کر رہے تھے۔ فکرمند ہر شخص تھا، لیکن صفیہ کی حالت بہت دردناک تھی، وہ گذشتہ ۶ ماہ کے اندر جب سے ذکی اس کو چھوڑ کر چلا گیا تھا شب و روز ہر وقت اسی کی یاد میں محو رہی تھی اور ایک خاموش پجاری کی طرح دل ہی دل میں اس کی پرستش کر رہی تھی، ہر چند وہ بالکل بے خبر تھی کہ ذکی کہاں اور کس عالم میں ہے، لیکن اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور آئے گا اور گذشتہ عہد الم کی پوری تلافی ہو جائے گی، مگر وہ اس سے آگاہ نہ تھی کہ اب ذکی ملے گا بھی تو اس حال میں کہ اس کی زندگی خطرہ میں ہوگی، عزت خاک میں مل چکی ہوگی اور دولت و جائداد بالکل تباہ و برباد۔ عزیز کے زبانی اسے تمام وہ حالات معلوم ہو گئے تھے جو اس نے کلکتہ میں سنے تھے، لیکن اب نہ اسے ان رسوائیوں کا خیال تھا، نہ حسرت و افلاس کا بلکہ وہ تڑپ رہی تھی اس کے لئے کہ کسی طرح وہ اس مرض سے جانبر ہو جائے اور اسے پھر اس کی خدمت کا موقع ہاتھ آئے۔

ایک ایک کر کے امید و بیم کے چالیس دن گذر گئے ہیں اور ذکی جو بالکل اپنے جسم کا سایہ سا معلوم ہوتا ہے، بے حس و حرکت لیکن تپ میں مبتلا پڑا ہوا ہے۔ صفیہ پاس بیٹھی ہوئی رو رہی ہے اور عزیز بھی مایوسی کی حالت میں باہر کمرہ میں افسردہ و خاموش بیٹھا ہے۔

آج کامل ایک ہفتہ سے صفیہ کی آنکھ سے آنکھ نہیں لگی، سوائے چند گھونٹ پانی کے کھیل تک اس کے منھ میں اڑ کر نہیں گئی، لیکن محبت کی وہ آگ جو تھوڑی دیر کے لئے مردہ میں بھی جان ڈالدیتی ہے، اس کے اندر بھڑک رہی تھی اور وہ بغیر کوئی تکان محسوس کئے ہوئے ذکی کی تیمارداری میں مصروف تھی۔

آدھی رات گذر چکی تھی اور صفیہ تنہا بیٹھی ہوئی گھڑی گھڑی اس کا جسم دیکھتی جاتی تھی کہ دفعۃً ۲ بجے کے قریب اس نے ایسا محسوس کیا کہ بدن اتنا گرم نہیں ہے اور پیاس کی شدت میں بھی کمی ہے۔ دس منٹ کے بعد پھر اس نے دیکھا۔ پانچ منٹ نہ گذرے تھے کہ پھر اس نے نبض پر ہاتھ رکھا، یہاں تک کہ اب وہ ہر منٹ پر اس کا جسم دیکھتی تھی اور جب صبح ہوتے اس کو یقین ہو گیا کہ بخار واقعی کم ہو رہا ہے، تو ایک ایسی مسرت کے ساتھ جو دنیا میں کبھی اس کو حاصل نہ ہوئی تھی دوڑتی ہوئی عزیز کے پاس گئی اور کہا کہ جا کر فوراً ڈاکٹر کو لاؤ۔ ڈاکٹر آیا تو اس نے دیکھکر کہا کہ آج اکتالیسواں دن ہے اور بخار شام تک اتر جائے گا، لیکن کمزوری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہ خود مرض بنگئی ہے اس خبر نے صفیہ پر جو اثر کیا وہ بارش خشک کھیتی پر بھی نہیں کرتی۔ اس مژدہ نے اس کے حوصلوں میں جان ڈالدی امیدوں نے پھر خون کو رگوں میں دوڑا دیا، اور گھر کی سوگوارانہ حالت دفعۃً مسرت سے تبدیل ہو گئی۔

. . . .

. . . .

ذکی:۔ ”آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کا کوئی نہیں“

صفیہ :- "میں جانتی ہوں کہ آپ میرے سب کچھ ہیں اور مجھے آپ کی بیوی ہونے کا فخر حاصل ہے"

ذکی :- "غلط۔ نہ آپ اس وقت تک حقیقی معنی میں میری بیوی تھیں اور نہ میں آپ کا شوہر، لیکن آج رات کی اس تنہائی میں آسمان کے تاروں کو، فضا کے سکوت کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں اس وقت آپ سے پھر نکاح کرتا ہوں اور یہی میرا "ازدواج مکرر" حقیقی ازدواج ہے، جس کے ذریعہ سے میں اپنے آپ کو صفیہ کی پرستش کے لئے وقف کرتا ہوں اور ...."

صفیہ نے ہنسکر ذکی کے منھ پر ہات رکھدیا اور بولی کہ دیکھئے آپ پھر اس ہیجان کے ساتھ شاعری کو ملائے دیتے ہیں اور مجھے پھر ڈر معلوم ہوتا ہے کہ ...."

اس مرتبہ ذکی نے صفیہ کا منھ بند کردیا، لیکن ہات سے نہیں ———— !

نیاز

ارہر کا کھیت!

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے

دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے، جو ہائڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے فرائض منصبی احتیاجات فطری، اور حادثات معاشرتی میں پیش آتے ہیں۔ ہائڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں، لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اسکی داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت ہی میں پڑی تھی

پارلیمنٹ اور کونسلوں کی تیز تیز اور چیز چیز جوان دنوں "رقص پروانہ" اور "پرفشانی شمع" سے زیادہ گرمی محفل کا باعث تصور کی جاتی ہیں وہ صدا ہائے بازگشت ہیں جو شاید سب سے پہلے کسی آ اکبر الصوت نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھیں۔ ہائڈ پارک کی خوش فعلیاں اکثر آرٹ یا اس کی عریاں بندی پر ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ارہر کے کھیت کی عریانیاں اکثر و بیشتر لوریہ تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ کی پیشرو گذر چکی ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔ دونوں بولتے ہیں، ضد کرتے ہیں جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ اور مفید کام کر جاتے ہیں، جس سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہونچتا ہے اور ہندوستانی اراکین پارلیمنٹ وہ کرتے ہیں جس سے ان کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان پہونچتا ہے، ایک تقاضائے حاجت کرتا ہے اور دوسرا ——— نان کو آپریشن

شام کا دھندلکا اور گاؤں کا دھواں کہر آلود ہو کر پھیلنے لگتا ہے۔ کتے بھونکنے لگتے ہیں۔ کسان اور ان کے تھکے ہوئے مویشی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں گویا دونوں ایک ہی مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ یعنے گھر پہونچکر کھانا ملے گا، سونے کو ملے گا اور عافیت ملے گی۔ ان کے مقابلہ میں دن کی محنت ہر حیثیت سے دلآویز تھی۔ اور دوسرے دن کی مشقت خوش آیند۔ مویشی اور مالک دونوں کا خاندان ایک ہی ہوتا ہے۔ کسان کی بیوی، اس کے بچے بچیاں اور اسکا بوسیدہ جھونپڑا، کسان کے لئے اتنا ہی عزیز ہوتے ہیں جتنا خود مویشی کے لئے۔ کسان اور مویشی دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں، اس لئے زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر یا مستغنی ہوتے ہیں۔ غرض کسان کتناہی نلاکت زدہ کیوں نہو وہ آجکل کے روشن خیال میاں بیویوں سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ خوش قسمت نہیں تو مسرور سہی!

لیکن وہ دیکھئے گا، گاؤں کے قریب والے کوئیں کے سامنے سے ایک راستہ کھیت کی سمت گیا ہے، ایک طرف گڑھا سا ہے جس میں کھاد پڑی ہوئی ہے، دوسری طرف ایک ببول کا کھوکھلا پرانا درخت ہے۔ جیسے کوئی شمشاد سالہ وکٹوریہ کراس تمغہ یافتہ، جیسے ایک آدھ شب زندہ دار بزرگ

اس طور سے بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہیں جیسے جنگ عظیم کے اختتام پر یورپ کے بعض فرزندانِ قسمت شاخ زریں پر بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ عورتوں کی کچھ تعداد کوئیں پر جمع ہوئی۔ یہاں کچھ دیر تک مزید کمک کا انتظار کیا گیا۔ ان میں جو جوان تھیں۔ پر شباب لیکن بے خطر کوئیں کی جگت پر تھیں پاؤں لٹکائے ہوئے کچھ گنگناتی ہوئی بڈ بوڑھیوں کو دعوت تہدید و عتاب دیتی ہوئی۔ کچھ بوڑھیاں تھیں جو جگت کے نیچے بیٹھی ہوئی کراہ رہی تھیں، گالیاں دے رہی تھیں اور کھانستی جاتی تھیں۔ اتنے میں ایک اور گروہ آپہونچا، نوجوان جگت پر بیٹھنے والیوں نے اپنی ہمجولیوں کا شوخی و طراری سے، اور بوڑھیوں نے کوسنے، گالی اور کھانسی سے خیر مقدم کیا۔ آخری قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے یہ مجمع کھیت کی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ جسموں کو تولتے ہوئے۔ نوجوان لڑکھڑاتیں تو ایک ہلکی سی چیخ اور بلند قہقہہ کے ساتھ سنبھل جاتیں۔ بوڑھیوں کا قدم ڈگمگاتا تو زمیندار اور کسان جس کا کھیت حاشیہ پر ہوتا، موسم، پاس کا لڑکا یا لڑکی یا قہقہہ لگانے والی عورت گالیاں سنتی ——— یہ مہم چلتے چلتے ایک تاریک ناقابل گذار، اندیشہ ناک اور خار دار سدِّ رویئں کے سامنے رک گئی۔ یہ دیہاتی تجیم کے قلعے تھے

برسوں گذرے ہیں اسی دشت کی سیاحی میں

لیکن بعض ثقات جس کا شاید نام لینے سے گھبرائیں ——— ارہر کا کھیت !

ناظرین سمجھ گئے ہوں گے یہ لشکر کس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لئے ہم چور ن یا مار کھاتے ہیں۔ یہیں سے شاعری کا اختتام اور تعزیرات ہند کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں حفظانِ صحت کے جراثیم ملتے ہیں۔ یہاں آنے پر معلوم ہوگا کہ بہت سے منچلے یا مظلوم پہلے سے پہونچ چکے ہیں کسی کا "آرام جاں" اور "مونس قلب" بچھڑ گیا ہے وہ اس کے لئے افتاں و خیزاں یہاں تک پہونچا ہے اور کسی سے وعدۂ دید و اند کے مزید کا قول و قرار ہے، وہ سراپا شوق چلا آرہا ہے، اور ——— کسی کا گدھا کھو گیا ہے، وہ بھی بھٹکتا ہوا آن پہونچا ہے۔ یہ اس بھول بھلیاں کا کرشمہ ہے کہ بچھڑے یہاں ضرور ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کبھی گدھے والے کے ہاتھ عشاق کی گردن پر ہوتا ہے یا خود گدھا کسی محبوبہ کے پہلو میں۔ آخر یورپ کے ازمنہ وسطیٰ میں (masquerade) ماسکوریڈ یا جشن "نقاب پوشی" کیا تھا جس پر یورپ والے ناز کرتے ہیں اور ہم روتے ہیں، یا گالیاں دیتے ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لئے موزوں ہے، مہابھارت یا ارہر کا کھیت، مہابھارت تو شاید اختتام پر ہے، سائمن کمیشن کی سفارشں اور ارہر کے کھیت کا ادر انتظار ہے !

جوانی کا کھونا اور وہ بھی ارہر کے کھیت میں، ایسا مسئلہ ہے جس پر ناک بھوں پر زور دینے سے پہلے، دل و دماغ پر زور دینا زیادہ ضروری ہے ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ اکثر شفاخانہ میں ورنہ جیلخانہ میں۔ جیلخانہ کا راستہ تو اکثر ارہر کے کھیت ہی سے گذرتا ہے اور شفاخانہ کا شہروں کی صاف، شفاف سڑکوں سے جس پر سے موٹر بھی گذرتے ہیں اور موٹوی بھی۔ یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ اس کے نوجوانوں نے اسراف شباب کے لئے شفاخانوں کو جیلخانوں پر ترجیح دی۔ زندگی کے آثار آپریشن ہال کے نشتر سے زیادہ جیلخانہ کے ڈنڈے میں پائے جاتے ہیں۔ شفاخانہ سے زندگی اور جیلخانہ سے موت گھبراتی ہے۔

شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا بے مرچوں کا سالن یا بے تمباکو کا پان، مانا، کہ مرچ اور تمباکو مضر صحت ہیں لیکن تندرستی کا مصرف تحفظ تندرستی نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے۔ شباب میں پیرانہ سالی کا لطف (اگر اسے لطف کہہ سکتے ہیں) اٹھانا ممکن ہے لیکن پیرانہ سالی میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شباب اور پیری دونوں حالات منتظرہ ہیں، ایک کا مقصود "نظارۂ دشمن ایمان و آگہی" یا "رہزن تمکین و ہوش" ہے دوسرے کا ——————— ؟

لیکن یہ ستم ظریفی ہندوستان کے مطالبۂ آزادی سے زیادہ دلچسپ ہے کہ شباب ایک طرف تو عقل سے شرمسار ہونے پر ضد کرتا ہے اور دوسری طرف سب کا انتقام بھی پورا پورا لیتا ہے۔

ارہر کے کھیت میں عقل سے شرمساری کی نوبت آتی ہے تو گاؤں والے بسولے سے کام لیتے ہیں؛ اور عدالت رندے سے خبر لیتی ہے، کسی منچلے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ اور شاید عبرت آمیز منظر ہے جتنا کسی پبلک مشاعرہ میں، پہلے انٹس شاعر کا اپنا کلام سنانا!

دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے الاّ عورت، شہری اس کا قائل ہے کہ جب تک یورپ اور دولت حیّ و قائم ہیں اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے الاّ عورت۔ دیہاتی عورت کو مایۂ عزت سمجھتا ہے، اور شہری آلۂ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے، بولتا ہے، آرام کرتا ہے پناہ لیتا ہے اور کشاکش حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تازہ دم ہو کر نکلتا ہے، تعلیمیافتہ کے نزدیک عورت ایک عضویاتی ضرورت ہے یا ایک وسیلۂ تفنن جس کیلئے اس نے چوپاٹی اور اپالو تعمیر کیا ہے۔ دیہاتی پناہ اور آرام چاہتا ہے، شہری صرف غم غلط کرنا چاہتا ہے، دیہاتی کے یہاں محنت دیانت اور عورت ہے، شہری بھی عورت کا طالب ہوتا ہے، لیکن محنت و دیانت سے نہیں، بلکہ مکر و دولت سے آج چوپاٹی اور اپالو در بابرد ہو جائیں تو وہ جلد سے جلد کوئی اور چوپاٹی، اور اپالو تعمیر کرے گا، کسان کے جھونپڑے پر یہ آفت آئے تو یہاں سطح آب پر اپالو اور چوپاٹی کی خس و خاشاک یا گندگی نظر نہیں آسکتی بلکہ موجوں کے ساتھ ایک خفیف سی ہلکی رنگین تحریر ——————! چوپاٹی اور اپالو کی تعمیر دولت اور مشین سے ہوتی ہے، یہ ایک لحظہ میں تعمیر ہوتے ہیں اور اپنے تعمیر کرنے والوں کی دولت اور حسن کی مانند ایک لحظہ میں فنا ہو جاتے ہیں، جھونپڑا نسلوں کی تعمیر ہے اور نسلوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے!

ارہر کا کھیت دیہات کی زنانہ پالیمنٹ ہے، کونسل اور اسمبلی کا صور یہیں سے پھونکا گیا تھا۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ سب یہاں معرض بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے، داروغہ جی کیوں آئے اور کیا لیکر گئے۔ پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنوائے۔ رُکمنیا کے بچہ کیوں نہیں پیدا ہوتا، اور لکھیا کو حمل کیسے ٹھیرا، ایک نے کہا میری گائے کے بچھیا ہوگی، دوسری بولی پہلوٹی کی بچھیا ہو چکی ہے، اب کے بچھوا ہوگا، اسپر اختلاف آرا ہوا، اور ہندوستانی لیڈروں کی طرح دونوں بھول گئیں کہ ہم دراصل کس شغل میں مصروف تھے، اور اب کیا ہو رہا ہے،

اندھیرے میں گالی گلوچ موثر نہیں ہوتی، دونوں آگے بڑھیں، ایک کا پاؤں اور دوسرے کا ہاتھ، لعوق حفظان الصحت پر پڑا اور پڑتے ہی غصہ کا سیلاب دوسری جانب مائل ہو گیا، دونوں یکلخت اس نتیجہ پر پہونچیں کہ یہ منیا کے لڑکے ممدیا کا فعل تھا، دونوں نے ممدیا کو بانگ دہل کوسا، یہ گویا منیا کو اعلان جنگ تھا، منیا نے بیٹھے ہی بیٹھے للکارا ممدیا گھبرا کر اپنی ماں کی تلاش میں بھاگا تو فریقین اول میں سے کسی کے اوپر جا گرا، دونوں چیخ پڑیں، منیا نے مار ڈالا، اب کیا تھا، سب نے اپنا اپنا شغل جہاں کا تہاں چھوڑا۔ نہ "مختشک طہارت" کا خیال رہا نہ ترنجاست کا، ایک غوغا بلند ہوا، بھگدڑ مچ گئی، کھیت کے چاروں طرف سے لوگ نکلنے لگے، مرد، عورت، بچے، گیدڑ، کتے، بھیڑیں، لومڑی، نیولا، بن بلاؤ——گویا اسمبلی میں بم گرا!

ایک روز ہمکو یکلخت معلوم ہوا کہ ہم کوئی نصف گھنٹہ مقررہ وقت سے پہلے کلاس پہونچگئے ہیں۔ بحیثیت لکچرار کلاس میں تنہا پایا جانا، پانے والے کے لئے اتنا ہی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے، جتنا کسی آثار قدیمہ دریافت کرنے والے کو ایک لاکھ برس قدیم انجہانی گینڈے کا ڈھانچہ مل گیا ہو۔ ایسی حالت میں ہر اس گذر جانے والے کو مخاطب کرنا اور طوعاً و کرہاً اس سے اظہار خلوص یا برتری کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری ہیئت کذائی پر سوچنے کا اہل ہے۔ اس اثنار میں ایک کتا سامنے سے گذرا، اور ہمنے بیٹھے ہی بیٹھے ایسی ڈانٹ بتائی اور آمادہ "نقض امن" ہوئے گویا اردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی نے ہم کو کتوں کے استیصال کے لئے تھانہ دار بنا دیا تھا۔ اتنے میں ایک بہشتی گذرا اور ہمنے انتہائی سرپرستانہ لہجہ میں پوچھا، کیوں اس طرف کا دروازہ کھل جانے سے تم لوگوں کو طے مسافت میں بڑی آسانی ہو گئی ہو گی، اس نے نہایت انکسار اور تشکرانہ انداز میں ہامی بھری، ابھی یہ رسمی تکلفات ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک خوانچہ والا سامنے آ گیا، بولا، میاں، اس دروازہ کی کنجی آپ ہی کے پاس رہتی ہے، دروازہ کھلنے سے بڑا آرام ہو گیا، (خوانچہ کے اندر، جو ابھی سر ہی پر رکھا ہوا تھا، کچھ ٹٹولتے ہوئے) خدا آپ کو سلامت رکھے، یہ لیجئے بریلی کا بڑا تحفہ امرود ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ حکام یونیورسٹی نے معلمین کے لئے کس مصلحت کی بنا پر گاؤن پہننا لازمی کر دیا ہے۔ لیکن ابھی ہمارا غصہ اور سکوت، خوانچہ والے اور "بریلی کے تحفہ امرود" کے درمیان پورے طور پر متوازن نہیں ہونے پایا تھا کہ ایکطرف سے "حاجی بلغ العلی" کچھ گنگناتے ہوئے اس طور پر جھپٹتے ہوئے نکلے گویا لمکی اور داڑھی کے علاوہ

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے!

حاجی صاحب کا عربی نام "بلغ العلی" اور فارسی "جریب زیتونی" ہے۔ کچھ لوگ "سابق دیوانہ ہمدرد" اور حال "ابوالمجنون" کہتے ہیں کچھ دنوں "تحشت البزاریہ" پر زور لگاتے رہے اندنوں "قانون مسعودی" کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کا پتہ نہیں کہ اب جنون کی کیا حالت ہے۔ ملتے ہی فرمانے لگے، جلدی سناؤ جلدی، میں نے کہا کیا، فرمایا کوئی اچھا سا شعر، میں نے کہا سنئے:—

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

گردن ہلا کر بجلوہ ریزی "لمکی" و "بربرفشانی" ریش اپنے سکوت کا ثبوت دیا،

میں نے کہا کوئی موضوع بتائیے تو مضمون لکھوں، فرمایا:۔

"ارہر کا کھیت!"

میں نے دریافت کیا کیوں جناب اس شعر کا یہ معاوضہ، سخن فہمی کی داد دوں؟ کل کو حاجی صاحب نے جناب "کراماً" کے سر سے اٹھا کر مولانا "کاتبین" پر ڈال دیا (میں نے سہولت کی خاطر ان "تسمہ پا" بزرگوں کے نام علیحدہ کر دیئے ہیں، اگر کوئی صاحب ان کے نام و نشان، حسب نسب، وطن اور مشاغل کے بابتہ اپنا ذخیرہ معلومات وسیع کرنا چاہتے ہوں تو نیاز صاحب سے رجوع کریں، مجھے امید ہے نیاز صاحب باب الاستفسار کے جن نمبر میں اس پر اظہار خیال فرمائیں گے، مجھے اندیشہ ہے کہ باب الاستفسار اور جن نمبر ہیں بھی کراماً کاتبین کے مانند مجھ سے کچھ خلط مبحث سرزد ہو رہا ہے) فرمایا نواب صاحب کہاں میں گے، میں نے کہا کون نواب نواب مزمل اللہ خاں صاحب، کیا یہ شعر سنائیے گا، کہنے لگے، نہیں جی، وائس چانسلر صاحب، نواب مسعود یار جنگ بہادر، میں نے کہا ان کو سنانا ہے تو پھر یہ شعر سنائیے گا۔

ترا که زور ببازوے تیغ زن باقیست
بگیر تیغ که آن حسرت کہن باقیست

فرمایا، یہ کیا، میں نے کہا یہ ہے

من آن علم و ہنر را بپر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

حاجی صاحب قبلہ نے کچھ گھبرا کر کچھ بے اختیار ہو کر فرمایا، ارے میاں، یہ سب تو ہوا، اب کیا ہو، اچھا تمہارے کلاس میں بیٹھ جاؤں، ذرا تمہارا لکچر سنوں گا، میں نے کہا، اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار ہوگا، فرمایا، السلام علیکم اور میں ڈنڈا لئے ہوئے کلاس میں پہونچ گیا۔

"اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا"

(۱) اگر مضمون اچھا ہے تو میں ذمہ دار

(۲) اگر عنوان برا ہے حاجی صاحب ذمہ دار

(۳) اگر کتابت وغیرہ کی غلطی ہے تو نیاز صاحب ذمہ دار

(۴) اگر کل برا ہے تو ناظرین ذمہ دار

خط و کتابت "و ترسیل زر" میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔

رشید احمد صدیقی (ایم۔ اے) مسلم یونیورسٹی

جلوۂ کرشن

جسودھا کی گود میں نشو و نما پانے والے کو کون نہیں جانتا۔ نند کے آغوشی فرزند کو کون نہیں پہچانتا؟ دیوکی کے لاڈلے اور واسدیو کے صلبی فرزند سے کون واقف نہیں۔ متھرا کے کنہیا کا سکہ کون ہے جس کے دل پر بیٹھا ہوا نہیں ہے!! بانسری کی دلکش پکار کس کو متوالا نہیں بنا دیتی۔ بندرابن کے عاشقانہ ذرات اب بھی گوپیوں کے لئے افسانوں کا کام دے جاتے ہیں۔ غرض کہ ہند میں ہزاروں سال سے اسی کا ترانہ ہے اور اسی کے جے کے نعرے، ہر مندر اسی کی جلوہ گاہ ہے اور ہر پجاری کا دل اسی کی حریم ناز! بچپن کا موسم محبت میں۔ جوانی کی فصل عاشقوں کی جھرمٹ میں اور موت کمبخت بھیل کے ترکش میں۔ جس نے اسے پرستش کے قابل بنا دیا۔

بھادوں کی تاریک گھٹاؤں میں، کال آگرہ محل کے زندان میں، دیوکی کے خوبصورت پیٹ سے وہ جنم لیتا ہے، جس کے گلے میں جیتنے کیلئے مالا اور راجدھانی کے لئے سر پر "مکٹ" (تاج) کا قدرتی خلعت تھا، یہ آثار دیکھکر دیوکی کی آتما مسرت سے لرز گئی، واسدیو کا قلب کنس کے ظالمانہ سلوک سے تھرا گیا، آٹھواں مولود تھا اور یہی ان دونوں کا آخری سہارا! واسدیو نے ٹوکرے کی آغوش میں اس ننھی سی جان کو ڈالا اور اپنے پیروں کی آہٹ کا احترام کرتا ہوا زندان کے دروازہ سے نکلا، جمنا کو عبور کیا اور گوکل میں پہونچ کر جسودھا کی معصوم پر درد آغوش میں سونپ دیا۔

جس کی زندگی دیوکی کے پیٹ سے انسانیت کا پیام لیکر نکلی تھی۔ وہ خوش اس لئے تھا کہ اس کو پرماتما نے ۹۵ سال زندہ رکھنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ ورنہ کنس کے ہندی تو ہمات پہلی سانس بھی نہ لینے دیتے۔ اس کو تو ارجن کا رتھ بان بننا تھا اور مہا بھارت کے معرکۂ کارزار میں "بقائے روح" فلسفہ سمجھانا تھا وہاں یہ کہنے والا اور کون تھا کہ :-

"جسم کا ناش ہوتا ہے مگر آتما امر اور غیر فانی ہے"

متھرا سے کوئی پوچھے، جس نے اس کے بچپن کی شوخیاں دیکھیں۔ بندرابن سے کوئی سوال کرے کہ واسدیو کے لخت جگر کی جوانی تیری مست فضا میں کیونکر مچلی۔ بنارس کے پنڈت شاستری بتا سکیں گے کہ انہوں نے اپنے سپوت کو علوم و معارف کے کون کون سے سبق دیئے۔ دوارکا کی غیر آباد سرزمین اس کی بیدار زندگی کے کارنامے بیان کر سکے گی۔ مجنت کرنے والی رکمنی کہہ سکے گی کہ کندن پور سے آغوش محبت میں لے جانیوالا کون تھا۔ گنگا کی موجیں گواہی دے سکیں گی کہ اس نے اپنی چادر سیال سے ہند کے دیوتا کے عریاں جسم کو کس طرح ڈھانکا تھا۔

ہند کا یہ اوتار موسیقار بھی تھا اور رقاص بھی۔ اپنی بانسری کی روح پرور صداؤں سے زندگیوں کی مضمحل نبضوں میں حیات کی بجلیاں بھر دیتا تھا اور اپنی جوشیلی تقریروں سے سرفروشی کے لئے تیار۔ اس کے روح پرور نغمے۔ اس کا دلنواز رقص۔ اس کی جانگداز بانسری اور اس کی فلسفیانہ سحر بیانی یہ ایسی آبی ہوئی تلواریں تھیں جو اس کے حلقہ بگوشوں کے دلوں کو دو نیم کر دیتی تھیں۔

ہمارا ہیرو سری کرشن نے اپنے شائستہ عادات و اطوار، اپنی سانچے میں ڈھلی ہوئی سیرت اور تعلیم و تلقین سے جو نتائج و اثرات صفحۂ ہند پر چھوڑے تھے، وہ ان کی عظمت کو منوائے بغیر نہیں رہتے۔ ان کی ۹۵ سالہ زندگی "ایشور پرستی" ہی میں گذری۔ ان کا مشرب موحدانہ تھا۔

ان کا مسلک صوفیانہ تھا۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ غرق تھا ادائے فرض میں، ادھرم پر ایقان رکھنے میں، اوقات کی پابندی میں، ثبات قدمی میں انسانیت کے احترام میں۔ اور رحم و ہمدردی کے انسانی صفات میں!۔

گو امتداد زمانہ نے حقیقت پرستی میں اوہام پرستی کی آمیزش کر دی اور اصلیت کو مسخ کر کے رکھدیا، کیونکہ مہاراجہ سری کرشن خود پرست برہمنوں کی طرح نہ اپنے علم و فضل پر ناز کرتے تھے اور نہ اپنی ہستی کو اپنے ہم جنسوں سے بالاتر سمجھتے تھے۔ وہ چھتریوں کی طرح نہ اپنے شجاعانہ کارناموں کا ڈھنڈھورا پیٹتے تھے۔ نہ ویشوں کی طرح دولت سمیٹنے کی دھن میں لگے رہتے تھے، اور نہ شدروں کی طرح اپنی انسانیت کی خود توہین کرتے تھے وہ انسانیت کو خدا کا اولین عطیہ سمجھتے تھے اور خود وہ انسانیت ہی کے حامل بنکر آئے تھے، اور انسانیت ہی پر قائم رہنے کے لئے "انسانوں" کو سبق دئے تھے۔ مگر افسوس کہ ناقص اور باسی دماغوں کی پیداوار نے اس کو یکسر بھلا دیا اور "ذات پات" کی تفریق اور "چھوت چھات" سے کراہت پیدا کر کے انسانیت کو مجروح کر دیا اور اس پر یہ بوالعجبی کہ اس کو اپنے دماغ کا بہترین کارنامہ بھی سمجھا۔ کاش تخلیق کی غایت پر غور کرتے اور انسانیت کا جنازہ اپنے کاندھوں پر نہ اٹھاتے!! آج ہندوستان اسی دماغی مرض میں شدت سے مبتلا رہ کر سوراج کیلئے گدایانہ سوال کر رہا ہے۔

بھگوت گیتا کے مصنف کی زندگی ۹۰ سال تک جنگ و پیکار ہی میں گذری۔ کنس کو چودھویں سال میں پچھاڑ کر دنیائے ہندوستان کو اس کے ناقابل برداشت مظالم سے نجات دلا دی، جراسندہ کا مقابلہ اس نے کیا۔ کرناٹک اور بنارس کی مہمیں اس نے سر کیں، شیشپال سے یہ نبرد آزما رہا۔ مہابھارت کے خونیں مناظر اس کی آنکھوں نے دیکھے اور دروپدی کے سوئمبر میں ارجن کی تیر اندازی پر صدائے تحسین اُس نے بلند کی۔

اس کی زندگی کے حالات نظم و نثر میں کثرت سے شائع ہو چکے ہیں۔ جس میں غالباً عقائد کی وجہ سے مبالغہ آمیز افسانوں کی بھرمار ہے اور وفور محبت نے حسن و قبح کا امتیاز بھی سلب کر لیا ہے۔ معلوم ہو رہا ہے کہ دماغی جہالت نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بیسویں صدی حیدرآباد کے "کرشن" کی شاعرانہ طبیعت کا دریا موجیں مارتا ہے۔ صرف اس عقیدے کو لئے ہوئے کہ یہ بھی اسی کے نام پر ۶۵ سال سے زندہ ہے، گو شاد ہے مگر زمانہ کی رفتار اور اپنی افراط شرافت سے ناشاد۔ گو خاندانی امیر ہے مگر اپنی ذات سے فقیر! نام کی برکت ہزاروں سال کے گذر جانے پر بھی اس حد تک تو باقی رہی کہ واسدیو کا "کرشن" ہند کا بادشاہ تھا۔ چندولال کا "کرشن" دکن کا وزیر ہے۔

مہاراجہ بہادر بالقابہ کی امیرانہ طبیعت کو شاعری کے ساتھ بچپن سے لگاؤ ہے۔ مہاراجہ چندولال شاداں کا شاہانہ دربار شعراء سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ جس میں نصیر دہلوی کے سے استاد داد سخن دیا کرتے تھے۔ مہاراجہ شاد کے شاعرانہ دربار میں بھی سرشار مست رہا کرتے تھے، اور داغ بھی یوں نوا سنج رہتے تھے کہ ع

آئے گی اردو زباں آتے آتے

جلیل و اختر بھی برسوں اس خوان کرم کے زلہ ربا رہے ہیں۔ ضیا کی ضیا باریاں بھی مشاعروں کو چمکا دیا کرتی تھیں اور فحوی کی شاعرانہ محویت اب بھی ہر جمعہ کو نظر آ جاتی ہے۔ ثاقب نے بھی اپنی پہلوانی کے شاعرانہ داؤ پیچ دکھائے ہیں اور غبار کی ضعیفی تو ابتک حضرت شاد ہی

کے دامن سے لپٹی ہوئی ہے اور مشق سخن مصروف۔ بیگم کے بوڑھے غمزے اب بھی ناک پر انگلی رکھ کر "طلائی چوڑیوں" کا خیال پیدا کرا دیتے ہیں۔ جہاں کی فضا ایسی شاعرانہ ہو۔ وہاں تو غیر موزوں طبیعتیں بھی موزوں ہو جاتی ہیں۔ نہ کہ مہاراجہ شاد جنہوں نے آنکھیں کھولتے ہی گھر میں شاعری کا چرچا سنا۔ کیونکر چپ رہتے۔ میدان شعر میں بے تکان دوڑیں لگانا شروع کر دیں۔ قوالوں کے گلے ان کی غزلوں سے حرکت کرنے لگے، رباعیات و قطعات کے بارے میں انکی جستیں حیرت کرنے کے قابل ہو گئیں۔ قصائد سے ان کا زور بیان ٹپکنے لگا۔ اور مثنوی سے واقعہ نگاری کی قابلیت معلوم ہونے لگی۔

اسی "جلوۂ کرشن" میں اپنا مسلک یوں نظم فرماتے ہیں:-

ہے میرا طریق صوفیانہ   توحید ہے بس مرا ترانہ
میں کیا کہوں کون ہوں میں کیا ہوں   اک آیت قدرت خدا ہوں
صوفی ہوں موحدانہ مسلک   کی میں نے نہ بت پرستی ابتک

مہاراجہ سری کرشن ماں کے پیٹ سے چندر بنسی اور باپ کے نطفہ سے سورج بنسی پیدا ہوئے تھے، اس بیان کے دو شعر اس مقدمہ میں سن لیجئے:-

یہ قہر کا گرم آشیانہ   وہ مہر کا سرد آستانہ
تریاق بھی اور زہر بھی تھا   تھا مہر بھی اور قہر بھی تھا

سری کرشن کی پیدائش کے وقت مہاراجہ شاد کے شاعرانہ دماغ کی موزونیت ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے:-

نقارۂ رعد بج رہا ہے   بادل اٹھ کر گرج رہا ہے
ہشیار کہ شیر کی ہے آمد   عالم کے دلیر کی ہے آمد
بنیاد ستم کی ڈھانے والا   احکام خدا سنانے والا
پیدا ہوا پیشوا مبارک   پورا ہو مدعا مبارک
گلچیں کی کہیں نظر نہ لگ جائے   اس گل کی مہک لگا لگ جائے

کنس کے درباریوں کے حاسدانہ طبائع کو ایک شعر میں کس لطیف استعارہ میں ظاہر کیا ہے:-

حُسّاد کی واں کمی نہیں تھی   زہریلی ہوا تھمی نہیں تھی

کرشن مرلی کے موسیقیت کا سحر ان اشعار میں دیکھئے:-

وہ اسکی رسیلی تانیں دلکش   سنکر جسے سننے والے ہوں غش
گوکل کی گوالنیں تھیں بیدم   ہے مستی و بے خودی کا عالم
ہر تان پہ سب بھڑکتی تھیں   سب شیام سندر کو تکتی ہی تھیں
تھی معجزہ بانسری کی آواز   فوق العادۃ تھا سوز میں ساز

کچھ ایسا سماں بندھا ہوا تھا سبزہ بھی زمیں پہ لوٹتا تھا
من موہ لیا بجا کے مرلی تھی شیام کی تان کیا رسیلی

کنس کے اکھاڑہ کا منظر۔ کرشن و بلرام کی آمد مست ہاتھی سے مقابلہ حاضرین کا خوف وہراس اور کرشن و بلرام کے شجاعانہ کارنامے انکی تصویر شعر کے قالب میں دیکھئے:۔

میدان میں پہلواں کھڑے تھے دو بچوں کی جان پر اڑے تھے
ہتھیار ہر ایک تولتا تھا تلوار کا ڈورا کھولتا تھا
تھا یاں تو دھکڑ پکڑ کا عالم ناگاہ کھلا ظفر کا پرچم
وہ گرد اٹھی غبار چھایا ہر شخص نے اپنا سر اٹھایا
دامن ہوا چاک گرد کا جب دو مہ نکل آئے آخر شب
میداں میں جب آئے شاہزادے تکتے تھے سوار اور پیادے
پہلے ہی سے یہ لکھی بدی تھی اک سمت سے چھوٹا مست ہاتھی
سب جان بچا کے اپنی بھاگے بڑھ آئے کرشن سب سے آگے
تلوار لئے اڑے رہے وہ جس جا تھے کھڑے کھڑے رہے وہ
جب آیا قریب مست ہاتھی اک وار میں سونڈ کاٹ ڈالی
چنگھاڑ کے فیل مست بھاگا پیچھا دیکھا نہ اس نے آگا

کرشن و بلرام کی دیو پیکر پہلوانوں سے کشتی۔ کرشن کا غلبہ۔ تماشائیوں کا حیرت بدنداں ہونا اسکو نظم فرماتے ہیں کہ:۔

آئے جو مقابلہ کو دشمن گردانا کرشن نے بھی دامن
یاں آتے ہی ان کے چھکے چھوٹے لڑکوں کو جو دیکھا دل بھی ٹوٹے
سمجھے تھے کہ ان کی جان لیں گے دونوں کو اٹھا کے پھینک دیں گے
لڑتے رہے دونوں بے ارادے کھیلا کئے دونوں شاہزادے
وہ پیچ کیا کرشن جی نے لی سانس تلک نہ مدعی نے
سینے پہ اسے گرا کے بیٹھے اٹھا نہ وہ یوں دبا کے بیٹھے

کنس کے قتل پر وفادار و جاں نثار حاشیہ نشینوں کا سکوت عبرت کے لئے کافی ہے:۔

نیرنگی دہر کے کرشمے عبرت کے سبق کے ہیں معمے
آلودہ بخوں تڑپ رہا ہے سر تن سے کہیں جدا پڑا ہے
بیجا تھا غرور حکمرانی عبرت کی ہے جا جہان فانی

تاج اس کا زمین پر پڑا تھا — جو ظلم کو رسم جانتا تھا
جو تاجوروں کا تاج لیتا — راجاؤں سے جو خراج لیتا
بیجان پڑا ہے سر کٹائے — سب دور ہیں پاس کون آئے
آیا نہ کوئی اسے بچانے — وہ قتل ہوا کھلے خزانے
بے گور و کفن پڑا ہے لاشا — دیکھا کئے سب کھڑے تماشا

کنس کی ظالمانہ زندگی کا خاتمہ کر کے سری کرشن جی مہاراجہ شاد کی شاعرانہ زبان سے اپنے پیرووں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

مجھ کو نہیں خواہش حکومت — جائز نہیں رکھتا میں خصومت
ظالم نہیں میں جو خون بہاؤں — غاصب نہیں ہوں جو ملک پاؤں
ظالم سے کیا ہے ملک خالی — یہ پھانس جگر میں تھی نکالی
میرا بھی فرض منصبی تھا — قصہ کروں پاک فتنہ گر کا
میرا جو ہے راج اور ہی ہے — تخت اور تاج اور ہی ہے

مثنوی کا خاتمہ مہاراجہ شاد نے اس دعا پر فرمایا ہے جس پر آپ بھی آمین کہئے:۔

او شان ہر اک بدلنے والے — یکتائی کی راہ چلنے والے
او بانسری کے بجانے والے — ہر ایک کا دل لبھانے والے
او زلف سیاہ والے ہمدم — او مظہر لطف رب اکرم
ہے داس ترا یہ شاد صوفی — کرتا ہے نوا کے سنگ سنگتی
نرگن ہو کر سگن بنا دے — پردے مری آنکھ سے اٹھا دے
پر کیف بنا سر یہ میرا — جگ میں مجھے آسرا ہے تیرا
مرلی کی مجھے صدا سنا دے — وہ نغمۂ جاں فزا سنا دے
دیکھا نہیں جو سماں دکھا دے — وہ جلوۂ ضو فشاں دکھا دے
درشن دے سکھی رہوں میں — کرپا سے ترے غنی رہوں میں
اس دل کی تڑپ نے مار ڈالا — ارماں نہ مگر کوئی نکالا
سمرن تری جپ رہا ہوں کب سے — دے مجھ کو فروں مری طلب سے
سنتوش ہو من وہ روپ دکھلا — بھگوان بھگت کے بس میں آ جا
من کی بپتا تو دیکھ میری — دکھ میں مرے ہو لگو دے دلیری
میری جو مراد ہے تو یہ ہے — خوش کامی شاد ہے تو یہ ہے

خدا حسن قبول دے اور زور بیان میں قوت، تاکہ آپ کے دماغی افکار سے دنیائے شاعری ہمیشہ لطف اٹھاتی رہے

ہوش بلگرامی

زندگی

زندگی کی ماہیت اور اس کی علّت غائی پر از آدم تا ایندم ہر زمانہ اور ملک میں انسان کچھ نہ کچھ غور و فکر کرتا رہا ہے۔ بظاہر ہم لاکھ آسودہ اور مطمئن ہوں لاکھ ہمارے اقتصادی، سیاسی، دماغی اور دیگر حوصلے پورے ہو چکے ہوں پھر بھی ہمارے اندر ''نا آسودگی'' کا ایک عنصر جراثیم سل کی طرح رہ جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً ہماری ساری ہستی پر اس طرح چھا جاتا ہے اور ہماری زندگی کو کچھ اس قدر دردناک بنا دیتا ہے کہ شیلی کی طرح عاجز ہو کر چلا اٹھتے ہیں ''واہ ری دنیا! واہ ری زندگی! واہ رے زمانہ!'' یا بیدل کے ساتھ بیساختہ یہ کہکر سر پیٹنے لگتے ہیں:۔

''چہ بارِ کلفتی اے زندگی کہ ہمچو حباب
تمام آبلہ بر دوش کردہ مارا''

بڑے سے بڑے شہنشاہ سے لیکر معمولی کوچہ گرد بھکاری تک اور بڑے سے بڑے عالم سے لیکر ایک غیر متمدن عامی تک سب کی زندگی میں ایسے لمحے کبھی نہ کبھی ضرور آتے ہیں کہ زندگی ایک بار معلوم ہونے لگتی ہے اور دنیا کا یہ نگار خانہ اپنی تمام دلفریبیوں اور نیرنگیوں کے باوجود ہم کو سکون دینے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

زبردست سے زبردست مادہ پرست فرعون کو زندگی میں ایسی ساعتوں سے سابقہ پڑا ہے اور پڑتا رہتا ہے جبکہ اس کے اموال و مقبوضات اس کے کام نہیں آتے اور وہ اپنی تمام جاہ و ثروت ساری عظمت و شوکت لئے ہوئے بلا کسی ظاہری سبب کے ایک عجیب بے چینی ایک ناقابل اظہار پراگندگی یا ایک غیر واضح افسردگی محسوس کرنے لگتا ہے اور دنیا کی تمام مسرتوں سے بیزار ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو اس عالم انتشار میں ہمارا دم اس طرح گھٹنے لگتا ہے کہ ہم دلکش سے دلکش کلاہ سلطانی کو ''بدردِ سر نمی ارزد'' کہکر اتار پھینکتے ہیں اور ہماری ہستی کی گہرائیوں سے یہ جانکاہ صدا بلند ہوتی ہے:۔

''ہائے کس خواب سے ہستی نے جگایا مجکو''

جاننے والے جانتے ہیں کہ مادیت کے علمبردار استدلالیت کے نبی اور افادیت کے مبلغ جان اسٹورٹ مل کو اپنی زندگی میں کتنی بار ایسے تاب آزما اور جاں گسل تجربے ہوئے ہیں اسپر یکے بعد دیگرے ہیجان اور اضمحلال کے دورے پڑا کرتے تھے اور اس کو کسی پہلو قرار نہ تھا اس نے اپنی ''حیات خود نوشتہ'' میں ان حالتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ایسی نازک گھڑیوں میں اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی ساری بنیاد متزلزل ہو رہی ہے اور کائنات میں کوئی ایسی دلچسپ چیز نہیں ہے جو جینے کا سہارا بن سکے۔ یہ اس شخص کا حال تھا جس کا عقیدہ یہ تھا کہ زندگی کا نصب العین کسب مسرت ہے۔ ''بطل پرست'' کارلائل بھی ایک عرصہ تک اس روحانی مرض میں مبتلا رہ چکا ہے۔ شب و روز اسکو ''دایمی نہیں'' کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور مقابلہ میں وہ ایک مدت تک ہارتا رہا۔ یہ ''دائمی نہیں'' دراصل انسان کے اندر اس شیطانی قوت کا نام ہے جو ایمان و ایقان کو فنا کرکے روح کو تشکیک و لا ادریت کے طوفان میں چھوڑ دیتی ہے، یہی ''دایمی نہیں'' ایک عمر تک امام غزالی کا پیچھا کرتی رہی یہاں تک کہ انہوں نے تصوف کی چہار دیوار میں پناہ لے لی اور یہاں ان کو قطعاً سکون ملا ہوگا اس لئے کہ زندگی۔ کائنات خیر و شر

رنج و راحت کی اصلیت سے بہت بڑی حد تک آگاہ ہو چکے تھے، بہر صورت کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ناآسودگی انسان کا مقدر ہے اور اس سے نجات پانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔

اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہیجان و اضطراب انسانی دنیا ہی تک محدود ہے اور دوسری مخلوقات اس غم سے ناآشنا ہیں؟ کون جانتا ہے کہ زمان و مکان کے تماشہ گاہ میں کون سا الم نامہ پیش کیا جا رہا ہے، جسمیں ہر مخلوق کا کوئی نہ کوئی حصہ ہے؟ بہت ممکن ہے کہ شیفتہ کا یہ کہنا واقعتاً صحیح ہو۔

"آرام سے ہے کون جہان خراب میں گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں"

یا بقول مومن:۔

"شبنم خراب جہر و کتاں سینہ چاک ماہ لو اور بھی ستم زدہ روزگار ہیں"

تو پھر کیا ہماری زندگی واقعی ایک عذاب ہے؟ کیا یہ سارا مایا جال قدرت کا کوئی دل آزارانہ استہزا ہے؟ کیا شوپن ہار کا خیال صحیح ہے کہ جس مشیت نے ایک اشارہ سے کائنات کا اتنا بڑا کھڑاگ پھیلا رکھا ہے وہ ایک شریر قوت ہے؟ دنیا میں اکثر لوگ تو ایسے ہیں کہ ان سوالات پر ایک لمحہ کے لئے بھی سر کھپانا نہیں چاہتے۔ لیکن اس بے اعتنائی سے سوالات کی اہمیت کم نہیں ہوتی ہے اور جو دل و دماغ رکھتے ہیں وہ ان سوالات پر بغیر سر کھپائے ہوئے نہیں رہ سکتے۔

زندگی اگر صرف اندھوں کا کھیل یا کسی جبار ہستی کا ظلم ناروا نہیں ہے تو پھر آخر زندگی ہے کیا، اور اسکی غرض و غایت کیا ہے؟ اس سوال کے مختلف زمانوں میں لوگوں نے مختلف جواب دیئے ہیں۔ بیکن نے اپنی مشہور عالم تصنیف "اطلانطس جدید" (New Atlantis) میں زندگی کا نصب العین قوانین قدرت کی تحقیق اور علم و حکمت کی ترقی قرار دیا ہے۔ بیچارہ اپنے زمانہ کی شورشوں سے مغلوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ بہر حال بیکن اور اس کے جانشینوں نے زندگی کے مسئلہ کو ریاضیات کا مسئلہ بنا کر چھوڑ دیا۔ وہ کہتے ہیں "ہم کو نہ یہ معلوم ہے، اور نہ یہ معلوم کرنے کی چنداں ضرورت کہ زندگی کی ماہیت کیا ہے، ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ انسان احساسات و جذبات رکھنے والا جانور ہے اب جتنا ہی مادہ انسانی احساسات و جذبات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اتنی ہی زیادہ زندگی خوشگوار ہوتی جائے گی اور اسیقدر زیادہ دنیا رہنے کے قابل جگہ بنتی جائے گی" اور انبساطی جذبات کو بڑھانے کی یہ صورت بتائی گئی ہے کہ ہم قوانین قدرت پر عبور حاصل کریں اور قدرت کو جہاں تک ممکن ہو اپنے قابو میں لائیں۔

اب آیئے تھوڑی دیر کے لئے آجکل کی مہذب دنیا کی سیر کریں جو بیکن کی "اطلانطس جدید" سے قطعاً منزلوں آگے بڑھ چکی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ طبیعیات اور کیمیا نے ہمارے لئے ہر طرح سامان عیش و تفریح بہم کر رکھا ہے ہر وہ بات جو آج سے سو سال پیشتر ناممکن معلوم ہوتی تھی نئی روشنی نے اس کو ہماری زندگی کا ایک کھیل بنا دیا ہے۔ لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان اب زیادہ پُرسکون زندگی بسر کر رہا ہے، ہمارا تجربہ اس سوال کا جواب نہیں میں دیتا ہے۔ مادیت کے قدم بہ قدم انسان کی ناآسودگی بھی بڑھتی گئی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بیکن کے وقت سے کہیں زیادہ آج کل اسپر غور کیا جا رہا ہے کہ انسان کے سکون و اطمینان کی صورت کیا ہو سکتی۔ دنیا کو سیاسی، اقتصادی، علمی اور اخلاقی حیثیتوں سے کیا ہونا چاہئے؟

یہ سوال ادبیات حاضرہ کا ایک خاص جز بنگیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک ایسا معمہ ہے جس کو حل کرنا مادیت اور ظاہر پرستی کا کام نہیں ہے۔

سائنس اور تمدن سے مایوس ہوکر اب مذہب اور تصوف کی طرف آیئے۔ اسمیں شک نہیں کہ ان دو چیزوں نے انسان کو ایک عظیم بالشان اور جلیل القدر چیز بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ پیغمبروں اور صوفیوں نے ہمکو یہ بتایا کہ ہماری زندگی ایک عکس ہے عالم مثال کا جو تمام کائنات پر محیط ہے۔ زمان و مکان کے مظاہر و حوادث چند آنی و فانی تنوعات ہیں، ایک لایزال ہمہ گیر ہمہ داں قوت کے۔ انسان ایک نقش ہے اس قادر مطلق کا جس نے ایک "کُن" سے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کر ڈالے۔ ہمکو بصد ناز یہ ندار بتایا جاتا ہے کہ:

"من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود ۔ آدم آورد دریں دیر خراب آبادم"

ہم بذریعہ انفراد و انفصال اپنی اصل سے جدا کر دیئے گئے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح "نے" "کاٹ کر نیستان" سے جدا کر دی جاتی ہے اب ہماری کوشش یہ ہونا چاہیئے کہ جس چیز کو ایک بار کھو چکے ہیں اس کو پھر پالیں، جس فردوس سے ہم ایک مرتبہ نکالے جا چکے ہیں اسمیں پھر داخل ہو جائیں یہ کیونکر ممکن ہے؟ تقریباً ہر مذہب اور صوفیوں کے ہر فرقہ نے اس کا ایک جواب دیا ہے۔ سورگ کو جیت لینے کی صرف ایک تدبیر ہے اور وہ عبادت ہے بھگتی ہے۔ معرفت ہے گیان ہے اپنے "روزگار وصل" کو پھر حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم تنوعات سے قطع نظر کرلیں اور "اصل" کا دھیان کریں۔ انسان کل میں اسطرح محو ہو جانا چاہیئے کہ جزئیات کا احساس تک باقی نہ رہجائے دنیا "دار المحن" ہے زندگی "سجن المومنین" ہے اور اس سے پیچھا چھوڑانے کی کوشش کرنا ہر ایمان والے کا منصب اولین ہے، اور اس کی یہی ایک تدبیر کہ ہم دنیا و مافیہا کو ایک نقش بر آب ایک نمود بے بود سمجھ کر خاطر انداز کر دیں۔ مذہب اور تصوف کا فلسفہ اور اصل و غایت جو کچھ بھی ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ دونوں آخر میں جلکر انسان میں معزولی اور رہبانیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یعنی زندگی کے مسئلہ کا حل یہ بتایا جاتا ہے کہ زندگی کو تج دو اور یہ کوئی حل نہیں ہوا یہ تو ایک طرح کی بے ہمتی اور نامردی ہوئی۔ زندگی اگر کوئی درد ہے تو اس کا علاج یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی ٹیسوں کی طرف سے بےحس ہو جاؤ۔ اب تک جتنے مبلغین اور متصوفین گذرے ہیں ان سبنے ایک عام غلطی یہ کی ہے کہ عقبیٰ کو دنیا سے الگ سمجھا اور سبنے بلا استثنا یہ کوشش کی کہ انسان کو خدا کیطرف لیجائیں۔ حالانکہ درحقیقت اس کوشش کی ضرورت تھی کہ خدا کو انسان کی طرف لے آیا جائے اور دنیائے انسانیت کا اپنا مرکز قائم رکھتے ہوئے الوہیت کو اس سے قریب کر دیا جائے۔ "قطرہ" میں "دجلہ" اور "جز" میں "کل" دیکھنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ قطرہ کی ہستی کو بھول جاؤ یا "جزو" کو ایک حرف غلط سمجھ لو۔ فنا فی اللہ سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ اللہ کی مخلوقات سے بیگانہ ہو جاؤ، عقبیٰ کی فکر اس کو نہیں کہتے کہ دنیا کو محو کر دو۔ عقبیٰ تو دنیا ہی کی ایک ارتقائی صورت ہے۔

زندگی نام ہے چند تعلقات کا۔ چند اعتبارات کا اور جب آپنے ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور جب آپنے تیاگ کا پرچار شروع کر دیا تو آپ جوگی سہی۔ اللہ والے سہی۔ ولی سہی۔ لیکن کم از کم آپ یہ کہنے کا منہ نہیں رکھتے کہ آپ نے زندگی کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے۔ مذہب نے تو خیر دنیا سے کسی حد تک ناتا قایم رکھا۔ لیکن تصوف نے دنیا کو بری طرح مٹانے کی کوشش کی۔ میں یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ تصوف کی بنیاد تیاگ پر ہے بلکہ برخلاف اس کے میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ تصوف نام ہے عمل اور درس عمل کا۔ لیکن دنیا میں اب تک عملاً ایسے تصوف کا وجود نہیں رہا ہے جس نصب العین اٹھا ہے ستم ظریفی یہ ہے کہ اسی کو آخر میں جلکر نظر انداز کر دیتا ہے۔ ایسے صوفیوں کا شمار شاید انگلیوں پر کیا جا سکے جن کو بنی نوع انسان کیساتھ

کوئی عملی ہمدردی رہی ہو۔ رہبانیت اور معزولی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان میں انفرادیت کا جذبہ غالب آ جاتا ہے۔ گرد و پیش کے دکھ درد کو محسوس کرنے کی صلاحیت اس میں باقی نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ صوفیوں میں ایک طرح کا جمود پیدا ہو جاتا ہے، اور ان کی ہستی کا ایک جزو مفلوج ہو جاتی ہے، یہ سب جانتے ہیں اور یہ سب کہتے ہیں کہ

"بنی آدم، اعضائے یکدیگر اند"

لیکن یہ جانتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے وہ ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھتے ہیں کہ ساری خلقت محنت و ابتلا میں سرگرداں ہے کہیں روٹی کپڑے کا رونا ہے کہیں تندرستی کا۔ کسی کو یار کا غم ہے کسی کو روزگار کا۔ کسی کو کچھ دکھ ہے کسی کو کچھ تو پھر ہم ان سب کی طرف سے آنکھیں کیونکر پھیر سکتے ہیں اور ہم کو اپنی شخصی اشراقیت میں کیا راحت مل سکتی ہے اگر ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ساری کائنات کی اصل نسل ایک ہی۔ ہم سب ایک ہی ابوالبشر کی اولاد ہیں اور ہم سب کو ایک ہی قدرت کاملہ نے پیدا کیا ہے؟ فطرت سلیم رکھنے والوں پر روشن ہے کہ جب تک ہم اپنی مادی زندگی کے کثیف اور پرشور مسایل کو روحانیت میں شامل نہیں کر لیتے جب تک روحانیت کی بنیاد تجرد پر ہے اسوقت تک روحانیت کے ہاتھوں ہم کو سکون ملتا نظر نہیں آتا۔

اب سکون کی تلاش میں صرف دنیائے شاعری کا جایزہ لینا رہ گیا ہے شاعری کا دنیا پر ابتدائے آفرینش سے جو احسان ہے اسکا اعتراف نہ کرنا سچا کفر ہے، اگر آج دنیا میں شاعری نہ ہوتی تو زندگی قطعاً عذاب تھی اور خودکشی ہماری نجات کا ذریعہ۔ شاعری نے ہمکو اس قابل بنایا کہ ہم اس عذاب کو راحت سمجھیں اور اپنی دوزخ کو جنت بنالیں۔ شاعری نے جو سب سے بڑا کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی ثنویت کو قایم رکھتے ہوئے اس کو فردوس میں تبدیل کر دیا ہے۔ شاعر جبتک اسیر مذہب اخلاقیات یا تصوف کا غلبہ نہیں ہوتا، انسان کی انسانیت کو قابل ملامت نہیں سمجھتا۔ وہ ان کمزوریوں کا احترام کرتا ہے جن کی بدولت انسان انسان ہوا، اسکو اس بات پر ناز نہیں ہے کہ انسان کبھی فرشتہ تھا۔ اسکے نزدیک فخر و مباہات کی اگر کوئی بات ہے تو یہ ہے۔

"آسماں بار امانت نتوانست کشید　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند"

شاعر کا مذہب محبت ہے اور محبت نام ہے تعلقات میں جکڑے رہنے کا۔ محبت کا تقاضا ہے کہ لاکھ تم کو محرومیوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ لاکھ ہجر کی سختیاں جھیلنا پڑیں۔ لاکھ الٹی سانسیں لینا پڑیں مختصر یہ کہ زمانہ لاکھ تم کو ستائے تم اپنی محبت میں ہنستے کھیلتے ثابت قدم رہو شاعر اسکو شایان شان نہیں سمجھتا کہ محبت کی صعوبتوں سے گھبرا کر محبوب کو ترک کر دے اور "الاماں" کہتا ہوا گوشۂ عافیت اختیار کر لے۔ بلکہ اس کے بالکل برخلاف وہ ہر مصیبت اور ہر ستم پر "ہل من مزید" کا ترانہ بلند کرتا ہے۔ وہ اگر روتا بھی ہے تو ہنس ہنس کر اور مزے لے لے کر۔ وہ ہم کو یہ سبق دیتا ہے کہ زندگی کا راز دھن اور لاگ ہے اور اس کا مقصد حرکت و اضطراب ہے نہ کہ افسردگی اور مجہولیت۔ شاعر جانتا ہے کہ ہمارے "چمن" کی "بہار" نت نئی شکستہ رنگیوں پر منحصر ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت کو کما حقہٗ سمجھ چکا ہے جو بقول درد بس اسقدر ہے:-

"مرگ باز یست کارہا دارد　　زندگی انتظارہا دارد"

یہ مان لیا کہ زندگی ایک بلا ہے اور ہستی کا یہ سارا جنجال کسی شریر قوت کا اندھیر ہے، لیکن ہم اس کو اپنے لئے سرمایۂ راحت بنا سکتے ہیں۔

ہم کو اپنی بیچینیوں میں سکون حاصل کرنا ہے تو ہمکو اپنی کرب کی کروٹوں سے راحت ملے گی۔ راحت یا سکون کوئی خارجی چیز نہیں ہے بلکہ خود اپنے اندر موجود ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ

"تمام کا ہے میرے وہ دکھ جو کسی کو نہ ملا　　کام کا ہے میرے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا"

تو انسان کو اس خیال سے خوش ہونا چاہئے اور اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے۔ ہم میں ایک ذوق۔ ایک جوش۔ ایک حوصلہ کی ضرورت ہے، پھر ہماری زندگی کبھی تلخ اور بدمزہ نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم میں شغف اور انہماک کا ملکہ ہے۔ اگر ہم دھن کے پورے ہیں۔ اگر ہم خلوص کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ:۔

"اگر قضا و قدر ز آسماں فرود آید　　من خیال تو باخیر دشرچہ کار مرا"

تو پھر یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم نے قضا و قدر پر واقعی فتح پائی ہے۔

شاعر کا پیغام یہ ہے کہ اگر آلام و مصائب ہماری قسمت میں ہیں۔ اگر ہم مجبور ہیں تو یہ کیا کم ہے کہ :؎ "ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر" کم از کم ہم کو اپنی مجبوری کے اندر پورا اختیار حاصل ہے اگر ہم تڑپائے جاتے ہیں تو ہمارا کام یہ ہے کہ اپنی تمام قوت تڑپنے لوٹنے اور سر دھننے میں صرف کر دیں "گرانی محمل" کا جواب صرف یہ ہے کہ اپنی "حدی خوانی" کو تیز کر دیا جائے، زندگی کی تکان کو دور کرنے کی یہی ایک صورت ہے، ہستی کا غم یونہی غلط ہو سکتا ہے یعنی زندگی کے مسئلہ کا حل عمل ہے نہ کہ تیاگ اور بیراگ۔

شاعر سے اگر "ذاتیت" (Subjectivism) اور انفرادیت کی خامی دور کر دی جائے (اور خدا کا شکر ہے کہ وہ آجکل بہت حد تک دور ہو چکی ہے اور دور ہوتی جا رہی ہے) تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج جبکہ مذہب ایک ڈھکوسلا ثابت ہو چکا جبکہ تصوف کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔ جبکہ مادیت کی بے مائگی ظاہر ہو چکی ہے اور جبکہ مجاز اور حقیقت کی لغو تفریق مٹ چکی ہے اور مجاز بجائے خود ایک حقیقت رکھنے لگا ہے۔ انسان کا اگر کوئی نجات دہندہ ہو سکتا ہے تو شاعر جس کا پیغام یہ ہے۔

"عمل کن عمل کن کہ خامی ہنوز"

یہی زندگی ہے اور یہی روحانیت۔

مجنوں گورکھپوری

کتاب سانس کے عجائب میں کیا ہے؟

(۱) سانس کے ذریعہ سے تندرستی و بیماری کا حال معلوم کرنا۔
(۲) سال کی اچھائی برائی پر حکم لگانا۔
(۳) ازالہ مرض کرانا۔
(۴) غالب مغلوب کو پہچاننا۔
(۵) بھاگے ہوئے کا پتہ چلانا
(۶) دل کے حالات معلوم کرنا۔

صرف ۴ر آنہ کا ٹکٹ بھیجنے سے مفت ملسکتی ہے۔

"منیجر نگار" ۔ لکھنؤ

جن حضرات کا چندہ اس رسالہ ماہ دسمبر ۲۹ء کے ساتھ ختم ہوتا ہے

ان کو اطلاع دی جاتی ہے کہ جنوری ۱۹۳۰ء کا پرچہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں تیار ہو جائے گا، اگر اس سے قبل پانچ روپیہ ذریعہ منی آرڈر وصول ہو گئے تو خیر ورنہ جنوری کا رسالہ وی۔پی کے ذریعہ سے روانہ ہوگا۔

وی۔پی مع محصولڈاک ۵؍۲ میں ہوگا اور ڈاکخانہ آپ سے دو آنے زائد لے گا، اس طرح گویا ۵؍۴ ادا کرنا پڑیں گے، منی آرڈر روانہ کرنے کی صورت میں ۴ر آنہ کی بچت ہوگی۔

جو حضرات رعایتی قیمت پر کتابیں حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ رعایتی قیمت چندہ کے ساتھ ہی روانہ کردیں تو بہتر ہے۔ کتابیں ذریعہ وی۔پی طلب کرنے میں، ان کو اس امر کا انتظار کرنا پڑے گا کہ یہاں نگار کا چندہ وصول ہو جائے۔ کیونکہ یہ رعایت نگار کے خریدار رہنے ہی کی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے۔ کتاب سائنس کے عجائب۔ بالکل مفت دی جائے گی لیکن اس میں بھی وصول چندہ کی شرط ہے۔ یوں ۴ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر روانہ ہوگی۔

نگار کا آئینہ نمبر

۱۶۰ صفحات کو محیط ہوگا اور بعض نہایت بیش بہا مضامین اسمیں ہوں گے، کوئی مضمون ناقص و نامکمل نہ ہوگا۔

جن حضرات کا چندہ دسمبر میں ختم ہو رہا ہے۔ ان کو ایک مطبوعہ تحریر اسی رسالہ کے اندر ملیگی۔ اس کو ملاحظہ کرنے کے بعد فیصلہ فرمایئے کہ آئندہ خریدار رہنے کی صورت میں آپ منی آرڈر بھیجنا مناسب سمجھتے ہیں یا وی۔پی طلب فرمانا۔

ادبی خطوط غالب

جنکو

مرزا محمد عسکری صاحب بی۔اے لکھنوی نے نہایت محنت و عرقریزی سے کتب مذکورہ بالا سے اخذ کر کے باضافہ ایک بسیط اور مفید مقدمہ اور مرزا غالب کے اکثر مکتوب الیہم کے دلچسپ حالات و نمونہ کلام کے مرتب کیا ہے

حجم ۳۰۰ صفحات تقطیع ۲۲×۱۸ قیمت مع تصویر غالب (عہ)

،،مینیجر نگار نظیر آباد لکھنو،،

باب الاستفسار

ساردا بل، صغر سنی کی شادی، اور ہمارے علما کی غلط فہمیاں

(جناب سید عبدالکبیر صاحب۔ دار جلنگ)

آپ نے اس سے پہلے رسالۂ نگار میں مختصر طور پر اپنی رائے ساردا بل کے موافقت میں ظاہر کی تھی، لیکن وہ رائے غالباً سرسری تھی اور ضرورت اس امر کی ہے کہ ان دلایل کے مقابلہ میں جو علما کی طرف سے بیان کئے جاتے ہیں زیادہ شرح و بسط سے کام لیا جائے۔ اس لئے موقعہ و محل کے لحاظ سے اگر اس کو دیگر استفسارات پر مقدم سمجھ کر درج نگار فرمائیں گے تو غالباً بے محل نہ ہوگا۔

(نگار) اگر آپ کا یہ استفسار میرے سامنے نہ ہوتا تو بھی میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس ماہ کے نگار میں کم از کم بہ سلسلۂ ملاحظات ہی، اس مسئلہ پر زیادہ وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالوں گا، لیکن اب آپ کے استفسار نے اس ارادہ کو اور زیادہ قوی کر دیا اور میں آج کی صحبت میں اس باب پر اپنی رائے واضح طور پر ظاہر کئے دیتا ہوں:۔

دنیا کی جتنی مذہبی قومیں ہیں، ان کے قانون و شریعت پر دو طرح بحث ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ اصل ماخذ شریعت کو سامنے رکھ کر اس سے کوئی نتیجہ نکالا جائے اور دوسرے یہ کہ تمدنی ضروریات کے لحاظ سے عقل کو راہبر بنا کر تنقید کی جائے۔ چونکہ نکاح کا مسئلہ بھی منجملہ قانون یا شرعی مسایل کے ہے، اس لئے اس پر بھی دونوں پہلوؤں سے گفتگو ہو سکتی ہے اور ہونا چاہئے۔

میں اس جگہ نفس مسئلہ نکاح پر کوئی عقلی یا نقلی بحث نہیں کروں گا اور نہ فلسفۂ ازدواج سے اعتنا کرنا میرا مقصود ہے (مگر اس حد تک کہ ضمناً اس کا ضروری ہو)، بلکہ جہاں تک ساردا بل کا تعلق ہے، اسی حد تک اپنی گفتگو کو محدود رکھوں گا۔ اس سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ساردا بل کا نفاذ، جہاں تک واضع قانون کی نیت کا تعلق ہے۔ حد درجہ نیک نیتی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ اور اس سے کوئی مذہبی یا قومی، تمدنی یا سیاسی اختلاف مقصود نہیں ہے، لیکن فریق مخالف اس کے جواب میں کہہ سکتا ہے کہ صرف حکومت کی نیک نیتی اس امر کی کافی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ لوگوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرے اور جن باتوں کو ان کے مذہب نے جایز قرار دیا ہے حرام کر دے۔ اور یہی اصل روح ہے تمام مخالفین ساردا بل کے جواب کی، جسکو مختلف اسلوب بیان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اگر آج واقعی اس کا فیصلہ ہو جائے کہ مذہب اسلام نے صغر سنی کی شادی کو جایز قرار دیا ہے، تو یقیناً اس بل سے اتفاق کرنا مذہب کی مخالفت ہوگی اور اگر یہ ثابت نہ ہو سکے تو پھر ساردا بل کے خلاف احتجاج شاید ہی کوئی ایسا احمق ہوگا جو عقل کے منافی نہ سمجھے

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ جتنے علماء کرام کے بیانات اس باب میں شائع ہوئے ہیں انہوں نے بالاتفاق اس کو تسلیم کیا ہے کہ صغر سنی کی شادی فعل حسن نہیں ہے اور یقیناً بہت سی معاشری خرابیاں اس سے پیدا ہو سکتی ہیں اس لئے میرا سب سے پہلا اعتراض ان حضرات پر یہ ہے کہ اگر اصول صحت و معاشرت کے لحاظ سے صغر سنی کی شادی فعل حسن نہیں ہے، تو کیوں مذہب اسلام نے اس کو جائز قرار دیا، جبکہ شریعت اسلام کو بہترین شریعت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسکا جواب ان کے پاس صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اگر صغر سنی کی شادی کو ممنوع قرار دیا جاتا تو بعض ایسی صورتوں میں جبکہ مصلحتاً اور ضرورت وقت و زمانہ کے لحاظ سے کسی لڑکی کا قبل بلوغ شادی کرنا مناسب ہوتا ہے، ہم مجبور ہوتے اور اس فتنہ و فساد کا سدّباب نہ کر سکتے جس کے دفعیہ کی بہترین تدبیر صغر سنی کی شادی ہی ہو سکتی ہے۔ اور اسی خیال کی بنا پر انہوں نے احتجاج کیا ہے کہ اس مسئلہ کا انحصار صرف علماء یا رہبران قوم پر ہونا چاہئے تھا اور حکومت کو قانون بنا کر یہ ذمہ داری اپنے سر نہ لینا چاہئے تھی کیونکہ یہ مداخلت فی الدین ہے اور وہ فعل جو کسی مصلحت کی بنا پر حلال قرار دیا گیا ہے، اسے حرام ٹھیرانا ہے۔ سب سے پہلے میں ان حضرات کو ساکت کردوں جو یہ کہتے ہیں کہ اس مسئلہ کا فیصلہ عالمان دین پر چھوڑ دینا چاہئے اس کے بعد بحث کے دوسرے پہلوؤں پر غور کروں گا۔

میں ان عالمان دین سے جو اپنے آپ کو حامل شرع متین و ہادی راہ یقین کہتے ہیں اور جو قومی معاشرت کی اصلاح کو اپنا فرض دینی قرار دیتے ہیں، یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ صغر سنی کی شادی کا استکراہ کب سے ان کے علم میں ہے، اگر ان کا یہ علم اسی قدر قدیم ہے جس قدر اُن کا وہ جبہ و دستار جو اعلان فضیلت کے وقت ان کے سر و دوش پر ڈالدیا گیا تھا، تو کیا میں ان سے پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت تک انہوں نے اس رسم قبیح کے مٹانے میں کیا کوششیں کیں، اور کتنے مسلمانوں کو اس فعل سے باز رکھا۔ میں ہندوستان کے عرض و طول میں ہر اس شخص سے جو اپنے آپ کو مولوی ہونے کی حیثیت سے نکاح کے عقد و فسخ کا تنہا ذمہ دار سمجھتا ہے دریافت کرتا ہوں کہ کیا اسکی زندگی میں کوئی ایک واقعہ ایسا ہوا ہے جس میں اس نے صغر سنی کی شادی سے انکار کر دیا ہو یا انکار نہ کیا ہو تو فریقین کو صرف سمجھا ہی دیا ہو کہ یہ فعل محمود و مستحسن نہیں ہے، غالباً وہ نہیں بتا سکیں گے۔ لیکن برخلاف اس کے ہزاروں لاکھوں ایسی مثالیں موجود ہیں جنمیں انہیں مولویوں نے جو آج ساردا بل کی مخالفت میں گردن کی رگیں پھلا پھلا کر اسٹیج پر آتش فشاں و شعلہ ریز تقریریں کر رہے ہیں، صغر سنی کی شادی پر نہ صرف جواز کے فتوے دیئے بلکہ بغیر کسی مصلحت کے بغیر کسی حیلۂ شرعی کے خود خدا جانے کتنی کمسن لڑکیوں کی قربانی اپنے "عشق پیرانہ سر" کے دیوتا پر چڑھا کر ہمیشہ کے لئے ان کو اس جائز فطری نشاط سے محروم کر دیا جو ایک جوان عورت کو جوان مرد ہی کے آغوش میں میسر آ سکتا ہے۔

آج اگر ان ہادیان طریقت کے تمام وہ کارنامے ہم پر ظاہر ہو جائیں جو دراز عباؤں کے وسیع دامنوں میں، لمبی چوڑی داڑھیوں کے طویل سایوں میں اور قرآن و حدیث کی اس اعجوبہ خیز تفسیر و تشریح کی اوٹ میں جو اُن کے لئے ہر حرام کو حلال اور ہمارے لئے ہر حلال کو حرام بنا دینے میں "سحر سامری" سے کم مرتبہ نہیں رکھتی، کئے جاتے ہیں، تو دنیا یہ دیکھ کر حیران ہو جائے کہ ہمارے کتنے وہ "ناکردہ گناہ"، جن کی حسرت بیان سے رہ جانے کا ذکر غالب نے کیا ہے، ان کے نامۂ اعمال میں کس طرح تو بر تو اور تہ بر تہ پائے جاتے ہیں، اور نہ صرف یہ بلکہ کتنی صورتیں معصیت کی ایسی ہیں جو کبھی ہم غریبوں کے خیال میں بھی نہیں گذرتیں اور یہ ہیں کہ خدا معلوم کتنی بار ان کو "چوم چوم کر" اور "چھوڑ چھوڑ کر" کر کے چھوڑ چکے ہیں اور فسق و فجور کو ایک فن کی حیثیت سے مرتب کر گئے ہیں۔

پھر مجھے حیرت ہے کہ جن کے بطون کا یہ حال ہو ان پر کیونکر اصلاح معاشرت کے کسی مسئلہ کا انحصار ہو سکتا ہے، صغر سنی کی شادی پر کس طرح انکا اقتدار مناسب ہے اور بھیڑوں کی چوپانی کیونکر ایک غیر راعی کے سپرد ہو سکتی ہے

اگر کہا جائے کہ ان کو صغر سنی کی شادی کا استکراہ حال ہی میں اس وقت سے محسوس ہوا ہے جب سے یہ تحریک ملک میں شروع ہوئی تو کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۶ء سے لیکر (جبکہ اول اول یہ مسئلہ ملک کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس وقت تک کتنی بار انہوں نے اس کے استکراہ لوگوں پر ظاہر کیا اور کتنی لڑکیوں کو انہوں نے اس بلا سے بچایا۔ غالباً ایک بار بھی نہیں، پھر جو جماعت ۲۳ سال کے عرصہ میں کوئی ایک مبارک مثال بھی منع و احتراز کی اپنی طرف سے پیش نہ کر سکتی ہو، اس کا آج یہ کہنا کہ "آئندہ ہم ضرور ایسا کرتے" ایسی سفیہانہ نہیں، بلکہ مفسدانہ جسارت ہے جس کے جواب کے لئے یقیناً کسی دلیل کی ضرورت نہیں

اسی سلسلہ میں آئیے ان خطرات پر بھی اک نگاہ ڈال لیں جو سارڈا بل کے نفاذ سے مولویوں کے نزدیک ظہور میں آسکتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد بدایونی نے (جنکی عزت میری نگاہ میں ان کے فضل و کمال سے زیادہ انکی ذہانت کی وجہ سے قائم ہے) اپنے مکتوب میں جو ممبرانِ اسمبلی کو مخاطب کر کے شائع کیا ہے بہ پندار خود صرف عقلی دلایل پیش کر کے حد درجہ ناصحانہ و مشفقانہ انداز سے نرم لہجہ میں گفتگو کی ہے اور تمام ان خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو اس قانون کے نفاذ سے ظاہر ہونے والی ہیں۔ اس لئے میں اس کو سامنے رکھکر بحث کے اس پہلو کو بھی ختم کئے دیتا ہوں۔

سب سے پہلے مولانا نے ممبران اسمبلی کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ:۔

> "میں سمجھتا ہوں کہ صغر سنی کی شادی کے انسداد کی طرف جو قباحت مائل و متوجہ کرنے والی ہوئی وہ صرف یک تھی یعنی "قبل از وقت مباشرت" مگر قابل معافی ہوں اگر برادرانہ اخلاص سے اس غلط فہمی کی طرف جناب کو متوجہ کروں کہ نکاح و مباشرت کو ایک سمجھ لیا گیا۔ شریعت اسلامیہ مباشرت قبل از بلوغ کو ظلم بتاتی ہے اور اسی لئے چاہے مسلمانوں میں کمسنی کی شادی کی مثال شاذ و نادر کہیں مل بھی جائے مگر مباشرت قبل از بلوغ کے جواز کا ثبوت مشکل ہی سے مل سکیگا اور رواج و عمل کی مثال تو مس میو جیسی ...... بھی مسلمانوں کے متعلق قطعاً پیش نہ کر سکی"

امر اول کو ہر ذی ہوش انسان تسلیم کرے گا اور اس لئے یہ کہنا کہ ممبران اسمبلی نے دونوں کے فرق کو محسوس نہیں کیا، قیاس مع الفارق ہے، لیکن مولانا کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بجائے نکاح کے مباشرت کے لئے وقت کی تعیین کر دی جاتی تو انہیں کچھ عذر نہ ہوتا لیکن غالباً مولانا کو معلوم نہیں کہ ۱۳ سال سے کم عمر کی لڑکی سے مباشرت تو پہلے ہی سے تعزیرات ہند میں ممنوع ہے۔ ضرورت تو اس کی تھی کہ ایسے نکاح ہی کو ناجائز قرار دیا جائے جس سے قبل از بلوغ مباشرت کا نہ صرف امکان بلکہ وقوع ہوا کرتا ہے۔ میں مولانا سے دریافت کرتا ہوں کہ اگر تیرہ سال کی لڑکی سے کسی کی شادی ہو جائے تو کیا اس کا شوہر اس کو اپنے گھر نہیں لے جا سکتا اور اگر وہ لیجا سکتا ہے تو پھر اس کا یقین کس کو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ مباشرت نہ کریگا، جبکہ سیکڑوں واقع چھ چھ سات سات سال کی لڑکیوں کے عصمت دری کے موجود ہیں۔ چنانچہ بالکل حال کا واقعہ ہے کہ ایک شخص حمید اللہ نے حیدرآباد میں اپنی کمسن بیوی سے مقاربت کر کے اس کو ہلاک کر ڈالا۔ اگر مولانا کے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ وہ نکاح کے بعد لڑکی کی رخصتی کو روک سکتے ہیں یا رخصت ہونے کے بعد اس کے شوہر کو مقاربت سے باز رکھ سکتے ہیں، تو

براہ کرم پہلے اس کو بتائیں تاکہ اسپر غور کیا جائے ورنہ یوں تو وہ خرابی دور نہیں ہو سکتی جس کو وہ خود بھی ظلم سے تعبیر کرتے ہیں اور شریعت کے نقطۂ نظر سے ناجائز۔

امر دوم کے متعلق بصد ادب یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مولانا نے یا تو قصداً "کتمان حقیقت" سے کام لیا ہے یا یہ کہ انہیں حقیقت کا علم نہیں۔ جناب تصدق احمد خاں صاحب شروانی نے جو اعداد و شمار کمسنی کی شادی کے مسلمانوں میں پیش کئے ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ ہندوؤں کے قریب قریب ہیں بلکہ کہیں ان سے زیادہ زائد ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ مولانا کی زبان میں "شاذ و نادر" کا استعمال "کثرت اعداد" کی کس حد تک استعمال ہوتا ہے۔

امر سوم میں مولانا فرماتے ہیں کہ مباشرت کا جواز شریعت اسلامیہ میں "مشکل" ہی سے ملسکتا ہے، اگر "مشکل" کے معنے نفی مطلق کے ہیں تو خیر، اور اگر اس کا مطلب ہو کہ ضرورت کے وقت کوئی مولوی اپنے لئے یا کسی اور کے لئے اس کو جائز قرار دے سکتا ہے۔ تو براہ کرم اس طریق استدلال سے آگاہ فرمائیے۔

امر چہارم میں مولانا نے اسی ذہانت سے کام لیا ہے جس کا میں شیفتہ ہوں۔ یعنی مولانا نے "مباشرت قبل از بلوغ" کے رواج و عمل کے انکار کی ذمہ داری خود اپنے سر نہیں لی ہے، بلکہ اس باب میں اپنے اختیارات مس میو کو دیدیے ہیں۔ یعنی مولانا خود تو انکار نہیں کرتے لیکن جب مس میو نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا تو انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ خود اس راز کو افشا کریں۔

آگے چلکر مولانا فرماتے ہیں:۔

> "چونکہ بلوغ مزاج، آب و ہوا کے لحاظ سے ہر ملک و ہر صنف میں مختلف عمر میں ہوتا ہے اس لئے اسلام نے کوئی عمر مقرر نہیں کی بلکہ صرف بلوغ پر مدار رکھا، البتہ نکاح ہر عمر میں جائز ہے۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ بعض اوقات ہر ملک، ہر شہر، ہر خاندان میں ایسے حالات پیش آجاتے ہیں یا آسکتے ہیں، جن کے سبب لڑکی کے متعلق ۱۴ سال سے قبل اور لڑکے کے لئے ۱۸ سال سے قبل تنظیم آل و حفاظت ماحول، و اصلاح مآل کی خاطر ایسی ضرورتیں ناگزیر ہو جاتی ہیں کہ اگر ان کا نکاح اس وقت نہ کر دیا جائے تو انکی زندگیاں برباد، خاندانی میراث و املاک ضائع یا ان کے ناموس تباہ ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ انگریزی قانون کے ہمہ گیر حول میں شرع اسلامی کے جو چند درے باقی رہ گئے ہیں وہ نکاح، مہر، طلاق، وقف وغیرہ کے ہیں ساردا ایکٹ ان سب پر غارتگری کا پہلا حملہ ہے اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد کیا ضمانت ہے کہ اسلامی تعداد ازدواج کے بھی خلاف قانون نہ پاس کرایا جائے گا، اور پھر اس کے بعد خلع و طلاق کا قانون بھی انگریزی یا ہندی مزاج کے مطابق نہ بنایا جائے گا۔"

یہ بالکل صحیح ہے کہ بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے، لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ ہندوستان میں اکثر و بیشتر ۱۴ سال کی عمر میں لڑکی جوان ہو جاتی ہے اس لئے قانون کا نفاذ شاذ مثالوں کے لئے نہیں روکا جا سکتا۔ قانون میں ہمیشہ اکثریت و صلاحیت کو دیکھا جاتا ہے، یعنی یہ کہ اکثر صورتیں کیا پیش آتی ہیں اور بہترین ممکن طریقہ کسی امر کے طے کرنے کا کیا ہے۔ دنیا میں کوئی قانون اس دعوے کے ساتھ پیش نہیں کیا جاتا کہ اسمیں

کوئی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا، یا یہ کہ اس میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں نکل سکتا، بلکہ مدعا صرف یہ ہوتا ہے کہ حالات حاضرہ میں بہترین صورت کو اختیار کیا جائے اور اکثریت کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس لئے مولانا کی یہ دلیل تو کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اب رہ گیا سوال مصالح کا، سو وہ بھی تجزیہ کرنے کے بعد کچھ نہیں رہتے۔ زیادہ صاف الفاظ میں گویا مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر لڑکی کی شادی کمسنی میں نہ کر دی جائے تو جائداد تباہ ہو جاتی ہے۔ اور کبھی اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عصمت نہ کھو بیٹھے۔ اول تو میری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ کمسنی کی شادی اور تحفظ جائداد میں باہم کیا علاقہ ہے۔ اس کی ایک مثال زیادہ سے زیادہ یہ فرض کی جا سکتی ہے کہ ایک شخص بستر مرگ پر ہے اور اس کی کمسن لڑکی غیر منکوحہ ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی سے اس کی شادی کر دوں تاکہ جائداد برباد نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ ایسے شخص کو کوئی شخص شادی کے لئے نہیں ملا تو وہ کیا کرے گا، یا یہ کہ بجائے لڑکی کے کمسن لڑکا ہے تو وہ کیا صورت تحفظ جائداد کی اختیار کرے گا۔ عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ جائداد کسی ولی کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ کمسن لڑکی بھی ولی کے سپرد نہ کی جائے اور وہ بعد بلوغ اس کے نکاح کا فیصلہ کرے۔ لیکن اگر ہم اس کو تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیں تو میں یہ سوال کروں گا کہ ہزار میں کتنے مسلمان صاحب جائداد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کو کمسن چھوڑ کر مرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ۲۰ فرض کر لیجئے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا ہزار میں ۲۰ کی رعایت تو ان کی دولتمندی کی وجہ سے کرتے ہیں لیکن ۹۸۰ کا تباہ ہونا گوارا کر لیتے ہیں اس لئے کہ ان کے پاس جائداد نہیں ہے۔ رہا سوال حفاظت عصمت کا سو یہ اس سے بھی زیادہ مہمل ہے۔ کیونکہ خیال عصمت منحصر ہے زیادہ تر تربیت پر۔ اگر لڑکی کی تربیت اچھی ہے تو اس کا اندیشہ نہیں۔ ورنہ بعد بلوغ و قبل بلوغ دونوں طرح اندیشہ رہتا ہے۔ اگر کوئی لڑکی گیارہ سال میں بالغ ہو گئی تو اس کی طرف سے یہ اندیشہ کرنا کہ ممکن ہے وہ عصمت کی حفاظت نہ کرے، اتنا زیادہ قرین قیاس نہیں ہے جتنا شادی کرنے کے بعد ختنا چھوڑ دینے سے۔ پھر یہ اکثر ہوتا ہے کہ شادی کر کے شوہر اپنی جوان عورت کو گھر پر چھوڑ جاتا ہے اور خود مہینوں بلکہ برسوں کے لئے باہر بسلسلۂ ملازمت و تجارت غائب رہتا ہے۔ اس لئے مولانا بتائیں کہ شرع میں کہاں اس کی ممانعت ہے۔ اور کیوں نہ ان کے نقطۂ نظر سے ایک اور قانون "متارع ہجر الزوجہ بعد النکاح" نافذ کیا جائے۔

اسی کے ساتھ مولانا نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ آگے چل کر نکاح، خلع، طلاق، وراثت وغیرہ کی اسلامی شریعت پر حملہ نہ کیا جائے۔ اس کا جواب میرے پاس صرف یہ ہے کہ "خدا وہ دن تو کرے" البتہ "تعدد ازدواج" کے باب میں جو اندیشہ مولانا کو ہے اس سے میں اختلاف نہیں کروں گا، کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو پھر "غریب مولوی" مر جائے گا، اور اس کی وہ تمام کارگاہِ خیال جس کو سامنے رکھ کر فردوس کی موعودہ حوروں کی یاد میں چار چار شادیاں کرنے پر بھی اپنی ہوس کی پوری صیقل نہیں کر سکتا، بالکل درہم برہم ہو جائے گی۔ اور یہ سانحہ اس کے "حیاتِ نشاط" اور "نشاطِ حیات" دونوں کے لئے کسی طرح قابل برداشت نہ ہو گا۔

یہاں تک تو ہو گئی عقلی بحث، اب آئیے اس سلسلہ میں قرآن مجید کو بھی دیکھ لیں کہ اس مسئلہ میں کیا فرمان ہے۔

کلام مجید میں نکاح کا ذکر چند جگہ آیا ہے اور ان میں کوئی مقام یا کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے صغر سنی کی شادی کی اجازت پیدا ہوتی ہو بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہاں بلوغ سے قبل کی شادی ممنوع قرار دی گئی ہے، اور اس وقت تک جتنے نکاح مولویوں نے قبل از بلوغ کئے ہیں وہ سب ناجائز تھے۔ سورۃ الروم میں نکاح کی غرض و غایت کو جن صریح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ

مذہب اسلام نے فلسفۂ نکاح کو کیا سمجھا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ

یعنے خدا نے تمہارے لئے جوڑے اس لئے پیدا کئے ہیں کہ تم ان سے جی کا سکون پاؤ اور آپس میں خلوص و محبت کا رابطہ پیدا ہو۔

ظاہر ہے کہ نہ اس فلسفہ سے بہتر کوئی فلسفۂ نکاح پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی مسئلہ ازدواج اس اصول سے ہٹ کر مرتب ہو سکتا ہے۔ پھر غور کیجئے کہ آیا کمسنی کی شادی میں یہ کیفیت باہم پیدا ہو سکتی، کیا نابالغ بچے اُس راحتِ قلب اس سکونِ جاں اور اس لذتِ اتحاد کو سمجھ سکتے ہیں جس کا ذکر کلام مجید میں کیا گیا ہے۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:۔ فانکحوا ما طاب لکم من النساء " یعنی ان عورتوں سے جو تمہارے دل کو بھائیں نکاح کرو"
ظاہر ہے کہ ایک مرد کے دل میں عورت کی طرف میلان بلوغ کے بعد ہی ہو سکتا ہے اور ایک عورت بالغ ہونے کے بعد ہی پسندیدگی کے قابل ہوتی ہے۔

اس صورت میں یتامیٰ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

وابتلوا الیتامیٰ حتیٰ اذا بلغوا النکاح فانِ آنستم منہم رشداً فادفعوا الیہم اموالہم۔ یعنی یتامیٰ کی نگرانی کرو اس وقت تک کہ وہ بالغ ہو جائیں اور اگر تم دیکھو کہ وہ ذی شعور ہو گئے ہیں تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔

غالباً یہ معلوم کر کے لوگوں کو حیرت ہو گی کہ ابو حنیفہ نے بلوغ کی عمر اٹھارہ سال قرار دی ہے، جو آج مردوں کے لئے ساردا بل میں تجویز کی گئی ہے۔

کلام مجید میں ایک آیۃ اور ہے جس سے نابالغ لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی ممانعت ظاہر ہوتی ہے ملاحظہ ہو:۔

یا ایہا الذین آمنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرہا۔ اے ایمان والو تمہارے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ جبر و اکراہ سے عورتوں کے وارث بن جاؤ۔ یعنی مدعا یہ ہے کہ عورتوں سے اجازت حاصل کر کے ان کی مرضی و خوشنودی سے ان کے شوہر و وارث بنو اور ظاہر ہے کہ ایک نابالغ لڑکی اس کی اہل ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی رضامندی کا اظہار کر سکے۔ اس میں اتنی سمجھ ہی نہیں ہوتی کہ وہ اچھے برے میں تمیز کر کے اپنے شوہر یا وارث کا انتخاب کرے۔ اسی لئے اس آیت کے نزول کے بعد اسلام میں کوئی نکاح نابالغ لڑکی سے عمل میں نہیں آیا۔

امام سرخسی نے ذیل کی آیت سے نکاح صغیرہ کا جواز ثابت کیا ہے:۔ واللائی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتہن ثلثۃ اشہر واللائی لم یحضن۔

طلاق کے سلسلہ میں عدت کا بیان ہوتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ جو عورتیں کبر سنی کی وجہ سے حائضہ نہیں ہوتی ہیں یا جن کو حیض ہی نہیں آتا ہے انکی عدت تین ماہ ہے۔

اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ واللائی لم یحضن سے نابالغ لڑکیاں ہی مراد ہیں اور وہ عورتیں مراد نہیں جن کا کسی بیماری کی وجہ سے

حیض بند ہو جاتا ہے، تو بھی اس آیت سے صغیرہ کے نکاح کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ آیت ان نکاحوں کے متعلق نازل ہوئی تھی جو اس سے قبل کی آیت نازل ہونے سے پہلے عمل میں آ چکے تھے اور اس لئے اس سے نکاح صغیرہ کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

کلام مجید کے ساتھ جب احادیث پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے نکاح کے لئے عورت کی اجازت کو بہت ضروری قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ طلب اجازت صغیرہ سے نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ بالغ لڑکی سے ممکن ہے۔ چونکہ اس قسم کی متعدد روایات تمام مشہور کتب حدیث میں باب النکاح کے تحت پائی جاتی ہیں، اس لئے ان کے اندراج کی ضرورت نہیں۔ من شاء فلیرجع الیہ

نکاحِ صغیرہ کے جواز میں لوگوں نے جناب عایشہ کے واقعۂ نکاح کو پیش کیا ہے، حالانکہ اصولاً اس سے استناد صحیح نہیں کیونکہ رسول اللہ کا نکاح جناب عایشہ سے قبل اس آیت کے نزول کے ہو چکا تھا جس میں طلب اذن کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کی صورت بالکل وہی تھی جیسی تعدد ازدواج کی تعیین کی کہ اس کی آیت بھی رسول اللہ کی متعدد شادیاں ہو جانے کے بعد نازل ہوئی۔

پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مسئلہ جس کی تصدیق میں قرآن کے احکام صراحۃً موجود ہیں، جس کے باب میں احادیث کی تائید موجود ہے۔ جو طباً، تمدناً، اور اخلاقاً ہر طرح مستحسن قرار دیا جاتا ہے، اس سے اختلاف کرنا اور اختلاف بھی ایسا شدید کہ معلوم ہوتا ہے مولویوں کے سر پر کوئی پہاڑ آسمان سے ٹوٹ پڑا ہے، کس عجیب و غریب ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس قانون سے خود مولویوں کی تمناؤں اور آرزوؤں پر پانی پھرا جاتا ہے، اور ان کی مخالفت اصلاح معاشرت نہیں، بلکہ خود اپنے جذبات کی رعایت پر مبنی ہے

وائسرائے نے جو جواب ڈپوٹیشن کو دیا ہے وہ اسقدر عاقلانہ مدبرانہ بلکہ مولویانہ ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر مسکت جواب کوئی ہو سکتا ہے؛ لیکن مولوی جو قیامت تک نہیں سمجھ سکتا کہ مذہب و شریعت میں کیا فرق ہے، جو مذہب و قوم میں کبھی تمیز نہیں کر سکتا، جس کا ذہن کبھی اس قدر بلند نہیں ہو سکتا کہ وہ سیاسیات کو مذہبیات سے متمایز کر سکے، اس کی سرکی پیشانیاں بالکل حق بجانب ہیں اور اس کا چراغ پا ہونا اس کا فطری تقاضہ۔

بہر حال اب یہ قانون تو مکمل ہو چکا اور دنیا کی کوئی معمولی قوت اس کو منسوخ نہیں کرا سکتی تا وقتیکہ کوئی غیر معمولی مظاہرہ یا سخت خطرناک احتجاج نہ کیا جائے۔ اس لئے میں تمام مولویوں کو جو اس قانون کے مخالف ہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ محض جلسوں ریزولیوشنوں، تاروں اور ڈپوٹیشنوں سے کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے قربانیوں کی اور یہی چیز ایسی ہے جو آپ کے پاس موجود نہیں۔

اگر سارڈا بل واقعی مداخلت فی الدین ہے تو اس سے زیادہ نازک وقت اور کیا آئے گا، کیوں نہیں علماء کرام احتجاجاً فاقے کرنا شروع کر دیتے اور اگر فاقے ممکن نہیں تو کم از کم قورمہ پلاؤ ترک کر کے "نانِ جویں" ہی پر قناعت کریں کہ کسی طرح تو حکومت کو معلوم ہو جائے کہ جو

گروہ اس قانون کی مخالفت پر آمادہ ہے وہ زیادہ نہ سہی "باندازۂ سر سوزن" ہی تکلیف اٹھانے کے لئے تیار نظر آتا ہے، یہ صورت نفاذ سے قبل اختیار کرنی چاہیئے۔ اور جب اپریل سنہ ۳۰ء میں اس کا نفاذ ہو جائے تو پھر "قانون شکنی" کرنا چاہیئے اور ہر مولوی کو کم از کم چار چار شادیاں نابالغ لڑکیوں کے ساتھ کر کے "قید و بند" کی تکالیف برداشت کرنا چاہیئے، اسکا نتیجہ جو کچھ ہو لیکن ایک فائدہ تو یقیناً حاصل ہو جائے گا اور وہ یہ کہ جس وقت تمام مولوی قانون شکنی کی پاداش میں جیل بھیجدیئے جائیں گے تو کم از کم اتنی مدت کے لئے ضرور دنیا میں امن و سکون پیدا ہو جائے گا اور عالم انسانیت اس عذاب سے چھٹکارا پاکر چند دن تک تو آزادی کی سانس لے سکے گا

رسالۂ جن

جنوری سنہ ۳۰ء کا بہ ادارت حضرت نیاز فتحپوری شایع ہو گیا، اگر آپنے ابھی تک مطالعہ نہیں کیا تو اب طلب کیجئے اور دیکھئے کہ کیا چیز ہے قیمت سالانہ دو روپیہ چار آنے حجم ڈھائی جزء

رسالۂ جن

آپ کو بتائے گا کہ، روح کی حقیقت کیا ہے اور عالم ارواح کس نوع کا عالم ہے (۲) روحوں سے کیونکر گفتگو کیجاتی ہے اور ان کے پیام ہمیں کیونکر حاصل ہوتے ہیں (۳) خواب کی دنیا کیا ہے اور تعبیر خواب کسے کہتے ہیں (۴) اشراقیت جو فلاسفۂ مشائین کی مایۂ ناز چیز تھی کسے کہتے ہیں (۵) مقناطیسی خواب دوسرے پر طاری کر کے کیا کیا کام اس سے لئے جا سکتے ہیں (۶) مسمریزم کے کیا اصول ہیں اور اس سے ہم کیا کام لے سکتے ہیں (۷) دوسروں کے افکار و خیالات جان لینا، بند تحریروں کے مضامین پڑھ لینا کس طرح ممکن ہے۔ (۸) عمل حاضرات کی کیا حقیقت ہے۔ (۹) تختی پر روحوں کی تحریروں کا ثبت ہو جانا، میز کی جنبش سے روحوں کا پیام حاصل کرنا کیونکر ہوتا ہے۔ (۱۰) معمول کی کیا خصوصیات ہیں اور اس کے ذریعہ سے ہم کس طرح پیشین گوئی کر سکتے ہیں (۱۱) یورپ روحانیات کے باب میں کیا کر رہا ہے اور اس کی جدید ترین معلومات کیا ہیں۔ (۱۲) جنات اور بھوت پریت کے متعلق کیسے کیسے عجیب و غریب واقعات لوگوں کے تجربہ میں آئے ہیں

"مینیجر نگار لکھنو"

ترانہ

فتح کابل

ساقی! درودے! بر جام و ساغر! مطرب! سرودے! بالحنِ خوشتر!
آمد نویدے، چون گل معطر! کز فضل حق شد، نادر مظفر!
وز تیغ او گشت کابل مسخر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

یک چند کابل! وقفِ ستم شد! افغانیان را، دل صرفِ غم شد!
ہر قلبِ حساس، صیدِ الم شد! و امروز آخر، دل شاد ہم شد!
از فتح نادر شیر دلاور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

یک چند ملت! مدہوش گشتہ! در قعرِ ذلت! روپوش گشتہ!
با شیر قالین ہمدوش گشتہ! بر جور سقا، خاموش گشتہ!
برداشت آخر! تیغِ دوپیکر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

شیرانِ افغان! خوابیدہ ماندند! دلہاے ملت! ترکیدہ ماندند!
بر خاک پستی، غلطیدہ ماندند! در قلب ظلمت، رنجیدہ ماندند!
آخر، عیان شد، صبح منور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

از غیب آمد، یک مردِ سنگی! افرشتہ پیکر، با روحِ جنگی!

از سطوت او، دل چاک، زنگی! وز ہیبتِ او، لرزان فرنگی!
ضرغامِ پردل، شیرِ دلاور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

بالا بلندے! روئین قبائے! دارا شکوہے! خسرو ادائے!
تیمور تمثال! رستم نمائے! نادر مثیلے! نادر لقائے!
شمشیر در کف! صمصام در بر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

از خاک مغرب! آمد چو طوفان! با چشمِ پر خون! با روحِ سوزان!
از درد ملت! با قلبِ بریان! در کف نمایان! شمشیرِ عریان!
گوئی درخشان! صمصامِ داور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!

غمخوارِ ملت! اورا چو دیدند! شیرانِ افغان! از جا جہیدند!
چون رعد و باران! یک یک رسیدند! تیغ از نیام، روئین کشیدند!
تیغے! چہ تیغے! یک برقِ مضطر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!!

با فوج احرار، نادر بروں شد! قوم و وطن را، او رہنموں شد!
دلہائے اعدا، در سینہ خون شد! افواجِ سقا! زار و زبون شد!
وز دست او شد، کابل مسخر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

تختِ امانی! آباد بادا!! شمشیرِ نادر! آزاد بادا!!
شاہ ولی خان! دلشاد بادا!! اعدائے محمود، برباد بادا!!
کز تیغ شان گشت ملت مظفر! اللہ اکبر!!! اللہ اکبر!!!

محمود شیرانی

مشاہدات وارادات

اک شاعرِ شہرت یافتہ نے کل بزمِ سخن مین نظم پڑہی
اس طرح کہ پوری محفل مین ہنگامۂ تحسین برپا تھا
ہر لفظ سے پھوٹ پڑتی تھی، تنویرِ ضیائے حُسنِ اثر
شاعر کے لبون پر شہرت کا دلچسپ تبسم پیدا تھا
اس نظم کے بعد اب شمع پھری اک اور سخن گو کیجانب
''گمنامی و ناپرسی'' جس کی ناشاد جبین پر لکھا تھا
جو اس نے پڑہی اس محفل مین، سرشارِ لطافت نظم نہ تھی
کہسار کے فردوسی دامن مین، چشمۂ شیرین بہتا تھا
کیا تجھسے کہون کیا داد ملی شاعر کو مگر اس کاوش کی
مین دیکھ کے طرزِ اہلِ سخن ہمراز بس اتنا سمجھا تھا
یہ بزمِ جہانستانِ حقیقت خود محرومِ حقیقت ہے
معبودِ خداوندانِ سخن دراصل خدائے شہرت ہے

(۲)

عقل کو سمجھا ہے تو اسرارِ عالم پر محیط ... مین تجھے پیغام دیتا ہون کہ غافل ہوشیار
تیری منزل ہے فریبستانِ اوہام و قیاس ... خود حجابِ چشم ہے جس مین جمالِ آشکار
تو نے یونہی کی ہے موجوداتِ عالم پر نظر ... اے رہینِ شبنم و نا واقفِ ابرِ بہار
دیکھتا ہو، خواب سے جس طرح کوئی چونک کر ... جسکی آنکھون مین ہو گہری نیند کا باقی خمار
جسکو دھندلے سے نظر آئین مناظر گرد و پیش
اور اس موہوم بینش، پر اُسے ہو اعتبار

سید علی اختر - اختر

ایک شاعر کا انجام

مصنفہ نیاز فتحپوری

اڈیٹر نگار کا سب سے پہلا افسانہ حسن و عشق، جسمیں تخیل کی بلندی، زور تحریر، اسلوب بیان اور ندرت انشار کے ایسے ایسے پاکیزہ نمونے موجود ہیں جو ساحری کی حد تک پہونچتے ہیں۔ جوش محبت کے جذبات جس مستانہ پن سے اس تصنیف میں ظاہر کئے گئے ہیں اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ یہ افسانہ جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہے۔

قیمت مع محصولڈاک ۱۲ار۔ "مینیجر نگار۔ لکھنو"

جذبات بھاشا

مصنفہ نیاز فتحپوری

ہندی شاعری میں جو لوچ اور کیفیت ہے، اس کا علم انہیں کو ہوسکتا ہے جنہوں نے اُس زبان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اس کتاب کو دیکھئے اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجئے۔

قیمت فی جلد۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۲ار

"مینیجر نگار۔ لکھنو"

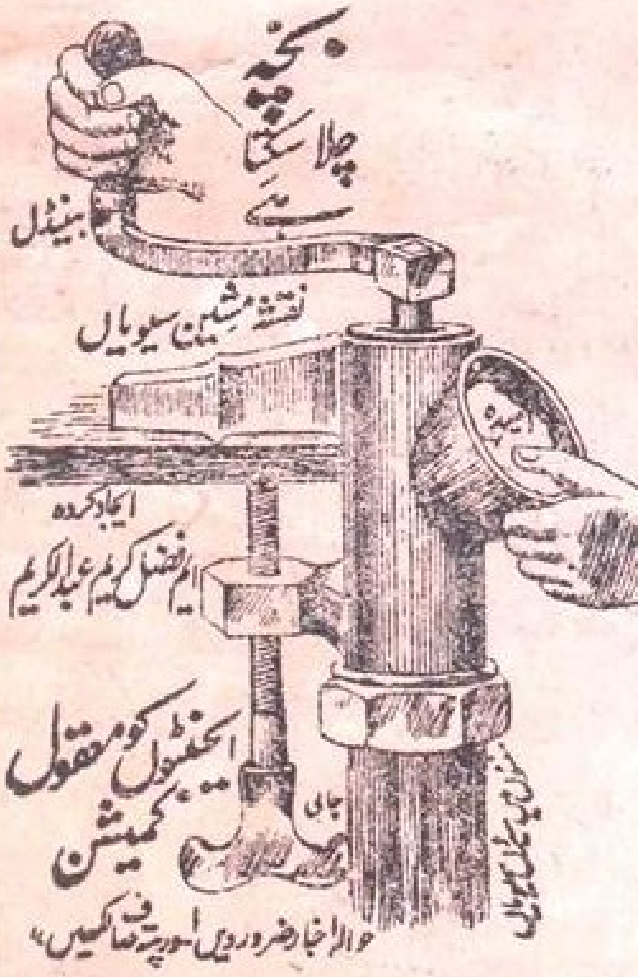

خلاف تحریر ہو تو قیمت واپس

ہمارے کارخانہ قائم شدہ ۱۹۱۴ء کی تیار کردہ مقبول عام پیتل کی خوبصورت پالش شدہ منٹوں میں سیروں نفیس و لذیذ رومالی سویاں تیار کرنے والی

نوایجاد مشین سویاں

وزن معمولی
حجم کم
پرزے مختصر و مضبوط

قیمت فی مشین پیتل پالش شدہ چھلنی دو عدد (سوراخ ۱و۲) ۱۲؎ علاوہ محصولڈاک وغیرہ

ملنے کا پتہ:۔ ہندوستانی ایجاد گھر دہلی

پرتاب ۱۲/
روہنی ۱۰/

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی عہ/
ملکہ زنوبیہ ۳/
قرۃ العین ۳/
محذرات عہ
جویائے حق للعہ
لعبت چین عہ/
فاتح مفتوح عہ
بابک خرمی عہ
الفانسو ۱۲/
ایام عرب عا
قیس و لبنیٰ عہ
یوسف و نجمہ عہ
زوال بغداد عہ
مینا بازار ۸/
مقدس نازنین عہ
رومۃ الکبریٰ عہ
فلپانا عہ
شوقین ملکہ عہ/
منصور موہنا ۸/
حسن انجلینا ۸/
ملک العزیز ورجنا ۱۲/
فردوس بریں ۸/
حسن کا ڈاکو عہ
دربار حرام پور ۱۰/
غیب دان دلہن عہ
بدر النساء کی مصیبت عہ

میوۂ تلخ ۸/
نیکی کا پھل عہ/

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق عہ
قاسم و زہرہ عہ/
نیرنگ جمال ۴/

میر ولی اللہ بی اے

بندگی عا
کاس الکرام سے/
لسان الغیب جلد اول سے
" دوم عا
" سوم عا
" چہارم عا
نمکدان فصاحت عہ
بادۂ ناب عہ/

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹/
نیلی چھتری عہ
بہرام کی گرفتاری عہ/

مولانا نیاز فتحپوری

گیتان جلی عا
گہوارۂ تمدن عا
نگارستان عا
صحابیات عا
تاریخ الدولتین عہ

سید سجاد حیدر بی اے

زہرا ۱۳/
جلال الدین خوارزم شاہ عہ
خیالستان عہ
ثالث بخیر ۸/

حکایات و احتسابات عہ

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

سراب فیشن ۸/
بالشوک شہزادی ۸/
شہید وفا ۸/
ممتاز بیگم ۸/
شعلۂ رنگین ۸/
محاصرۂ پیرس عہ/
شیخ چلی عہ/
بہادر ترک ۸/
بہرام کی دلہن ۴/
انقلاب فرانس عہ
حسن بنارس ۸/
فطرتی جاسوس عہ
ترکی حرم سرا ۸/
جنگ طرابلس ۸/
بہرام چور عہ
زر پرست عہ
کنجی کا راز عہ
عبد الرحمٰن ناصر عا
عروس مصر عا
سیلاب خون عہ
کرشمہ عہ
وفادار دلہن عہ
طواف زمین عہ/

سیاحت زمین عہ
سیاحت عہ/
نازنین مراکش ۸/
سمندر کی سیر عا
اسرار بالشوزم عہ
روح لیلیٰ ے/
امین بک عہ
حجاج بن یوسف عہ
یوسف پاشا عہ
انقلاب عثمانی عہ
نیلی چھتری عہ
بہرام کی آزادی ۱۲/
بہرام کی گرفتاری عہ/
بہرام کی سرگزشت عہ/
پر اسرار قتل عا/

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب سے/
بزم خیال عہ/
مشاطۂ سخن عہ/
انشائے نسوان ۶/
مکاتیب محسن الملک عہ
لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸/

مراثی

مراثی دبیر عا
مراثی انیس للعہ
مراثی ضمیر عہ/
مراثی مونس ۱۲/
مراثی دیگر ۱۲/

تذکرۃ الشعرا

تذکرۂ حسینی ۱۱/
گلشن عہ/
سراپائے سخن عہ/
سوانح نظیر اکبرآبادی عہ

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز عہ/
کلیات عراقی ۱۲/
دیوان حافظ عہ
دیوان نعمت خاں عالی عہ/
کلیات انوری عا
دیوان بیدل ۱۰/
کلیات سعدی عہ
دیوان عرفی ۱۲/
کلیات جامی عہ
کلیات غالب عہ
کلیات صائب عا
کلیات حزیں عا
دیوان عنصری ۴/
دیوان ظہیر فاریابی ۶/
دیوان غنی کشمیری ۶/
دیوان ناصر علی ۵/
دیوان ہلالی ۶/
کلیات جلال اسیر عہ

دواوین اردو

دیوان حسن دہلوی ۶/
کلیات ظفر عا

کلیات مومن عہ/
دیوان ناسخ عہ
کلیات میر عہ
کلیات سودا عہ
کلیات انشا عہ
کلیات نظیر اکبرآبادی عہ/
گلزار داغ عہ
دیوان رند ۹/
دیوان ذوق ۱۲/
کلیات اسمٰعیل عا/
مرآۃ الغیب عہ/
صنمخانۂ عشق عا/
فریاد داغ ۴/
دیوان آتش ۸/
دیوان شہیدی ۴/

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات تصویر رنگین عہ
یا تصویر سادہ للعہ
مجمع الفنون سے
طلسم فرنگ عا
کارخانۂ عالم عہ/

رینالڈز کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین و لیلیٰ عہ
فریب حسن عا
سوزن عشق عہ
روز الیمبرٹ للعہ
ناول اسرار عا
شام جوانی سے
طلسمی فانوس عہ

نگار بک ایجنسی
نظیر آباد لکھنؤ